

شوکت صدیقی

# خُدا کی بستی

ناول

alhamra



## خدا کی بستی (مشاہیر کی نظر میں)

میں نے کل آپ کی ناول ”خدا کی بستی“ ختم کی، اب تک دل و دماغ کے تار جھنجھنا رہے ہیں۔ اسے پڑھ کر مجھے اردو پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں انتہا پسند ہوں، مگر شاید، یہ مبالغہ نہ ہو گا اگر یہ کہوں کہ آپ کی ناول ہر زبان کی ناول سے ٹکر لے سکتی ہے۔

عصمت چغتائی  
(خط سے اقتباس)

مصنف نے بڑے کیونوس پر ناکارہ ریاستی نظم و نسق، حکمران طبقے کی مکروہ بد عنوانی اور دیانت دار اور محبت وطن عناصر پر نااہل اور بد اطوار لوگوں کی بالادستی کی نہایت اعلیٰ تصویر کشی کی ہے، جہاں امیر، امیر ترین اور غریب، غربت اور تنگدستی کی مزید گہرائی میں گرتے جا رہے ہیں۔

”خدا کی بستی“ بد عنوان پاکستانی معاشرے پر بڑا بھرپور طنز ہے۔

خوشنوت سنگھ

(روزنامہ ”انڈین ایکسپریس“ دہلی)

”خدا کی بستی“ میں اپنے دور کی زندگی بڑی صداقت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ شہری تمدن کے نفوش، جن میں سماجی مرتبے کی خواہش، دولت کے حصول کی اندھی طلب، مستقبل کا خوف، بیروزگاری، بھوک، بے راہروی، جنس، ہنگامہ اور تصنع نمایاں عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس ناول میں فن کارانہ طنز کے ساتھ ابھارے گئے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق

(تنقیدی تجزیہ ”خدا کی بستی اور ناول نگاری“)

## شوکت صدیقی

(مختصر تعارف)

- 1923ء 20 مارچ، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔
- 1930ء گورنمنٹ جوبلی کالج میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا۔ ساتویں جماعت تک اسی اسکول میں زیر تعلیم رہے۔ بڑے بھائی حامد حسین صدیقی کے پاس کانپور چلے گئے اور وہاں نواب گنج ہائی اسکول میں آٹھویں میں داخلہ لیا۔ لیکن ایک سال بعد ہی لکھنؤ واپس آ گئے۔
- 1938ء امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول، لکھنؤ، سے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔
- 1940ء پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایف اے کیا۔
- 1944ء پرائیویٹ ہی بی اے کیا۔
- 1946ء ایم اے (سیاسات) کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔
- 1950ء ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔
- 1952ء مکتبہ اُردو، لاہور، سے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”تیسرا آدمی“ شائع ہوا۔ اسی سال اگست میں ڈاکٹر محمد سعید خاں کی صاحبزادی سے شادی ہوئی۔ نیز اسی سال روزنامہ ”پاکستان اسٹینڈرڈ“ سے بحیثیت سب ایڈیٹر وابستہ ہو گئے۔ ”پاکستان اسٹینڈرڈ“ سے وابستگی دو سال رہی۔
- 1954ء روزنامہ ”ٹائمز آف کراچی“ میں ملازمت اختیار کی۔

1955ء جولائی میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”اندھیرا اور اندھیرا“ شائع ہوا۔

1956ء تیسرا افسانوی مجموعہ ”راتوں کا شہر“ منظر عام پر آیا۔

1958ء آپ کا پہلا ناول ”خدا کی بستی“ شائع ہوا۔ جسے اردو ادب کا عظیم شاہکار قرار دیا جاتا ہے۔ اس ناول کی عالمی سطح پر بہت پذیرائی ہوئی۔ انگریزی کے علاوہ اب تک دنیا کی 26 ترقی یافتہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن سے پانچ مرتبہ ٹیلی کاسٹ کیا جا چکا ہے اور اس وقت تک اس کے صرف اردو میں 46 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور موجودہ ایڈیشن 47 واں ہے۔

1960ء روزنامہ ”مارننگ نیوز“ کراچی میں ملازمت اختیار کی۔ اسی سال آدم جی ادبی انعام حاصل کیا۔

1963ء انگریزی صحافت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اردو صحافت کے ساتھ وابستگی کا آغاز کیا۔ روزنامہ ”انجام“ کراچی، میں بطور نیوز ایڈیٹر فرائض سنبھالے اور چیف ایڈیٹر کے عہدہ تک پہنچے۔

1966ء پاکستانی ادیبوں کے ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس منعقدہ بیکنگ میں شرکت کی۔

1967ء افریشیائی ادیبوں کے وفد کے ہمراہ پاکستانی نمائندے کے طور پر شام، لبنان، عراق، فرانس، الجزائر، سیرالیون اور افریقہ کے مختلف ملکوں کا دورہ کیا۔

1969ء ہفت روزہ ”الفتح“ کے نگران اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔

1972ء روزنامہ ”مشرق“ کراچی، لاہور، میں بطور کالم نگار شمولیت اختیار کی۔

1973ء پاکستان پیپلز پارٹی نے پارٹی ترجمان کے طور پر کراچی سے روزنامہ ”مساوات“ کا اجراء کیا تو اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

1974ء روزنامہ ”مساوات“، کراچی، لاہور، لاکل پور کے چیف ایڈیٹر کا منصب سنبھالا اور اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے تمام غیر ملکی دوروں میں ان کے ہمراہ گئے۔

1976ء روزنامہ ”مساوات“ سے بطور چیف ایڈیٹر کنارہ کشی اختیار کی۔ مگر 1980ء تک مستقل

کالم نگار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

1984ء چوتھا افسانوی مجموعہ ”راتوں کا شہر“ شائع ہوا۔ مارشل لا حکومت کی جانب سے اخبارات پر بدترین سنسرشپ اور آزادی تحریر و تقریر پر طرح طرح کی ناروا پابندیوں سے دل برداشتہ ہو کر صحافت کو خیر باد کہا اور پوری توجہ اور لگن کے ساتھ تخلیق ادب کو نصب العین قرار دیا۔

1985ء انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی میں کنوینسنگ کمیٹی کے چیئرمین اور مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔

1987ء عالمی امن کانفرنس، ماسکو، میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔

1988ء دوسرا ناول ”جانگلوس“ شائع ہوا۔ اس ناول کو بھی پاکستان ٹیلی وژن سے تین بار ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔

1990ء تیسرا ناول ”چار دیواری“ شائع ہوا۔ دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی گل ہند کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت کی اور کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کا اعزاز حاصل کیا۔

1997ء حکومت پاکستان نے ادب میں اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف کے طور پر صدارتی ایوارڈ، ”تمغہ حسن کارکردگی“، عطا کیا۔

فن اور شخصیت کے بارے میں تحقیقی کام

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے طالب علم، غلام نبی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کی طالبہ، ناصرہ ملک اور اسی یونیورسٹی کے طالب علم عبدالغفار اعوان، پنجاب یونیورسٹی کی طالبہ فضیلہ احمد، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد، کے طالب علم محمد علی نظر، پشاور یونیورسٹی کے طالب علم، عرفان محمد خاں ایم اے (اردو) کے امتحانات میں شوکت صدیقی کے فن اور شخصیت پر تحقیقی مقالات لکھ کر کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔

کراچی یونیورسٹی سے مریم حسین، گزشتہ چار برس سے معروف نقاد ڈاکٹر حنیف فوق کی نگرانی میں شوکت صدیقی پر بطور ادیب پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالے پر کام کر رہی ہیں جو تکمیل کے مرحلے میں ہے۔



## فصل اول

(۱)

گلی کے کنڈر پر مینو نیپلی کی لائین روشن تھی۔

لائین کی روشنی میں محلے کے کچھ نو عمر لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ وضع قطع سے وہ آوارہ گرد اور لنگا نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے بال، پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص اور گلے میں بندھا ہوا میلا پھیلا ریٹھی رومال۔ ملی جلی آوازوں کے شور میں وہ بار بار چیخ کر کہتا۔

”کہو استاد! کیسا بیمہ کیا؟“

”ابے یہ رہی نیگی۔ واہ میری جان، میں تیرے قربان۔“

”سالو! آج تم کو پدما روں گا۔“

وہ برابر جیت رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں شامی تھا۔ وہ دبلا پتلا تھا اور قد بھی ذرا دیتا ہوا تھا۔ آنکھوں سے شوخی جھلکتی تھی۔ مزاج کا بھی تیز تھا۔ ایک بار جب راجہ نے سب کی نظریں بچا کر، پیر کے نیچے چھپا ہوا تاش کا پتہ نکالا تو شامی نے تاز لیا۔ فوراً چلایا۔

”دیکھ لیا۔ دیکھ لیا۔ سالے! یہ بے ایمانیاں کرتے ہو۔“

راجہ اس کے احتجاج پر کھیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ ”ابے کچھ دماغ خراب ہو گیا

ہے؟“

وضع قطع: طور طریقہ، شکل و صورت۔ پدما روں گا: مرا کو نکال کر دوں گا، حقیر کر دوں گا۔ دیتا ہوا قد: چھوٹا قد۔ کھیانی ہنسی: ایسی ہنسی جس میں شرمندگی بھی شامل ہو۔ ڈھٹائی: بے حیائی۔



شامی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”تم نے ابھی پیر کے نیچے سے پتا نکالا ہے۔“

راجہ نے دھاندلی کرنا چاہی۔ شامی نے جل کر ہاتھ میں دبے ہوئے تاش کے سارے پتے پھینک دیے اور روٹھ کر بیٹھ گیا۔

راجہ اسے چھیڑنے لگا۔ ”سالا ہارنے لگا تو رونے بیٹھ گیا۔“

شامی بگڑ کر بولا۔ ”تم ایک نمبر بے ایمان ہو۔ اب تمہارے ساتھ کبھی نہیں کھیلوں گا۔“

راجہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ”کھیلو گے کیوں نہیں؟ داؤں دے کر جانا پڑے گا۔“

شامی اڑ کر بولا۔ ”دیکھیں کون مائی کا لال داؤں لیتا ہے۔“

راجہ کو غصہ آگیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے دبے پتلے شامی کو دیکھا۔ کڑک کر بولا۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ اور جھپٹ کر شامی کا گریبان پکڑ لیا۔ شامی نے جھٹکا دے کر گریبان چھڑانا چاہا۔ کھینچا تانی میں گریبان جھڑ سے پھٹ گیا۔ شامی کو تاؤ آگیا۔ اس نے منہ بسور کر راجہ کی جانب دیکھا اور تڑے زنارے کا ایک ہاتھ راجہ کے گال پر رسید کیا۔ راجہ کے کان جھنجھناٹھے۔ وہ تمللا کر شامی پر جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لڑکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اب وہ دونوں یوں میں بٹ گئے تھے۔

ایک ٹولی راجہ کی حمایت میں تھی۔ دوسری لکار لکار کر شامی کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ شامی تھا تو مریل سا مگر اس کے جسم میں بڑا کس بل تھا۔ پہلے راجہ نے ٹنگڑی لگا کر پٹنی دی۔ شامی کو گرایا اور اوپر سے دبا کر بیٹھ گیا۔

لیکن ایک بار شامی نے نیچے سے کچکا کر زور لگایا تو راجہ سے سنبلانہ گیا۔ دھڑام سے نیچے آگیا۔ شامی جھٹ سے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ گردن پر گھنٹا رکھ کر دو تین گھنٹے جو دیے تو راجہ چپیں بول گیا۔ لگا نہیں غیس کرنے۔

اسی وقت گلی میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ جب روشنی میں آیا تو لڑکوں نے دیکھا وہ کانلے صاحب تھا۔ اس کی کمر قدرے جھگی ہوئی تھی۔ قدم بوجھل پڑ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی لڑکوں نے نعرہ لگایا۔

جل کر: غصے میں آکر۔ تیوری پر بل ڈالنا: غصے میں آنے۔ قہر آلود: غصے سے بھری ہوئی۔ تاؤ: غصہ۔ کھلبلی پڑنا: ہنگامہ برپا ہونا۔ بڑھاوا دینا: ہمت بڑھانا۔ شاہاں دے کر لڑنا: کس بل: قوت، طاقت۔ ٹنگڑی لگا کر پٹنی دینا: کبھی کا ایک دائرہ گھمے دینا۔ رگڑ لڑنا: جھپٹ بولنا۔ ہارنا: ہارنا۔

”کالے صاحب!“

اس نے جیکھی نظروں سے ان کو دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ راجہ اور شامی ابھی تک گتھم گتھا تھے۔ کالے صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر دونوں کو کسی نہ کسی طرح علیحدہ کیا۔ ان کی قیصیں جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں۔ چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ دھندلی روشنی میں دونوں کا حلیہ بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ کالے صاحب نے آنکھیں نکال کر غصے سے دیکھا اور دھمکانے کے لیے ان پر جھپٹا۔ انہوں نے کالے صاحب کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کالے صاحب کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس نے بغل میں دبا ہوا چمڑے کا بیگ سنبھالا اور آگے بڑھ گیا۔

لڑکے تالیاں بجا بجا کر چیخنے چلانے لگے۔

”کالے صاحب! ٹوٹ گئی بوتل، اڑ گیا کاگ۔“

”کالے صاحب۔۔۔۔۔“

وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتا۔ بار بار لڑکوں کو ڈانٹتا۔ کبھی ڈرانے دھمکانے کے لیے جھپٹتا۔ لڑکے اسے پلٹتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ پھر اکٹھا ہوتے اور تالیاں بجا بجا کر چھیڑتے۔ وہ دور تک اس کے پیچھے شور مچاتے چلے گئے۔

لالٹین کے نیچے اب صرف راجہ، شامی اور نوشارہ گئے تھے۔ راجہ کھیانا کھیانا لگ رہا تھا۔ وہ محلے کے سارے لڑکوں کا سر غنہ تھا اور اس وقت شامی کے ہاتھوں سب کے سامنے اس کی بڑی کرکری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال درست کیے۔ جب سے ایک مڑی مڑی سگریٹ نکالی، سلگائی، دو تین لمبے لمبے کش لگائے اور ایک روپیہ نکال کر نوشارہ بولا۔

”ابے سنیما چلتا ہے؟“

نوشارہ خوشی سے باجھیں کھل گئیں۔ ”کون سی بکچر دیکھو گے؟“

راجہ نے شامی کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”آج تو یار لوگ بغداد کا چور دیکھیں گے۔ باپ قسم ایسی فٹ کلاس بکچر ہے۔ لطف آجائے گا۔“

نوشارہ شامی کی سفارش کی۔ ”اور شامی کو نہیں لے چلو گے؟“

لتھڑے ہوئے: لت پت، کندھے۔ دھونکی کی طرح: براؤ تیز تیز۔ کاگ: ڈانٹ۔ کھیانا: شرمندہ۔ لیڈر: کرکری۔ بے عزتی۔



راجہ مجز کر بولا۔ ”دیکھ بے چلنا ہے تو دیکھی بات کر۔ ورنہ جا اپنی ایسی کی تیری میں۔“

شامی خراٹے لگا۔ ”دیکھو جی! تم کو سنیا جانا ہو تو جاؤ۔ میرا نام مت لو۔ میں تو گھر جاؤں گا۔ تمہاری طرح میں رات رات بھر آوارہ گردی نہیں کرتا۔“ اتنا کہہ کر وہ تو وہاں سے چل دیا۔ نوشا نے اسے روکنا چاہا۔ ”ابے بات تو سن۔“

راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ ”جانے دے سالے کو۔ دیکھ لینا اب کبھی اسے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ ایک نمبر حرامی ہے۔ سالے نے گردن چھیل ڈالی۔“ وہ آہستہ آہستہ اپنی گردن سہلانے لگا جس پر خراش پڑ گئی تھی۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے سینما ہاؤس کی طرف چل دیے۔

آدھی رات کے قریب جب وہ ”بغداد کا چور“ دیکھ کر لوٹے تو گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میونسپلٹی کی لائٹیں کے نیچے ایک خارش زدہ کتابیٹا اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا۔ دونوں اس کے قریب سے گزرے تو راجہ کو خرمستی سو گھی۔ اس نے ایسی زوردار لات ماری کہ وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا بھاگا۔ اس کی چیخوں سے ساری گلی گونج اٹھی۔ نوشا پہلے ہی سہا ہوا تھا۔ اس شور سے اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔ مگر راجہ لاابالی پن کی ترنگ میں تھا۔ فلم اسے پسند آئی تھی۔ بار بار کہتا۔ ”یار بڑی زوردار کچر تھی۔ سالا کیا اشکال سے مگمارتا تھا۔“

راجہ نے جیترا بدلا۔ مٹھی بھینچ کر ہاتھ ہوا میں لہر لیا اور حلق سے آواز نکالی۔ ”ڈھم۔“ ساتھ ہی اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نوشا کی پیٹھ پر دھپ مار کر بولا۔ ”باب قسم جی آگیا آج۔“

نوشا جل کر بولا۔ ”ابے تجھے تو ججا آ رہا ہے۔ کہیں اپنا سینما نہ ہو جائے۔“

راجہ اسے چھیڑنے لگا۔ ”جب اتنا ہی ڈر ہے تو سالے خان پھر سینما کیوں جاتے ہو؟“

”یار اب انہیں جاؤں گا۔ بہت رات ہو جاتی ہے۔“

”ابے تو روزی نوئی کہتا ہے۔ کل پھر جائے گا۔ دیکھ لینا۔“

دونوں باتیں کرتے سناٹان گلی میں چلتے رہے۔ نوشا کا گھر قریب آگیا تو اس نے راجہ کو ٹھہرا لیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر گیا۔ کان لگا کر اندر کی سن گئی۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے کواڑوں کو آہستہ سے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ نوشا لٹے قدموں راجہ کے پاس ڈپٹ کر ڈپٹ کر بھائیں بھائیں کرنا۔ لوگوں کے نہ ہونے کی وجہ سے خوفناک معلوم ہوتا، بالکل سناٹا ہوتا۔ خرمستی، خرموت، لاابالی پن، بے پروائی، بے گہری، ترنگ، جوش، لہر دھپ، چھڑ، سن گئی لینا، چپ کر سنا۔

واپس پہنچا۔

راجہ نے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ٹھاک ہے؟“

نوشا نے جواب دیا۔ ”دروازہ تو بند ہے۔“ اس کی آواز میں ہلکی سی قہر قہرٹ تھی۔

”ابے تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔“ راجہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے گھر کی چار دیواری کے نیچے پہنچ گئے۔

نوشا کا گھر بھی محلے کے عام مکانوں کی طرح پرانا اور معمولی وضع کا تھا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہ

تھیں۔ راجہ بیرونی دیوار سے ٹیک لگا کر گھوڑا بن گیا اور ہاتھ ہلا کر بولا۔

”آجا میرے شیر۔“

نوشا چپ چاپ اس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار مضبوطی سے پکڑی اور بندر کی طرح

اپک کر اوپر پہنچ گیا۔ نیچے سے راجہ نے سرگوشی کی۔ ”یار میں تواب چلا۔“

نوشا نے دہلی زبان سے کہا۔ ”اچھا۔“

راجہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ لیکن نوشا دیوار پر خاموش بیٹھا رہا۔

جب دیر تک کوئی آواز نہ سنائی دی تو وہ دم سے صحن میں کود گیا۔ وہیں ٹین کا ایک ڈبا پڑا تھا۔ ڈبا اس

کے پیروں کے نیچے آکر زور سے کھڑکھڑایا۔ اسی وقت کمرے کے اندر ماں کی آواز ابھری۔

”کون؟“

نوشا دیوار سے چٹ کر بیٹھ گیا اور منہ سے تلی کی طرح آوازیں نکالنے لگا۔ ”میاؤں میاؤں۔“

ماں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پھر ابھری۔ ”ہش ہش ہش، ہش!“

نوشا دیوار کے قریب سہا ہوا بیٹھا تھا۔ دھڑکنے دل سے سوچتا تھا۔ اگر ماں نے باہر آکر کہیں

اسے دیکھ لیا تو اچھی خاصی مرمت ہو جائے گی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ ہوا سائیں سائیں کرتی چل

رہی تھی۔ سردی کے مارے نوشا کے دانت کلکتارہے تھے۔ سارا بدن برف کی مانند سرد پڑ گیا تھا۔ مگر

وہ دبا ہوا جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کمرے کے اندر کوئی آہٹ نہ ہوئی تو اس نے احتیاط

کے طور پر دو تیس بار تلی کی آواز نکالی۔ مگر کوئی نہ بولا۔

وہ بچوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس

نے گردن بڑھا کر اندر دیکھا۔ کونے میں لیپ چل رہا تھا۔ دھندلی روشنی میں سامنے فرش پر اس کا



چھوٹا بھائی انور سو رہا تھا جسے پیار سے آؤ کہا جاتا تھا۔ ذرا فاصلے پر ماں لیٹی تھی اور اس کے قریب ہی سلطانہ لحاف میں دیکی پڑی تھی۔ وہ انوار نوشا سے بڑی تھی۔

نوشا چوروں کی طرح چپکے سے کمرے کے اندر گیا اور آؤ کے برابر لیٹ گیا۔ اسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ ڈر کے مارے نوشا نے ان کی رضائی کو ہاتھ بھی نہ لگایا جسے اوڑھ کر دونوں سویا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ نیند میں ذرا بھی آؤ کے ہاتھ لگتا تو گھبرا کر اس بری طرح چیخا کہ سوتوں کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ سردی سے کانپتا سکڑا سکڑا لیا لیا رہا۔

ذرا دیر بعد سلطانہ نے کھنکار کر گردن اونچی کی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مڑ کر نوشا کی جانب دیکھا جو آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ وہ اٹھ کر نوشا کے پاس گئی۔ رضائی اس کے جسم پر ڈال کر سرگوشی کی۔

”امو مئے بے رضائی تو اوڑھ لے۔ تجھے تو سردی بھی نہیں لگتی۔“

نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ اس کی کمر میں زور سے بکوتا بھرا۔ وہ بلبل کر بولی۔ ”ہائے اماں۔ ایک تو کجنت کے ساتھ نیکی کرو۔ اوپر سے چٹکیاں بھر رہا ہے۔“

اس دفعہ سلطانہ کی آواز کسی قدر اونچی تھی۔ مگر ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے کروٹ بھی نہ لی۔ نوشا نے ڈر کے مارے چوں بھی نہ کی۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ جب سلطانہ اٹھ کر جانے لگی تو وہ جل کر بڑبڑایا۔

”حرامزادی۔“

سلطانہ نے اس کی گالی سن لی تھی مگر اب وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ خاموشی سے جا کر اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ نوشا ذرا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر گہری نیند سو گیا اور دن چڑھے تک سوتا رہا۔



نوشا اس روز ڈیوٹی پر پہنچا تو دیر ہو گئی تھی۔ چھانک پر ور کشاب کا چوکیدار گل خان بیٹھاناک میں ہلا س چڑھا رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔ ”خوتم اتنی دیری سے آتا ہے۔ سیٹھ بوت گرم ہوتا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ تمہیں تو۔“ نور انہی اسے چھینک آگئی۔ پھر کئی چھینکیں آئیں۔ اس کی بقیہ بات چھینکوں کی

نذر ہو گئی۔

نوشا جھپاک سے احاطے میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچتے ہی اس نے چوکننا نظروں سے عبد اللہ مستری کو تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ عبد اللہ مستری کاروں کی مرمت کرنے والے ورکشاپ کا مالک تھا۔ کاریگروں کو سزا دینے کے معاملے میں دور دور تک اس کا شہرہ تھا۔ نوشا دھر دھر دیکھتا بھالتا، شیڈ کے نیچے پہنچ گیا جہاں دوسرے کاریگر کام کر رہے تھے۔ اس کے پہنچتے ہی ایک کاریگر زور سے کھنکار کر بولا۔

”ابے دیر سے آتا تھا تو سر سے تو اباندھ کر آتا۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ارے یار، یہ تو بڑا پگلا ہے۔ ابے رات کو نسی فلم دیکھی تھی؟“

”سالار روز سنیما جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی شوقین سے ٹکرا گیا۔“

”ارے اس کی کیا پوچھتے ہو۔ اس پر تو چا تو چلتے ہیں چا تو۔“

نوشا بگڑ کر بولا۔ ”دیکھو جی! مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔“

ابھی اس پر ایک آدھ فقرہ اور جست ہوتا ہی تھا عبد اللہ مستری کی آواز سنائی دی۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ نوشا نے جلدی سے ایک پانا اٹھایا اور قریب کھڑی ہوئی کار کے نیچے گھس گیا اور خواہ مخواہ کھڑ پٹر کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عبد اللہ مستری وہاں آ گیا۔ کاریگروں کی روح فنا ہو گئی۔ سب کے ہاتھ جلدی جلدی چلنے لگے۔ نوشا کار کے نیچے گھسا ہوا کھڑ پٹر کرتا رہا۔ اس کا نچلا دھڑ باہر نکلا تھا اور برابر جنبش کر رہا تھا۔ وہ تو صاف بچ گیا۔ ساری آئی گئی ایک اور کاریگر کے سر گئی۔ وہ بھی دیر سے پہنچا تھا۔ اس کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔

عبد اللہ نے پہلی ہی نظر میں اسے بھانپ لیا۔ گردن ہلا کر بولا۔ ”کیوں بے دیر سے آیا ہے؟“

ڈر کے مارے لڑکے کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ اس دفعہ عبد اللہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”ابے کیا منہ پھوٹ گیا۔ بولتا کیوں نہیں؟“

وہ گھبرا کر بولا۔ ”اماں نے روک لیا تھا۔“

عبد اللہ نے میڑھی سی گالی دے کر کہا۔ ”اماں نے کیا اپنے کسی یار کے پاس بھیجا تھا؟“

اس سوال کا وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ صرف عبد اللہ کا منہ ٹکر ٹکر تکتے لگے۔



”اچھا جی! اب تم کپڑے اتارو اور ننگے کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔ فی الحال تمھاری یہی سزا ہے۔“  
کارگیر لڑکا گڑگڑانے لگا۔ مگر عبد اللہ ایسی خوشامد سے کہاں پیچھے والا تھا۔ آنکھیں نکال کر  
بولاً۔ ”اے اتار تا ہے کپڑے یا پھر دکھاؤں کال کو ٹھری کا راستہ۔“  
کال کو ٹھری کا نام سنتے ہی لڑکے کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے گھبرا کر جلدی جلدی  
سارے کپڑے اتارے اور مادر زاد برہنہ ہو گیا۔

آسان پر ابر چھایا تھا۔ ہوا بھی بھری ہوئی تھی۔ مہاوٹوں کی سردی تھی۔ خود عبد اللہ موٹے  
اولیٰ کپڑے کا اور کوٹ پہنے تھا۔ سر اور کانوں کو مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لڑکے کا برہنہ جسم سردی  
سے کپکپانے لگا۔  
عبد اللہ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”اے اس طرح کب تک چوتڑ بھولے کھڑا رہے گا۔  
ننگے تلے جاتا ہے کہ نہیں۔“

نوعمر کاریگر نے بے بسی سے عبد اللہ کی جانب دیکھا اور نظریں شرم سے نیچی کیے پاپ کے  
نیچے جا کر بیٹھ گیا جس کی ٹونٹی کھلی تھی اور پانی دھار بن کر گر رہا تھا۔  
عبد اللہ چلا گیا تو نوشانے چوہے کی طرح موڑ کار کے نیچے سے گردن نکالی اور باہر آ گیا۔ اس  
کے کپڑے گرد سے اٹ گئے تھے۔ چہرے پر سیاہی کے جگہ جگہ دھبے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک  
کاریگر نے جو عمر میں دو تین سال بڑا ہو گا اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔

”استاد اب رشوت میں ایک پیار دلو! وہ نہیں تو ابھی تم کو بھی ننگے کے نیچے بھجواتا ہوں۔“  
نوشا اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے چپ چاپ چہرہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کاریگر  
نے اس کے گالوں کا ایک بوسہ لیا۔ پھر براسانہ بنا کر فرش پر تھوک دیا۔  
”سالے نے منہ کڑوا کر دیا۔ اے یہ موہل آئل کہاں سے چڑ لیا۔“  
سب کاریگر کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسنے لگے۔



لیپ کی دھندلی روشنی میں سلطانہ گردن جھکائے قینچی سے بیڑی کے پتے کاٹ رہی تھی۔

پہچانا: رحم کرنا۔ اوسان خطا ہو جانا: اوسان درست نہ رہنا۔ مادر زاد برہنہ: بالکل ننگا۔ مہاوٹ: بارش جو سردیوں کے مہینوں میں ہوتی ہے۔  
چڑ لیا: نکالا۔

عبد اللہ غضب ناک ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ ”سالوں کو کام بھی سکھاؤ۔ اوپر سے تنخواہ بھی دو  
اور یہ حرام کے ختم اس کا صلہ یہ دیتے ہیں کہ گھر سے نواب بن کر نکلتے ہیں۔“  
اس نے ایک کاریگر کے ہاتھ سے پلاس چھینا اور لڑکے کی ناک اس میں رکھ کر زور سے بھیج  
دی۔ وہ بلبلہ کر چنچا۔

”ہائے مر گیا مستری جی!“  
”تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“  
”اب کبھی دیر سے نہیں آؤں گا۔“  
وہ برابر چیخا رہا۔ فریاد کرتا رہا۔ مگر عبد اللہ نے اس کی ناک نہ چھوڑی۔ جب وہ تکلیف سے بے  
قابو ہو کر فرش پر ہاتھ پاؤں جٹختے لگا تو عبد اللہ نے ڈانٹا۔  
”سالے! یہ ایکٹنگ ہو رہا ہے۔“

وہ تڑپ کر چنچا۔ ”ارے مر گیا مستری جی۔ اب کبھی نہیں کروں گا۔“  
مستری زور سے گرجا۔ ”سیدھا بیٹھ۔“ لڑکا ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔  
ذرا دیر بعد عبد اللہ نے پلاس کے شکنجے سے اس کی ناک آزاد کر دی۔ اب ناک ٹماڑ کی طرح  
سرخ نظر آرہی تھی۔ لڑکا بار بار ناک چھوتا اور زور زور سے سسکیاں بھرتا۔  
عبد اللہ نے اس کی تکلیف پر توجہ دیئے بغیر اونچی آواز سے پکارا ”منشی جی! اے منشی جی۔ ذرا  
یہاں تو آؤ۔“

فوراً ہی ایک سوکھا پتلا ادھیڑ آدمی ناک کی پھٹکی پر عینک درست کرتا ہوا پہنچا۔  
عبد اللہ نے لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو جی، آج کی اس حرام کے جنے کی  
تنخواہ نہیں لگے گی۔ سمجھ گئے؟“

منشی جی فوراً سمجھ گئے۔ جھٹ جواب دیا۔ ”بہت بہتر، بہت بہتر۔ میں ابھی جا کر رجسٹر میں اس  
کی غیر حاضری لگائے دیتا ہوں۔“

لڑکے نے اطمینان کی سانس لی۔ سوچا اب تو جان بچ گئی۔ لیکن عبد اللہ مستری اتنی آسانی سے  
کاریگروں کی خطا معاف کر دیتا تو پھر اس کا اس قدر شہرہ کیوں ہوتا۔ کہنے لگا۔

حرام کے ختم: ایک گال۔ بھیجنا: دہانا۔ پٹھنا: زور زور سے مارنا۔ پھٹکی: ناک کا سر۔



”چل بیٹھ۔ بڑا آیا گیدڑ بھگانے والا۔“ ماں نے اسے ڈانٹا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتا۔ وہ تیرا سگا باہر کھڑا رہا ہے۔ دیکھ میں تجھ سے ہزار بار کہہ چکی ہوں۔ اس حرامی راجہ کی صحبت چھوڑ دے۔ نہیں تو سر پر ہاتھ دھر کر روئے گا۔“

نوشا کھیانا ہو کر رہ گیا۔ دیر تک پڑا سلطانہ کو کوستا رہا جو شوخی سے بار بار اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ نوشا کا بس چلتا تو اس کے منہ پر ایسا زانٹے کا تھپڑ رسید کر تاکہ ساری ہنسی نکل جاتی۔

(۲)

گلی کی دھندلی دھندلی روشنی میں راجہ بار بار حلق سے گیدڑ کی آواز نکالتا رہا۔ ہر بار وہ دروازے کی جانب دیکھتا۔ مگر اس روز دروازہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ وہ دیر تک نوشا کا انتظار کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

راجہ میونسپلٹی کی لائٹن کے نیچے پہنچا۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ تجلے کے کسی لڑکے کا دروازہ دور تک نام و نشان نہ تھا۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سردی کڑا کے کی پڑ رہی تھی۔ دن بھر بادل چھائے رہے۔ شام کو بوندا باندی بھی ہوئی۔ اب ہوا کے تھکڑے چل رہے تھے۔ راجہ کے پاس اس روز پیسے بھی زیادہ نہ تھے۔ ورنہ سنیما ہی چلا جاتا۔ سوچا تھا کہ نوشا مل جائے گا تو دونوں مسلم ہوٹل میں ایک ایک کڑک چائے پیئیں گے اور ریڈیو سے فلمی گانے سنیں گے۔

راجہ نے لائٹن کے نیچے کھڑے ہو کر زور زور سے گیدڑ کی آواز نکالی۔

”ہمگا ہوا، ہمگا ہوا۔“

گہری خاموشی میں دیر تک اس کی آواز گونجتی رہی۔ مگر کوئی دروازہ نہ کھلا۔ کوئی باہر نہ نکلا۔ وہ جل کر بڑبڑانے لگا۔ ”آج سب سالے مر گئے۔“ اسی جھنجھلاہٹ کے عالم میں وہ مسلم ہوٹل کی طرف چل دیا مگر اس وقت ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا جب تک خبریں چلیں اتنی دیر کیوں نہ چھی کرالی جائے؟ سر میں کچھ درد بھی تھا۔ چھی کرنے والا ایک نوجوان مالشیا مسلم

محبت: ساتھ دوستی: زمانے کا: زور دار: ہو کا عالم: دیرانہ: خوفناک: جگہ: چھی: ہر دوسری مالش۔

قریب ہی ماں بیٹھی تھی جو کئے ہوئے پتوں میں تمباکو بھر بھر کر بیڑیاں بنا رہی تھی۔ دونوں سے ذرا ہٹ کر آٹو کاپی پر جھکا ہوا لکھنے میں منہمک تھا۔ نوشا سب سے الگ تھک گونے میں لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔

کمرے میں دیر سے خاموشی چھائی تھی۔ آخر ماں نے سکوت توڑا۔ آٹو کو مخاطب کیا۔ ”آٹو! دیکھ کل سویرے ہی سویرے اٹھ کر کارخانے جانا۔ ملک جی سے کہنا سارا پچھلا حساب صاف کر دو۔“

آٹو نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے جواب دیا۔ ”اچھا اچھا۔“

ماں نے پھر کہا۔ ”بھولنا مت۔ پورا حساب لے کر آنا۔ نہیں تو گھر میں فاقہ پڑ جائے گا۔ میرے پاس اب ایک پیسہ نہیں رہا۔ اور ہاں ان سے یہ بھی کہہ دینا۔ شام تک ہزار بیڑیاں پہنچ جائیں گی۔ سمجھ گیا نا؟“

اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ وہ رک رک کر اپنی بات کہتی رہی۔ ذرا دیر خاموش رہی پھر نہ جانے کیا سوچ کر بولی۔

”آبیڑیوں کے بنڈل بنانا کر تاگا لپیٹتا جا۔“

آٹو نے احتجاج کیا۔ ”میں اسکول کا کام کر رہا ہوں۔ کام پورا نہیں ہوا تو کل ماسٹر صاحب بیچ کر کھڑا کر دیں گے۔“

مگر ماں نے اس کی ایک نہ سنی۔ ڈپٹ کر بولی۔ ”چل باتیں نہ بنا۔ بڑا آیا پڑھنے والا۔ بہت ہو چکی پڑھائی۔ پہلے پیٹ کا دھندا کر۔ کھانے کو نہیں ہوگا تو سب سے زیادہ تو ہی فیل چائے گا۔“

آٹو بادل ناخو استہا اور ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بیڑیوں کے بنڈل تیار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد گلی میں گیدڑ کے بولنے کی آواز ابھری۔ نوشا جو آٹو درکشاپ سے واپس آنے کے بعد ابھی تک تھکا ہوا سالیٹا تھا، جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سلطانہ نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا اور ماں کو مخاطب کیا۔

”امان! آج تو سر شام ہی گیدڑ بولنے لگے۔“

ماں لا پرواہی سے بولی۔ ”توبہ کرو بیٹی! اس وقت کہاں سے گیدڑ آگئے۔“

نوشا فوراً آنچ میں بول اٹھا۔ ”نہیں امان! آواز تو گیدڑ کی معلوم پڑتی ہے۔ جا کر بھگا آؤں۔“

منہمک: مصروف: سکوت: خاموشی: بے نیازی: لا پرواہی: ڈپٹ کر: ڈانٹ کر: پیٹ کا دھندا: سخت: مزدوری: ٹیل: چٹا: شور ڈالنا۔



ہوٹل کے باہر ہی بیٹھا تھا۔

راجہ نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”ابے ہوتی ہے کچھ چچی وہی؟“  
وہ جھٹ بولا۔ ”ابھی لو!“ اور تیل کی شیشیاں سنبھال کر سامنے آکھڑا ہوا۔  
راجہ نے پوچھا۔ ”مگر یہ تو بتا لے گا کیا؟“  
”یار جو جی چاہے دے دیتا۔“

”میرے پاس ایک دوڑنی ہے۔ بول کیا کہتا ہے؟“  
اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”چل یار تو بھی کیا یاد کرے گا؟“  
راجہ وہیں چائے خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ چچی کرنے والے نے شیشی سے تیل نکال کر  
راجہ کے سر میں ڈالا اور مالش شروع کر دی۔ اس کی انگلیاں نرم تھیں اور ہاتھ پھرتی سے چل رہے  
تھے۔ راجہ نے چچی کراتے کراتے بے نیازی سے پوچھا۔ ”کیوں جی اور زانہ تم کو کیا مل جاتا ہو گا؟“  
”بس یار! یہ نہ پوچھ کیا مل جاتا ہے۔“

راجہ اصرار کرنے لگا۔ ”پھر بھی؟“  
”بہی روپیہ ڈیڑھ روپیہ روز پیٹ لیتا ہوں۔“  
”ابے تو یہ کچھ کم ہے۔“ راجہ نے حیرت سے کہا۔ ”کسی کا گھر لوٹنے کا ارادہ ہے؟“  
”کم تو نہیں، پر محنت بڑی ہے۔“

راجہ بولا ”ابے کیا محنت ہے۔ میں سیکھوں تو سکھا دے گا؟“ واقعی وہ اس کے لیے آمادہ بھی تھا۔  
”یار کیا کرے گا سیکھ کر۔ سالہا بڑا ادھیات دھندا ہے۔“  
”واہیات کی اس میں کوئی بات ہے؟“

وہ بے زاری سے بولا۔ ”بس کہہ دیا کہ ہے۔“  
راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ابے صاف صاف بتا۔ آخر بات کیا ہے؟“  
وہ مسکراتے لگا۔ ”تو پھر اس آدمی سے پوچھ لو۔“

راجہ نے اس آدمی کی جانب دیکھا جو برابر کی دکان کے تھوڑے پر بیٹھا اپنی ران کھج رہا تھا۔  
راجہ نے اس سے تو کوئی بات نہیں کی۔ البتہ چچی کرنے والے سے دریافت کیا۔

”ابے اس سے کیوں پوچھوں۔ تو کیوں نہیں بتاتا؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”وہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے۔“ اس نے اس شخص کو مخاطب کیا۔ ”اماں خان  
صاحب! یہ راجہ تم کو پوچھ رہا ہے۔“  
خاں صاحب نے ران کھجاتے کھجاتے راجہ کی طرف دیکھا۔ ہنس کر بولا۔ ”روپیہ ایک عدد  
کلدار ملے گا۔ بول چلتا ہے؟“

راجہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کہاں؟“  
اس نے بد معاشی سے آنکھ مار کر کہا۔ ”واہ جان من! اب یہ بھی سمجھنا پڑے گا۔“ اور راجہ کی  
سمجھ میں ساری بات آگئی۔ اس نے غضب ناک ہو کر موٹی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب  
پہنچ گیا۔

”سالے حرامی پن کرتا ہے۔ ابھی ساری بد معاشی نکال کر رکھ دوں گا۔“  
وہ گہرا کر بولا۔ ”ابے میں نے تجھ سے کہا بھی کیا ہے۔“

راجہ نے اسی طرح کڑک کر کہا۔ ”سالے یہاں لونڈوں کو پٹانے آتے ہو۔“  
”ابے جائے گیا کچھ لے گا۔ خاما خاسر ہوئے جا رہا ہے۔“ اس نے راجہ کو دھمکی دی۔ مگر راجہ  
ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا اور چیخ چیخ کر گالیاں دیتا رہا۔ شامت اعمال چچی کرنے والا بھی خاں صاحب  
کی حمایت میں بول اٹھا۔

راجہ اس کے سر ہو گیا۔ غصے سے اس کی تیل کی شیشیاں توڑ ڈالیں۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا  
ہو گیا۔ خاں صاحب بہت سٹ پٹائے۔ بڑی مشکل سے راجہ کو منایا۔ منت سماجت بھی کی اور گالیاں  
بھی کھائیں۔

راجہ نے جھنجھلاہٹ میں چائے بھی نہیں پی اور اپنی کھولی کی جانب چل دیا۔

\*\*\*

کھولی میں گہپ اندھیرا تھا۔ یہ کھولی ایک شکستہ عمارت میں تھی جو پچھلی برسات میں منہدم  
ہو گئی تھی۔ راجہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی بوڑھے گداگر نے



کھانا شروع کر دیا۔

راجہ نے پوچھا۔ ”اماں استاد! تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“

وہ کھانتے کھانتے بولا۔ ”باپ رے باپ۔ آج تو گجب کی سردی پڑ رہی ہے۔ جرادروا جا تو بند

کردے۔ اور دیکھ وہ کونے میں جو چدر پڑی ہے۔ مجھے اڑھادے۔“

اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ راجہ نے ماچس جلائی تو سامنے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بوڑھا فرش پر گٹھری بنا ہوا دکھائی دیا۔ روشنی کے ساتھ ہی ایک چمکدار کھولی میں تیزی سے چکر کاٹنے لگی۔ راجہ نے کونے میں پڑی ہوئی چادر اٹھائی اور گداگر کے اوپر ڈال دی۔ گداگر اپنے کوڑھ کے زخموں کو کھسکا کھسکا دیکھتا ہوا بولا۔

”آج تو جلدی آگیا۔ سردی لگی ہوگی۔ باہر جھکڑ چل رہے ہیں۔“

راجہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازہ بند کیا اور اپنی گدڑی کے اندر گھس گیا۔ اس وقت غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ راجہ کو ایسا محسوس ہوا گویا گدڑی پانی میں بیگ گئی ہے اور اس کا سارا بدن منجمد ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے کھنڈرے پن سے ہو ہو کر کے حلق سے بے ہنگم آوازیں نکالیں اور دونوں گھٹنے سیڑ کر سینے سے لگا لیے۔ بڑی دیر بعد راجہ کو نیند آئی۔

سویرے ہی سویرے گداگر نے کمر پر لات مار کر راجہ کو جگادیا۔ آنکھ تو کھل گئی مگر وہ دم سادھے خاموش پڑا رہا۔ گداگر کی دوسری لات اس کے کندھے پر لگی۔ اب ٹالنا مشکل تھا۔ بوڑھا بخشنے والا نہیں تھا۔ لاتیں بھی مارتا اور شام کو اٹھتی دینے میں نخرے الگ کرتا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ بوڑھے گداگر نے کھولا تھا یا رات گئے تیز ہوا سے پتھر ہٹ گیا تھا۔ باہر ہر طرف گہری دھند چھائی تھی۔ دھندلی دھندلی نیلگوں روشنی میں گداگر بھوتوں کی طرح ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ اس کی گندی ڈاڑھی بکھری تھی اور سر کے بال الجھ کر آنکھوں پر آگئے تھے۔ وہ اپنے رستے ہوئے زخم کھجا رہا تھا۔

راجہ نے کھولی سے لکڑی کی چھوٹی سی گاڑی باہر نکالی۔ گداگر کو اس میں بٹھایا اور گاڑی کھینچتا ہوا آگے چل دیا۔ بوڑھا تو اپنی چادر اوڑھ کر مزے سے گاڑی کے اندر بیٹھا رہا۔ مگر راجہ صرف ایک پھنی ہوئی قمیص پہنے تھا۔ اس کا جسم صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لرز رہا تھا۔ اسے سردی سے ٹھٹھرتے دیکھ

گدڑی: بستر۔ منجمد: برف کی طرح جمنا ہوا۔ کھنڈر: پاپن: سرو لاہر والی کاندا۔ ٹھٹھرتا: سردی سے کانپنا۔

کر گداگر نے منہ لگا ڈالا۔

”ابے یہ روز روز جو تو سینما جاتا ہے۔ کیوں بے فضول پیسہ برباد کرتا ہے۔ ایک گرم کوٹ کسی

پرانے کپڑے بیچنے والے سے کیوں نہیں خرید لیتا؟ دیکھ تو کیسی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔“

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ گاڑی کھینچتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔ سارا شہر نیلگوں کبر کے جال میں الجھا ہوا ابھی تک سو رہا تھا۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی، سناٹا تھا، خاموشی تھی اور اس گہرے سکوت میں آہستہ آہستہ ابھرتی ہوئی آمد صبح کی پہلی آوازیں مکھیوں کی طرح جھنجھٹا رہی تھیں۔ گداگر نے اپنی مخصوص صدا لگائی۔

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے

حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

گداگر کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ صبح کی گہری خاموشی میں اس کی صدا بڑی دردناک معلوم ہو رہی تھی۔ مگر راجہ پر اس دردناک صدا کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اگر کوئی احساس تھا تو سردی کا۔ وہ گاڑی کھینچتا ہوا اللہ دیا کے چائے خانے کے سامنے پہنچ گیا۔ اندر بھٹی میں انگارے دہک رہے تھے کبھی کبھی کوی کوئلہ زور سے چنچتا تو سرخ روشنی کی لکیر دور تک لہر اجاتی۔ بھٹی کے اوپر سادار رکھا تھا۔ سادار سے ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی۔

راجہ نے گاڑی کی رفتار سست کر دی۔ گداگر گڑگڑا کر اللہ دیا کو دعائیں دینے لگا۔ ”اللہ کار و بار میں برکت دے۔“ مگر اللہ دیا، جسے اس وقت دعاؤں کے بجائے گاکوں کی ضرورت تھی، بے رخی سے بولا۔

”بابا آگے جاؤ۔“

راجہ نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔

اندروں چائے خانے میں اللہ دیا بڑ بڑا رہا تھا۔ ”سالے صبح ہی صبح نازل ہو گئے۔ نہ بوہنی نہ بٹا پہلے ان کو دے دو۔“

گداگر نے اس کی بڑ بڑاہٹ سن کر راجہ سے کہا۔ ”ابے تو نے بھی کس سالے نوڑھئے کے پاس گاڑی روکی۔“

بلا کا: بہت زیادہ۔ سوز: درد۔ صدا: آواز۔ سادار: پانی گرم کرنے کا برتن۔ نہ بوہنی نہ بٹا: امر او آمدنی، ابھی بالکل نہیں ہوئی۔



”تم اس بوڑھے کا ساتھ چھوڑ دو۔ اسے کوڑھ کا مرض ہے۔ یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔“  
اس نے نزدیک کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا۔ اسٹیرنگ و ہیل سنبھالا اور کار اسٹارٹ کر دی۔  
جب کار آگے بڑھ گئی تو بوڑھے کوڑھی نے گندی سی گالی دے کر راجہ سے کہا۔ ”سالے نے  
پیہ ایک نہیں دیا۔ نصیحت ڈھیر بھر کر دی۔ اب اس مرغی کے جنے سے پوچھو کہ خالی نصیحت سے  
پیٹ تو نہیں بھرتا۔ دھت تیرے۔“ گداگر نے پھر گالی دی۔  
راجہ نے سوچا۔ بوڑھا ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ خالی نصیحت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ جب کوئی  
کام دھندا نہیں ملا تب ہی تو اس نے گداگر کی نوکری کی تھی۔ اب اسے دونوں وقت پیٹ بھرنے کو  
کھانا ملتا تھا۔ روزانہ اٹھتی دھاڑی کی اور اس کے علاوہ گداگر کی نظر بچا کر جو پیسے بھیک سے اڑا لیتا، وہ  
آمدنی الگ تھی۔

دن بھر راجہ، بوڑھے گداگر کو گاڑی میں ڈال کر شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ بوڑھا اپنی  
دردناک صدا بلند کرتا رہا۔ گاڑی کے پیچھے اونچے نیچے راستوں پر کھڑکھڑاتے رہے۔ گداگر جب ایک  
کروٹ پڑے پڑے تھک جاتا تو دوسرا پہلو بدلتا۔ کوئی سنسان جگہ آتی۔ راجہ دم لینے کو ٹھہر جاتا۔  
سگریٹ سلگا کر دو چار کش لگاتا اور تازہ دم ہو جاتا۔  
صبح کے نکلے ہوئے دونوں تھکے ہارے کھولی میں واپس پہنچے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔  
بازاروں کی رونق اجڑنے لگی تھی۔ گلی کوچوں میں سناٹا پڑ گیا تھا۔  
کھولی میں پہنچتے ہی راجہ نے حسب معمول اپنی دھاڑی مانگی۔ بوڑھا اٹھتی دینے میں حسب  
معمول ٹال منول کرنے لگا۔ ”ابے تو ان پیسوں کو برباد کر دے گا۔ میرے کئے پڑے رہنے دے۔  
تیرے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔“

راجہ ضد کرنے لگا۔ ”نہیں میں تو ابھی لوں گا۔“  
گداگر جل کر بولا۔ ”سالے مرے گا تو کفن بھی بھیک ہی کا پڑے گا۔“  
”دیکھو استاد اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ سیدھے ہاتھ سے اٹھتی نکال کر دو۔“  
آخر گداگر نے ٹٹول ٹٹول کے آٹھ آنے کی ریزگاری گئی اور راجہ کے ہاتھ میں رکھ کر ایک  
گالی بھی دی۔ پیسے ملتے ہی راجہ نے زغند بھری اور کھولی سے باہر چلا گیا۔

نظر بچا کر: چوری چھپے: کئے: پاس: زغند: چھلاگ۔

راجہ نے بیزار سے جواب دیا۔ ”سوچا تھا، سالہ ایک چائے تو پلا ہی دے گا۔“  
گداگر نے فوراً کہا۔ ”ابے تو نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی؟ پیسے دیتے تو اس کا باپ بھی چائے  
پلاتا۔ چل تجھے ابھی چائے پلاتا ہوں۔ اوہو ہوا! بھئی جبر دست سردی ہے۔“ اس کے دانت سردی  
سے بکر رہے تھے۔

آگے بڑھ کر وہ ایک اور چائے خانے کے قریب پہنچے دونوں نے ایک ایک پیالی گرم گرم  
چائے کی چڑھائی اور تازہ دم ہو کر پھیری پر چل دیئے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک راہ گیر  
نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک سکتہ گداگر کے پیالے میں ڈالا۔ ٹن سے آواز ابھری۔ بوڑھے  
نے ٹٹول کر اسے اٹھایا۔ خوش ہو کر بولا۔ ”اکتی جان پڑتی ہے۔“ اس نے چپکے سے آنکھیں کھول  
دیں۔ اکتی اٹھا کر دیکھی اور بڑبڑانے لگا۔

”مجھے تو کھوٹی لگے ہے۔ جراتو دیکھ راجہ۔“  
راجہ نے اکتی اس کے ہاتھ سے لے کر غور سے دیکھی اور واپس دے کر بولا۔ ”ایک دم کنڈم  
ہے۔“  
گداگر جل کر بولا۔ ”یارو کیا جمانہ آگیا ہے۔ اب تو پبلک اللہ میاں سے بھی چار سو بیسی کرنے  
لگی۔“ وہ رک رک کر بڑبڑاتا رہا۔ ”آج کا دن تو منحوس لگے ہے۔ سالی سویرے سے نسیٹھ پر نسیٹھ  
ہو رہی ہے۔“

مگر وہ دن دونوں کے لئے منحوس ثابت نہ ہوا۔ کچھ ایسے بھی اللہ کے بندے مل گئے جن کے  
دل میں خوف خدا تھا اور جو خیرات دے کر اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے تھے۔ دو پہر تک روپے سوا  
روپے کی ریزگاری اکٹھا ہو گئی۔ ایک محلے میں کسی مرنے والے کا چالیسواں تھا۔ دونوں نے ٹھاٹھ سے  
فاتحہ کی خمیری روٹیاں اور سالن کھایا۔ ذرا دیر دھوپ میں بیٹھ کر آرام کیا اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں جب شہر کی ایک صاف ستھری سڑک سے گزر رہے تھے تو ایک شخص نے، جو وضع  
قطع سے ڈاکٹر لگتا تھا، راجہ کے برابر لمبے بھر کے لیے رک کر پوچھا۔ ”اے بچے، تم اس بوڑھے کے  
ساتھ کب سے ہو؟“ اور جواب کا انتظار کئے بغیر گداگر کی جانب دیکھا جو آنکھیں بند کئے مردوں کی  
طرح منڈھال پڑا تھا اور اپنے زخموں کو لٹچی لٹچی انگلیوں سے کرید رہا تھا۔

چار سو بیسی: فرداد: صول: نسیٹھ: نحوس: لٹچی: بیروسی۔

شامی نے گھبرا کر دیکھا۔ اس کا باپ پشت پر کھڑا خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو تاتھا اور چہرہ غصے سے ڈراؤنا ہو رہا تھا۔ شامی کی سٹی گم ہو گئی۔ باپ نے جوتے کا دوسرا ہاتھ گھمایا۔ مگر شامی گردن جھکا کر سر کو صاف بچا گیا۔ تاش چھوڑ کر بگ مٹ بھاگا۔ باپ نے ڈپٹ کر کہا۔

”ٹھہر جا حرامی! نہیں تو کھال ادھیز دوں گا۔“

مگر شامی اب کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ اس نے زغند بھری اور آنکھ جھپکتے ہی دور جا پہنچا۔ گلی کا چکر کاٹ کر وہ سیدھا گھر گیا۔ باپ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ماں نے اسے دیکھا تو سمجھ گئی کہ باپ سے بڑ بھیر ہو گئی، جب ہی اتنا خوف زدہ نظر آ رہا ہے۔ اس نے شامی کو دو چار کونے دیئے اور کوٹھری کی جانب دھکادے کر بولی۔

”اب منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا جلدی سے چھپ جا۔ ورنہ تیرا ابا آج ہڈی پسل توڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔“

شامی جلدی سے کوٹھری میں گھس گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد باپ گھر کے اندر آیا اور شامی کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ اس کی گالیوں کی آواز گھر کے سانے میں ابھرتی رہی۔ شامی کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ وہ سہا ہوا کوٹھری میں بیٹھا رہا۔ دروازے پر ذرا بھی آہٹ ہوتی تو اس کا دل اچھل پڑتا۔

بہت دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماں سرگوشی میں آہستہ آہستہ اسے آواز دے رہی تھی۔ شامی نے دروازہ کھولا۔ وہ اسے باورچی خانے میں لے گئی۔ بازو میں غصے سے بکوتا بھر کر بولی۔

”لے کچھ ٹھونس لے۔ صبح سے اب تک بھوکا پیاسا پھر رہا ہے۔ کم بختوں نے میری زندگی حرام کر دی“

وہ بیٹھی اپنی قسمت کو کوسی رہی اور شامی لمبے لمبے لقمے حلق کے نیچے جلدی جلدی اتارتا رہا۔ بار بار اس کی سہمی ہوئی نظریں کمرے کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ ڈرنے کی بات ہی تھی۔ مار کے معاملے میں وہ بڑا جلا دیتا تھا۔ جو چیز ہاتھ میں آتی کھینچ مارتا۔ کئی دفعہ اس کی مارے شامی کا سر اور پیشانی لہو لہان ہو چکے تھے۔ اس روز وہ خوف کے مارے باپ کے کمرے میں نہیں سویا۔ بلکہ ماں سے رضائی لے کر کوٹھری کے اندر جا کر پڑ گیا۔

ٹی کم ہوتا: گھبرا، بکوتا، بگ مٹ: بہت تیز۔ آنکھ جھپکتے ہی: فوراً ہی: کونسا: بدو عادی، برا بھلا کہتا۔ جلاو: سرواٹا۔

(۳)

میونسپلٹی کی لائین کے نیچے صرف شامی بیٹھا تھا۔ محلے کے دوسرے لڑکے نہ جانے کہاں تھے۔ راجہ اس کے قریب سے گزرا۔ مگر کوئی بھی نہ بولا۔ اس رات کے جھگڑے کے بعد دونوں میں اب تک بات چیت بند تھی۔

راجہ ٹہلنا ہوا گلی کے ٹکڑے تک چلا گیا۔ چلتے چلتے اس نے سوچا۔ شامی سے اب صلح کر لینا چاہیے۔ لہذا واپسی پر لائین کے پاس دوبارہ آیا تو بے نیازی سے پوچھا۔

”اے شامی! یہ سالانہ آج کہاں مر گیا؟“

شامی بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ اس نے جھٹ جواب دیا۔ ”اس کی لٹاں نے پکڑ کر بٹھالیا ہو گا۔“

راجہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ ”یار! نوٹشے کی ماں، سالی ایک نمبر چنڈال ہے۔ باپ رے باپ۔ اس طرح زور زور سے چیخنی چلاتی ہے کہ اس سے تو ڈر لگتا ہے۔“

شامی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”یار تاش ہو تو نکال۔ ذرا دو چار ہاتھ ہو جائیں۔“

راجہ نے فوراً پتلون کی جیب سے گڈی نکالی اور تاش کے پتوں کو پھینٹنے لگا۔

”دیکھو استاد! ٹرک بازی نہیں چلے گی۔ ورنہ میں نہیں کھیلوں گا۔ بیکار میں جھگڑا مٹنا ہو جاتا ہے۔“ شامی نے اسے خبردار کیا۔

راجہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ ”نہیں بے۔ اس روز تو میں ذرا مباح کر رہا تھا۔ خاماخا کا پھنڈا ہو گیا۔“

دونوں اطمینان سے بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ ایک بار شامی نے چبک کر زور سے پتہ مارا اور جھوم کر بولا۔ ”کہو استاد کیسی رہی؟“

اسی وقت اس کے سر پر دھڑ سے جوتا پڑا اور گرج دار بھاری آواز ابھری۔ ”اور یہ کیسی رہی؟“

چنڈال: ہندوستان کا ایک کم ذات قبیلہ، بد ذات۔ ٹرک بازی: دھوکا، فریب۔



مرحلہ اس انجینئر کا بنگلہ تھا جہاں ایک خطرناک السیشن پلا تھا۔ اسے دیکھتے ہی غرا کر بھونکنا شروع کر دیتا۔ اس کی آواز اس طرح نکلتی گویا گنبد کے اندر گونج رہی ہو۔ جیسے ہی شامی پھاٹک پر پہنچتا وہ بھونکتا ہوا اس کی طرف جھپٹتا۔ ایک بار تو اس پر اس طرح جھپٹ کر سوار ہو گیا کہ خوف کے مارے شامی کی ٹھکی بندھ گئی۔ وہ شاید اس بنگلے پر کبھی اخبار نہ لگاتا مگر بات یہ تھی بل ادا کرنے کے معاملے میں انجینئر بڑا کھراگاہک تھا۔ کبھی میمنٹ نہیں رکا۔ یہی وجہ تھی کہ کتے کے خوف کے باوجود وہ نہایت پابندی سے اخبار پہنچاتا رہا۔

نوبے کے قریب وہ اخبار بیچ کر تھکا ہارا گھر پہنچا تو ماں نے کمر بھی سیدھی نہ کرنے دی۔ کہنے لگی۔ ”جا جلدی سے دکان چلا جا۔ آج تیرے باپ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔“ وہ چپ چاپ دکان کی جانب روانہ ہو گیا۔



شامی کا باپ باسٹلی تھا۔ بازار میں اس کی چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ دکان پر بیٹھا رک رک کر کھانسنے رہا تھا۔ شامی پہنچا تو باپ نے صرف تنکھی نظروں سے دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ شامی نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ مصیبت اس کے سر سے صاف ٹل گئی۔ وہ خاموشی سے دکان پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد سات آٹھ سال کی ایک لڑکی سیپ کے بٹن خرید کر لے گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگئی۔ کہنے لگی۔ ”سیپ کے بٹن پلاسٹک کے ہیں چاہیے ہیں۔“ شامی نے پلاسٹک کے بٹن دے دیے مگر چند ہی منٹ بعد لڑکی پھر موجود تھی۔ اس دفعہ اسے بڑے بٹن درکار تھے۔ شامی نے بٹن تو دے دیے مگر جل کر اس کے ہاتھ میں چٹکی بھری۔ وہ تمللا کر چیختی تو باپ کو بھی اس کی اس حرکت کا پتہ چل گیا۔ اس نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔

”اے او حرام کے ختم! تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا؟“

وہ دیر تک گالیاں دیتا رہا اور شامی خاموش بیٹھا گالیاں سنتا رہا۔ اس کا باپ دسے کامریض تھا۔ وہ دکان پر بیٹھا تمام دن کھانستار بتایا شامی کو گالیاں دیتا۔ زیادہ غصہ آتا تو دو چار تھپڑ سید کر دیئے۔ ایک آدھ لات نکادی۔

ٹھکی بندھ جانا: ڈر کے مارے بول نہ سکتا۔ کھرا: عمدہ صاف۔ باسٹلی: چھوٹی موٹی چیزیں بیچنے والا۔ تمللاتا: تڑپتا رہے جیسا ہوتا۔

سویرے کسی کے اٹھنے سے پہلے ہی شامی گھر سے باہر نکل گیا۔ بنگلوں میں ہاتھ دبائے سردی سے ٹھہرتا اخبار کے دفتر پر پہنچا۔ مگر اخبار ابھی چھپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اخباروں کا بڈل اٹھایا اور سڑکوں پر آواز لگنے لگا۔

”آگیا، آگیا، آج کا تازہ اخبار آگیا۔“

سنسنی خیز خبروں کی سرخیاں چیخ چیخ کر سناتا ہوا وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ ابھی بہت سے ٹھکانوں پر اسے اخبار پہنچانا تھا۔ ہر گھر پر وہ اخبار کھڑکی کے راستے یا دروازے کی جھری سے اندر پھینک دیتا اور جلدی سے آگے بڑھ جاتا۔ جہاں دروازہ کھلوائے بغیر چارہ کار نہ ہوتا وہاں آواز لگاتا۔ ”اخبار والا۔“ اسی طرح گھروں پر اخبار پہنچاتا ہوا جب ایک مکان پر پہنچا تو آواز لگاتے ہی ایک شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس وقت وہ تولیے سے اپنا چہرہ پونچھ رہا تھا۔

شامی کو دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”تم اتنی دیر سے اخبار کیوں لاتے ہو؟“

شامی معذرت کرنے لگا۔ ”آئندہ جلدی لاؤں گا جی۔ آج اخبار ذرا دیر سے چھپا تھا۔“ وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ لیکن اس شخص نے اخبار اٹھا کر اس کے منہ پر پھینک دیا۔

”لے جاؤ اپنا اخبار۔ مجھے نہیں چاہیے۔“

”مہر رہا ہوں اب اتنی دیر نہیں ہوگی۔“

وہ جھڑک کر بولا۔ ”بس کہہ دیا کہ اخبار نہیں چاہیے۔ کیوں بیکار میں دماغ کھائے جا رہا ہے؟ شامی ملزموں کی طرح گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جب وہ شخص دروازہ بند کرنے لگا تو شامی نے دہلی زبان سے کہا۔

”ساب! پچھلے مہینے کا میمنٹ ابھی تک نہیں ہوا۔“

وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ ”بھاگ جاؤ۔ کوئی میمنٹ ویمنٹ نہیں ہوگا۔ اتو کے مٹھے!“ اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

شامی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر اس نے سوچا اگر کوئی جھگڑا مٹا ہو گیا تو دوسری جگہ بھی اخبار دیر سے پہنچے گا اور وہاں بھی ڈانٹ پڑے گی۔ ورنہ وہ اپنا میمنٹ تو کھڑے کھڑے وصول کر لیتا۔

وہاں سے بڑھ کر وہ اپنے دوسرے ٹھکانوں کی جانب چل دیا۔ لیکن اس کے لیے سب سے بڑا

تیوری میں بل ڈالنا: غصے ہونا، ناراض ہونا۔

دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ بازار میں پھیلنے لگا تھا۔ گاہکوں کی آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ دکاندار لاپرواہی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ شامی بابا تو یوں بھی ہر وقت مجہولوں کی طرح پڑا رہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ اسی اثنا میں برابر والی دکان کے بساطی نے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔

”اماں دلاور خان جمتی ہے؟“

یہ جو اکیلے کی دعوت تھی۔ شامی کے باپ نے فوراً جواب دیا۔ ”یہاں کب انکار ہے؟“

وہ بولا۔ ”تو پھر نکالو ر قم۔“

شامی کے باپ نے گلے سے روپیہ نکالا۔ ”لو یہ رہی رقم۔“

دونوں نے ایک ایک روپیہ نکالا۔ اپنا اپنا روپیہ صابن سے اچھی طرح دھو کر صاف کیا اور دکان کی گدی کے سامنے ایک صاف جگہ پر رکھ دیا۔ دونوں ذرا ہٹ کر پاس پاس بیٹھ گئے اور پوری توجہ سے دیکھنے لگے کہ مکھی کس کس روپے پر بیٹھتی ہے۔ شرط یہ بدی گئی کہ جس کے روپے پر پہلے مکھی بیٹھ جائے وہ دونوں روپے اٹھالے۔

کچھ ہی دیر بعد ایک مکھی اڑتی ہوئی آئی۔ ”شامی کا باپ گردن ہلا کر کہنے لگا۔ ”آؤ آؤ جانی ادھر آؤ۔“

دوسری طرف سے بھی ایسی ہی آواز آئی۔ ”ادھر کہاں چلیں جھیلی۔ ادھر آؤ جان من  
ادھر۔ اے اے۔“ مکھی اس وقت شامی کے باپ کے روپے پر منڈلا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے  
گویا ہوا۔

”وہ آئی۔ وہ آئی۔ شیخ جی! آج تو دونوں روپے اپنی جیب میں گئے۔“

شیخ جی نے فوراً کہا۔ ”ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار۔“ مگر اس کا چہرہ قح ہو تا جا رہا تھا۔ اس لیے کہ مکھٹی نے اس کے روپے کی جانب رخ ہی نہیں کیا۔

مکھٹی بھی بڑی ستم ظریف تھی۔ شامی کے باپ کے رویے پر برابر منڈلاتی رہی۔ مگر بیٹھی

مجبور: حروف نفی: شرط ہونا: بازی لگانا، شرط لگانا۔ جمیلی: خوش اندام۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو: (مثل) ابھی انتظار کرو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ فی ہونا: رنگ اڑانا، برائیاں ہونا۔ ستم غریف: ظالم۔

نہیں۔ شامی کے باپ کے دل کی دھڑکن کئی بار تیز ہوئی۔ کئی بار مسرت سے اس کی آنکھیں چمکیں۔ سمر بات نہ بنی۔ ادھر شیخ صاحب کی حالت دگرگوں تھی۔ مکھٹی دوسری ہی طرف چمک کاٹ رہی تھی۔ ایک بار بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ مگر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو ڈھارس دیتا رہا۔

”بھائی وہ بیٹھے گی تو اسی روپے پر۔ بڑی کھری کمائی کا روپیہ ہے۔“

شامی کا باپ بگڑ کر بولا۔ ”اور یہاں تو حرام کی رقم آتی ہے۔“

”اس کا پتہ تو ابھی چل جائے گا۔“

”اس طرح شیخی بگھارنے سے کام نہیں چلے گا۔ گنشی والے شاہ جی سے روپیہ پڑھوا کر لاؤ۔ تب

شاید کچھ ہو جائے۔ یہ روپیہ تو سمجھ لو اپنی جیب میں گیا۔“

مگر اس کا سارا طعنے دھرا کا دھرا رہ گیا۔ مکھی ایک بار مٹھر سے اڑ گئی۔ شامی کا باپ جل کر بولا۔ ”دھت تری کی۔“ اس نے مکھی کو ایک عدد گالی دے ڈالی۔ شیخ جی نے فوراً جلتی آگ پر تیل چھڑکا۔ ”میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ اب چاہے تم گالی دو یا ٹسوے بہاؤ۔ وہ تمہارے روپے پر بیٹھے کے لیے آئی ہی نہیں تھی۔“

دونوں بچوں کی طرح چہلیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے پر چوٹیں کس رہے تھے۔ اسی اثنا میں مکھٹی پھر جھنجھٹائی ہوئی آگئی۔ وہی تھی یا کوئی دوسری۔ لیکن اس دفعہ جو آئی تو سیدھی شیخ جی کے روپے کی طرف۔

وہ اس طرح چکارنے پچکارنے لگا جیسے وہ واقعی اس کی باتیں سن رہی ہو۔

”آ، آچ پچ۔ میری جان ایک بار تو کلیجہ ٹھنڈا کر دے۔“

مکھی واقعی اس کے چکارے میں آگئی۔ اس نے ایک بار پر سینے اور عین اس کے روپے کے اوپر آگئی۔ اسی وقت شامی کے باپ کو کھانسی کا ٹھکا لگا اور وہ کھول کھول کر کے زور زور سے کھانسنے لگا۔ مکھی فوراً اڑ گئی۔

شیخ نجی نے جھنجلا کر کہا۔ ”گے تم چوتھائیں کرنے۔ اڑا دانا کھانس کر۔“

انماں کھانسی آگئی تو میں کیا کروں۔“ شامی کا ماں ڈھٹائی سے منسنے لگا۔

”کچھ خدا کے غضب سے ڈرو۔ جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔ جان بوجھ کر کھانے تھے۔“

دگرگوں: خراب، ڈھارس، حوصلہ، ہمت، تلخ، غرور، ٹوٹے پھانسا، جھوٹ موٹ رونا، چلبلیں، ہنسی مذاق۔



بات بھی دراصل یہی تھی۔ شامی کا باپ مکھتی کو بھگانے کے لیے کھانسا تھا۔ مگر یہ چال بازی وہ تسلیم کیسے کرتا۔ صاف مکر گیا۔ ”اماں کھانسی کا تو بہانہ ہو گیا۔ وہ تمہارے روپے پر بیٹھنے والی ہی کب تھی؟“

دونوں بڑھوں میں ایک بار پھر نوک جھونک شروع ہو گئی۔ شامی ان کی حرکتیں بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ روزانہ دوپہر کو عام طور پر اسی طرح جوا ہوتا مگر ہار جیت کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی۔ البتہ دونوں میں ٹکرا ہر بار ہوتی۔ اکثر گالی گلوچ بھی ہوتی۔ مگر دوسرے روز جہاں دوپہر ہوتی دونوں کو ہڑک اٹھتی۔ روپے نکالے جاتے اور صابن سے دھو کر رکھ دیئے جاتے۔ مکھتی شیخ جی کے روپے سے اڑ کر ایسی گئی کہ پھر نہ لوٹی۔ کسی دوسری مکھتی نے بھی ادھر کارخانہ نہ کیا۔ دوپہر کا سناٹا اور بڑھ گیا۔ بازار کی رونق مضحل ہو گئی۔ دونوں بیٹھے بیٹھے اوگھنے لگے۔ انہوں نے اپنے اپنے روپے اٹھائے۔ آنکھیں بند کیں اور تھکے ہوئے سے لیٹ گئے۔



دھوپ اب سامنے کے رخ پر آگئی تھی۔ دوپہر کے سناٹے میں کبھی کبھی کوئی گاڑی پیڑ کھڑکھڑاتی ہوئی گزر جاتی۔ بازار پر خاموشی چھائی تھی۔ صرف ٹرک اور صندوق بنانے والے کارخانے میں دھڑا دھڑٹین کی چادریں پیٹنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ خالی بیٹھے بیٹھے شامی کا جی اٹا گیا۔ اس نے باپ کی جانب دیکھا۔ وہ بے خبر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ شامی اپنی جگہ سے اٹھا اور چپکے سے دکان کے باہر آگیا۔

باہر تیز بستی دھوپ پھیلی تھی۔ موسم کچھ ایسا تھا کہ سائے میں بیٹھنے سے سردی معلوم ہوتی اور دھوپ میں سورج کی سلگتی ہوئی کرنیں جسم میں سویوں کی طرح چھیتیں۔ دکان سے نکل کر شامی ٹہلٹھا ہوا بازار کے دوسرے کڑکی جانب چل دیا۔ وہاں نیم کا گھنا پیڑ تھا جس کے نیچے اکثر دوپہر کو راجہ گداگر کی گاڑی لا کر ٹھہراتا تھا۔ دونوں دھوپ میں بیٹھ کر جسموں کو حرارت پہنچاتے تھے اور کپڑوں سے جو عین نکال کر مارتے تھے۔ راجہ اس وقت مل جاتا تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ کے دوچار کش لگایا۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ یکایک بازار کے درمیان سے مرنے والی گلی میں ملی جلی آوازوں کا شور

ابھر۔ شامی لپک کر گلی کے اندر گھس گیا۔ دیکھا مسجد کے دروازے پر لوگوں کا جھوم ہے۔ اس نے ایک شخص سے پوچھا۔

”کیا ہو گیا؟“

وہ بولا۔ ”چور پکڑا گیا ہے۔“

شامی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا چرایا تھا؟“

”سلا مسجد سے جوتے چرا رہا تھا۔“

شامی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”اچھا!“

”ہاں جی، نمازی بے چارے تو ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے اور یہ سالا ان کے جوتوں کی تاک میں تھا۔“

شامی نے اس سے مزید کوئی بات چیت نہیں کی۔ آگے بڑھ کر مجمع میں گھس گیا۔ دیکھا، لمبے قد کا ایک آدمی لوگوں کے درمیان کھڑا ہے۔ اس کا سر رنگا تھا۔ وہ گندی سی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ دیکھنے میں بالکل سیدھا سادا لگتا تھا۔

شامی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورنے لگا۔ اس لیے کہ وہ صرف چور ہی نہیں تھا بلکہ اس نے اللہ میاں کے گھر میں چوری کی تھی۔ ابھی وہ چور کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ جھوم میں سے ایک ٹھٹھکا آدمی تہہ سنبھالتا ہوا نکلا اور اچھل کر چور کے منہ پر کس کے تھپڑ رسید کیا۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ پھر تو ہر طرف سے چور پر مار پڑنے لگی۔ طمانچے، ککے، لاتیں، ہر شخص بپھر بپھر کر اسے مار رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا، اور چور بالکل خاموش کھڑا مارا رہا تھا۔ نہ اس نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی نہ فریاد کے لیے گر گزرایا۔ مزے سے کھڑا مارا کھاتا رہا۔

اسی اثنا میں ایک بوڑھا وہاں آگیا۔ اس کی سفید لمبی ڈاڑھی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو روکا۔ اونچی آواز سے بولا۔ ”اس طرح مارنے سے کیا ہو گا۔ اسے تو ایسی سزا ملنی چاہیے کہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔“

اس نے سزا کے لیے جو اسکیم بتائی شامی غل غپاڑے میں سن نہ سکا۔ البتہ اس نے یہ ضرور دیکھا کہ ایک شخص ہاتھوں میں کالک بھرے ہوئے آیا اور چور کا سارا چہرہ سیاہ کر دیا۔ اب وہ واقعی

خوفناک نظر آ رہا تھا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کہیں سے ایک گدھا بھی آ گیا۔ چور کو گدھے پر بٹھادیا گیا۔ نگلے میں پرانے جوتوں کا ہار ڈالا گیا اور گدھے کو ہانک کر آگے بڑھادیا گیا۔ پیچھے پیچھے لوگوں کا غول تھا۔ کچھ لونڈے لپاڑے ٹین کا ایک پیاٹھالائے اور زور زور سے بجانے لگے۔ شامی بھی اس جلوس میں شامل ہو گیا۔ اس نے کئی بار لڑکوں سے پیاچھین کر زور زور سے بجایا اور سب کے ساتھ مل کر نعرے لگائے۔ نعرے لگانے والے دو گروہوں میں بے ہوئے تھے۔

ایک گروہ گلا پھاڑ کر کہتا۔ ”جوتے چور کا؟“

دوسرا گروہ جواب دیتا۔ ”منہ کالا۔“

جلوس گلی سے نکل کر بازار میں آ گیا۔ دکاندار اٹھ اٹھ کر چور کو دیکھ رہے تھے۔ جو ذرا زندہ دل تھے وہ دکانوں سے نیچے اتر کر جلوس میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر شخص ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ شامی کو بڑا لطف آ رہا تھا۔ ایک بار اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ قہقہہ لگاتے ہی اس کی گدی پر زنانے کا ہاتھ پڑا۔ شامی چکر اکر گرتے گرتے پچا۔ پلٹ کر دیکھا۔ باپ بھوت کی طرح سر پر سوار تھا۔

جوتے چور کا جلوس تو پیا بجاتا شور مچاتا آگے بڑھ گیا مگر شامی پر بیچ بازار میں دھڑا دھڑ جوتے پڑنے لگے۔ نہ جانے اس کے باپ کے مریل ہاتھوں میں کہاں سے قوت آ گئی تھی۔ ایسے کس کس کے جوتے مار رہا تھا کہ شامی بلبلہ کر سڑک پر لوٹنے لگا۔ آس پاس کے دکانداروں کو اس کی حالت پر ترس آ گیا۔ قریب جا کر اس کے باپ کو سمجھانے بھجانے لگے۔

”اماں خاں صاحب! اب جانے بھی دو۔ بچہ ہے آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔“

ایک نے بڑھ کر شامی کے باپ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ مگر وہ بار بار ہاتھ چھڑا کر شامی پر جھپٹتا۔ ”چھوڑ دیجی، میں اس حرامی کی آج ہڈی پیلی برابر کر دوں گا۔ اماں ذرا آنکھ پچی اور یہ سالادکان سے رنو چکر۔ حال یہ ہے کہ لوگ خدا کے گھر کو تو چھوڑتے نہیں۔ دکان تو پھر دکان بٹھری۔ میاں سویا مرا برابر ہوتا ہے۔ کوئی اٹھا کر کچھ لے جائے تو اس سالے کی گرہ سے کیا جائے گا۔“ وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا اور ساتھ ہی گالیاں بھی دے رہا تھا۔

دکانداروں نے منت سماجت کی۔ شامی کے باپ کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ قسمیں دیں کہ اب اور نہ

غول: جھوم گدی: سر کا بچھا حصہ۔ مریل: بکوز۔ رو پکڑ ہونا: بھاگ جانا، چل دینا۔ گرہ: جیب۔

مارے۔ باپ نے اس کے بعد شامی کو مارا تو نہیں البتہ کئی بار جھنجھلا کر مارنے کے لیے ضرور اٹھا۔ جب بھی شامی سسکی بھرتا وہ جل کر اسے گالیاں دیتا۔

شامی دکان پر بیٹھا دیر تک سسکیاں بھرتا رہا اور باپ کی گالیاں سنتا رہا۔ سہ پہر ہو گئی۔ بازار کی رونق لوٹ آئی۔ گاہک دکانوں پر منڈلانے لگے۔ ملی جلی آوازوں کا شور بڑھنے لگا۔ گاڑیوں کے پہنے پختہ سڑک پر کھڑ کھڑانے لگے۔ اس شور و غل میں، اس گہما گہمی میں شامی اور اس کا باپ سب کچھ بھول گئے اور دکانداری میں الجھ کر رہ گئے۔

شام گزری۔ رات آئی۔ باپ نے دکان بند کی شامی کو تنبیہ کی۔ ”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تو سیدھا گھر کی طرف جانا۔“

شامی دکان سے نکل کر باپ کی ہدایت کے مطابق گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں نوشا سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اس وقت وہ اترا اترا کر چل رہا تھا۔ شامی کو دیکھتے ہی اس نے قمیص کی جیب سے دس دس کے دو کرارے کرارے نوٹ نکالے۔ گردن اکڑا کر بولا۔

”آج تو اپنے ٹھاٹھ ہیں۔“

شامی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”اب کہاں سے مار لایا؟“

نوشا اسی طرح اترا کر بولا۔ ”مار کہاں سے لا تا مجھے ملے ہیں۔“

شامی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ ”کہاں سے مل گئے؟ ابے اکٹھے بیس روپے۔“

نوشا پھر اترا۔ ”بس مل گئے۔“

شامی نے فوراً گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سامنے والے چائے خانے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ ”تو پھر ہو جائے، کچھ چائے پانی۔“

”نہیں یار، آج نہیں، پھر کسی اور دن۔“

شامی جل کر بولا۔ ”لگے سالے سیانپن کرنے۔ ابے تو ایک نمبر کنجوس ہے۔“

نوشا نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”جاے، تو بھی بس یونہی رہا۔ یہ روپے، میرے کب ہیں۔ مکان کا کرایہ دینے نیاز کی دکان جا رہا ہوں۔“

”جب ہی تو میں سوچ رہا تھا کہ ایک نہ دو اکٹھے اتنے روپے کہاں سے پار کر دیئے۔“

مار لانا: نوٹ کر لانا، غنم کر کے لانا۔ اترا: غرور کرنا، مازاں ہونا۔ سیانپن: چالاکی۔



نوشانے کہا۔ ”ابے چلتا ہے نیاز کی دکان تک۔ ذرا دیر کی تو بات ہے۔“

”چائے پلاؤ تو چلتا ہوں۔“

مگر نوشا کے پاس چائے پلانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ لہذا شامی اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

(۴)

نیاز کی دکان بازار سے ذرا ہٹ کر گلی کے اندر تھی۔ پہلے وہ فرنیچر تیار کرنے والے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ مگر اب اس نے اپنی دکان کھول لی تھی اور پرانی اور استعمال شدہ اشیاء بیچنے اور خریدنے کا کاروبار کرتا تھا۔ دکان کے پچھلے حصے میں ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں نیاز کی رہائش تھی۔ بیوی عرصہ ہوا فوت ہو چکی تھی۔ اولاد بھی اس نے کوئی نہ چھوڑی۔ شادی کے دو سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جو چھ ماہ بعد نمونیہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ بیوی، شادی کے بعد آٹھ سال تک زندہ رہی اور اولاد کی حسرت دل میں لیے ایک روز اللہ کو پیاری ہو گئی۔

نیاز نے اب تک دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ کنواروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یوں وہ ابھی تک جوان تھا۔ اس کی عمر ۳۵ برس سے کچھ اوپر تھی۔ البتہ جسم میں چربی بڑھ جانے کے باعث وہ اب کسی قدر بھرا لگتا تھا۔ کام بھی کچھ ایسا تھا کہ زیادہ جسمانی مشقت نہ کرنا پڑتی۔ تمام دن دکان پر بیٹھے بیٹھے گزر جاتا۔ صرف اتوار کو وہ نینام میں جاتا تھا یا کبھی اتفاقیہ سودے کے سلسلے میں دکان سے نکلتا۔ لیکن ایسا کبھی بکھار ہوتا تھا۔ کہنے کو تو وہ کبڑا تھا مگر کام دراصل کرتا تھا چوری کے مال کی خرید فروخت کا۔

اس وقت نیاز کی دکان میں لائٹیں روشن تھیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نوشا دکان میں داخل ہوا۔ نیاز نے دیکھتے ہی پوچھا۔

”ابے آج کیسے آنا ہوا؟“

نوشانے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ قمیص کی جیب سے دونوں نوٹ نکالے

اور اس کو دے کر بولا۔ ”لہاں نے دو مہینے کا کرایہ بھیجا ہے۔“

”دو مہینے کا کیوں؟“ نیاز نے ناگواری سے کہا۔ ”سارا حساب کیوں نہیں صاف کیا؟“

نوشانے ماں کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ ”انہوں نے کہا ہے بقیہ دو مہینے کا کرایہ جلد ہی آجائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”ان سے کہہ دینا۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ کرایہ وقت پر ملنا چاہیے ورنہ رہنے کا کہیں اور بندوبست کر لیں۔“

نیاز چاہتا بھی یہی تھا کہ کسی طرح مکان خالی ہو جائے۔ اس کے پاس کئی ایسے ضرورت مند آچکے تھے جو زیادہ کرائے کے علاوہ ہزار بارہ سو پگڑی دینے کو بھی تیار تھے۔ نیاز ایسا فائدے کا سودا ہاتھ سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ محلے میں اس کے دو مکان تھے جو اس نے ایک ہندو دکان دار سے بہت سستی قیمت پر خریدے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں سے مکانوں کا ہندو مالک بہت سہا ہوا تھا۔ وہ سندھی تھا اور کسی نہ کسی طرح ساری جائیداد ادا کرنے پونے بیچ کر بمبئی جانا چاہتا تھا۔ اس کے بال بچے پہلے ہی بمبئی پہنچ چکے تھے۔

نوشا واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نیاز نے پوچھ لیا۔ ”ابے نوشا! آج کل تو کر کیا رہا ہے؟“

نوشانے جواب دیا۔ ”عبداللہ مستری کے ورکشاپ میں کام سیکھ رہا ہوں۔“

”اچھا کب سے؟“ نیاز نے حیرت کا اظہار کیا۔

”چھ سات مہینے ہو گئے۔ اب تو بیس روپے مہینہ تنخواہ بھی ملنے لگی ہے۔“

”یہ بہت اچھا ہوا۔ مگر عبداللہ تو ایک نمبر بد معاش ہے۔ سنا ہے کارمگروں کو بہت مارتا پیٹتا ہے۔ پر اس نے کاروبار اچھا جمایا ہے۔ جب یہاں آیا تھا تو ٹھیکیدار علی بخش کے ٹرک پر کلینر تھا۔ سالا پاس کھڑا ہو جاتا تو ایسی بو آتی تھی کہ دماغ پھٹنے لگتا تھا۔“ نیاز تیکھے لہجے میں رک رک کر بولتا رہا۔ ”میں نے تو اس کا وہ وقت بھی دیکھا ہے جب بدن خاں کے گیراج میں تیری طرح معمولی کار بیکر تھا۔ پھر اس نے اپنا علیحدہ گیراج کھول لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا بنا لیا کہ کئی سو گزر پر پھیلا ہوا ہے۔ پچانگ پر عبداللہ آٹو ورک شاپ کما یہ بڑا بورڈ لگا ہے۔ لیکن جب سے کاروبار چمکا ہے سالا سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔“

نوشا چپ چاپ نیاز کی باتیں سنتا رہا۔ نیاز اسے بدظن کرنے کی غرض سے کچھ دیر تک عبداللہ مستری اور اس کے کاروبار کے بارے میں اظہار خیال کرتا رہا، پھر اس نے رازدارانہ لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ”موقع لگے تو کبھی کبھار کوئی پرزہ یا اوزار اڑا دیا کر۔ اس سالے پانی کا مال کھانا تو ثواب کا کام ہے۔“ نوشا اس کی بات سن کر چونکا۔ گھبراہٹ ہوئی نظروں سے نیاز کا منہ نکلنے لگا۔

نیاز کہتا رہا۔ ”کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ بس سیدھا یہاں آ جایا کر۔ چائے پانی کا خرچہ نکل آئے گا۔ میں نے سنا ہے تجھے تو فلم دیکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔“ لمحہ بھر رک کر اس نے سوال کیا۔ ”بول کیا کہتا ہے؟“

نوشا سے کچھ نہ کہا گیا۔

نیاز نے اس دفعہ زور دے کر پوچھا۔ ”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“

نوشا سہما ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”کہیں مستری جی کو پتہ چل گیا تو میری شامت آ جائے گی۔“

نیاز اپنے ڈھب پر لانے کے لیے اسے پھسلانے لگا۔ ”ابے جب اس سالے کو پتہ لگے تب۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ دیکھ میں تجھے ترکیب بتاؤں۔“ اس نے پرزے چرانے کے نوشا کو کئی طریقے بتائے۔ پھر بھی نوشا کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔

لیکن نیاز نے اسے اپنے پھندے سے نکلنے نہ دیا۔ نوشا جانے لگا تو اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر دیا۔ مسکرا کر بولا۔

”لے آج میری طرف سے جا کر فلم دیکھ۔“

نوشا روپیہ لینے میں چھر چھر کرنے لگا تو نیاز نے اصرار کر کے اس کی جیب میں ڈال دیا۔ ”زیادہ ضد نہیں کرتے۔ میرے کہنے پر چلے گا تو عیش کرے گا۔“ نوشا نے اس کی باتیں خاموشی سے سنیں اور شرابیا ہوا سدا کاٹن سے باہر چلا گیا۔

\*\*\*

میونسپلٹی کی لائٹن کے نیچے محلے کے لڑکے جمع تھے۔ مزد جو ہوٹل میں بیراگری کرتا تھا، مزے سے بیٹھا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔

نوشا نے گلی میں داخل ہو کر دیکھا۔ راجہ بھی وہاں موجود تھا اور منہ سے طبلہ بجا کر سنگت

پانی: مٹا، کار: شامت: آنا: مصیبت: آنا: ڈھب: روش: چھر چھر: ہل: سول: پس: وچیں: ماؤتھ آرگن: منہ سے بجا جانے والا ایک ساز۔

دے رہا تھا نوشا پر مدد کا ہزار غب پڑا۔ وہ بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ مدد اس وقت ایک فلمی دھن بجا رہا تھا جس کے بول باجے کے سروں میں سے صاف نکل رہے تھے۔ ذرا دیر بعد اس نے ماؤتھ آرگن بجانا بند کر دیا اور منہ صاف کر کے بولا۔

”کھیل ختم پیہ ہضم۔“

سب لڑکے اصرار کرنے لگے۔ مدد کو ان کے اصرار میں مزا آ رہا تھا۔

نوشا نے پوچھا۔ ”اماں کتنے کا خرید اتم نے یہ باجا؟“

وہ ہنس کر بولا۔ ”کیا کرو گے جان کر۔ تمہارا پاجامہ بھی بک جائے گا تب بھی خرید نہیں سکو گے۔ نقد چھ روپے لگتے ہیں۔ کیا سمجھ؟ ہے ہمت خریدنے کی؟“

چھ روپے کا نام سن کر نوشا خاموش ہو گیا۔

جب لڑکوں نے بہت اصرار کیا تو مدد نے ایک نئی دھن شروع کر دی۔ سب مزے میں آ کر گردن ہلانے لگے۔ مدد ماؤتھ آرگن بجاتے بجاتے ایک دم اٹھ کر بھاگ گیا۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رو گئے۔

راجہ نے جل کر موٹی سی گالی دی اور نوشا سے کہنے لگا۔ ”ابے ٹھہر چلتا ہے؟“

نوشا حسب معمول تیار ہو گیا۔ ”ہاں ہاں چلو۔“

راجہ ہنس پڑا۔ ”پہلے ایک عدد روپیہ تولے کر آؤ۔“

نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر سامنے کر دیا۔ ”یہ لو۔“

راجہ چونک پڑا۔ ”ابے یہ ٹھاٹھ ہیں۔ آج کہاں ہاتھ مار دیا؟“

نوشا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بے چینی کا اظہار کیا۔ ”تو پھر چلو۔ کے بچے ٹھہر شروع ہوتا ہے!“

”کل چلیں گے۔ وہ بھی اگر ایک روپیہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا۔ اپنی تو گاڑی ٹوٹی پڑی ہے ایک حرام کے جنے نے پوزی موڑ چڑھا دی۔ یار اللہ نے بال بال بچایا۔“ راجہ اپنی پریشانی بیان کرنے لگا۔

”کونسا کھیل ہو گا؟“ نوشا نے پوچھا۔

”کل تو شیریں فرہاد ہو گا۔ دیکھے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ ابے جب فرہاد، شیریں، ہائے میری پیاری شیریں کہہ کے تیشہ مارتا ہے اور گر کر مر جاتا ہے تو چچ جان آنسو نکل پڑتے ہیں۔“ راجہ



نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سارا منظر کچھ ایسی اداکاری کے ساتھ بیان کیا کہ نوشا حیرت زدہ ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر دریافت کیا۔ ”تو کیا وہ سچ مچ مر جاتا ہے؟“

راجہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”یار، تو گھماؤ کا گھماؤ ہی رہا۔ کہیں وہ سچ مچ مر سکتا ہے۔ ابے یہ تو ایکٹنگ ہے ایکٹنگ۔“

نوشا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ ”کمال ہے بھی۔“

”یہی نہیں، پتلی جان کا ڈانس دیکھ گاتو جاب آجائے گا۔ سالی بالکل ننگی نا جتی ہے۔“

”نگی نا جتی ہے، سچ؟“ نوشا نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

”بس ذرا سا جا نگیا پھن لیتی ہے۔ سالی کی گوری گوری رانیں روشنی میں ایسی چمکتی ہیں کہ یار طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

نوشا شرم کر رہ گیا۔ ”سالے تو ایک نمبر بد معاش ہے۔“ مگر پتلی جان کی ننگی ننگی رانیں دیکھنے کے لیے اس کا بھی دل تڑپ رہا تھا۔ ذرا دیر رک کر بولا۔

”تو پھر کل کی پتلی رہی۔“

”ہاں جی کل ضرور چلیں گے۔ اب اسی بات پہ ایک ایک چائے ہو جائے۔“

نوشا تیار تو نہیں تھا مگر انکار بھی نہ کر سکا۔ روز راجہ سے چائے پیا کرتا تھا۔ سینما دیکھتا تھا۔ وہ اسے چائے خانے میں لے گیا۔ راجہ تھیرڑی ایک ایک تفصیل اس دلچسپی کے ساتھ بتاتا رہا کہ نوشا کا شوق اور بڑھ گیا۔ مگر جب دونوں چائے خانے سے باہر نکلے تو نوشا کے پاس کل چار آنے رہ گئے تھے۔ راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ اب تھیرڑا کاپرو گرام کیسے بنے گا۔

نوشا درکشاپ گیا تو وہاں بھی تھیرڑا دیکھنے کا خیال سنا تا رہا۔ شام کو چھٹی ہوئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس جگہ وہ کام کر رہا تھا وہاں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس نے ایک پرزہ اٹھایا۔ چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور جلدی سے اسے المونیم کے اس ڈبے میں رکھ لیا جس میں وہ اپنا کھانا لاتا تھا۔ مگر جب اسے لے کر چلا تو قدم کا پتھر رہے تھے اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر جھٹ باہر نکل گیا۔ گھبراہٹ کے باعث اس کے قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔

وہ سیدھا نیاز کی دکان پر پہنچا اور جاتے ہی پرزہ نکال کر سامنے ڈال دیا۔ نیاز نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ منہ بگاڑ کر بے زاری سے بولا۔

”ابے یہ کیا اٹھا لایا۔ کسی اچھے مال پر ہاتھ ڈالا ہوتا۔“

نوشا بچھ کے رہ گیا۔ مگر نیاز نے اسے زیادہ دیر ناامیدی میں مبتلا نہ رکھا اور ڈیڑھ روپیہ نکال کر دے دیا۔ خوشی کے مارے نوشا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ نیاز نے پیٹھ ٹھونک کر شاباش دی اور اس بات پر آمادہ کیا کہ آئندہ کوئی قیمتی پرزہ چر آ کر لائے۔

نیاز کی دکان سے نکل کر نوشا آج بھی گھر جانے کے بجائے گلی میں پہنچا۔ راجہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اس نے بھی کچھ رقم کا بندوبست کر لیا تھا۔ اب شامی کا انتظار تھا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دونوں اس کے گھر کی جانب چل دیئے۔ قریب پہنچے تو گھر کے اندر ادھم چا ہوا تھا۔ شامی چیخ کر رو رہا تھا اور اس کا باپ گالیاں بک رہا تھا۔

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے شامی سالا پکڑا گیا۔“

نوشا بولا۔ ”چلو یار اس کے بآنے دیکھ لیا تو ہم دونوں پر بھی گالیاں پڑیں گی۔“ دونوں چپ چاپ لوٹ آئے اور ”شیریں فرہاد“ دیکھنے تھیرڑی کی جانب چل دیئے۔

تھیرڑے والپسی پر صبح ہو گئی۔ جیسے ہی دونوں گلی میں داخل ہوئے کہیں نزدیک ہی مرغ نے بانگ دی۔ نوشا سہم کر رہ گیا۔ ڈرتے ڈرتے دیوار پر چڑھا اور جیسے ہی کود کر گھر کے اندر پہنچا وہاں کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نوشا کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ اسی وقت اٹھ کر اس کی پیٹھ پر ایسا زور دار دو ہتھوڑا مارا کہ نوشا فرش پر گر پڑا۔ وہ زور زور سے کونے لگی۔ اس ہنگامے سے سب کی آنکھ کھل گئی۔

نوشا مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس پر لعنت ملامت ہو رہی تھی۔

لیکن دوسرے روز نوشا نے پھر ایک پرزہ چرایا اور اسے نیاز کے پاس لے گیا۔ روپیہ ڈیڑھ روپیہ جو کچھ اس نے دیا جیب میں ڈالا۔ راجہ کے ساتھ مسلم ہوٹل میں جا کر چائے پی، بسکٹ کھائے اور قلمی گانے سنے۔

پھر تو اس کا یہ معمول ہو گیا۔ جہاں موقع لگا کوئی پرزہ یا اوزار چرا لاتا اور نیاز کے ہاتھ فروخت

کہ اسے چند ہی روز پہلے خریدا گیا ہے۔ سر پر نئی جناح کیپ تھی۔ گردن میں گلوبند تھا۔ کپڑوں کی اصطلاح میں وہ اس وقت بالکل شائن نظر آ رہا تھا۔

نیاز آیا تو مکان کے کرائے کا تقاضا کرنے کی غرض سے تھا مگر سلطانہ اس کی نظروں میں ایسی کھب گئی کہ وہ کرائے کا سوال تک زبان پر نہ لایا۔ بلکہ جب نوشا کی ماں نے دواہ کا کرایہ برداشت نہ پہنچنے پر اظہار معذرت کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

”جب جی چاہے بھیج دیجئے گا۔ میں اس ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ اس طرف سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ کی خیرت معلوم کر لوں۔“

نوشا کی ماں اپنی پریشانیوں کا دکھڑا رونے لگی۔ نیاز نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”پریشان نہ ہوں۔ جس بات کی تکلیف ہو مجھ سے کہلوادیا کریں۔ بشرطیکہ آپ مجھے اپنا سمجھیں۔ ورنہ مرنے والی کے ساتھ سب ہی نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں۔ حالانکہ میں تو آپ لوگوں کو آج بھی ویسا ہی مانتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

نوشا کی ماں بولی۔ ”یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم ابھی تک سب کو اسی طرح سمجھتے ہو۔ ورنہ پاکستان میں بھائی کہاں کی عزیزداری کہاں کا رشتہ۔ جسے دیکھو ایک دوسرے کی کاٹ میں لگا ہے۔ نہ وہ پہلی سی محبت نہ میل ملاپ۔ ایسی آپادھانی ہے۔ ایسی نفسا نفسی ہے کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔“

دونوں دیر تک ایسی ہی گھریلو باتیں کرتے رہے۔ نیاز دوران گفتگو میں بار بار سلطانہ کی جانب چور نظروں سے دیکھتا رہا جو ماں کے برابر خاموش بیٹھی تھی۔ ایک بار جب سلطانہ نے بھی شرمائی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو نیاز تڑپ اٹھا۔ اس نے کوٹ کے بٹن کھول دیئے اور سینہ تان کر جوان پٹھوں کی طرح ذرا اکڑ کے بیٹھ گیا۔ کسی تماش بین سے اس نے سن رکھا تھا کہ عورت پیسے کوڑی پر اتارتا نہیں رہتی جتنا مرد کے جسم پر مرتی ہے۔

دکان سے وہ یہ سوچ کر چلا تھا کہ کھڑے کھڑے دوبائیں کر کے واپس آجائے گا۔ مگر اس کا ایسا دل لگا کہ اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ نوشا کے گھر سے نکلا تو رات خاصی بھیک چکی تھی۔

شائن: مرلونا لٹا، ساہو دل جوئی: تلی، تسکین: سعادت مندی: فرمانبرداری: آپادھانی: اپنی اپنی فکر: نفسا نفسی: خود غرضی۔  
رجمہ: عاشق ہونا، متوجہ ہونا۔

کر دیتا۔ اس رقم سے روزانہ نٹ نٹے پروگرام بننے اور رات بھر آوارہ گردی ہوتی۔ نوشا نے غور کیا کہ جب سے اس کی جیب گرم رہنے لگی تھی شامی اور راجہ دونوں کے انداز میں خوشامد آگئی تھی۔ اب وہ اس کی ہر بات مان لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کا سر غنہ بننا جا رہا تھا۔

(۵)

نوشا ابھی تک ورکشاپ سے واپس نہیں آیا تھا۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نوشا صبح کا نکلا رات کے پچھلے پہر اس وقت لوٹا جب سب گھر والے سو جاتے۔ ماں اس کے انتظار میں بے چین بیٹھی تھی۔ اور جھنجھلا جھنجھلا کر کوسنے دے رہی تھی۔ ناگاہ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ اٹو نے باہر جا کر دیکھا۔ دروازے پر نیاز کھڑا تھا۔ اس نے ماں کو فوراً ہی اطلاع دی۔

ماں نے کہا۔ ”اندر بلا لو۔“

ذرا دیر بعد نیاز گھر کے اندر آگیا۔ اس نے نوشا کی ماں کو سلام کیا اور اس کے قریب ہی فرش پر پچھی ہوئی درری پر بیٹھ گیا۔ نیاز کا نوشا کی ماں سے کوئی سگار رشتہ نہیں تھا۔ نیاز کی بیوی رشتے میں سلطانہ کی ماموں زاد بہن تھی۔ اس رشتے سے وہ نوشا کی ماں کا بھتیج داماد لگتا تھا۔

نیاز کو آئے ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ سلطانہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دوپٹے سے سر ڈھانپا اور شرماتے ہوئے کہا۔

”دو لٹا بھائی سلام۔“

نیاز نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت عرصے بعد آیا تھا۔ وہی سوکھی مرل سی لڑکی، جو اب بکھرے گھر میں ڈھبڑ ڈھبڑ کرتی پھرتی تھی اب چھٹ چھٹا کر پتھر کے مجسمے کی طرح سڈول ہو گئی تھی اس کی آنکھوں میں ستاروں کی جھلماہٹ اور چہرے پر چاندنی کی چھوٹ تھی۔ نیاز نے دل ہی دل میں کہا۔ یار یہ لڑکی تو اب قیامت بن گئی ہے۔

اس روز وہ اپنا سیکنڈ ہینڈ امریکن کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کی شکنیں صاف چٹلی کھار ہی تھیں

ناگاہ: اچانک۔ سگا: بہت قریبی۔ سڈول: خوبصورت۔ چھوٹ: چمک دک۔ چٹلی کھانا: مرا کوکھا، ظاہر کرنا۔

نیاز نے ہنس کر کہا۔ ”میا کیجئے گا پوچھ کر؟ میں اب اس کی قیمت تو آپ سے لینے سے رہا۔“ وہ ڈر اور اصرار کر کے خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس روز بھی وہ رات گئے واپس گیا۔

اب نیاز کا یہ معمول ہو گیا کہ رات کا کھانا ہوٹل سے کھا کر ہر دوسرے تیسرے روز نوشا کے گھر پہنچ جاتا اور گھنٹوں بیٹھا اس کی ماں سے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔

\*\*\*

نوشا حسب معمول گھر سے غائب تھا۔ ماں پڑوس میں کسی کام سے گئی تھی۔ گھر میں صرف سلطانہ تھی اور تو تھا جو لیمپ کے پاس پڑھتے پڑھتے وہیں لڑھک کر سو گیا تھا۔ اسی اثناء میں نیاز آ گیا۔ سلطانہ نے نیاز سے زیادہ بات چیت نہ کی اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نیاز نے پوچھا۔ ”کہاں چلیں؟“

”اماں کو بلانے جا رہی ہوں۔ سامنے والے گھر میں تو گئی ہیں۔“

وہ باہر جانے کے لیے مڑی تو نیاز نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ ہاتھ کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ کلائی میں پڑی ہوئی تمام چوڑیاں چھن چھن کے ٹوٹ گئیں۔ وہ منہ بسور کر بولی۔

”لیجئے آپ نے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ کل ہی تو پہنی تھیں۔“

نیاز ہنس کر بولا۔ ”اور پہن لینا۔“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”بڑی مشکل سے اماں نے چوڑیاں پہنائی تھیں۔ آپ نے میرا پورا ہاتھ ننگا کر دیا۔ اماں دیکھیں گی تو میرا فضیلتا کر کے رکھ دیں گی۔“

اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔

نیاز کی جیب میں اس وقت کئی سو کے نوٹ موجود تھے۔ اس نے نوٹوں کی گڈی نکال کر سامنے کر دی۔ ”تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ لو کتنے کی چوڑیاں پہنوں گی؟“ سلطانہ نے کبھی اتنے بہت سے روپے نہیں دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکنے لگی۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولی۔

”جی نہیں! مجھے آپ کے روپے نہیں چاہیے۔“

نیاز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم بیٹھو تو، میں تمہیں کاٹ تو نہیں کھاؤں گا۔“

سلطانہ: بے طریقی سے۔ منہ بسور تا: رونے والی صورت بنانا۔ فضیلتا کرنا: ذلیل کرنا۔

ہر طرف سنائے کا راج تھا۔ سنسان گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔

ایک روز ناغہ کر کے تیسرے دن وہ پھر نوشا کے گھر پہنچا۔ جھوٹے موتیوں کا ایک ہار بھی لیا گیا۔ ہار بڑی نفاست سے تیار کیا گیا تھا۔ نیاز نے اسے انگلستان واپس جانے والے کسی انگریز خاندان کے سامان سے نیلام میں خرید ا تھا اور عرصے سے کباڑ خانے کی الماری میں پڑا تھا۔ نیاز نے ڈبا کھول کر ہار نوشا کی ماں کے سامنے ڈال دیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”آج ایک شخص زبردستی یہ ہار میرے سر چکا گیا۔ دیکھئے کیسا ہے؟“

نوشا کی ماں نے ہار ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کی تعریف کرنے لگی۔ ”بڑا خوبصورت ہار ہے۔“

سلطانہ لمحہ بھر تک اسے بے چینی سے دیکھتی رہی۔ مگر اٹھ لڑکی سے زیادہ دیر ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے ماں کے ہاتھ سے ہار لیا۔ نظر بھر کر دیکھا اور گلے میں پہن کر ماں سے پوچھنے لگی۔

”کیوں اماں! کیسا لگ رہا ہے؟“

ماں نے اسے ڈانٹا۔ ”اے ہے سلطانہ۔ تجھے تو کسی آئے گئے کا بھی ذرا لحاظ نہیں۔ کیسے جلدی سے ہار مڑکا کر بیٹھ گئی۔ اتار کھینٹ، آنکھیں نکالے کیا دیکھ رہی ہے؟“

نیاز کو تو ایسے ہی موقع کی تلاش تھی۔ کہنے لگا۔ ”پہننے دیجئے۔“ مگر سلطانہ نے بچے ہوئے دل کے ساتھ ہار اتار کر ڈبے میں ڈال دیا اور منہ لٹکا کر خاموش بیٹھ گئی۔ نوشا کی ماں نے نیاز سے کہا۔ ”تمہاری بات دوسری ہے۔ تم ٹھہرے گھر کے آدمی۔ لیکن لڑکیوں میں یہ عادت نہیں ہونا چاہیے۔ کسی اور کے سامنے ایسی حرکت کر بیٹھی تو وہ اس کے جنم پر کیا تھو کے گا۔ میں لڑکیوں کو سر پر چڑھانے کی قائل نہیں۔ اولاد کو نوالا کھلائے سونے کا مگر دیکھے ہمیشہ قہر کی نظر سے۔ ورنہ آج کل کی اولاد تو آفت کی پر کالہ ہیں۔“

نوشا کی ماں نے اولاد کی تربیت پر اپنا لکچر ختم کیا تو نیاز نے کہا۔ ”اب اس نے پہن لیا ہے تو اسے کو دے دیجئے۔“

”کتنے کا لیا تم نے؟“

الطرح: شوخ، نادان، بے پرواہ، لحاظ خیال۔ آفت کا پر کالہ: شریر، آفت کا نکلنا۔



وہ شرمائی ہوئی ذرا ہٹ کر وہیں دری پر بیٹھ گئی۔ لیپ کی گہری بستی روشنی میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر جھکی ہوئی لالہ بلیکس اور رخساروں پر کندن کی سی چمک، سمنٹا اور پھیلتا ہوا سڈول جسم۔ نیاز نے اسے اس عالم میں دیکھا تو بے قابو ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”ایک بات کہوں؟“

وہ بولی۔ ”کہئے۔“

نیاز کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہانہ گیا۔ الجھی ہوئی سانس بھر کر صرف اس قدر کہا۔ ”تمہاری اماں سے بات کروں گا۔“

سلطانہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔ دہلی زبان سے بولی۔ ”مجھ سے کہنے میں کوئی حرج ہے؟“ نیاز نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ ”سلطانہ! نہ جانے تم مجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہو؟“ اس نے بڑی سادگی سے دل کی بات کہہ دی۔

سلطانہ خاموش بیٹھی پیروں کے ناخن توڑتی رہی۔ نیاز نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہیں پتہ ہے میں روز روز کیوں آتا ہوں؟“ وہ اس وقت سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔

وہ بے نیازی سے بولی۔ ”مجھے کیا معلوم؟“

”اور جو میں یہ کہوں کہ صرف تمہاری خاطر یہاں آتا ہوں“

سلطانہ نے تڑاق سے جواب دیا۔ ”بالکل جھوٹ۔“

”اب تم کو کیسے یقین دلاؤں۔“

”وہ دیدے مٹا کر بولی۔ ”واہ! بیٹھے اماں سے باتیں کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے لیے آتے ہیں۔ میرے لیے کیوں آنے لگے؟“

نیاز برابر مسکراتا رہا۔ ”لیکن میری آنکھیں تو برابر تم کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔“

سلطانہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”کیوں؟“

”میرے قریب آکر بیٹھو تو بتاؤں۔“

اس نے گردن ہلادی۔ ”میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

سلطانہ کی ایک ایک ادائیہ کوڑ سے جاری تھی۔ وہ بے قرار ہو کر بولا۔ ”تو پھر میں تمہارا

پاس آجاؤں؟“

وہ اسی جیسے لہجے میں بولی۔ ”آپ وہاں بیٹھے کیا برے لگ رہے ہیں۔“

نیاز نے اسے پھر چھیڑا۔ ”اچھا ذرا میری طرف تو دیکھو!“

وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ ”لیجئے۔“

نیاز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے قراری سے بولا۔ ”ہائے!“

دل کی بات ٹھنڈی سانس کے ساتھ بہہ گئی۔ سلطانہ کے لیے نیاز کی یہ تمام حرکتیں کچھ عجیب سی تھیں۔ بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں اور بہت سی وہ بالکل نہ سمجھ سکی۔

نیاز کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اسی وقت ماں دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوئی۔ نیاز سنبھل کر بیٹھ گیا۔

نوشا کی ماں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”ارے تم کب آئے؟ میں تو برابر والے مکان میں تھی، بلوالیا ہوتا۔“

وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ ”آئے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی۔“

”اے سلطانہ! نیاز کو پان بھی کھلایا۔“ اس نے قریب پہنچ کر پاندان کھولا اور پان بنانے لگی۔

پان کھا کر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ سلطانہ ذرا دیر تک بیٹھی رہی پھر اٹھ کر اپنے بستر میں جا کر دبک گئی۔

\*\*\*

شام ہو چکی تھی۔ نیاز اپنی دکان میں بیٹھا تھا۔

لالین کی میالی روشنی میں ایک شخص سے رازدارانہ لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ کسی مال کا سودا ہو رہا تھا جو کسی طرح طے ہی نہ ہو پاتا۔ نیاز سو روپے سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا اور وہ شخص بے حد تھا کہ ایک سود سے کم نہ لے گا۔

نیاز نے آخری قیمت لگاتے ہوئے کہا۔ ”پانچ اور بڑھالو۔ پسند آئے تو دے دو۔ نہیں تو دوسرے جگہ دکھا دو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ اگر دوسری جگہ بھی اتنے ہی دام لگیں تو یہیں دے جاتا۔“

وہ آدمی بولا۔ ”بچوں گا تو تمہارے ہی ہاتھ اور پورے ایک سودس لوں گا۔ لویہ سنبھالو اپنا

”مال۔“

اس نے دو گھڑیاں نیاز کے سامنے ڈال دیں۔

نیاز آمادہ نہ ہوا۔ ”نہیں بھی اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔“

”خدا قسم بازار میں صرف ایک کی قیمت دو سو سے زیادہ ہے۔ روز ہم تمہاری بات مان لیں

ہیں۔ آج تم کو ہماری بات ماننی پڑے گی۔“

”دیکھنے میں تو دونوں ٹھیک لگتی ہیں۔ مگر ان کا نکالنا کتنا جو کھوں کا کام ہے۔ ہر وقت پولیس کا خطرہ۔ چوری کا مال بیچنا تم کوئی آسان کام سمجھتے ہو۔“

”نیاز بھائی، تم زیادہ دکان داری نہ کیا کرو۔ تمہارے ساتھ کوئی آج پہلا معاملہ کر رہا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ان ہاتھوں سے تم کو ہزاروں کا مال دے چکا ہوں۔ ہر وقت کی بزنس اچھی نہیں ہوتی۔ لاؤ نکالو سیدھے ہاتھ سے روپے۔“

نیاز اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”ہوں گے وہی ایک سو پانچ۔“

”لایار نکال جو تیرا بی چاہے۔“

نیاز نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ایک سو پانچ روپے گن کر اس کی طرف بڑھادیے وہ بولا۔ ”اماں چائے پانی کو تو کچھ دے دو۔“ نیاز نے اٹھنی اور دے دی۔ جل کر بولا۔

”لو یہ بھی لو۔ تمہارے اسی لپچڑپن سے مجھے چڑھے۔“

وہ شخص ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ اس نے نوٹ گن کر کوٹ کی جیب میں رکھے اور مسکراتا دکان سے باہر چلا گیا۔ نیاز نے دونوں گھڑیوں کو لائین کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ بالکل نئی تھیں اس نے دکان کے پچھلے حصے میں جا کر الماری کھولی۔ گھڑیاں رکھیں اور الماری میں تالا لگا دیا۔

نیاز کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ دیکھا نوشا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اس روز موٹر سائیکل کے انجن کا کوئی پرزہ لایا تھا۔ نیاز نے پرزے کو صرف ایک نظر دیکھا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر نوشا کو دیا۔

”جا آج ٹھاٹھ سے عیش کر۔“

نوشا کے ہاتھ میں پورا دس روپے کا نوٹ آیا تو وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ نیاز اس وقت ترنگ

تھا۔ ہنس کر بولا۔

”اے میرا منہ کیا تک رہا ہے۔ اسے جیب میں ڈال لے۔“

نوشا نے جلدی سے نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ اس وقت اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔

(۶)

گلی میں صرف شامی موجود تھا۔ راجہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ نوشا کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ جلد سے جلد راجہ کو یہ خوشخبری سننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی جیب میں پورے دس روپے کا کرار نوٹ ہے۔

شامی نے بتایا کہ راجہ کالے صاحب کے گھر تبول کھیلنے گیا ہے اور یہ کہہ کر گیا ہے کہ نوشا آئے تو اس کو وہیں لیتے آنا۔ نوشا نے سوچا آج تو ٹھاٹھ سے وہ بھی تبول کھیلے گا۔ وہ شامی کے ساتھ اسی طرف چل دیا۔

کالے صاحب کا مکان فرلانگ، سوافرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ بیچ میں دو گلیاں پڑتی تھیں۔ اس کے بعد عیسائیوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ وہیں کالے صاحب کا مکان تھا۔ دونوں جب وہاں پہنچے تو اس وقت سرنگ کی طرح لمبے کمرے میں، بوسیدہ بنجوں پر بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ کمرے میں ہر طرف تمباکو کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ سامنے چبوترے پر کالے صاحب، اونچی باڑھ کی بیٹ لگائے، ہاتھ میں جاو گروں کی طرح سیاہ چھڑی لیے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے چوکور میز تھی جس پر ایک تھیلا رکھا تھا۔ چار پانچ سال کا ایک گول مٹول بچہ تھیلے کے اندر سے نکٹ نکال کر دیتا جا رہا تھا جس پر لکھے ہوئے نمبر کالے صاحب سرکس کے مخروں کی طرح گردن منکا منکا کر اونچی آواز سے پڑھ رہا تھا۔

کمرے میں ایک طرف بیچ پر راجہ بھی بیٹھا تھا۔ کالے صاحب نمبر بولتا جا رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ ہاتھوں میں دبے ہوئے کاغذوں پر پنسل سے جلدی جلدی نمبر کاٹ رہے تھے۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص کے کان کالے صاحب کی آواز پر لگے تھے جو دھڑا دھڑا نمبر بول رہا تھا۔

کوفت: صدمہ۔ تبول: مغربی طرز کا جواہ لاری۔ منکا منکا کر: جھمکا کر۔

جو کھوں کا کام: بہت مشکل کام۔ دکان داری: سودا بڑھ کر باتیں کرنا۔ معاملہ: مراد سودا۔ لپچڑپن: خدائی طبیعت۔ بھونچکا: حیران۔

اچانک ایک موٹے ٹنگڑے آدمی نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ ”ہاؤس!“ کسی دل جلے نے چیخ کر اپنی جھلاہٹ کا اظہار کیا۔

”دھت تیرے کی۔“

اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

شامی نے راجہ کو آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا اور اٹھ کر ان کے پاس آگیا۔

نوشا نے تمبولہ کھیلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ ”یار! تو اس چکر میں نہ پڑ۔ یہ کالے صاحب ایک نمبر بے ایمان ہے۔ سالانہ ضرور گڑ بڑ کرتا ہے۔“

راجہ شام سے بیٹھا تمبولہ کھیل رہا تھا اور برابر ہار رہا تھا۔

کالے صاحب کے مکان پر ہر سنیچر کی شام کو تمبولہ ہوتا تھا۔ راجہ کئی ہفتوں سے وہاں جا رہا تھا اور ہر بار ہار کرتا تھا۔ تمبولہ کھیلنے کے لیے وہ ہفتہ بھر تک پیسے جمع کرتا اور سب ہار آتا۔ بعد میں کالے صاحب کو گالیاں دیتا۔

نوشا کا دل تمبولہ کھیلنے کو مچل رہا تھا۔ اس نے دبی زبان سے کئی بار اصرار بھی کیا مگر راجہ نے ایک نہ سنی۔ وہاں سے نکل کر تینوں باہر آئے۔ نوشا نے دس روپے کا نوٹ نکال کر دکھایا۔ راجہ پر رعب پڑا۔

ذرا دیر کے لیے تو وہ چکر اگیا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”ابے یہ نقشے ہیں۔ آج تو بڑی لمبی را مار لایا۔“

”اسی لیے تو تمبولہ کھیلنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ نوشا نے ایک بار پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ راجہ نے اس دفعہ بھی اس کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ ”ابے تمبولے میں کیا رکھا ہے۔ میں ہسیکی کو دیکھنے چلا آیا۔ پر سالی وہ آج آئی نہیں۔“

نوشا نے کہا۔ ”یار تو تعریف تو اس کی بہت کرتا ہے۔ کسی دن دکھا تو دے۔“

شامی بیچ میں بول اٹھا۔ ”ابے کیا کرے گا دیکھ کر۔ میری دکان پر روز سودا لینے آتی ہے۔ ابکہ دم واپیات ہے۔ کالی کلوٹی۔ بالکل کوامپری۔“

راجہ کو اس کی بات سخت ناگوار گزری۔ اس نے ٹیکھی نظروں سے شامی کو دیکھا۔ جل کر بولا۔ ”سالے وہ تمہاری عشق تو جیسے پرستان کی شہزادی ہے۔ سالی بھینگے کہیں کی۔“

ان کی باتیں سن کر نوشا کو شدید احساس کمتری ہوا۔ بے چارگی سے بولا۔ ”یار تم دونوں نے تو ایک ایک معشوق چھانٹ لیا۔ یہاں تو سالی کوئی کالی کلوٹی بھی نہیں ملتی۔“

دونوں اس کی سادگی پر بے ساختہ ہنس پڑے۔ شامی نے آنکھ مار کر کہا۔ ”استاد اس کے لیے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر کہیں لوٹنیا پھنسی ہے۔“

راجہ بے تکلفی سے ہنستا رہا۔ ”سالانہ دکان پر بیٹھا دن بھر یہی تو چکر چلاتا رہتا ہے۔“ شامی نے جھٹکادے کر اپنے بڑے بڑے بالوں کو ایکٹروڈ کی طرح پیچھے پٹا اور فخریہ انداز میں مسکرانے لگا۔

راجہ بولا۔ ”ابے نوشے تجھے ایک ترکیب بتاؤں۔ جو اوور سیر ہے نا۔ وہی جس کا چور ہے پر دو منزلہ مکان ہے۔ تو اس کی لوٹنیا کو گانٹھ لے۔ روز اس کو پڑھنے جاتی ہے۔ باپ قسم بڑی زور دار چیز ہے۔ میں نے تو اس کے بھائی سے یارنہ کر لیا ہے۔ چاہے تو تو بھی سا جھا کر لے۔ پٹ گئی تو موج کریں گے۔ لاملا اسی بات پر پلاؤ والا ہاتھ۔“ اس نے گرم جوشی سے نوشا کا ہاتھ دبوچ لیا۔

”ویسے یار لوٹنیا تو میر کلن کی بھی بہت زور دار ہے۔ بالکل پٹا ہے پٹا ہے۔“ شامی نے مڑ کر نوشا کی جانب دیکھا۔ ”ابے نوشے! تو نے تو اسے دیکھا ہو گا۔“

”وہی تو نہیں جو اسکول کے پچھواڑے رہتی ہے؟“

”ہاں یار وہی۔“ شامی نے نوشا کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مارا۔ ”میں نے تو اسے ٹانچنے کی بہت کوشش کی۔ پر سالی بدکتی بہت ہے۔ جتنے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتی۔ تو لگ جا اس کے پیچھے۔ پھنس گئی تو عیش کرے گا۔“

”ابے اس سے کیا لوٹنیا پھنسنے گی۔ یہ تو ایک دم لینڈی کتاب ہے۔ اس کے سامنے جا کر دم ہلانے لگے گا۔“ راجہ نے زور سے قہقہہ لگایا۔

نوشا بھی کھیانا ہو کر ہنسنے لگا۔

سبے ساختہ: بلال احمد، ریاض: محنت: ساجھا: برادر کی حصہ داری: پٹا ہے: مراد بہت خوبصورت۔ پچھواڑے: کچھل طرف: پیچھے۔ دھپ: تھپ۔ بدکتا: بھڑکتا، غصے میں آتا۔ لینڈی کتاب: مراد زور پوک۔ کھیانا: شرمندہ۔

چھٹا: بے قرار ہونا۔ کوامپری: مراد کو کے کی طرح سیاہ۔



تینوں دیر تک محلے کی لڑکیوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ راجہ اور شامی، جو لگ بھگ نوشاہی کے ہم عمر تھے اور کسی کا بھی سن چودہ پندرہ سال سے زائد نہ ہو گا اس انداز سے بڑھ چڑھ کر بات کر رہے تھے کہ نوشاہی کی طرح ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

تمبولہ کھیلنے کا پروگرام منسوخ ہوا تو راجہ نے ایک نیا پروگرام بنایا مگر اس کی تفصیل نہ بتائی۔ شامی نے ضد کی تو اس نے ڈانٹ دیا۔

”بس کہہ دیا ایک جگہ چلیں گے۔ تجھے چلنا ہوتا چل۔“

شامی نے پوچھا۔ ”کب تک واپسی ہوگی؟“

”کوئی ٹھیک نہیں۔ گیارہ تو بج ہی جائیں گے۔“ راجہ نے جواب دیا۔

شامی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ”نا بابا! میں اتنی دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ اب مولانا قدوس کا وعظ سننے گئے ہیں۔ دس بجے تک لوٹ آئیں گے۔ مجھے گھر میں نہیں دیکھا تو ادھم مچا دیں گے۔ میں تو بھی چلا۔“ وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

راجہ اور نوشاہی باتیں کرتے ہوئے بازار کی جانب مڑ گئے۔

\*\*\*

بازار کی چہل پہل اب اجڑ چکی تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا دکانیں کھلی تھیں۔ چوکیداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا تھا اور دکانوں کے تالے ہلا ہلا کر دیکھ رہے تھے۔ راجہ اور نوشاہی بازار عبور کیا اور ایک گلی میں داخل ہو گئے۔

گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ آگے آگے راجہ تھا اور اس کے پیچھے نوشاہی چل رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک موٹر پر تیز روشنی نظر آئی۔ قریب ہی ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ دونوں اسی طرف مڑ گئے۔ جس قدر وہ آگے بڑھتے گئے شور نزدیک آتا گیا۔ آخر راجہ ایک قدیم وضع کی اونچی عمارت کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔

بڑا چھانک بند تھا اور اندر خوب شور ہو رہا تھا۔ راجہ نے کھڑکی نما دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی نوشاہی چلا گیا۔ دروازے کے سامنے کشادہ صحن تھا۔ اس کے ایک طرف نیچی محرابوں والا طویل دالان تھا جس میں گیس بیتیاں روشن تھیں۔ جگہ جگہ ٹین کی کرسیاں اور لکڑی

کی بھندی میز پر پڑی تھیں۔ میزوں پر شراب کی بوتلیں تھیں۔ گلاس تھے۔ اس شراب خانے میں ایسی شراب ملتی تھی۔ دالان میں شریاؤں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ شراب پی رہے تھے۔ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ تھقبے لگا رہے تھے۔ راجہ اور نوشاہی کھینچ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گئے۔ راجہ نے نوشاہی سے دس روپے کا نوٹ لیا اور کاؤنٹر پر جا کر ٹھہرے کا ایک ادھالے آیا۔ اس نے بوتل کھول کر میز پر رکھی۔ اپنے گلاس میں شراب انڈیلی۔ لیکن جب وہ دوسرے گلاس میں شراب ڈالنے لگا تو نوشاہی گھبرا کر بولا۔

”یاد رہے تو کس کے لیے انڈیل رہا ہے؟“

وہ ہنس کر بولا۔ ”ابے تیرے لیے اور کس کے لیے؟“

نوشاہی ہوئی آواز سے بولا۔ ”نہیں یاد مجھے نہ چلا۔“

راجہ اصرار کرنے لگا۔ مگر نوشاہی برابر انکار کرتا رہا۔ اسی اثنا میں دالان کے اندر ڈھولک ٹھنکنے لگی۔ ایک بیچوالہک لہک کر گانے لگا۔

بریلی کے باجرا میں جھکا گرا رے

او جھکا گرا رے - - -

گانے کے ساتھ ساتھ وہ کمر لچکا کر ناچنے بھی لگا۔ ایک شرابی جھومتا ہوا اٹھا اور بیچوے کے ساتھ ناچنے لگا۔ اس کا جسم خاصا بھاری بھر کم تھا۔ دھم دھم کر کے ناچتا تو چھت تک اٹل جاتی۔ دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ اسے ناچتے دیکھ کر زور زور سے تھقبے لگانے لگے۔ دونوں کے ناچ نے شراب خانے کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی۔ نوشاہی اس ہاؤ ہو میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ بار بار کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اسی دوران میں ایک ادھیڑ آدمی نے دونوں کے قریب آکر پوچھا۔

”کھانے کو کچھ لاؤں۔“

راجہ نے کہا۔ ”کباب ہوں گے؟“

”کباب تو ابھی ابھی ختم ہو گئے۔“

راجہ بولا۔ ”اچھا تو آلو چھولے لے آؤ۔ مگر خوب چٹ پٹے ہوں۔“

”ابھی لوجی، ابھی۔“

نفرے سنا تا اور دونی وچنی وصول کر کے دوسری میز پر چلا جاتا۔ وہ باری باری ہر میز پر جا رہا تھا۔ راجہ اور نوشا کو دیکھ کر اس نے ہاتھ منکا منکا کر تالیاں بجائیں اور زور سے تان لگائی۔

چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلی کھیلے  
نوشا تو اس کی حرکتوں پر شرما گیا۔ مگر راجہ نے بڑی بے باکی سے اٹھا کر اس کے گلے میں  
بانہیں ڈال دیں اور چٹاخ سے اس کا گال چوم لیا۔ بیچڑا ہاتھ پھیلا کر بولا۔

”اسی بات پر ایک چوٹی دلاؤ۔“

راجہ نے فوراً جیب سے چوٹی نکال کر دے دی۔ وہ کو لمبے منکا تا ہوا آگے بڑھ گیا۔  
دونوں دیر تک بیٹھے ٹھٹھے سے شغل کرتے رہے۔ ٹھٹھے کی خاصیت ہے کہ اس کا نشہ  
طوفان کی طرح چڑھتا ہے۔ راجہ نے غضب یہ کیا کہ بوتل ختم ہونے کے بعد ایک پوٹ اور لے آیا۔  
پوٹ ختم نہیں ہوا تھا کہ راجہ ہنسنے لگا۔ اب وہ خواہ مخواہ ہنس رہا تھا بات کہتے کہتے بھول جاتا۔ کبھی نوشا  
کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔ کبھی اس طرح چہرہ بگاڑتا جیسے رو پڑے گا۔ نوشا بھی ہولے ہولے  
جموم رہا تھا۔ اسی عالم میں ایک بار وہ ڈمگایا اور دھڑام سے فرش پر گر ا۔ اٹھ کر اس نے میز کا سہارا لیا تو  
میز الٹ گئی۔ بوتل لڑھک گئی۔ گلاس گر کر چکنا چور ہو گئے۔ راجہ نے گندی سی گالی دی۔ ساتھ ہی  
ایک زمانے کا ہاتھ نوشا کے گال پر پڑا۔ نوشا نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ راجہ خوشخوار نظروں سے گھور  
رہا تھا۔ اسے نہ جانے کیسا جھمی کہ دالان سے نکل کر صحن میں آگیا۔ پیچھے سے راجہ نے آواز دی۔  
نوشا کو ایسا محسوس ہوا جیسے راجہ کنویں کے اندر سے بول رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔  
پھانک کی کھڑکی سے نکل کر باہر گلی میں آگیا۔

وہ ڈمگاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ اسے مطلق علم نہیں تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟ کدھر جا رہا  
ہے؟ آدھ گھنٹے تک سسنان گلیوں میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ ایک کشادہ سڑک پر آگیا۔ لیکن  
سڑک پر کچھ ہی دور گیا ہو گا اچانک اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے وہیں سڑک پر تے کر دی۔ اٹھ کر  
لڑکھاتا ہوا چند قدم گیا۔ ہر چیز اس کے سامنے گردش کر رہی تھی۔ مکانوں کے درپچوں پر جھلکتی  
روشنیاں جگنوؤں کی مانند اس کی نظروں کے سامنے جلنے بجھنے لگیں۔ پھر وہ سپیرے کی بین پر جمونے  
والے ناگ کی طرح لہرایا اور پکڑا کر گر پڑا۔ سڑک ٹھنڈی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ نوشا کو بڑا سکون

پتا: چوتھا حصہ۔ مطلق: بالکل۔ درپچہ: کھڑکی۔

وہ چلا گیا اور ذرا دیر بعد المونیم کی گندی سی پلیٹ میں آلو چھو لے لے آیا جن پر پس ہوئی لال  
مرچیں پڑیں تھیں۔

بھاری بھر کم جسم والا شرابی ابھی تک بیچڑے کے ساتھ تاج رہا تھا۔ وہ اپنے چوڑے چکلے  
کو لمبے منکا کرنا چتا تو نوشا کو بڑا لطف آتا۔ راجہ نے کہا۔ ”اب ذرا سی لگائے بغیر کیا مزہ آئے گا۔“ اس  
نے گلاس اٹھا کر نوشا کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

نوشا نے ایک گھونٹ پی کر برا سامنے بنایا۔ ”یار، یہ تو بہت کڑی ہے۔“

راجہ نے آلو چھو لے لے پلیٹ سامنے کر دی۔ ”لے آلو کا ایک قتلہ کھالے۔“

نوشا نے پلیٹ سے آلو کے کئی قتلے اٹھا کر کھالیے۔ راجہ نے گلاس اٹھا کر اپنی آنکھوں کے  
سامنے کیا۔ گہری گلابی شراب کو روشنی میں دیکھا۔ گلاس کو بوسہ دیا اور غٹا غٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔  
نوشا نے بھی گلاس اٹھا کر تھوڑی سی پی لی اور راجہ سے کہنے لگا۔

”یار تو تو بڑا چھپا ستم نکلا۔“

”نہیں بے! بس دو تین بار اس سے پہلے اور پی تھی اور یہاں تو دوسری دفعہ آیا ہوں۔“

”لگے سالے جھوٹ بولنے۔ اب تو پکا شرابی معلوم ہوتا ہے۔“

”نہیں یار! قسم لے لے۔“ راجہ نے صفائی پیش کی۔

دونوں باتیں کرتے رہے اور ٹھٹھے کے گھونٹ چڑھاتے رہے۔ جب گلاس ختم ہو جاتا تو  
راجہ اور انڈیل دیتا۔

نوشا پیٹے پیٹے ذرا دیر بعد بولا۔ ”یار راجہ مجھے تو کچھ عجیب سالگ رہا ہے۔“

”ابے ابھی سے چڑھنے لگی۔ چل تھوڑی سی اور لگا۔“

نوشا نے ٹھٹھے کی چسکی لی اور خواہ مخواہ ہسنے لگا۔ یہ ہنسی بڑی بے ڈھنگی تھی۔ اس نے گلاس اٹھا  
اور غٹا غٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ بھاری بھر کم جسم والا شرابی ناچتے ناچتے یکایک لڑکھڑا کر گر پڑا تھا اور  
اب چاروں خانے چت فرش پر لیٹا بیٹھیں کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ دالان میں بیٹھے ہوئے شرابی زور زور  
سے قہقہے لگا رہے تھے۔

بیچڑے نے گانا بند کر دیا تھا۔ وہ ہر میز پر جاتا۔ کسی سے گند انداق کرتا۔ کسی کو دو چار بازار

قتلہ: کھڑا بے ڈھنگی۔ بے ترحیب، بد نما۔ چاروں خانے (شانے) چت: مراد پشت کے بل بالکل سیدھا۔

تا نگے میں ڈالا اور خود بھی سوار ہو گیا۔ تا نگا نوشا کے گھر کی طرف چل دیا۔  
سڑک کا راستہ تو تا نگے میں اطمینان سے گزر گیا۔ لیکن گلی اتنی تنگ تھی کہ تا نگا اندر نہیں جاسکتا تھا۔ سلمان نے تا نگے والے کو کرایہ دیا اور نوشا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر گلی کے اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں دوبار ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔  
رات کا وقت اور اجنبی جگہ۔ سلمان کے لیے نوشا کے گھر کا پتہ لگانا بھی ایک مسئلہ بن گیا۔ نہ جانے کتنی دیر اسے اندھیری گلی میں بھٹکتا پڑتا۔ خوش قسمتی سے محلے کا ایک آدمی مل گیا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھا اور اس وقت ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔ اس نے نوشا کا مکان بتا دیا۔ سلمان نے نوشا کو گھر کے دروازے پر لٹایا اور ذرا دیر تک ہانپتا رہا۔ وہ چہرے پر جسم کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس قدر مشقت کا عادی نہ تھا۔ اس کا سارا بدن پسینے پسینے ہو گیا تھا۔  
سلمان نے دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ وہ رک رک کر دروازے پر دستک دیتا رہا۔

\*\*\*

آہٹ سے نوشا کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس روز اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ لہذا خود تو دروازے پر نہ جاسکی۔ آواز دے کر سلطانہ کو بیدار کیا۔ وہ کچی نیند سے اٹھی تھی۔ دروازے پر کھٹکھٹانے کی آواز سنی تو ڈر کر بولی۔  
”اے اماں! یہ اتنی رات گئے دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟“  
ماں غصے سے بولی۔ ”ہو گا کون، وہی حرام خور ہو گا نوشا۔ ساری رات وہی تباہی پھرنے کے بعد اب لاٹ صاحب کو گھر کی سو جھی ہے۔ جا بیٹی دروازہ کھول دے۔ ورنہ وہ کیمخت سونے بھی نہ دے گا۔“

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ آنگن میں پہنچ کر سردی کا احساس ہوا تو جسم کپکپا کے رہ گیا۔  
اول شب موسم خوشگوار تھا۔ مگر اب خشکی بڑھ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور گردن باہر نکال کر بولی۔

شفقت: موت۔ واپسی تباہی: آوارہ، فضول۔

ملا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بے خبر سو گیا۔

سڑک کے پیچوں پہنچ وہ ہاتھ پھیلائے لاش کی طرح بے جان پڑا تھا۔ دفعۃً قریب کے موڑ سے ایک کار تیز رفتار سے نکلی اور آنا فانا نوشا کے سر پر پہنچ گئی۔ نوشا پیچے کی لپیٹ میں آکر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک بار وہ کلیجہ پھاڑ کر چیخا۔ ”ہائے“ اور پھر خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے۔ کار شور کرتی ہوئی زور سے اچھل کر رک گئی۔ کسی نے کار کے اندر سے گردن نکال کر نوشا کو دیکھا۔ وہ دھندلی روشنی میں مردے کی طرح بے سدھ پڑا تھا۔  
”مر گیا؟“ جھانکنے والے کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

کار کے اندر سے کسی نے کہا۔ ”گاڑی آگے بڑھاؤ۔ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔“ انجن اشارت ہونے کی آواز خاموشی میں ابھری اور کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

(۷)

نوشا سڑک پر بے سدھ پڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ آدھی رات کو ایک راہ گیر ادھر سے گزرا۔ یہ سلمان تھا۔ وہ ایک مقامی کالج کا طالب علم تھا۔ اور فلم دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے نوشا کو دیکھا تو رک گیا۔ جھپکتا ہوا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت نوشا نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ سلمان جھک کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے تمام جسم پر خاک تھی۔ اس نے نوشا کا ہر طرف سے جائزہ لیا۔

چوٹ زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صرف کندھے کے پاس خون کا گہرا سرخ نشان تھا۔ اسے سچ سڑک سے اٹھا کر وہ فٹ پاتھ پر لے آیا۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ ہر طرف ویرانی برس رہی تھی۔ اس نے نوشا کو ہولے ہولے جھنجھوڑا اور کسی نہ کسی طرح نام اور پتہ معلوم کیا۔

اتفاق سے ایک خالی تا نگا آتا ہوا نظر آیا۔ سلمان نے تا نگا کو لیا۔ کوچوان کی مدد سے نوشا کو

پیچوں پہنچ: بالکل درمیان میں۔ آنا فانا: ایک دم، یکایک۔ کلیجہ پھاڑ کر: بہت زور سے۔ بے سدھ: بے ہوش۔ آدم زاد: انسان۔



”نوٹا! اے نوشا۔“

سلمان بھونچکا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ سلطانہ گہری نیند سے اٹھی تھی۔ اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی بھی نہ دیا۔ نوشا کی آواز نہ آئی تو وہ بولی۔

”ارے کہاں چلا گیا۔ بولتا کیوں نہیں؟“

سلمان سے اب خاموشی نہ رہا گیا۔ ”کارے اس کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔“

ایکسڈنٹ کا نام سننے ہی سلطانہ بدحواس ہو کر چیخی۔ ”ہائے اللہ“ اور تیزی سے بھاگتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی۔

ماں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”ارے کیا ہو گیا؟“

سلطانہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”نوشا موٹر کار سے پھل گیا۔“ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

ماں بھی چیخ کر رونے لگی۔ شور سن کر آٹو جاگ اٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ سلمان اس وقت تک نوشا کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کا جسم سلمان کے ہاتھوں پر بارش سے بھیگی ہوئی شاخ کی طرح جھول رہا تھا۔ سلمان نے نوشا کو دری بہ لٹا دیا اور ماں بیٹی کو تسلی دینے لگا۔

”گھبراہٹے نہیں۔ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے، بال بال بچ گیا۔“

دونوں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ انہیں روتے دیکھ کر آٹو بھی منہ بسور کر رونے لگا۔ سامنے نوشا آنکھیں بند کئے بے حال پڑا تھا۔ لیپ کی روشنی میں اس کا چہرہ لاش کی طرح خاستری نظر آ رہا تھا۔

سلمان نے پھر ان کو تسلی دی۔ ”آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ کندھے پر ذرا ساز خم آگیا ہے۔“

ماں نوشا کو سر ہانے بیٹھ گئی۔ سلطانہ بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔

نوشا ابھی تک بے ہوش تھا۔

اس کی ماں اور بہن بے قرار ہو کر آنسو بہا رہی تھیں۔ رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھیں۔

یہ بڑا المناک منظر تھا۔

سلمان سے زیادہ دیر دیکھانہ گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔

”اب میں چلوں گا۔“

ماں اسے دعائیں دینے لگی۔

\*\*\*

سلمان باہر گلی میں آگیا اور سیدھا اپنے گھر کی طرف چل دیا کمرے میں پہنچ کر جب بستر پر لیٹنے لگا تو اسے خیال آیا کہ گھر پہنچانے کے بجائے وہ نوشا کو اسپتال کیوں نہ لے گیا۔ ممکن ہے چوٹ کے اندرونی حصوں میں آئی ہو۔ وہ دل گرفتہ ہو گیا۔ سوچنے لگانہ جانے نوشا کی اب کیا حالت ہو۔ گھر میں کوئی ایسا مرد بھی نظر نہ آیا تھا کہ رات میں اگر طبیعت زیادہ گڑبڑ ہو جائے تو زخمی کو اسپتال لے جائے۔

یوں تو سلمان بڑا آشفستہ طبع اور لاابالی نوجوان تھا۔ یہاں اس کا کوئی سرپرست بھی نہ تھا۔ تنہا رہتا تھا اور بڑی غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ان طالب علموں کے زمرے میں شامل تھا جو زمانہ طالب علمی میں ہی زندگی کے بہت سے تجربات حاصل کر لیتے ہیں۔ فلتس یاری کھیلنے پر آتا تو رات رات بھر کھیلتا رہتا اور ایک ایک پیسہ ہار جاتا۔ محفل جم جاتی تو کبھی کبھار شراب بھی پی لیتا۔ گھر سے جس روز مٹی آرڈر آتا اس روز وہ کسی بالا خانے پر جا کر گانا ضرور سنتا۔ مگر ان تمام کمزوریوں کے باوجود بڑا نرم دل اور خدا ترس بھی تھا یہی وجہ تھی کہ وہ رات اس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔

صبح اٹھتے ہی وہ نوشا کے گھر پہنچا۔ نوشا کی ماں نے اسے اندر بلا لیا۔ کمرے میں جا کر اس نے دیکھا، نوشا ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ ماں نے بتایا کہ سویرے بہت تڑکے اسے ہوش آیا تھا۔ بات چیت بھی کی تھی۔ اب طبیعت ذرا ٹھیک ہے۔

سلمان وہیں دری پر بیٹھ کر نوشا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ سلطانہ کمرے کے باہر تھی۔ اس نے کئی بار سلمان کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اور برابر سگریٹ پر کش لگا رہا تھا۔ سلطانہ نے آٹو کو اشارے سے قریب بلایا۔ پڑوس میں بھیجا کہ کرسی مانگ لائے۔ اسے سلمان کا پتلون پہن کر فرش پر بیٹھنا بڑا بے تکالگ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد آٹو کرسی لے کر آگیا۔ کرسی بوسیدہ تھی۔ اس کا ایک پایہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کرسی کمرے کے اندر بھجوا دی۔

نوشا کی ماں نے اصرار کر کے سلمان کو کرسی پر بیٹھا دیا۔ لمحہ بھر بعد اس نے پہلو بدلا تو کرسی

دل گرفتہ: غمیں۔ آشفستہ طبع: پریشان حال۔ لاابالی: بے پرواہ۔ زمرہ: جماعت۔ بالا خانہ: مرد اور عورت کا کونسا۔ بے کلا: ناموزوں۔

بال بال بچتا: مشکل سے بچتا۔ بے حال: کمزور، مردار۔ غمی: خاستری: مٹی کے رنگ کا۔ المناک: دکھ بھرا۔

ڈنگا کراٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی سلمان دھڑام سے فرش پر آ رہا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کمر ہو گیا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ کمرے کے باہر سلطانہ کی ہنسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔ سلمان جھینپ کر مسکرانے لگا۔

ماں بچوں کو خواہ خواہ کو سننے لگی۔ ”خدا سمجھے ان کم بختوں کو۔ اچھی بھلی کرسی توڑ ڈالی۔“ اس نے کرسی اٹھائی۔ دیوار سے ٹکائی اور سلمان کو اس پر زبردستی بیٹھا دیا۔ اس وقت وہ اس طرح چوکا ہو کر کرسی پر بیٹھا تھا جیسے فوٹو کھینچو رہا ہو۔ اب وہ عین دروازے کے مقابل بیٹھا تھا۔ کئی بار اس نے سلطانہ کو دروازے کی آڑ سے جھانکتے ہوئے دیکھا اور کئی بار اس کی نظریں سلطانہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔

## فصل دوم

(۱)

موسم بدل رہا تھا۔ سردی کا چل چلاؤ تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ مگر راتیں بڑی سہانی ہوتیں۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ چاند ٹکٹا تو دروہام آئینہ خانہ بن جاتے۔ شفاف چاندنی سے دل میں کسک اٹھتی۔ کتنی ہی دبی ہوئی خواہشیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتیں۔ ایک ایسی ہی سہانی رات تھی۔ نوشا کی ماں دالان میں سانبان تلے بیٹھی تھی۔ اس نے سہ پہر کو غسل کیا تھا۔ دھلے ہوئے اجلے کپڑے پہنے تھے۔ سلطانہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوچھی کہ اس نے ماں کا دوپٹہ اتار کر اپنا بستی دوپٹہ اوڑھادیا۔

ماں نے احتجاج کیا۔ ”اری لڑکی کچھ دیوانی ہو گئی ہے۔ لامیر ادوپٹہ تو دے۔“

وہ ہنس کر بولی۔ ”اللہ قسم اماں بستی دوپٹہ تو تم پر کھل گیا۔“

بات بھی ایسی ہی تھی۔ اس کی ڈھکی چھپی جوانی بستی دوپٹے میں جاگ اٹھی تھی۔ باہر صحن میں چاندنی چمکی ہوئی تھی۔ ماں کا چہرہ دمک رہا تھا، جھگڑا رہا تھا۔ یوں اس کی عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی۔ سال بھر بعد سلطانہ پیدا ہوئی جواب لگ بھگ سترہ سال کی تھی۔ اس حساب سے اس کا سن ۳۳ سال کے قریب تھا۔ لیکن شوہر کے انتقال کے بعد کچھ تو دکھوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا اور کچھ اس نے اپنی وضع قطع بھی بڑی بوڑھیوں کی سی بنا رکھی تھی۔ ورنہ ایک زمانے میں وہ بڑی طر حدار عورت تھی۔ شوہر چاہنے والا ملا تھا۔ ضلع کچہری میں محرر تھا مگر اس نے

جل چلاؤ: آخری وقت، رواں گی۔ تمازت، شدت، گرمی۔ کھل گیا، جگ گیا۔ حلیہ، طر حدار، خوش انداز، ہانگی۔

روپے کانٹ نکال کر بولا۔

”ذرا لپک کر سیر بھر گرم گرم ہالوشاہی تولانا۔“

نوشا کی ماں نے بہت منع کیا مگر وہ ہانڈہ آیا۔ ضد کر کے اٹو کو مٹھائی لانے کے لیے بھیج دیا۔  
ذرا دیر بعد اٹو مٹھائی لے کر آگیا۔ نیاز نے بڑے اصرار سے نوشا کی ماں کو خود اپنے ہاتھ سے ایک ہالوشاہی کھلائی۔ پھر مٹھائی تقسیم کی گئی۔ سب خوش تھے۔ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔  
مگر بھر میں ہنگامہ برپا تھا۔ نوشا بھی اسی وقت آیا تھا۔ اور سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔

رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ آخر نوشا اور اٹو اپنے اپنے بستروں میں جا کر دیک گئے۔  
تھوڑی دیر میں سلطانہ بھی جمائیاں لینے لگی۔ وہ جانے کے لیے اٹھی تو نیاز نے اس طرح دیکھا کہ اس کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں۔ کچھ دیر تو اور بیٹھو۔ مگر وہ اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ نیاز بار بار مرکز کمرے کی جانب تکتا رہا کہ شاید سلطانہ واپس آجائے۔ لیکن وہ بے خبر سو رہی تھی۔

نیاز ذرا دیر تک بجھا بجھاسا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا چلو آج لگے ہاتھوں سلطانہ کے ساتھ رشتے کی بات چھیڑ دی جائے۔ وہ اپنی گھریلو تکلیفوں کا رونا رونے لگا۔ ہوٹل کے خراب کھانے سے گھر کے اکیلے پن تک، ساری باتیں سناڈالیں۔ سلطانہ کی ماں چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو اس نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا۔

”میرا کہنا تو تم اپنا گھر سالو۔ اس طرح کب تک تکلیفیں اٹھاؤ گے۔“

نیاز یہی بات اس کی زبان سے سننے کا عرصے سے خواہشمند تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”سوچ تو میں بھی رہا ہوں، مگر میرا یہاں کون ہے جو کہیں سلسلہ چھیڑا جائے۔ لے دے کے ایک آپ کا گھر ہے جہاں چلا آتا ہوں۔“

”کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں؟“

نیاز کے ذہن میں ایک باریہ خیال ابھرا کہ صاف صاف کہہ دے۔ مگر ہچکچاہٹ کے باعث اپنا بات نہ کہہ سکا۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔ ”یہ تو آپ ہی کو سوچنا پڑے گا۔“

وہ اس کی بات کا مطلب کچھ کچھ بھانپ گئی۔ ”بھئی میں کیا بتاؤں؟ اگر میری سلطانہ کچھ بڑی ہوتی تو میں خدا قسم اس کو تمہارے ساتھ بیاہ دیتی۔“

نیاز کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ بوکھلا کر بولا۔ ”آپ میری عمر کتنی سمجھتی ہیں؟“

کبھی بیوی کا دل میلا نہیں کیا۔ آدمی رات کو بھی اگر اس نے کسی چیز کی فرمائش کی تو اسی وقت جا کر لے آتا۔ لیکن اب اسے مرے ہوئے پانچ برس ہو گئے تھے اور ان پانچ برسوں میں اس کے سارے جتن ہو گئے۔ کون سی مصیبت تھی جو اس نے نہیں جھیلی، کون سی پریشانی تھی جس سے اس کا ساقہ نہیں پڑا۔

اوڑھنے کو تو اس نے بستی دوپٹہ اوڑھ لیا مگر ڈر رہی تھی کہ کسی ٹکے والے والے نے دیکھ لیا تو بن جائے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ رنڈا پاجھوڑ چھاڑا ب بننا سنو رنا شروع کر دیا ہے۔ مارتے ہاتھ سب پکڑ لیتے ہیں کہتے ہیں زبان کوئی نہیں پکڑتا۔ وہ بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ نیاز آگیا۔

اس روز وہ بالکل چھیلان کر آیا تھا۔ سفید ملل کا کرتا اس کے نیچے شرعی بنیائیں۔ کھڑکھڑانی ہوئی کلف دار لٹھے کی شلوار، ٹوپی بھی اس نے اتار دی تھی۔ آڑی مانگ نکال کر بڑی محنت سے بالوں کو جمایا تھا جن پر چڑا ہوا خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ ایک ہاتھ کی کلائی میں موتے کے پھولوں کا گہرا پڑا تھا۔ کان میں عطر کا پھویا تھا۔ نیاز آکر بیٹھا تو سارا گھر مہلکے لگا۔ اس وقت وہ تھا بھی بڑا خوش۔ نوٹا کی ماں کو بستی دوپٹہ اوڑھے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔

”ارے آج تو آپ کو پچا پچانا مشکل ہو گیا۔“

سلطانہ جو قریب ہی بیٹھی تھی، مسکرا کر بولی۔ ”دولہا بھائی! میں ان سے ابھی یہی کہہ رہی تھی۔ اچھا خا صا پنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ جب دیکھو یہ گلوڑا مونا سفید دوپٹہ سر پر منڈھے بیٹھی ہیں۔“  
نیاز نے مرکز سلطانہ کو دیکھا۔ اس کا حسن سفید لباس میں کچھ اور نکھر گیا تھا۔ گلابی ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ آنکھوں میں تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی شگفتگی تھی۔ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

”ٹھیک تو کہہ رہی ہے سلطانہ۔ خدا قسم! یہ دوپٹہ تو آپ پر بڑا اچھا لگ رہا ہے۔“

نوشا کی ماں شرم کر بولی۔ ”کیوں تم دونوں مل کر مجھے بنارہے ہو؟“

سلطانہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ نیاز کو اس کی ہنسی بڑی اچھی لگی۔ وہ اسے خوش کرنے کے لیے بولا۔ ”سلطانہ۔ تم ان کو روز نکلیں دوپٹے اوڑھ لیا کرو۔ ذرا دیکھو تو کیسی چمک رہی ہیں۔ بھی اسی بات سب کا منہ میٹھا ہو جائے۔“ وہ اس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں تھا۔ ابھی ابھی اس نے چوری کے سولہ موٹر ٹائر فروخت کئے تھے جس میں کئی سو روپے کا منافع ہوا تھا۔ اس نے اٹو کو بلایا اور جیب سے پانچ



”یہ تو میں جانتی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سلطانہ کی اور تمہاری عمر میں آدھوں آدھ کا فرق ہو گا۔“

نیاز یہ بات کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا۔ کھیٹا ہوا کر بولا۔ ”آپ بھی کمال کر رہی ہے۔ فرق کیسے ہو سکتا ہے۔“

”برانہ مانو تو ایک بات کہوں؟“

”ضرور کہئے۔“ وہ اس وقت سب کچھ سننے کو تیار تھا۔

سلطانہ کی ماں نے دبی زبان سے کہا۔ ”سچ پوچھو تو سن میں دو چار سال میں تم سے چھوٹی ہوں گی۔“

وہ حیرت زدہ ہو کر چیخ پڑا۔ ”جی۔“

”میری عمر کیا سمجھتے ہو؟ تیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔“ دو تین سال کی اس نے اپنی طرف سے ڈنڈی ماردی۔

نیاز نے اس دفعہ اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی ابھی تک جوان تھی۔ سر کے سارے بال سیاہ تھے اور بڑے سلیقے سے گندھے ہوئے تھے۔ چہرے کے نقوش کا ٹیکھاپن گو کہ ماند پڑ چکا تھا پھر بھی ان میں تازگی تھی۔ دل آویزی تھی۔ البتہ جسم ذرا بھدا ہو گیا تھا۔ خاص طور پر کولھے جو کسی قدر پھیل گئے تھے۔ لیکن اس میں ایک دل فریب سج دھج اور کشش تھی۔ نیاز نے اب تک اسے اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے صرف سلطانہ کی ماں کی حیثیت سے دیکھتا رہا تھا۔ مگر اس وقت صرف ایک عورت کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی ایک مرد کی نظر سے۔

سلطانہ کی ماں نے اسے اس طرح ٹٹولتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھا تو شرما کر دوپٹہ سر پر سر کالیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ نیاز کے سامنے وہ شرما بھی سکتی ہے۔ اس احساس میں خوف تھا، لذت تھی۔ ایسی لذت جس سے وہ نا آشنا نہیں تھی اور جسے وہ تھک کر سلا چکی تھی۔ اس نے اپنے جسم میں پسینے کی نمی محسوس کی۔ وہ گھبرا رہی تھی اور اس گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے اس نے جلدی سے پاندان کھول کر پان لگایا اور نیاز کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

”کس سوچ میں پڑ گئے؟ لو پان کھاؤ۔“

نیاز نے ہاتھ بڑھا کر پان لیا۔ دونوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے مس ہوئیں۔ نوشا کی ماں کا ہاتھ سکیپا اور پان نیچے گر پڑا۔

دونوں چونک کر ایک ساتھ بولے۔ ”ارے!!“

دونوں خاموش ہو گئے اور کئی منٹ تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ چاندنی اور نکھر گئی۔ ہوا میں سرسراہٹ تھی اور نیاز کی کٹائی میں پڑے ہوئے گجرے کے پھول مہک رہے تھے۔ اچانک کمرے کے اندر ریمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی جہاں گھپ اندھیرا تھا۔

جتنی دیر وہ کمرے کے اندر رہی یہ تمام وقت نیاز نے بڑی بے چینی سے کاٹا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کیا وہ اٹھ کر یہاں سے چپ چاپ چلا جائے؟ کئی سوال اس کے ذہن میں ابھرا بھر کر غوطے لگا رہے تھے۔ اجلی چاندنی باہر صحن میں نکھری ہوئی تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور موتے کے پھول مہک رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آئی۔ نیاز نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ نیاز کی نظریں برابر اس کے جسم کے پیچ و خم پر منزل لاتی رہیں۔ مگر جب وہ اس سے ہٹ کر دور بیٹھنے لگی تو نیاز کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

”یہاں میرے قریب“

وہ کھٹک کر اس کے قریب ہو گئی۔ مگر نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اجلی چاندنی کی ہلکی ہلکی جگجگاہٹ میں دونوں دالان کی تنہائی میں گم سم بیٹھے تھے۔ نیاز نے پھولوں کا گجر ہاتھ سے نکال کر سامنے رکھ دیا۔ لمحہ بھر تک وہ اس کے ساتھ انگلیوں سے کھیلتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ کیا بات کرے۔

کچھ دیر بعد وہ بولی۔

”بہت رات ہو گئی۔“ اس کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی۔

”گیارہ بجے ہوں گے۔“

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ یہ خاموشی بڑی ہیجان خیز تھی۔ نیاز نے گھبرا کر انگڑائی لی۔ اسے غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ ”ذرا اور قریب آ جاؤ۔“ اور وہ خود اس کی طرف جھک گیا۔ وہ

کسمسا کر اپنی جگہ پر رہ گئی۔

کمرے میں سلطانہ اور اس کے دونوں بھائی گھپ اندھیرے میں بے خبر سوزہ تھے۔

\*\*\*

نیاز بہت تڑکے اٹھ کر نوشا کے گھر سے چلا گیا۔ رات کے حادثے کی یاد گار گجرے کے سیر ہوئے پھول رہ گئے تھے جو دالان میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

اب اکثر ایسا ہوتا کہ نیاز سر شام نوشا کے گھر جاتا۔ رات گئے تک بیٹھا باتیں کیا کرتا اور علی الصباح اٹھ کر چپکے سے چلا جاتا۔

لیکن سلطانہ ابھی تک اس کی نظروں میں چڑھی ہوئی تھی۔ بلکہ ماں اور بیٹی جب ساتھ بیٹھی ہوتیں تو ماں اسے بھدی اور بدو وضع معلوم ہوتی۔

موقع مل جاتا تو نیاز سلطانہ سے ہنس کر بات بھی کر لیتا۔ مگر ماں اب اس کی کڑی نگرانی کرنے لگی تھی۔ کسی وقت بھی اکیلا چھوڑ کر نہ جاتی۔ ذرا ذرا سی بات پر اس سختی سے ڈانٹ دیتی کہ نیاز کی موجودگی میں سلطانہ کا بیٹھنا دو بھر ہو جاتا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ نیاز سلطانہ کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کسی رشتے دار کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ ماں اور بیٹی ذرا دیر پہلے لوٹی تھیں۔ سلطانہ ابھی تک اپنا ریشمی جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس میں اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے تھے۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ رعنائی بھٹک رہی تھی۔

نیاز کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بار بار اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ کو بھی اس وقت اپنی دل کشی کا پورا پورا احساس تھا۔ ماں کے بار بار کہنے کے باوجود اس نے لباس تبدیل نہیں کیا اور وہیں ماں کے کولھے سے لگی بیٹھی رہی۔

نیاز نے ایک بار نظر اٹھا کر دیکھا تو سلطانہ کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ ماں سر جھکا پان لگا رہی تھی۔ معاً اس کی نظر سلطانہ پر پڑ گئی۔

اس نے سلطانہ کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ قہر آلود نظروں سے

سر شام: شام ہوتے ہی۔ علی الصباح: صبح سویرے۔ بھدی، بدو وضع: مراد بد صورت۔ کڑی: سخت۔ دو بھر: مشکل، دشوار۔ رعنائی: خوبصورتی، حسن۔ معاً: اچانک۔ تیوری: ناخدا، پیشانی۔ قہر آلود: غصے سے بھری ہوئی۔

اسے گھورا۔ ڈپٹ کر بولی۔ ”جاندر جا کر بیٹھ۔ جب دیکھو سر پر سوار ہے۔“

سلطانہ اترانے لگی۔ ”ابھی نیند نہیں آرہی۔“

ماں نے غصے سے کہا۔ ”جانتی ہے کہ نہیں۔“ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے کے اندر لے گئی۔ اس نے سلطانہ کے رخسار میں زور سے چمکی بھر کر دبی زبان سے کہا۔ ”حرام زادی، میں تیرے سب کر توت جانتی ہوں۔“

سلطانہ منہ بسور کر رہ گئی۔

ماں کے انداز میں جذبہ رقابت صاف جھلک رہا تھا۔ یہ بات سلطانہ نے تو محسوس نہیں کی۔

البتہ نیاز کو اس کاشدیت سے احساس ہوا۔

دوسرے ہی دن سے نیاز محسوس کرنے لگا کہ سلطانہ اب اس کے سامنے آتے ہوئے کترانے لگی ہے۔ کمرے کے اندر سے کبھی کبھار صرف اس کے بولنے کی آواز آ جاتی۔ نیاز نے ایک آدھ بار باتوں باتوں میں سلطانہ کا ذکر چھیڑا تو اس کی ماں بے رخی سے ٹال گئی۔ نیاز کے ذہن میں اچھی خاصی الجھن پیدا ہو گئی۔ کئی روز اسی الجھن میں گزر گئے۔

\*\*\*

انہی دنوں کا ذکر ہے۔

نیاز خلاف توقع دن کے وقت نوشا کے گھر چلا گیا۔ دس ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ اس روز ماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ آؤ کے ساتھ اسپتال گئی تھی۔ نوشا اور کشاپ جاچکا تھا گھر میں صرف سلطانہ تھی۔

نیاز اس کے پاس پہنچا۔ وہ اسے اپنے رو برو دیکھ کر گھبرا گئی۔ نیاز نے سب سے پہلی بات جو اس سے پوچھی وہ یہ تھی۔

”تم دکھائی کیوں نہیں دیتیں۔ ہر وقت کمرے کے اندر کیوں بیٹھی رہتی ہو؟“

اس نے صاف صاف بتا دیا۔ ”لہماں نے آپ کے سامنے آنے سے منع کر دیا ہے۔“

نیاز کے ذہن کو زبردست دھچکا لگا گھبرا کر بولا۔ ”کیوں؟“

اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ”انہوں نے کہا ہے کہ دو لہا بھائی سے پردہ کیا کرو۔“

کر توت: بری حالتیں، برے کام۔ رقابت: مخالفت، دشمنی۔ کترانا: پچانا۔

نیاز نے دل ہی دل میں کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی سلطانہ نے اس کے سامنے آنا بند کر دیا اچانک اس نے سلطانہ کی ماں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ ذرا دیر خاموش کھڑا بیچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے محبت بھری نظروں سے سلطانہ کو دیکھا اور بڑے پیار سے بولا۔  
”سلطانہ۔“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”جی۔“

چند لمبے دونوں خاموش کھڑے رہے پھر سلطانہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”آپ جاییں۔  
اماں آتی ہوں گی۔ آپ کو یہاں دیکھ لیا تو مصیبت آجائے گی۔“  
نیاز نے سوچا واقعی ان حالات میں اس کا وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ وہ فوراً باہر آگیا۔ اسے وہ کر سلطانہ کی ماں پر غصہ آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی سلطانہ کو حاصل کر لینے کی تمنا شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔

(۲)

کالے صاحب نے نیاز کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”مسٹر نیاز! بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ کیا بات ہے؟“  
نیاز نے ٹالنا چاہا تو کالے صاحب اس کے سر ہو گیا۔ ”میں کہتا ہوں تم اپنی لائف انشور کرالو۔ کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔“  
نیاز اس وقت جھنجھلایا ہوا تھا۔ جل کر بولا۔ ”کالے صاحب! تمہیں ہر وقت بیمہ ہی کرانے کی پڑی رہتی ہے۔ نہ وقت دیکھتے ہو نہ موقع۔ ہر وقت سالانہ بیمہ تمہارے ساتھ لگا رہتا ہے۔“  
کالے صاحب ہنسنے لگا۔ ناراض ہونا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ورنہ اس قدر کامیاب انشورنس ایجنٹ نہ ہوتا۔

”ارے تم تو ناراض ہو گئے۔ آؤ تم کو چائے پلاؤں۔“ کالے صاحب نرمی سے بولا۔ مگر نیاز اس کے ہمراہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔

بیچ و تاب کھانا: جسے میں نے آنا۔ تشویش: فکر۔ سر ہونا: پیچھے ہٹنا۔

کالے صاحب اصرار کرنے لگا۔ ”بیمہ نہ کراؤ۔ مگر میری چائے تو پی لو۔ آؤ میرے ساتھ۔“  
وہ نیاز کو گھیر گھاڑ کر قریب کے اس چائے خانے میں لے گیا۔ چائے کا آرڈر دیا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ مگر بیمے کا ذکر کئے بغیر کالے صاحب زیادہ دیر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ گھوم پھر کر اسی موضوع پر آگیا۔

”زندگی میں گارنٹی بہت بڑی چیز ہے اور وہ صرف انشورنس سے ملتی ہے۔ تم تجربے کے لیے دس ہزار کی پالیسی لے کر دیکھو۔ پھر خود ہی اس کی امپارٹنس سمجھ لو گے۔“  
نیاز نے سنجیدگی کے ساتھ بیمہ کرانے کے بارے میں نہ کبھی سوچا تھا اور نہ اب اس کا ارادہ تھا اس نے صرف کالے صاحب کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ ”دیکھو کالے صاحب، بیمہ ویمہ تو میں کرواؤں گا نہیں۔ البتہ کوئی ایسی ترکیب تم کو معلوم ہو تو بتاؤ جس سے سال سوا سال میں چالیس پچاس ہزار کی رقم مل جائے۔“

کالے صاحب کہاں میدان چھوڑنے والا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”اس کا بھی ایک ہی طریقہ ہے۔ انشورنس اور صرف انشورنس۔ اپنے کسی بچے یا وائف کا بیمہ کراؤ۔ اگر سال بھر کے اندر اس کی موت واقع ہو گئی تو پچاس ہزار کیا ایک لاکھ کی بھی پالیسی لو گے تو تم کو کمپنی اتنا ہی روپیہ دے گی۔“

نیاز سوچ میں پڑ گیا کالے صاحب سمجھا کہ وہ اس کی باتوں پر ناراض ہو گیا۔ لہذا معذرت کرنے کے انداز میں بولا۔ ”دیکھو بھی اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ انشورنس ایجنٹ موت اور زندگی کی بات ہمیشہ ڈاکٹروں کی طرح صاف صاف کرتا ہے۔“

”یہ بات نہیں۔ دراصل میں اس وقت ایک پریشانی میں ہوں۔ بات یہ ہے؟“ نیاز آگے اور کچھ کہتا مگر کالے صاحب نے بات بھی پوری نہ کہنے دی۔ لگا اپنی ہانکنے۔ ”میں تمہاری پریشانی خوب جانتا ہوں۔“

نیاز نے اسے جیکھی نظروں سے دیکھا اور چائے کا گھونٹ پی کر سوچنے لگا۔ یہ کالے صاحب بھی عجیب مسخرا ہے۔ میری پریشانی یہ کیا جانے۔ مگر کالے صاحب قطعی کاروباری موڈ میں تھا۔ اس نے دیکھا شکار پھنس رہا ہے۔ اب اسے نکلنے نہ دو۔ یہیں گردن دبوچ لو کہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکے۔ وہ

گھبر گھبر کر: بھلا پھلا کر۔ اپنی ہانکنا: کسی دوسرے کی بات پر توجہ دینے کی بجائے اپنی کہے جانا۔

خٹھ دے دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔

نیزانے سوچا کہ اگر عیسے کے ذریعے سال دو سال میں چالیس پچاس ہزار کی رقم ہاتھ لگ جائے تو مزہ آجائے۔ بات کچھ سمجھ میں آتی بھی تھی۔ لیکن اس کے لیے پہلے ایک عدد بیوی کی ضرورت تھی۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک اسکیم تیار کی اور نوشا کے گھر پہنچ گیا۔

\*\*\*

سلطانہ کمرے کے اندر بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کی آواز ابھرتی تو نیاز کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔

نوشا کی ماں کی ہر بات اسے زہر میں سمجھی ہوئی معلوم ہوتی۔ وہ اس وقت نیاز کے سامنے بیٹھی ہنس ہنس کر پڑوس کی ایک عورت کا قصہ سنارہی تھی جس کی شلوار میں چوہیا گھس گئی تھی۔

جب پہر رات گزری اور گھر پر سناٹا چھا گیا تو نیاز نے خلوت میں بڑے پیار سے کہا۔ ”اس طرح کب تک یہ چوری چھپے کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ میرا تو اب تمہارے بغیر ایک گھڑی جی نہیں لگتا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”دن میں گھڑی دو گھڑی کو چلے آیا کرو۔“

”میں تو کہتا ہوں کہ کیوں نہ ایک روز قاضی کو بلوا کر دو بول پڑھوالیے جائیں۔ اللہ رسول بھی خوش اور دنیا کا خوف بھی نہیں۔“

سلطانہ کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی مگر اس کے پروگرام کے مطابق ابھی اس نیک کام کا وقت نہیں آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اسے نیاز کی نیت پر شبہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے سلطانہ کو بیاہ کر گھر سے رخصت کر دے۔

اس نے نیاز کی بات خوش اسلوبی سے ٹال دی۔

جوش میں آکر بولنے لگا۔ ”دیکھو مسٹر نیاز! آگے کا حال کوئی نہیں جانتا۔ زندگی کیا ہے؟“ یہ بات خود کالے صاحب کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے وہ الجھا کہ اب کیا کہے۔ پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی چینی کی پلیٹ اٹھائی اور اسے نیاز کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

”زندگی کی مثال اس پلیٹ کی طرح ہے۔ اس پلیٹ کو اٹھاتے ہوئے تم ڈرو گے کہ کہیں ٹوڑ نہ جائے۔ لیکن اگر اس کا انشورنس ہو چکا ہے تو ڈر کی کوئی بات نہیں۔ اس کی قیمت تو تمہاری جیب میں ہے۔ تم اس کو یوں اٹھا کر پھینک سکتے ہو۔“

اور کالے صاحب نے واقعی پلیٹ اٹھا کر اچھال دی۔ وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ پلیٹ کے ٹوٹنے کا چھٹکا ہوا تو کالے صاحب بھی چونکا کہ یہ اس نے کیا کر دیا۔ چائے خانے میں ذرا دیر کے لیے سنسنی پھیل گئی۔

ایک بیرالپک کر اس کے پاس آیا۔ حیرت زدہ ہو کر گویا ہوا۔ ”صاحب۔ آپ نے پلیٹ کیوں توڑ ڈالی؟“

کالے صاحب بہت پکرا لیا۔ پھر کھیانا ہو کر ہٹنے لگا نیاز کو بھی ہنسی آگئی۔

بیرا بولا۔ ”ساب ہنسی کی بات نہیں۔ دو روپیہ ڈنڈ بھرنا پڑے گا۔“

ہوا بھی یہی۔ چائے کے بل کے ساتھ کالے صاحب کو پلیٹ کے بھی دو روپے دینا پڑے۔ اس دو روپے کی چپت سے کالے صاحب کی ساری تیزی رُفُو چکر ہو گئی۔ بھیگی بلی کی طرح مری ہوئی آواز سے اس نے نیاز کو مخاطب کیا۔

”مسٹر نیاز اب تم سے کہاں ملاقات ہو گی؟“

آج سے پہلے اگر کالے صاحب یہ بات نیاز سے پوچھتا تو وہ جل کر کہتا۔ ”جہنم میں۔“ مگر اب وہ واقعی بیمہ کرانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

”پرسوں سے پھر کو آجاؤ۔ اس وقت کام بھی نہیں ہوتا۔ اطمینان سے بات ہو گی۔“

دوبارہ ملنے کا پروگرام طے کر کے دونوں اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔

دکان پر پہنچ کر کالے صاحب کی باتوں پر نیاز دیر تک غور کرتا رہا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صرف روپیہ پیدا کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے بوجھ سے دبے ہوئے ایک روز خٹھ دے

زہر میں بھی ہوئی۔ انتہائی تلخ خلوت۔ تنہائی۔ نیک کام۔ مرنوشتی۔ خوش اسلوبی سے اچھے طریقے سے، عمدہ طریقے سے۔

سنسنی / حیرانی / حیرانہ لڑکھانہ / چپت / مرنوشتی / خٹھ دے / خٹھ دے / چپکے سے۔

(۳)

سہ پہر کا وقت تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ سلمان کہیں سے تھکا ہارا آرہا تھا۔ راستے میں اس کی آٹو سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔

گھر نزدیک تھا۔ وہ اصرار کر کے سلمان کو گھر لے آیا۔ ماں نے اندر بلالیا۔ سلمان ان دنوں پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ مگر اس دفعہ وہ گھر نہیں گیا تھا۔ باپ اس سے ناراض تھا۔ ہر ماہ کے اخراجات کے لیے جو رقم گھر سے آتی تھی وہ بھی بند کر دی گئی تھی وہ پیسے پیسے کو محتاج تھا۔ اکثر فاقے بھی کرنا پڑتے۔ صحت خراب ہو گئی تھی۔ چہرہ بیماروں کی طرح زرد نظر آرہا تھا۔

نوشا کی ماں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو تعجب سے پوچھا۔ ”کیا تم بیمار پڑ گئے تھے؟“ وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ ”جی ہاں ملیں یا ہو گیا تھا۔“

”جب ہی تو میں کہوں کہ تم اس روز کے بعد سے آئے کیوں نہیں۔“

سلمان کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے جانے لگا تو نوشا کی ماں نے روک لیا کہ کھانا کھا کر جانا۔ وہ تھی بھی کچھ باتونی عورت اور اس روز تو اس پر باتوں کا دورہ پڑا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں قصے سناتی رہی۔ اس عرصے میں کئی بار دروازے پر سلطانہ کی جھلک نظر آئی۔ سلمان جو ماں کی باہر سر دیا تو اس سے آگیا تھا، سلطانہ میں دلچسپی لینے لگا۔ اب وہ ماں کی نظریں بچا کر اس کی جانب دیکھ لیتا۔

سلمان نے سوچا لڑکی خوبصورت ہے۔ لہتو ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی زبان میں دلچسپی بھی لے رہی ہے۔ یہ احساس خود اپنی جگہ کم کشش انگیز نہیں تھا۔ ان دنوں وہ سنی پریشان تھا۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی۔ ذہنی فرار کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے میں گرا اور جس کے باوجود دیر تک بیٹھا نوشا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔

دن ڈھلنے لگا شام کی آمد آمد تھی۔ نوشا کی ماں کسی ضرورت سے باہر چلی گئی۔ کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔ اور اس تنہا کمرے میں سلطانہ کے جوان جسم کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس مہک

باتونی بہت باتیں کرنے والی۔ بے سرو پا: فضول۔

ایک لذت اور دار فکری تھی جسے وہ چپ چاپ بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔

شام کا دھندلکا فتنی کی میز میزوں سے اترتا ہوا درود یوار پر پھیل گیا۔ گلی کی چہل پہل بڑھ گئی۔ گھروں میں بچوں کا شور ابھرنے لگا۔ موسم گرما کی یہ ایک ایسی شام تھی جس کی گہما گہمی وہ صرف آوازوں سے محسوس کر رہا تھا۔ ان آوازوں میں سلطانہ کی بھی آواز شامل تھی۔ وہ خواہ مخواہ اٹھلا اٹھلا کر اس طرح بول رہی تھی جیسے اسے بخوبی احساس تھا کہ کوئی اس کی آواز سن رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آگیا۔ کھانے میں خاصا تکلف کیا گیا تھا۔ وہ صبح کا بھوکا تھا۔ کھانا اسے پسند آیا اور اس نے تعریف بھی کی۔ نوشا کی ماں اصرار کر کے ایک ایک چیز کھلاتی رہی۔ اس کی یہ شام بڑی مزے دار گزری۔

دوروز کا غوطہ دے کر چوتھے روز سلمان پھر وہاں پہنچا۔ نوشا کی ماں اس روز بھی بڑی محبت سے پیش آئی۔ باتوں باتوں میں نوشا کے باپ کا ذکر آگیا۔ وہ ایک لمبی چوڑی داستان سنانے لگی۔ نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا اسی اثناء میں کسی نے آکر اطلاع دی کہ پڑوس میں جو منشی جی رہتے تھے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے گھر سے نوشا کی ماں کے دیرینہ مراسم تھے۔ کچھ تو وہ زور درخ تھی کچھ دکھوں کی ماری ہوئی بھی تھی۔ اس خبر کے سنتے ہی ایسی حواس باختہ ہوئی کہ سلمان سے بھی کچھ نہ کہا۔ اٹھی اور فوراً منشی جی مرحوم کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

کمرے میں اب سلمان کے پاس نوشارہ گیا تھا۔ کمرے کے باہر سلطانہ تھی جو کھانا پکانے میں مشغول تھی۔

وہ نوشا سے باتیں کرنے لگا۔ اب زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے جانے کا قصد کیا تو سلطانہ نے خود دروازے پر آکر کہا۔

”کھانا کھا کر جائیے گا۔ اماں تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔“

وہ دروازے کی آڑ میں کچھ اس طرح کھڑی تھی کہ ’صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں‘ والی کیفیت تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ کی نگاہیں جھک گئیں اور سلمان نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

دار فکری: بے خودی۔ اٹھلا اٹھلا کر: غزے کے ساتھ، ادا کے ساتھ۔ دیرینہ: پرانے۔ مراسم: تعلقات۔ زور درخ: جلد ناراض ہو جانے والی۔ قصد: ارادہ۔





شام کی خاموشی میں دروازے پر دستک ہوئی۔ نیاز آیا تھا۔ پہلے تو سلطانہ گھبرا گئی کہ کمرے۔ پھر اس نے مناسب یہی سمجھا کہ نیاز کو اندر نہ بلائے۔

اس نے نوشا کو قریب بلا کر کہا۔ ”دو لٹا بھائی سے کہہ دو۔ اماں گھر میں نہیں۔ آپ رات آئیے گا۔ اس وقت تک وہ واپس آجائیں گی۔“

نیاز نے نوشا کی زبانی یہ بات سنی تو تھلا کر رہ گیا۔ سلطانہ پر تو اسے ذرا شبہ نہ ہوا۔ البتہ اس کی ماں پر سخت غصہ آیا۔ سوچا گھر سے جاتے ہوئے وہ سلطانہ کو منع کر گئی ہوگی۔ وہ جھنجھلایا ہوا داخل چلا گیا۔

نوشادیر سے باہر نکلنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ دیکھا موقع غنیمت ہے وہ بھی وہاں سے کھسک گیا۔ کمرے میں سلمان تنہا رہ گیا۔ اس تنہائی نے اسے شدید بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ اب گھر میں وہ تنہا۔ سلطانہ تھی۔ ان کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ دیوار میں دروازہ تھا جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ شام کی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کمرے کے اندر آرہے تھے۔ لیپ کی لو بار بار بھڑک اٹھتی۔ ایک بار سلطانہ دروازے کے سامنے سے گزری۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ لیپ کی بھڑکتی ہوئی لوجیسے بار بار کہہ رہی تھی۔

”کچھ ہونے والا ہے۔“

”کچھ ہو کے رہے گا۔“

اچانک گھری خاموشی میں شیشہ ٹوٹنے کا چھنکا ہوا۔ سلمان چونک پڑا۔ کمرے کے باہر شیشے کا کوئی برتن گر کر کچی کرجی ہو گیا تھا۔ چھنکا کچھ اس طرح گونجا کہ سلمان نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا ہو گیا؟“

باہر سے سلطانہ کی آواز ابھری۔ ”کچھ نہیں۔ چوہوں نے طاق سے گلاس گرا دیا تھا۔“

”چوٹ تو نہیں آئی؟“ سلمان نے اظہار ہمدردی کیا۔

وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ ہنسی کی آواز سن کر سلمان کو اپنے سوال کے بے تکیہ پن کا احساس

ہوا۔

تھلانا: بے چین ہوا۔ کرجی کرجی: کھوے کھوے۔

کچھ اور وقت خاموشی میں گزر گیا۔

سلمان نے خاموشی سے اکٹا کر اونچی آواز سے کہا۔ ”یہ نوشا کہاں چلا گیا؟“ سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سلمان کو سخت کوفت ہوئی۔

ذرا دیر بعد کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ سلطانہ نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پوچھا۔ ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا؟“

”جی ہاں۔ دیواروں سے تو باتیں کرنے سے رہا۔“

”ارے!“ وہ بے نیازی سے ہنسنے لگی۔

”اب میں چلوں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ شوخی سے بولی۔ ”اکیلے کمرے میں آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا؟“

کالج کا شوخ اور کھلنڈرانو جوان شرارت پر اتر آیا۔ ”بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔“

اس دفعہ سلطانہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”ایسا کیجئے آپ یہاں کمرے میں آکر بیٹھ جائیے اور میں کھانا تیار کروں گا۔“ سلمان نے اسے چھیڑا۔

”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ایسا فرسٹ کلاس کھانا تیار کروں گا کہ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔“

”کہاں سیکھا آپ نے؟“

”باقاعدہ امتحان پاس کیا ہے۔“

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ ”اچھا تو کھانا پکانے کا بھی امتحان ہوتا ہے۔“

”بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔“

دونوں باتیں کرتے کرتے بالکل آنے سامنے آگئے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر سلطانہ شرمائی اور دروازے کی اوٹ میں چھپنے لگی۔ سلمان نے فوراً کہا۔

”اب کیا کیجئے گا پردہ درودہ کر کے۔“

سلطانہ نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ پھر بڑی معصومیت سے کہا۔ ”اماں ناراض ہوں گی۔“

رہی ہے یا بند ہے۔ جب وہ اسے اچھی طرح دیکھ بھال چکا تو مسکرا کر بولا۔

”آپ ہی کی ہے نا؟“

سلمان کو اس بے تکے سوال پر حیرت بھی ہوئی۔ کچھ تاؤ بھی آیا۔ جی چاہا کہ جواب دے۔ ”جی نہیں چوری کی ہے۔“ مگر وہ جھگڑنے نہیں آیا تھا۔ گھڑی فروخت کرنے آیا تھا۔ اس نے صرف اس

قدر کہا۔

”جی میری ہی ہے۔“

”اگر آپ کی نہیں بھی ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔“ نیاز کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

سلمان تھکے لہجے میں بولا۔ ”جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”ناراض نہ ہوں میں نے مان لیا کہ آپ ہی کی ہے۔“ نیاز بدستور مسکراتا رہا۔

”آپ اسے خریدنا چاہتے ہیں؟“

نیاز بے نیازی سے بولا۔ ”خرید لوں گا۔ ویسے عام طور پر ایسی چیزیں خریدتا نہیں۔ یہ مشینری کا معاملہ ہے۔ اس میں بڑی چار سویشی ہوتی ہے۔“

سلمان سوچنے لگا عجیب نامعقول سے سابقہ پڑا ہے۔ الو کا پٹھان خواہ مخواہ ایک کئے بعد دوسرا الزام عائد کرتا جا رہا ہے۔ لیکن کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں۔“

نیاز نے سلمان کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ زیر لب مسکرایا۔ ”صورت سے تو آپ بھلے مانس لگتے ہیں۔“ لمحہ بھر وہ خاموش رہا۔ اس کی یہ خاموشی سلمان کو بے حد شاق گزری۔ جی چاہا کہ گھڑی واپس لے لے۔ دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر دکان سے باہر چلا جائے۔ مگر وہ دکان سے باہر نہیں گیا۔ گو گو کے عالم میں کھڑا رہا۔

نیاز نے کہا۔ ”اچھا اب یہ بتائے کہ آپ لیں گے کیا؟“

”یہ اومیگا وایچ ہے۔ میں نے اسے ۳۲۵ روپے میں خریدا تھا۔“

”چار پانچ سال سے استعمال بھی کر رہے ہوں گے۔ اس سے کم تو پرانی نہیں لگتی۔“

زہر خند وہ مٹی جو غصے، ناگواری یا شرمندگی کی وجہ سے ہو۔ الو کا پٹھا: ایک گالی، نہایت بیوقوف۔ عائد کرنا: لگانا۔ شاق: ناگوار۔ گو گو: ٹھک و ٹھک۔

سلمان مسکرانے لگا۔ ”ان کے سامنے پردہ کر لیا کیجئے۔ ٹھیک ہے نا۔“

وہ کمرے سے باہر نکل کر اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطانہ نے اسے اپنے روبرو اور طرح پٹا تو گھبرا کر بولی۔

”ہائے اللہ۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔ سلمان کو اس کی یہ ادا بھاگئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سلطانہ کے شانے پر اپنا ہاتھ اس طرح رکھ دیا جیسے وہ دیکتی ہوئی انگلیٹھی ہو جس سے اس کا ہاتھ حمل جائے گا۔

سلطانہ کا تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ سلمان نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

ذرا دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔ سلمان کسی نامعلوم خوف سے گھبرا گیا۔ دہلی زبان بولا۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔“ اس کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی۔ اس نے سلطانہ کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کے باہر چلا گیا۔

سلطانہ سوچتی ہی رہ گئی کہ کیا کہے۔

(۴)

شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سلمان نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ نہ اس کا جیب میں کوئی پیسہ تھا اور نہ کہیں سے کچھ ملنے کی امید تھی۔ اس کے پاس ایک گھڑی رہ گئی تھی جسے کئی روز سے فروخت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ راستے میں نیاز کی دکان پڑتی تھی۔ وہ جھجکتا ہوا دکان کا اندر داخل ہو گیا۔

دکان میں لائٹیں روشن تھیں۔ اس کی پیلی پیلی روشنی میں نیاز خاموش بیٹھا تھا۔ اسے دیکھا بولا۔ ”کہئے؟“

سلمان گھبرا یا ہوا تھا۔ دہلی زبان سے گویا ہوا۔ ”میں یہ گھڑی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“

نے اس کے ہاتھ سے گھڑی لی۔ الٹ پلٹ کر دیکھی۔ کان کے پاس لے جا کر اندازہ لگایا کہ آیا

بھاگنی: پسند آئی۔

تھیں۔

تمام دن وہ کمرے میں پڑا بے خبر سو تا رہا جس کی ہر چیز اس کی زندگی کی طرح بے ترتیب تھی۔ دن ڈھلے وہ نوشا کے گھر کی جانب جانے کے ارادے سے نکلا۔ راستے میں اکبر مل گیا۔ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ دونوں نے بار میں جا کر کئی گلاس بیئر کے پئے اور وہیں یہ پروگرام بنا کہ کسی عشوہ ساز اور طرح دار طوائف کا گانا سنا جائے۔

دونوں نے کئی بالا خانوں کے چکر کاٹے۔ آخر ایک گانے والی ان کو پسند آئی۔ گانا تو وہ کچھ وا جی سا جانتی تھی۔ مگر آواز ایسی رسیلی تھی جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ سن بھی زیادہ نہیں تھا۔ اداؤں میں شوخی اور لگاؤ تھی۔ ایک ایک بول کے ساتھ یوں بھاؤ بتاتی کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچ جاتی۔ سلمان کو وہ سادہ سادہ طوائف کچھ اس طرح بھاگئی کہ کئی گھنٹے تک بیٹھا گانا سنتا رہا۔ شروع میں کچھ دوسرے تماش بین بھی موجود تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب چلے گئے۔

پہرہات گزر چکی تھی۔ محفل اپنے شباب پر تھی۔ سلمان کی فرمائش پر طوائف ایک ٹھمری گارہی تھی۔

تم بن ناہیں آوت چین

اب اس نے پیروں میں گھونکھر دبانہ لے لے تھے اور آہستہ آہستہ ناچتی بھی جا رہی تھی۔ ٹھمری کے بول اونچے اٹھتے گئے۔ ناچ تیز ہوتا گیا۔ طیلی جھوم جھوم کر ٹھیکادے رہا تھا۔ طوائف کے جسم میں یوں پچ و خم پیدا ہو رہے تھے کہ سلمان بے قرار ہو جاتا۔ بار بار پہلو بدلتا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لہراتی ہوئی قریب آتی تو وہ تڑپ کر گہری سانس بھرتا۔ جھک کر اکبر کے کان میں کہتا۔

”یار ہم تو قتل ہو گئے۔“

”بڑی زوردار لو ٹڈیا ہے۔“

ناچ اور ٹھمری کے پھڑک دار بولوں نے سلمان کو وارفتہ کر دیا تھا۔ وہ بے قابو ہو کر چیخ پڑتا۔

”ہائے کیا بات ہے میری جان۔“

”ہے جیو جگ جگ جیو۔“

بے تکلف: سر اور اڑاؤں۔ عشوہ ساز: تازہ آواز کرنے والی۔ وا جی سا: تھوڑا سا۔ سن: عمر۔ بھاؤ بتانا: ناچ گانے میں ہاتھوں، آنکھوں اور دوسرے اعضاء سے حرکت کے معنوں کا نقشہ کھینچنا۔ ٹھمری: حرکت کی ایک قسم۔ طیلی: طبلہ بجانے والا۔ زور دار: سر اور بصورت۔ وارفتہ: بے خود۔

”جی ہاں کوئی چار سال تو اسے خریدے ہوئے ہو گئے۔“ سلمان نے صاف گوئی سے کام لیا۔ وہ ہنس کر بولا۔ ”یوں سمجھئے کہ اس کی قیمت تو آپ نے وصول ہی کر لی۔“

سلمان نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں صاحب۔“

نیاز نے بات کو زیادہ طول نہیں دیا۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ ”میں تو اس پچاس روپے سے زیادہ نہیں دوں گا۔ جی چاہے تو گھڑی رکھ جائیے اور روپے لیتے جائیے۔“

سلمان ۵۰ روپے میں گھڑی فروخت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

بڑی مشکل سے نیاز نے ۱۵ روپے اور بڑھائے۔ سلمان کو گھڑی بیچتے ہوئے دکھ تو بہت ہوا۔ اس کے بغیر چارہ کار بھی نہ تھا۔ اس نے نیاز سے ۶۵ روپے لے کر جیب میں ڈالے اور دکان سے جانے کے لیے مڑا۔ نیاز نے ٹوکا۔

”سنئے، آئندہ بھی کچھ بیچنے کو چھوٹے کارادہ ہو تو یہیں آ جایا کیجئے۔ انشاء اللہ دوسری جگہ مقابلے میں آپ یہاں سے خوش جائیں گے۔“

سلمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”بہت بہتر۔“

وہ دکان سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔

\*\*\*

رات سہانی تھی اور سلمان کی جیب گرم تھی۔ عرصے سے دہلی ہوئی خواہشیں اچانک جاگ اٹھیں۔ وہ سیدھا ایک بار میں گیا اور بیئر کی دو بوتلیں چڑھائیں۔ ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا کھایا اور اکابر دوست کے گھر چلا گیا۔ حسب معمول وہاں رمی ہو رہی تھی۔ سلمان بھی جا کر شامل ہو گیا۔

سینئر کی رات تھی۔ دوسرے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ لہذا تمام رات کھیل ہوتا رہا۔ روز سلمان کا ستارہ عروج پر تھا جیسے تاش کے پتے اس نے چاہے ویسے ہی ملے۔ دو آنے پوائنٹ کھیل ہو رہا تھا۔ سلمان کے وارے نیارے ہو گئے۔

جب وہ رمی کھیل کر اٹھا تو مسجدوں میں اذانیں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف سرمئی دھند ہوئی تھی۔ سلمان کی جیب میں کچھ اوپر تین سو روپے تھے اور آنکھیں شب بیداری سے سرخ ہو رہی تھیں۔

صاف گوئی: سچائی۔ چارہ کار: عمل، تدبیر۔ بار: شراب خانہ۔ ڈٹ کر: خوب پیٹ بھر کر۔ وارے نیارے ہونا: خوشحال ہونا۔

”ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔“

عین ہنگام طرب ایک بھد اور بے ڈول شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کی گھنی مونچھیں تھیں۔ آنکھیں الو کی طرح گول گول تھیں۔ لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وضع قطع سے بھڑوا لگتا تھا۔ اندر آکر اس نے دونوں کو غور سے دیکھا اور گاؤں سے لگ کر بیٹھ گیا۔ سلمان بھی اسے بھڑوا ہی سمجھا بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔

”اماں کچھ پینے پلانے کا بھی انتظام ہوگا؟“

اس نے سلمان کی جانب تنکھی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کو طوائف سے کہا۔ ”بند کرو گی۔“

ناچ و اوج، بہت ہو چکا مجرا۔“

طوائف نے فوراً ناچ بند کر دیا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف کھسک کر بیٹھ گئی۔

ساز بھی خاموش ہو گئے۔ سارنگیا، سارنگی پر غلاف چڑھانے لگا۔ طبلچی ہتھوڑی لے کر طبل کو ٹھونکنے پٹنے لگا۔ سلمان کو سخت طیش آیا۔ وہ سو روپے سے زائد خرچ کر چکا تھا اور جب نگر شباب پر آئی تو اس نامعقول آدمی نے جو ہر طرف سے بھڑوا لگتا تھا، رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔

سلمان نے تنکھے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ یہاں کے چودھری ہیں؟“

اس شخص نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ چٹکی بجا کر ایش ٹرے میں سگریٹ کی رکھ جھاڑو گردن اونچی کی اور بڑے طنطنے سے کہا۔ ”جی نہیں! ہزار روپے مہینہ دیتا ہوں۔ یہ ملازم ہے میرا کیا سمجھے؟“

سلمان سرخوشی کے عالم میں تھا۔ جھوم کر بولا۔ ”بہت سستا سودا کر لیا۔ یہاں تو صرا رات بھر کے ہزار روپے دینے کا ارادہ تھا۔“

”آپ لوگوں کا ایفون کا ٹھیکہ تو نہیں ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی۔ مگر سلا سمجھا کہ چوٹ کر رہا ہے۔ تڑے بولا۔ ”آپ بتا سکتے ہیں آج کل کوئلے کا بھاؤ کیا ہے؟“ وہ زبرد مسکرایا۔ ”کوئلے کی دلالی ہی کرتے ہیں نا؟“

وہ شخص کالا بھینگ تھا۔ سخت تملایا۔ ”دیکھئے صاحب! میں اس قسم کی بد تمیزی برداشت نہ

کر سکتا۔“

سلمان نے کہا۔ ”رٹڈی کے کوٹھے پر تمیز تو لکھنؤ کے نواب زادے سیکھا کرتے ہیں۔ ہم ٹھہرے روہیل کھنڈی۔“

وہ جل کر بولا۔ ”آپ روہیل کھنڈی ہوں یا بندھیل کھنڈی۔ بس اب شرافت کے ساتھ یہاں سے تشریف لے جائیں۔“

اکبر جواب تک خاموش بیٹھا تھا بیچ میں بول پڑا۔ ”ورنہ؟“

اس نے اکبر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اونچی آواز سے پکارنے لگا۔ ”ابے میرو۔ کہاں مر گیا۔ یہاں تو آ۔“

فوراً ایک لحیم شمیم آدمی کمرے کے اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”کیا حکم ہے سیٹھ؟ ذرا سٹے پر دم لگا رہا تھا۔“

”کمرے خالی کر کے دروازہ بند کر دو۔ یہ دونوں پھڑا کر نا چاہتے ہیں۔ انھیں یہاں سے چلتا کرو۔“

میرو نے دونوں کو بغور دیکھا۔ ”چلو جی بڑھاؤ نٹو۔ اب گانا دانا نہیں ہوگا۔“

سلمان کو اس کی بد تمیزی پر غصہ آ گیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”ٹھیک سے بات کرو۔“

”سیدھی طرح جاؤ گے یا کچھ لے کر۔“

اس نے جھپٹ کر سلمان کا بازو پکڑا اور ایک جھینکے کے ساتھ اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ سلمان نے گھبرا کر طوائف کی جانب دیکھا۔ وہ نظریں جھکا کر خاموش بیٹھی تھی۔ سلمان سنہلنے بھی نہ پایا تھا کہ میرو نے اپنے مضبوط ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور زینے کے دروازے کی جانب لے چلا۔ سلمان نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر اس کی گرفت سے نہ چھوٹ سکا۔ میرو نے دروازے پر پہنچ کر اس زور سے چوتروں پر لات ماری کہ سلمان سیزھیوں سے لڑھکتا ہوا سڑک پر آ گیا۔

وہ سڑک پر دم بخود پڑا رہا۔ سب کچھ اس قدر آنا فانا ہوا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ معاً اسے اکبر کا خیال آیا۔ اسی وقت اکبر آکر اس کے اوپر دھم سے گرا۔ دونوں بوکھلا کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔

لحیم شمیم: مونہ تارو، سلفہ پر دم لگتا: مراد چس چتا، نشہ کرتا۔ چھڑا: لڑائی، ہنگام۔

ہنگام طرب: خوشی کے وقت۔ بھڑوا: دلال، رٹڈی کا سودا کرانے والا۔ طیش: غصہ۔ شباب: مراد عروج۔ رنگ میں بھنگ ڈالنا: حرا کرنا۔ طنطنہ: غرور، تکبر۔ سرخوشی: مسرت، شراب کا نشہ۔ چوٹ: خطر۔ کالا بھینگ: بہت زیادہ کالا۔

عام آدمی نظر آنے لگا تھا۔ سلمان اسی عالم میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اطمینان سے بولا۔ ”گھر سے ابھی میرا منی آرڈر نہیں آیا۔ کل پرسوں تک آجائے گا۔ تمہارا سارا اکیونٹ کردوں گا۔“

یہ بات وہ دہ دہتے پہلے بھی کہہ چکا تھا اور پرسوں رات چائے پیتے ہوئے بھی یہی عذر تراش کر اسے صاف غیادے گیا تھا۔ لہذا بات کچھ بنی نہیں۔ روشن خان معا بھڑک اٹھا آنکھیں نکال کر بولا۔

”مشٹر، اس طرح کام نہیں چلے گا۔ پورا حساب چکنا کرنا ہو گا۔ آج اور ابھی۔“

سلمان نے پھر مسکے لگایا۔ ”خاں صاحب تم ضرور کسی سے لڑ کر آئے ہو۔“ اس نے خواہ مخواہ مسکرتی کی کوشش کی۔ ”کچھ ایسی ہی بات ہے۔ لگتا ہے بیگم سے لڑ کر آرہے ہو۔“

روشن خان نے بیرگیری کرتے کرتے خود اپنا چائے خانہ کھول لیا تھا جس میں چائے کے علاوہ کھانا بھی ملتا تھا۔ اس کی چھت پھوس کی تھی اور دیواریں کچی تھیں۔ مگر اس کا نام اس نے ”دل ربا ہوٹل“ رکھا تھا۔ روشن خان کو اپنی مہینچر بیوی کے لیے بیگم جیسا معزز لفظ کچھ عجیب سا لگا۔ بہر حال اسے خوشی ضرور ہوئی۔ اس دفعہ وہ مسکرا کر بولا۔

”وہ تو میکے گئی ہے جی۔ لڑوں گا کس سے!“

سلمان کو موقع مل گیا۔ ہنس کر بولا۔ ”یاد ستار ہی ہوگی۔“

روشن خان اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنس پڑا۔ سلمان کی جان میں جان آئی۔ اس نے اصرار کر کے روشن خان کو کمرے میں بلا کر بٹھایا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

اس طرح اسے کچھ روز کی اور مہلت مل گئی۔ مگر آج کی باتوں سے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر جلد ہی روشن خان کو کچھ نہ دیا گیا تو وہ کسی روز ہنگامہ برپا کر دے گا۔ روشن خان کمرے سے باہر گیا تو اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سگریٹ کی طلب محسوس کی۔ مگر سگریٹ موجود نہیں تھی۔ البتہ کمرے کے ایک گوشے میں سگریٹوں کے کئی خالی ڈبے اور مختلف برانڈ کے پیکٹ پڑے تھے۔ فرش پر جا بجا سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ادھ جلی سگریٹ فرش سے اٹھا کر سلگائی۔ کش لگاتے ہی خالی معدہ سلگنے لگا۔ جھنجھلا کر اس نے سگریٹ پھینک دی۔ غصے سے اسے مسل ڈالا۔

”وہ بت کی مانند سارکت بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر میز

عذر تراشا: بہانہ بنانا۔ مچا کر دینا: دھوکا دینا۔ مسکے لگانا: خوشامد کرنا۔ جان میں جان آنا: اطمینان ہو جانا، ہمت بندھنا۔ جھنجھلا کر: غصے میں آکر۔

ذرا دیر بعد انہوں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہڈی پیلی نہیں ٹوڑی۔ صرف جسم پر کہیں کہیں خراشیں آئی تھیں۔ اکبر کی گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی تھی۔

سلمان نے گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ ”سالے کے ہاتھ لوہے کے بنے ہوئے تھے۔“

اکبر کھسیانا ہو کر بولا۔ ”یار بڑی بے عزتی ہوئی۔“

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جھک کر دائیں ہاتھ کی کہنی دیکھنے لگا جس سے ہلکی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ کچھ دیر ٹھہر کر دونوں چپ چاپ آگے بڑھ گئے۔

\*\*\*

سلمان اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

دن ڈھل چکا تھا۔ دھوپ چڑھ کر مکانات کی اونچی منڈیروں پر پہنچ چکی تھی۔ سائے جھکے تھے اور ان جھکے ہوئے سایوں میں دروازے کے پاس ”دل ربا ہوٹل“ کا مالک روشن خان کھڑا تھا۔ سلمان اسے دیکھتے ہی گھبرا گیا۔

روشن خان نے بلا کسی تمہید کے کہا۔ ”مشٹر، آج ہمارا حساب بے باقی ہو جانا چاہیے۔“

اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر سلمان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ قرض کی رقم لیے بغیر لے نہیں۔ ادھر اس کی حالت یہ تھی کہ پاس کھوٹا پیسہ بھی نہ تھا۔ رات وہ جوئے میں سب کچھ ہار آیا اور صبح سے اب تک بے خبر سو رہا تھا۔ سوال یہ درپیش تھا کہ اس بلا کو کس طرح ٹالا جائے۔ اس نے خوشامد کا پہلو اختیار کیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ ”اماں خاں صاحب کیا کسی سے لڑ کر آرہے ہو؟“ وہ بغیر کسی لگاؤ کے بولا۔ ”نہیں مشٹر، ہم غریب آدمی ہیں، بھلا کس سے جھگڑا اٹھانا کرے ہیں۔“

اس دفعہ سلمان نے ہمدردی جتائی۔ ”تو پھر کچھ طبیعت خراب ہوگی۔ دیکھنے سے تو یہی پتہ چلا ہے۔“

”گرمی کے دن ہیں جی۔ آج کل طبیعت کا معاملہ بس گڑبڑ ہی رہتا ہے۔“ اس کی چڑھی ہوئی تیوری کے بل رفتہ رفتہ کھلتے جا رہے تھے۔ وہ ایک جھنجھلائے ہوئے قرض خواہ کے بجائے سیدھا سالا

نہیں: درود۔ حساب بے باقی کرنا: اگرا: پچھلا حساب چکا کرنا۔ تیور: اندازہ۔ بلا: مصیبت۔ قرض خواہ: قرض دینے والا۔



وہ دکان کے اندر آگیا۔ نیاز اسے چائے اور پیسٹری لانے کا آرڈر دینے لگا۔ سلمان تکلفاً انکار کرنے لگا۔ مگر نیاز نے ایک نہ سنی۔ گردن اکڑا کر بولا۔ ”واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے!“ اس نے بیرے سے ٹیٹ کر کہا۔ ”اے منہ کیا تک رہا ہے جالہ دی سے ایک سیٹ چائے لے کر آ۔ پیسٹری تازہ لانا۔ کل کچا ہوا مال نہ لانا۔ مرزا جی سے بولنا۔ بیکری سے جو مال ابھی آیا ہے اس میں سے بھیجیں۔ ورنہ ایک پیسہ نہ دوں گا۔“ بیرا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد بیرا چائے لے کر آگیا۔ نیاز نے اپنے ہاتھ سے سلمان کو چائے بنا کر پلائی۔ اصرار کر کے تازہ پیسٹریاں بھی کھلائیں۔ اس خاطر مدارات میں نیاز کی کوئی غرض وابستہ نہ تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ صورت شکل اور وضع قطع سے تعلیم یافتہ اور شائستہ نظر آنے والا سلمان اسے بہت اچھا معلوم ہوا تھا۔

چائے پیتے پیتے اچانک اس نے سلمان سے پوچھا۔ ”آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟“ سلمان نے صاف بات کہہ دی۔ ”پریشان نہ ہوتا تو یہ تھرماس لے کر یہاں کیوں آتا؟“ نیاز کو اس پر ترس آگیا۔ بڑی شفقت سے بولا۔ ”کتنے روپے کی ضرورت ہے؟“ سلمان اس کے احساسات کا اندازہ نہ لگا سکا۔ ”تھرماس کی آپ جو قیمت لگائیں۔“ نیاز نے مسکرا کر کہا۔ ”بھئی حد ہو گئی۔ اماں تھرماس گیا ایسی تیشی میں۔“ اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ ”لو، اس سے کام چل جائے گا؟“ سلمان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوچنے لگا۔ آخر ماجرا کیا ہے۔ یہ کبایا اچانک اس پر اس قدر مہربان کیوں ہو گیا؟ اسے خاموش دیکھ کر نیاز نے فوراً کہا۔ ”اماں پہلے ان کو جیب میں تو رکھو۔“ سلمان نے روپے لے لیے۔

”تھرماس جی چاہے تو لیتے جاؤ۔“ نیاز نے بے نیازی سے کہا۔ سلمان نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں؟“ نیاز نے اس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا ”یار ہم تو شرافت پر جان دیتے ہیں۔ پیسہ سالا تو ہاتھ کا میل ہے۔ ادھر آیا ادھر گیا۔ سچ پوچھو تو اس روز بھی تمہاری گھڑی نہ رکھتا۔ پھر یہ سوچ کر رہ

خاطر مدارات: مہمان نوازی، آداب، غرض، مقصد، مطلب، شائستہ، مہذب، ہاتھ کا میل: بے حقیقت ہے۔

پر رکھے ہوئے تھرماس پر پہنچ گئی۔ پچھلے سال وہ اسے گھر سے لایا تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ سفر میں تکلیف نہ ہو، برف بھرا کر یہ تھرماس ساتھ کر دیا تھا۔ وہ خوابناک نظروں سے اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کئے اور تھرماس اخبار میں پلیٹ کر باہر آگیا۔

نیاز کی دکان اس کے گھر سے دور تھی۔ تھرماس لے کر اتنی دور پیدل چلنا اسے کھل رہا تھا۔ بھوک کی نقاہت اور بھی ٹنڈھال کئے دے رہی تھی۔ جب وہ نیاز کی دکان پر پہنچا تو گلا خشک پڑ گیا تھا۔ سانس بوجھل ہو گئی تھی۔ خیریت ہوئی کہ نیاز اس وقت دکان پر موجود تھا۔

نیاز نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”آج ادھر کیسے بھول پڑے؟“ اس کی بے تکلفی سلمان کو اچھی نہ لگی۔ وہ کو آپریٹو سوسائٹیز کے رجسٹرار کا بیٹا تھا۔ کمزور کباڑیے کا اس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اس کے نزدیک انتہائی بدتمیزی تھی۔ اس نے نیاز کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے تھرماس پر لپٹا ہوا کاغذ علیحدہ کیا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ تھرماس بالکل نیا تھا۔

نیاز نے قدرے حیرت سے کہا۔ ”بیچنے لائے ہو۔“ سلمان نے گردن ہلا دی۔ ”جی ہاں!“ نیاز نے تھرماس اٹھایا۔ گھما پھرا کر اندر باہر سے دیکھا۔ ”اپنا ہی ہے نا؟“ اس نے ایک آنکھ کر رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

”دیکھئے آئندہ آپ مجھ سے ایسی بات نہ کہیں۔“ نیاز بے باکی سے ہنسنے لگا۔ ”ارے بھئی آپ تو برامان گئے۔ اچھا یہ بتائیے اس کا کیا دے دوں؟“ ”جو آپ مناسب سمجھیں۔“

یہ کیا بات ہوئی۔ میں کہوں کہ مفت دے دیں تو آپ دے دیں گے؟“ سلمان بھی ترنگ میں آگیا۔ ”آپ مانگ کر تو دیکھیں۔ مفت بھی دے دوں گا۔“ خوب صورت چہرے والے سلمان کی یہ ادانیاز کے دل میں اتر گئی۔ خوش ہو کر بولا۔ ”بھئی بزنس کی بات تو بعد میں ہوگی۔ آپ پہلے چائے پیئیں گے۔“ اس نے گردن بڑھا کر چائے خانے کے بیرے کو آواز دی۔

کھانا: کدو، براگنڈ، نقاہت: کمزوری، ٹنڈھال: تھکا ہوا، ترنگ: جوش۔

گیا کہ پہلا سابقہ ہے۔ تم نہ جانے کیا سوچو۔ یہ زمانہ سالا بہت خراب ہے۔“

حالانکہ یہ بات اس نے بالکل جھوٹ کہی تھی۔ اس روز اس نے کوئی ایسی بات نہیں سوچا تھی۔ بس چلتا تو وہ گھڑی کے بیس روپے سے زائد نہ دیتا۔ مگر آج اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔

سلمان اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ گردن جھکا کر گویا ہوا۔ ”تھرماس اپنے پاس ہی رکھیں۔ میں آپ کی رقم دے کر اسے واپس لے جاؤں گا۔“

نیاز تنکھے لہجے میں بولا۔ ”یار اب دل توڑنے کی باتیں نہ کرو۔ دوستوں کا حساب دل میں رہتا ہے۔ یہ لیٹا دینا تو چلتا ہی رہے گا۔“ وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا اور سلمان کو اس کی بے تکلفی ذرا بھی بری نہ لگی۔

وہ دیر تک بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔

شام ہو گئی اندھیرا پھیلنے لگا۔ سلمان نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور دکان سے باہر آ گیا۔ لیکن جس وقت وہ باہر نکل رہا تھا عین اس وقت نوشا بھی پہنچ گیا۔ اس نے سلمان کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ سلمان کی اس پر نظر نہ پڑی۔ نوشا چاہتا بھی یہی تھا۔ جیسے ہی سلمان آگے بڑھا نوشا جھٹ دکان کے اندر داخل ہو گیا۔

(۵)

نوشا اس روز خالی ہاتھ آیا تھا اور اس ارادے سے آیا تھا کہ نیاز سے ایک روپیہ ادھار مل جائے۔ اس شام اس نے راجہ اور شامی کے ساتھ سنیما دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نیاز نے صاف انکار کر دیا۔ بے رخی سے گویا ہوا۔

”جب کچھ پاس ہو کرے تب ہی یہاں آیا کرو۔“

نوشا خوشامد کرنے لگا۔ ”کل میں ضرور کچھ نہ کچھ لے کر آؤں گا۔ بس آج ایک روپیہ دے دو۔“

وہ گھڑ کر بولا۔ ”بس ایک بار کہہ دیا۔ خواہ مخواہ جان نہ کھا۔“

نوشا ذرا دیر گردن لٹکائے چپ بیٹھا رہا پھر اٹھ کر چل دیا۔ لیکن جب وہ دروازے پر پہنچا تو

بیچے سے نیاز کی آواز آئی۔

”ابے اب چلا ہی جائے گا؟“

نوشا نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ نیاز بیٹھا بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے نوشا کو بلایا۔

وہ پالتو کتے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

”سنیما دیکھنے کے لیے روپیہ چاہیے ہے نا؟“

نوشا نے انکار نہ کیا۔ گردن ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔“

نیاز نے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں دیں۔ پھر جیب سے ایک روپیہ نکال کر سامنے پھینک دیا۔ ”لے! مگر یاد رکھنا سالے یہ سنیما کی چاٹ تجھے تباہ کر دے گی۔“ نوشا نے چپ چاپ روپیہ اٹھا لیا۔ نیاز تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”دیکھ! کل کچھ نہ کچھ لے کر ضرور آنا۔ ورنہ سالے خال آئندہ ایک پیر نہ دوں گا۔“

نوشا خوش خوش باہر چلا گیا۔

\*\*\*

میونسپلٹی کی لائٹیں روشن ہو چکی تھیں۔ مگر راجہ موجود نہیں تھا۔ قریب ہی ایک مکان کے چبوترے پر شامی اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کی قمیص کا گریبان پٹھا ہوا تھا۔ نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔ جسے وہ بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا۔ آستین پر جگہ جگہ خون کے لال لال دھبے نظر آرہے تھے۔

شامی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے نوشا کی طرف دیکھا اور ہونٹ سے رستا ہوا خون پونچھنے لگا۔ نوشا نے قریب جا کر گھبرائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ”ابے کیا ہو گیا۔ لہانے مارا ہے؟“ اس نے گردن ہلا دی۔ ”نہیں۔“

نوشا نے جلدی سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

شامی نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ البتہ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ گردن جھکا کر رونے لگا۔

نوشا اور گھبرا گیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”ابے کچھ منہ سے تو بول۔ ہو کیا؟“

شامی نے بھرائی ہوئی آواز سے بتایا۔ ”ڈاکٹر موٹو کے لڑکے اور اس کے نوکر نے مل کر مارا

ہے۔“ وہ اور بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”اچھا تو وہ سالہ بھوریا تھا۔ وہ تو ایک نمبر حرامی ہے۔ پر تو اس سے کہاں نکل گیا۔“

شامی نے سسکیاں بھر کر کہا۔ ”بات کچھ بھی نہیں تھی۔ دوپہر کو میں دکان سے کھانا کھانے کے لیے گھر آ رہا تھا۔ بڑے میدان میں وہ مل گیا۔ کہنے لگا۔ آؤ گلی ڈنڈا کھیلیں۔ پہلے تو یہی بد معاشرہ کی کہ داؤں اپنا رکھا۔ پھر دیر تک دھوپ میں پدایا۔ جب میری باری آئی تو کہنے لگا کہ داؤں نہیں دوں گا۔ میں نے کہا۔ داؤں دیئے بغیر جانے نہ دوں گا۔ کیوں ٹھیک بات کہی تائیں نے؟“ اس نے اپنی بات کہتے کہتے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک بات تھی۔“ نوشا نے اس کی تائید کی۔ ”ہاں پھر کیا ہوا؟“

”سالے نے چھوٹے ہی ناک پر گھونسا مارا۔ خدا قسم میرے آنسو نکل آئے۔ پھر تو مجھے ہم تاؤ آ گیا۔ سالے کو اٹھا کر دھوں سے وہیں دے مارا۔ روتا ہوا چلا گیا۔ اب شام کو اپنے نوکر کے ساتھ آیا۔ دونوں کے پاس اسکیں تھیں۔“

نوشا نے حیرت سے کہا۔ ”اچھا تو سالے اسکیں لے کر آئے تھے؟“

”ہاں جی، آتے ہی مارنا شروع کر دیا۔“

”ان کی تو ایسی کی تھیں۔ آخر سمجھا کیا ہے۔“ نوشا نے آستین چڑھاتے ہوئے کڑک کر کہا۔ ”تو پرواہ نہ کر۔ سالوں کو گھر میں گھس کر نہ مارا تو نام نہیں۔“ شامی کا سارا دکھ درد اڑن چھو ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”راجہ کو بھی ساتھ لیے لیتے ہیں۔“

”ہاں اس کو بھی لے لے۔ مگر وہ آیا کیوں نہیں؟“

پتہ نہیں، کیوں نہیں آیا اب تک؟“

نوشا نے مشورہ دیا۔ ”چل پہلے اسے ڈھونڈ لیں۔“

شامی جھٹ چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ دونوں راجہ کی کھولی کی جانب چل دیئے۔

راجہ خلاف معمول دروازے پر منہ لٹکائے گم صم بیٹھا تھا۔ قریب ہی لکڑی کی بھٹی گاڑی نظر آ رہی تھی جس پر بوڑھے گداگر کو بٹھا کر وہ پھیری پر جاتا تھا۔ کھولی کے اندر گہری تاریکی چھا تھی۔ دونوں نے اسے افسردہ دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ نوشا سمجھا کہ راجہ بھی کہیں سے لڑ جھگڑا

پدایا: مراد دوڑیا۔ کڑک کر: زوردار آواز میں۔ اڑن چھو ہونا: غائب ہونا۔ جھٹ: جلدی سے۔ کھولی: کوٹھڑی۔ گم صم: خاموش

آیا ہے۔ قریب جا کر بولا۔

”اب یہ رونی صورت بنائے کیوں بیٹھا ہے؟“

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر ٹن سے بجایا۔ ”بول کیا کہتا ہے؟“

اس دفعہ وہ بیزار سی بولا۔ ”یار تنگ نہ کر۔ پہلے ہی اپنا ڈبا گل ہو رہا ہے۔“

شامی سچ میں بول پڑا۔ ”استاد سے جھگڑا ہو گیا؟“

”نہیں یار۔! استاد بے چارے کو تو پولیس والے پکڑ کر لے گئے۔“

راجہ کی بات سن کر دونوں چونک پڑے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے انسداد گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کر کے سرکاری محتاج خانے میں بھیج دیا گیا۔ راجہ بات کہتے کہتے اداس ہو گیا۔ اداس ہونے کی بات ہی تھی۔ گداگر کے گرفتار ہو جانے کے باعث اس کی آمدنی کا ذریعہ اچانک بند ہو گیا تھا۔

دونوں جس ارادے سے آئے تھے راجہ کو غمگین دیکھ کر اس کا ذکر بھی نہ کیا۔

سینما جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا۔ تینوں نے جا کر مسلم ہوٹل میں چائے پی اور دیر تک غور کرتے رہے کہ راجہ کو اب کیا کرنا چاہیے۔ رات گئے جب ان کی محفل برخواست ہوئی تو نوشا نے وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنے آٹور کشاپ میں کام دلانے کے لیے حاجی فطر سے بات کرے گا۔

مگر نوشا کی کوئی کوشش کام نہ آئی۔ راجہ کئی کئی وقت کے فاتے کرنے لگا۔ اس نے بھیک مانگنے کی کوشش کی۔ ان دنوں انسداد گداگری کی مہم زور شور سے چل رہی تھی۔ گداگروں اور بھکاریوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ راجہ بھی ایک روز پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دوسرے گداگروں کے ساتھ اسے بھی مویشیوں کی طرح ہانک کر پولیس کی لاری میں بند کر دیا گیا مگر راجہ کا غدر پن کام آ گیا۔ ہوا یہ کہ جب گداگروں کو تھانے کے احاطے میں لاری سے اتارا گیا تو راجہ سب کی نظریں بچا کر لاری کے نیچے دبک گیا اور موقع ملتے ہی احاطے کی دیوار پھاند کر ایسا فوجہ ہوا کہ پولیس والے دیکھتے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کئی روز تک وہ اپنی کھولی میں پولیس کے ڈر سے چھپا رہا۔ نوشا اور شامی آجاتے تو پیٹ بھرنے کا

انسداد گداگری: بھکاریوں کی روک تھام۔ ٹڈو پن: بہادری۔ فوجہ ہونا: ہماگ جانا۔



عبداللہ نشے کی دھن میں کسی دور جانے والے کو یاد کر رہا تھا اور نوشا کو، جو قریب کی دیوار سے لٹکا ہوا تکلیف سے بلبل رہا تھا، بھول چکا تھا۔ دفعۃً نوشا زور سے چیخا۔

”ہائے مستری جی میں مرا۔“

عبداللہ نشے کی جھونک میں بولا۔ ”ابے تو ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ لٹکے رہو بیٹا۔ بالکل چکا ڈلگ رہا ہے اس وقت تو۔“ اپنی بات پر وہ خود ہی زور سے ہنس پڑا۔

لیکن نوشا کی ٹانگیں لوہے کے اسپرنگ کی طرح زور زور سے کانپ رہی تھیں۔ وہ ذبح ہونے والے بکرے کی مانند گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس دفعہ عبداللہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ اوپر سے خون کا ایک قطرہ فرش پر گرا۔ پھر دوسرا، تیسرا، ٹپ، ٹپ، خون کے قطرے نیچے گر رہے تھے۔ انگلیوں کی کھال پھٹ گئی تھی۔ نوشا کے ہاتھ لہو لہان ہو گئے تھے۔ وہ کب کا ہاتھ چھوڑ چکا ہوتا، مگر عبداللہ نے انگلیوں کو اس طرح پھنسا کر لٹکایا تھا کہ وہ کھل نہ سکتی تھیں۔ خون دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے عبداللہ کا چہرہ فکر مند ہو گیا۔ وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے گلاس میں پڑی ہوئی وہسکی ایک ہی سانس میں غناٹ چڑھائی۔ نوشا کو گندی سی گالی دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

قریب جا کر اس نے نوشا کو نیچے اتارا۔ اس کی انگلیاں ابھی تک آپس میں گتھی ہوئی تھیں۔ ان سے جیتا جیتا لہو بہہ رہا تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے پا بجائے میں پیشاب کر دیا عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے۔ نوشا تکلیف سے بلبل کر زور سے چیخا۔ انگلیاں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔

عبداللہ خاموش کھڑا نشے سے جھومتا رہا۔ پھر اس نے ڈپٹ کر کہا۔ ”جا پہلے ہاتھ دھو کر آ۔“ نوشا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر چلا گیا۔ عبداللہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی وہسکی انڈیلی اور آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد نوشا واپس آ گیا۔ عبداللہ نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ جیب سے بیس روپے کے نوٹ نکالے اور نوشا کے سامنے پھینک دیے۔ ”لے یہ بھی لیتا جا۔ مگر اب کبھی یہاں اپنی شکل نہ دکھانا۔ ابے منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جادفان ہو۔“ وہ چیخ چیخ کر گالیاں بکتے لگا۔

دھن: سروستی، سرور، قہر آلود: نشے سے بھری ہوئی۔

نوشا کو سانپ سوگھ گیا۔ اس نے چوں تک نہ کی۔ عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح آپس میں پھنسائیں کہ انگلیاں پھسلنے کے اندر ہی رہیں۔ اس کے بعد اس نے نوشا کو اٹھا کر میخ پر لٹکادیا اور عین اس کے تلوؤں کے نیچے فرش پر دو میخیں گاڑ دیں جن کے کپڑے سرے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ڈپٹ کر کہا۔

”دیکھ بے ہاتھ چھوڑے تو سمجھ لینا سالے دونوں میخیں پوری اندر اتر جائیں گی۔“ نوشا نے جھک کر میخوں کو دیکھا تو سہم کر رہ گیا۔ تکلیف سے اس کی انگلیاں ٹوٹے جا رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک انگلی کی ہڈی دوسری کی ہڈی توڑ کر اندر پیوست ہو جائے گی۔ وہ درو سے بلبل کر رونے لگا۔

”مستری جی! اللہ کے لیے چھوڑ دو۔“

”مستری جی! ہائے مستری جی! میں مرا۔“

”ہائے میری انگلیاں ٹوٹے جا رہی ہیں۔“

نوشا گڑ گڑاتا رہا۔ تکلیف سے بلکتا رہا۔ خدا اور رسول کی دہائی دیتا رہا۔ مگر مستری اطمینان سے بیٹھا چسکی لے لے کر دیسی وہسکی کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارتا رہا۔ جب نوشا زیادہ شور مچانا لگا لیاں دے کر چیخا۔

”چپکار ہے گایا سالے دو چار ہاتھ بھی لگاؤں۔“

”سالے رات بھر لٹکائوں گا۔ تو نے مجھے سمجھا کیا ہے۔“

”روز روز چوری کر کے بہت شیر ہو گیا تھا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ بہت مشکل سے ہاتھ آ رہا ہے۔“

اس کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر نوشا لمحہ بھر کے لیے چپ ہو جاتا پھر گڑ گڑانے لگتا۔ عبداللہ وہسکی کی چسکی لگا کر کہتا۔ ”چوری کر دینا، چوری کرو۔“

دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر طرف اندھیرے کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ عبداللہ پر جیم خانہ و ہنر کا تیز نشہ چڑھ رہا تھا۔ وہ بے ڈھنگے پن سے اپنی بھونڈی آواز میں جھوم جھوم کر گنگنا نے لگا۔

او دور جانے والے وعدہ نہ بھول جانا

او دور جانے والے



کالے صاحب چاہتا تھا کہ جلد از جلد معاہدے پر دستخط ہو جائیں۔  
ایک روز اس نے آتے ہی اپنا بریف کیس کھولا۔ بیمر کمپنی کے کچھ کاغذات نکالے اور نیاز کے سامنے رکھ کر بولا۔

”مسٹر نیاز! آج تم فارم تو بھر ہی دو۔“

”مگر بیمر تو میں اپنی بیوی کا کرواؤں گا۔“

کالے صاحب نے حیرت سے نیاز کو دیکھا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ ”کوئی بات نہیں۔ تم خود پالیسی لو یا وائف کے نام سے لو۔ بات ایک ہی ہے۔“ لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔ ”تو پھر ایسا کرو کہ وائف کے نام سے فارم بھروا کر دستخط کروادو۔ اس کے ساتھ پہلی قسط بھی ادا کرنی ہوگی۔“

نیاز مسکرا کر بولا۔ ”مگر بیوی تو میری موجود نہیں۔“

کالے صاحب اس کی بات کا مفہوم سمجھ نہ سکا۔ ”میکے ویکے گئی ہیں؟“

نیاز اسی طرح بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ ”اس کو تو مرے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے۔“

کالے صاحب سنائے میں آگیا۔ جھنجھلا کر بولا۔ ”تو گویا تم اب تک مجھ سے مسکری کر رہے تھے۔“

وہ غصے سے نجانے اور کیا کیا کہتا۔ مگر نیاز نے قطع کلام کرتے ہوئے فوراً وضاحت کی۔ ”بھئی کالے صاحب! تم تو خواہ مخواہ برامان گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں عنقریب دوسری شادی کرنے والا ہوں۔“

کالے صاحب کے چہرے کی کھنکی کم ہو گئی۔ ”تو یوں کہو نا۔“

”تم نے میری پوری بات ہی کب سنی۔ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔“

”تو پھر کب تک ارادہ ہے؟ ایک عدد پارٹی تو ضرور ہوگی۔“

”پارٹی ہوگی اور بہت جلد ہوگی۔“

اس کے بعد دونوں بے تکلفی سے ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد کالے صاحب نے اپنے کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھے اور دکان سے باہر چلا گیا۔

ٹائٹل میں آنا: حیران ہو جانا۔ مسکری: مذاق۔ کھنکی: خن۔

نوشانے کا پتہ ہاتھوں سے نوٹ اٹھائے اور سسکیاں بھرتا ہوا پھانک سے باہر نکل گیا۔

\*\*\*

نوشا کی انگلیاں سوچ گئی تھیں۔ ہاتھوں پر درم آگیا تھا۔ چہرہ گیندے کے پھول کی طرح پڑ گیا تھا۔ ماں نے دیکھا تو بدحواس ہو گئی۔ جلدی سے پوچھا۔ ”ارے یہ کیا کر لیا ہاتھوں کا؟“  
نوشا نے جیب سے بیس روپے نکال کر ماں کے سامنے ڈال دیے۔ منہ بسور کر بولا۔ ”مسٹر جی نے مجھے نکال دیا۔“ مگر اس نے صاف بات نہ بتائی۔ بہانہ یہ بنایا کہ ایک قیمتی پرزہ ٹوٹ گیا تھا ناراض ہو کر عبد اللہ مستری نے مارا بھی اور برطرف بھی کر دیا۔  
ماں عبد اللہ کو کوسنے لگی۔

نوشا جب ورکشاپ سے نکلا تھا اسی وقت سے اس کا جسم بخار سے تپنے لگا تھا۔ اب بخار شدت اور بڑھ گئی تھی۔ ماں نے جراثیم سے مرہم منگوا لیا اور انگلیوں پر لگا کر اوپر سے نئی لپیٹ دی۔  
نوشا بستر پر لیٹ گیا۔ رات گئے اس نے بخار کے عالم میں سنا نیاز گھر میں آیا تھا اور ماں سے بیٹھا ہاتھ کر رہا تھا۔

وہ اس وقت نوشا ہی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں کہتا ہوں کہ یہ تو آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر پرلے درجے کا حرام خور ہو گیا ہے۔ اس نے ضرور کوئی ایسی حرکت کی ہوگی جس کا عبد اللہ نے اس طرح مارا۔ ورنہ وہ تو بڑا بھلا آدمی ہے۔ کارگیروں کو اولاد کی طرح رکھتا ہے۔“  
نوشا کو اس کی باتیں سن کر سخت غصہ آیا۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کئی گالیاں دیں اور کروٹ بدل کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

(۷)

نیاز کی دکان پر کالے صاحب کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ کالے صاحب دوسرے تیس روز کسی نہ کسی وقت وہاں پہنچ جاتا۔ دیر تک بیٹھا انشورنس کی خوبیاں بتاتا رہتا نیاز بھی اس کی باتوں میں اب انہماک اور گہری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ پچاس ہزار کی پالیسی کا معاملہ تھا کمیشن اچھا بنانا

جراثیم: وہ شخص جو زخموں اور پھوڑے پھنسیوں کا علاج کرے۔ پرلے درجے کا: انتہائی اچھا۔ حرام خور: مفت خور۔ انہماک: بھلاؤ۔

\*\*\*

نیاز خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ نوشا کی ماں سے نکاح کر لے گا۔ پچاس ہزار روپے میں اس بیمہ بھی کرا دے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اسے کس طرح راستے سے ہٹایا جائے تاکہ نیبے کی رقم پر سے جلد مل جائے اور سلطانہ بھی اس کے قابو میں آجائے۔

سوچتے سوچتے ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے اٹھ کر دکان بند کی۔ تالا ڈال دیا۔ ڈاکٹر موٹو کے مطب کی جانب چل دیا۔

نیاز نے مطب کے اندر جا کر دیکھا۔ ڈاکٹر اس وقت تک پہنچا نہیں تھا۔ کپاؤنڈر نے بتایا کہ گھر پر ہے۔ تھوڑی دیر بعد آئے گا۔ نیاز نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ مطب میں وہ مریضوں کی موجودگی کے باعث ٹھیک سے بات نہ کر سکتا تھا۔ گھر پر اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر گھر سے نکلے ہی والا تھا اسی اثنا میں نیاز پہنچ گیا ڈاکٹر نے اسے کمرے میں بٹھایا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔

”کہو میاں نیاز! آج ادھر کیسے آ گئے؟“

نیاز اپنی بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر موٹو سے اس کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ وہ بیمار پڑتا تو اسی کے زیر علاج رہتا۔ مگر اس وقت جو بات وہ کہنا چاہتا تھا ایسی نہ تھی کہ دھڑک کہہ دی جائے۔ گو کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر موٹو کو رقم کھلائی جائے تو وہ ہرگز کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ڈاکٹر موٹو کا نام خیرات محمد تھا۔ مگر اپنے

ڈول اور تنومند جسم کے باعث عرف عام میں ڈاکٹر موٹو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ کرناٹ کاربے کا تھا اور وہاں ایک ڈاکٹر کے مطب میں کپاؤنڈ تھا۔ فسادات کے بعد مہاجرین کرپاکستان آیا تو اس نے اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ اب اس نے اپنے نام کے ساتھ ایک بوگس ڈگری لگائی تھی اور ٹھانڈے

ڈاکٹری کرتا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے پورے چار سال بھی نہیں ہوئے تھے مگر اس عرصے میں کئی سنگین مقدمات میں ملوث ہو چکا تھا اور ہر بار جیل جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔ لیکن اس بار

کے باوجود وہ اپنی خطرناک حرکتوں سے باز نہ آتا تھا۔

ڈاکٹر خیرات محمد عرف موٹو نے نیاز کو خاموش دیکھا تو ہنس کر گویا ہوا۔ ”کیا کہیں سے

پوشیدہ بیماری لے آئے ہو جو کہتے ہوئے جھجک رہے ہو۔ میرا کہنا مانو تو اب تم گھر بسالو اور یہ بازاری عورتوں کا چکر چھوڑ دو۔“

کسی اور وقت ڈاکٹر نے یہ بات کہی ہوتی تو نیاز اس کے سر ہو جاتا۔ مگر اس وقت تو وہ غرض مند بن کر آیا تھا۔ مسکرا کر اس کی بات ٹال گیا۔

”آپ کہہ رہے ہیں تو گھر بھی بسالوں گا مگر اس وقت میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔“

”لوگوں کی خدمت کرنا تو اپنا پیشہ ٹھہرا۔ کہو کیا کام ہے؟“

نیاز بات کہتے کہتے رک گیا۔

”کہو کہو گھر کیوں رہے ہو؟ کوئی خاص بات ہے؟“

”خاص ہی بات ہے۔“

ڈاکٹر حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ ”اچھا! تو پھر کہتے کیوں نہیں؟“

نیاز ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب!“ وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ گھبرا کر ڈاکٹر کا چہرہ نکلتے لگا۔

ڈاکٹر نے زچ ہو کر کہا۔ ”بھئی اب کہہ بھی چکو۔ تم نے خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا کر دیا۔“

نیاز گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پھر کسی وقت آکر بات کروں گا۔“

ڈاکٹر نے فوراً ٹوکا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے اب تو تم اپنی بات کہہ کر ہی جاؤ گے۔ بیٹھو، کہاں چلے؟“

نیاز کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ اس نے نظریں جھکا کر دلی زبان سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کوئی چیز سلو پوائزننگ ہوتی ہے۔“

ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے جسے بتاتے ہوئے اس قدر جھجک محسوس ہو رہی تھی وہ نہ خائف ہو اور نہ ہی کسی طور گھبرا۔ لمحہ بھر تک نیاز کا چہرہ بغور دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر پوچھا۔

”خیریت تو ہے۔ یہ سلو پوائزننگ کے بارے میں معلوم کرنے کی ضرورت تم کو کیوں

محسوس ہوئی؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

ڈاکٹر کی آنکھوں میں بحرمانہ چمک ابھر آئی۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ ”میرا مانو تو سلو پوائزننگ کے چکر میں نہ پڑو۔ یہ طریقہ خطرناک ہے اور اس میں بڑا جھنجٹ بھی ہے۔“

نیاز کسی قدر ناامید ہو کر بولا۔ ”تو پھر کیا کیا جائے؟“

ڈاکٹر نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”گھبراؤ نہیں، ذرا صبر سے کام لو۔ ایسے کاموں کے لیے

اب تو ایک سے ایک نیا طریقہ نکل آیا ہے۔“

نیاز خاموش بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔

”صرف چند انجکشن لگائے ہوں گے جن سے دل کمزور پڑ جائے گا اور حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہو جائے گی اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔“ ڈاکٹر سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ ہم ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کر کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں دھر لیے جاؤ۔ میری رائے پوچھتے ہو تو یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اب یہی چل رہا ہے۔“

نیاز کو ڈاکٹر کا مشورہ پسند آگیا۔ اس نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔“

ڈاکٹر کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا اس نے دروازے کا بولٹ چڑھایا۔ نیاز کے قریب پہنچا۔ کوٹ کی جیب سے ایک ڈبا نکال کر کھولا اور نیاز کے سامنے رکھ کر دروازہ دارانہ لہجے میں گویا ہوا۔

”دیکھو یہ ہیں وہ انجکشن۔ ایسی چیزیں میں کلینک کی بجائے گھر میں رکھتا ہوں۔“

نیاز نے ڈبے کے اندر رکھے ہوئے انجکشنوں کو حیرت اور خوف سے دیکھا۔ ”یہی ہیں انجکشن؟“ اس نے اٹکتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر اس کام کے میں پانچ ہزار روپے

لوں گا۔“

نیاز نے پانچ ہزار کا نام سنا تو سناٹے میں آگیا۔ مری ہوئی آواز میں بولا۔

صحبت: مصیبت۔ الجھن۔ دھر لیے جاؤ۔ بکڑے جاؤ۔

”ڈاکٹر صاحب یہ تو بہت ہیں۔“

”بس اتنا ہی لوں گا۔ اس سے کم نہ ہو گا۔ سوچ سمجھ لو۔ سچ پوچھو تو ایسے خطرناک کاموں کے

لیے لاکھوں بھی تھوڑے ہیں۔“

نیاز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر بھی خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نیاز نے کہا۔ ”کچھ کم نہیں کیجئے گا؟“

”نہیں۔“ ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔

”میری اتنی حیثیت نہیں۔“

”تو پھر یہ خیال چھوڑ دو۔“ ڈاکٹر بے مروتی سے بولا۔

نیاز لمحہ بھر بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے ڈاکٹر کی بات مان لی۔ ”چلے آپ ہی کی بات بڑی رہی۔ مگر اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟“

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”چار پانچ مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔“

”آپ چاہیں تو اور بھی زیادہ وقت لے سکتے ہیں۔ مگر سال بھر سے زیادہ نہ لگے۔“

”نہیں بھی سال بھر کی مدت تو بہت ہوئی۔“

دونوں نے کچھ اور ضروری باتیں کیں اور یہ طے ہوا کہ نیاز، ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ پیشگی دے گا اور جب مریض کی حالت خطرناک صورت اختیار کرنے لگے تو مزید دو ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ بقیہ رقم موت واقع ہو جانے کے بعد فوراً ادا کر دی جائے گی۔

نیاز نے تمام باتیں طے تو کر لیں مگر جب دکان پر واپس پہنچا تو نامعلوم خوف سے سہا ہوا تھا۔ ہر چند کہ وہ چوری کا مال بیچ بیچ کر خاصا غنہ ہو گیا تھا لیکن اتنا خطرناک جرم اس سے اب تک سرزد نہ ہوا تھا۔ لہذا وہ بہت گھبرا ہوا تھا۔

اسی الجھن میں وہ اس روز نوشا کے گھر بھی نہیں گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا اور چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

\*\*\*

رات کے کوئی گیارہ بجے کا عمل ہو گا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔

وقت ایک پیسہ نہیں۔“

سلمان ذرا دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر منہ لٹکائے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔

نیند ایسی اچاٹ ہوئی کہ دیر تک نہ آئی۔ نیاز کروٹیں بدلتے بدلتے اکتا گیا تو خیال آیا کہ نوشا کے گھر چلنا چاہیے۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور نوشا کے گھر کی طرف چل دیا۔

جس وقت نیاز وہاں پہنچا رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر نوشا کے گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ بات یہ تھی کہ جب سے نوشا کی ملازمت ختم ہوئی تھی سلطانہ اور اس کی ماں کو زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ دونوں اس وقت لیمپ کی روشنی میں کارخانے کے لیے بیڑیاں تیار کر رہی تھیں۔

گھر میں نیاز کے داخل ہونے سے قبل سلطانہ دالان سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ لیکن نیاز نے جاتے جاتے بھی اس کی ایک جھلک دیکھ لی۔ چست لباس میں وہ اس وقت قلمی آم کی قاش معلوم ہو رہی تھی۔ نیاز نے بڑے جذباتی انداز میں گہری سانس بھر کر سوچا کہ اب اسے اپنی اسکیم پر جلد ہی کام شروع کر دینا چاہیے۔

اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ سلمان سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں بال بے ترتیب تھے۔ چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔

نیاز اسے اپنے ہمراہ اندر لے آیا۔ رات گئے آنے کا سبب پوچھا۔ سلمان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”نیاز بھائی! اس وقت تمہارے پاس بڑے ضروری کام سے آیا ہوں۔ اگر سو روپے کا بندوبست کر دو تو تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا۔“

نیاز اس کی باتوں سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ اس نے سخن سازی سے کام لیا۔ ”مجھے تو آج کل نو روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس وقت تو میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔“

سلمان خوشامد کرنے لگا۔ ”نہیں نیاز بھائی، اس وقت تو تم کو کہیں نہ کہیں سے بندوبست ہی پڑے گا۔ میں بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں۔“

حالانکہ نیاز کے پاس اس وقت کئی سو روپے موجود تھے مگر وہ اسے کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ سلمان، جس روز سے قمر ماس دے کر گیا تھا اس کے بعد اب پلٹا تھا۔ نیاز نے اس عرصے میں کہا سوچا کہ سلمان مل جائے تو اس سے روپے کا تقاضا کرے۔ اب وہ آیا بھی تو روپے مانگتا ہوا۔ دس ٹی نہیں، پورے سو۔ اس نے بے رخی سے کہا۔

”بھی معاف کرنا۔ تم نے پہلی ہی جو رقم لی تھی وہی نہیں دی۔ اب اور مانگ رہے ہو۔“ سلمان پھر بھی اصرار کرتا رہا۔ بات یہ تھی کہ وہ دوپہر سے بیٹھا فلتش کھیل رہا تھا اور اس وقت ایک ایک پیسہ ہار کر نکلتا تھا۔ ہارے ہوئے جواری کی جو حالت ہوتی ہے وہی اس وقت اس کی تھی۔ اسے روپیہ چاہیے تھا چاہے کسی طرح ملے۔

جب نیاز کسی طرح روپیہ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو سلمان نے کہا۔ ”اگر آپ کو میرا اعتبار نہیں رہا تو سید لکھو الیجے۔“

نیاز اچانک بھڑک اٹھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھئی واہ! اچھا یاد پالا۔ سید ہی لکھو اتنا ہوتی تو پھر تم ہی رہ گئے تھے؟“

سلمان شرمندہ ہو کر بولا۔ ”آپ میری بات کا مطلب غلط سمجھے۔“

”میں تمہاری بات کا مطلب بالکل سمجھ گیا۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ میرے پاس

وضاحت کی۔ ”یار جا کر دو چار سائیکلوں میں پنچر ہی کر دو۔ کچھ تو سالاکام آئے گا۔“  
 نوشا تو چپ رہا۔ لیکن راجہ نے کہا۔ ”یار پکڑے گئے تو بڑی مار پڑے گی۔“  
 مجید منہ بگاڑ کر بولا۔ ”ابے تو تو بڑا ڈرپوک نکلا۔ بس ٹائر میں جا کر ڈراپن ہی تو چھوٹی ہے اور  
 کون سا بدنام کوڈا کہ ڈالتا ہے۔“

## فصل سوم

(1)

راجہ رضامند ہو گیا۔ ”یار برا کیوں مناتا ہے۔ آج یہ بھی سہی۔“ وہ اٹھ کر دفتر کی عمارت کی  
 طرف چل دیا۔ احتیاطاً اس نے نوشا کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت آس پاس کوئی نہ تھا۔ نوشا کو  
 پہرے پر لگا کر راجہ نے جھپاک جھپاک کئی سائیکلوں کے پنچر کر دیے۔  
 مجید کا قیاس ٹھیک نکلا۔ کچھ ہی دیر بعد سائیکلوں کے پنچر جڑوانے والے اس کی دکان پر آنا  
 شروع ہو گئے۔ دن ڈھلے جب دکان بند کرنے لگا تو اس نے راجہ اور نوشا کو فی پنچر ایک آنے کے  
 حساب سے سات آنے دیے۔

تجربہ کامیاب رہا تھا۔ لہذا دوسرے دن انہوں نے پورے ایک درجن پنچر کیے اور اس کے  
 صلے میں نقد بارہ آنے کمائے۔ اب تو ان کا یہ معمول ہو گیا کہ سائیکلوں کے اسٹینڈ کے ارد گرد  
 منڈلاتے رہتے۔ انگلیوں میں مضبوط نوکیلی پتلیں دبی ہوتیں۔ جہاں موقع ملا آنکھ بچا کر کام کر جاتے۔  
 وہ اپنے کام میں اس قدر منجھ گئے تھے کہ اکثر بے دھڑک پنچر کر دیتے۔ ان کی اس دیدہ دلیری  
 پر مجید نے ایک آدھ بار تنبیہ بھی کی مگر ان کو تو اب خطرہ مول لینے میں لطف آنے لگا تھا۔ ایک دفعہ  
 انہوں نے بد معاشی کی حد کر دی۔ ایک سرے سے تمام سائیکلوں کے پنچر کر ڈالے۔ بڑی کھلبلی  
 مچا۔ کچھ لوگوں نے مشتبہ نظروں سے بھی دیکھا مگر وہ ذرا نہ گھبرائے۔ اس روز انہوں نے کچھ کم تین  
 روپے کمائے۔

چند روز بعد کا ذکر ہے۔ راجہ نے ایک سائیکل میں پنچر کیا۔ عین اسی وقت دفتر سے وہ شخص  
 باہر نکلا جس کی سائیکل تھی۔ اس نے راجہ کو ٹائر میں پن چھوتے دیکھ لیا۔ پہلے بھی دوبار اس کی  
 سائیکل میں اسی اسٹینڈ پر پنچر ہو چکا تھا۔ اس نے جھپٹ کر راجہ کی گردن دبوچ لی۔ شور سن کر لوگوں  
 کا جھوم ہو گیا۔ ان میں بیشتر ایسے تھے جن کی سائیکلوں کے پنچر ہو چکے تھے۔ پہلے تو راجہ پر گالیاں  
 پڑیں۔ پھر مار پڑنے لگی۔ نوشا بھی جھوم میں موجود تھا اور گھبرایا ہوا سوچ رہا تھا کہ کس طرح راجہ کو  
 نکالیا جائے۔ اسی وقت کسی نے کہا۔

نوشا کے ہاتھوں کے زخم مندمل ہو گئے تھے، مگر اب وہ دن بھر لاوارث کتوں کی طرح گلی  
 کوچوں میں آوارہ گردی کرتا۔ راجہ بھی ہنوز فاقہ مستی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان دنوں دونوں نام  
 طور پر ساتھ ساتھ نظر آتے۔

کچھ عرصے سے انہوں نے یہ معمول بنالیا تھا کہ دن چڑھے دونوں میں سے کوئی نہ کوئی، راشن  
 کے دفتر کے سامنے نیم کے بیڑے کے نیچے جا کر بیٹھ جاتا اور دوسرے کا انتظار کرتا۔ یہاں سائیکلوں کی  
 مرمت کرنے کی چھوٹی سی دکان تھی اس کا مالک مجید نامی ایک نوجوان تھا جس سے انہوں نے بارہ  
 گانٹھ لیا تھا۔ دن کا زیادہ وقت دونوں اس کے پاس گزارتے۔ وہ اکیلا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی گاہک ایک  
 ساتھ آجاتے تو وہ چہیوں میں ہوا بھرنے یا ایسے ہی چھوٹے موٹے کاموں پر ان کو لگا دیتا۔ اس کے  
 صلے میں سگریٹ اور کبھی کبھار چائے بھی پلا دیتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ مجید کے پاس کام بالکل نہ آیا۔ راشن کے دفتر کے سامنے اسٹینڈ پر بہت سی  
 سائیکلیں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ راجہ اور نوشا حسب معمول دکان پر موجود تھے۔ دوپہر کا وقت  
 تھا۔ سڑک پر سناٹا چھلپا تھا۔ مجید کو بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا سوچھی کہ آنکھ مار کر دونوں سے مخاطب ہوا  
 ”ابے آج تم ہی کچھ باندگی دکھاؤ۔ گاہک نے تو آنے کی قسم کھالی ہے۔“

انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ مگر اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ مجید نے خود ہی



”اس کے ساتھ ایک لڑکا اور بھی ہوتا تھا۔ اس سالے کی بھی خبر لو۔“

نوشا کے فوراً کان کھڑے ہوئے۔ سخت پریشان ہوا۔ جھوم کو چیر کر دھکم دھکا کرتا ہوا سر بھاگا۔ لوگوں نے شور مچایا۔ ”پکڑنا، پکڑنا۔ جانے نہ پائے۔“ مگر نوشا کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔ ہوا چھوڑ کر چسپاکی سے ایک گلی میں گھس گیا اور گلیوں، گلیوں پھر تاروا گھر پہنچ گیا۔

شام کو راجہ ملا۔ نوشا نے دیکھا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ ایک آنکھ سوچ گئی تھی۔ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ ”یار سالوں نے مار مار کے بھر کس نکال دیا۔“

نوشا نے پوچھا۔ ”مجید نے نہیں بچایا؟“

”وہ سالہ تو خود ڈر رہا تھا۔ دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔“

دونوں گلی کے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں شامی آگیا۔ وہ بڑا خوش نظر تھا۔ اس نے آتے ہی پانچ روپے کا نوٹ دکھایا اور چپک کر بولا۔ ”سینما چلتے ہو؟“ نوشا اور راجہ نے تیار ہو گئے۔

سینما جانے سے قبل تینوں نے مسلم ہوٹل میں چائے پی اور وہیں شامی نے بتایا کہ پانچ روپے کا نوٹ اس نے دکان سے اڑایا ہے۔ اس روز اس کے باپ کو دے کا سخت دورہ پڑا تھا۔ لہذا وہ دکان نہیں گیا۔ جس روز باپ دکان نہیں جاتا تھا شامی کے پو بارہ ہوتے۔ خوب ہنجرے اڑاتا۔ کچرا جاتا مرمت بھی خوب ہوتی۔

راجہ اور نوشا نے شامی کے پانچ روپے سے سینما بھی دیکھا اور تفریح بھی کی۔ بڑے مزے شام گزری۔

دوسرے روز نوشا سویرے ہی سویرے راجہ کے پاس پہنچ گیا۔ مجید کی دکان پر جانے کی اجازت منگوائی۔ اس نے راجہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ”دیکھو جی اب تم یہاں نہ آنا۔ ورنہ غم خواہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ساری دکان داری چوہٹ ہو جائے گی۔“

اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وقت کہاں گزارا جائے۔ کچھ دیر دونوں کھولی کے اندر بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر شامی کی دکان پر پہنچے۔ مگر شامی وہاں موجود نہ تھا۔ البتہ اس کا باپ

کان کھڑے ہوتا۔ ہوشیار ہوتا، چمکتا ہوتا۔ بھر کس نکالتا۔ بہت زیادہ مارنا۔ پو بارہ ہوتا۔ دو لگتا، قسمت جاگتا۔ ہنجرے اڑاتا۔ عجائی کی چوہٹ ہوتا۔ خراب ہوتا، عمارت ہوتا۔

لہاں رہا تھا۔

دونوں نے بازار کا ایک چکر لگایا اور راجہ کی تجویز پر دریا کی طرف جانے کا پروگرام بنایا۔ پروگرام یہ تھا کہ دریا کے اس پار سے آنے والے پھلوں اور سبزیوں کو کشتیوں پر سے اتارنے یا دھند کیا جائے۔ مگر چار میل کا راستہ طے کر کے جب دونوں وہاں پہنچے تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کشتیاں موجود ضرور تھیں لیکن ان میں سے بیشتر ریت پر دور تک کچھوڑوں کی طرح الٹی پڑی تھیں۔ قریب ہی ملاح بیٹھے اونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ ایک نیلے پر کھڑا کشتیوں کو دیکھتا رہا۔

ذرا دیر بعد ایک ملاح قریب سے گزرا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میونسپلٹی نے کشتیوں پر ٹیکس بڑھا دیا ہے۔ لہذا بطور احتجاج ملاحوں نے ہڑتال کر دی۔ اس اطلاع سے دونوں کو بڑی کوفت ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھاٹ پر پہنچے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ گھاٹ آثار قدیمہ کے کسی کنڈر کی طرح شکستہ تھا۔ اس کا ایک حصہ دریا کی طغیانیوں سے کٹ کٹ کر منہدم ہو چکا تھا۔ صرف ایک برج باقی تھا۔ اس میں بھی بڑا سا شگاف تھا۔ دونوں سیڑھیاں طے کرتے ہوئے برج کے اوپر پہنچ گئے۔

\*\*\*

دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج آسمان کے پتھوں سچ آگیا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ راجہ در نوشا جھکے ہوئے تھے۔ تیز دھوپ میں کئی میل چل کر آئے تھے۔ برج کے اندر پہنچتے ہی ایسا بھیگا ہوا جھونکا آیا کہ مزہ آگیا۔

دونوں شکستہ محراب کے نیچے بیٹھ گئے۔ نشیب میں دریا آہستہ آہستہ بہ رہا تھا۔ دور تک پانی ہی اپنی تھا۔ نوشا کو برج کے اندر بیٹھ کر دریا کا نظارہ کرنے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ مگر راجہ چپ چاپ تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ نوشا نے کئی بار بات کرنے پر اکسایا۔ مگر وہ بیزاری سے کچھ نہ کچھ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ آخر نوشا نے دریافت کیا۔

”لہاں راجہ! بات کیا ہے جو تم اتنے چپ چاپ بیٹھے ہو؟“

وہ برا سامنہ بنا کر بولا۔ ”یار پریشان نہ کر۔“

لہاں دریا کا تالاب پرانے کی جگہ۔ شکستہ، ٹوٹا ہوا۔ آسمان، اجمارنا، آباد کرتا۔

نوشا باز نہ آیا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ ”آخر ہوا کیا؟ یار! تو خواہ مخواہ روٹھا ہوا سا بیٹھا ہے؟ راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔  
”اماں کچھ بتاؤ تو۔“ نوشا نے اصرار کیا۔

اس دفعہ بھی وہ خاموش رہا۔ نوشا بھی چپ ہو گیا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ سورا سنہری کرنیں دریا کی لہروں پر جھللاتی رہیں۔ پانی کے آہستہ آہستہ بہنے کی گنگناہٹ ابھرتی جیٹکی ہوا کے جھونکوں سے ان کے سر کے بال بار بار بکھر کر چہرے پر آ جاتے۔ برج کے اندر سکوت تھا اور اس سکوت میں دونوں شکستہ محراب کے نیچے الو کی طرح گول گول آنکھیں ٹکا خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک راجہ کھسک کر آگے چلا گیا۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں باہر لٹکا دیں۔ نوشا نے راجہ سے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ لہریں بار بار اندر کر گھرا دیواروں سے ٹکراتی رہیں۔ ان کے ٹکراتے سے سفید سفید جھاگ اٹھتا۔ پانی کے چھینٹے دور تک بکھر جاتے۔ ہر بار ایسا شور اٹھتا جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ سسکیاں بھر رہا ہو۔ خوف سے اس کا جگر اٹھا۔ اسی وقت لہروں کے شور میں راجہ کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”یار جی چاہتا ہے، مر جاؤں۔“

نوشا نے سہمی ہوئی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ اس کی گردن دیوار سے ٹکی تھی۔ آنکھیں آسمان کی جانب تھیں اور ٹانگیں دریا کی طرف تھیں۔ نوشا اس کی بات سن کر کچھ اس قدر خوف ہو گیا کہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

راجہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا۔ ”سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔“

نوشا نے دیکھا، اس کا چہرہ چھٹکی کے پیٹ کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے ایسا محسوس تھا جیسے وہ دیر تک روتا رہا ہے۔ راجہ نے گہری سانس بھری اور گردن جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ ان ٹانگیں کھسک کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ آدھا دھڑ باہر لٹک رہا تھا۔

نوشا نے جھپٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ گھبرا کر بولا۔ ”یار راجہ تجھے ہو کیا گیا راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نوشا کی گرفت سے خود کو چھڑانے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتہ گتے۔ راجہ نے خفگی سے کہا۔ ”نوشا مجھے چھوڑ دے۔“ مگر نوشا باز نہ آیا۔ وہ اسے جانب گھسیٹ رہا تھا۔ اور راجہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دوا

ہاتھیں باہر لٹکی ہوئی زور زور سے مل رہی تھیں۔ نیچے دریا کی لہریں ابھرا بھر کر گھاٹ کی دیوار سے ٹکراتیں۔ پانی اچھل کر دور تک بکھر جاتا۔ سطح آب پر سفید سفید جھاگ پھیل جاتا۔ ہر بار اس طرح شور اٹھتا جیسے کوئی کراہتے ہوئے ہائے کرے۔

لہریں ٹکراتی رہیں۔ شور ابھرتا رہا۔

ہائے، ہائے، ہائے!

”نوشا مجھے چھوڑ دے۔ نوشا مجھے چھوڑ دے۔“ راجہ بار بار کہہ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں۔ چہرے پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے بال جھک کر پیشانی پر آگئے تھے۔ اچانک راجہ نے چیخ کر کہا۔  
”چھوڑ دے مجھے ورنہ تو بھی میرے ساتھ جائے گا۔“

نوشا نے کچھ کہنا چاہا۔ اسی وقت بلبلہا کر راجہ نے اس کی کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ لمحہ بھر کے لیے نوشا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ راجہ نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ابے حرای چھوڑ مجھے۔“

نوشا نے جلدی سے بازو پکڑ کر زور سے گھسیٹا۔ راجہ کا تمام جسم اوپر آگیا۔

راجہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا جسے اس نے ایک ہاتھ سے چھپا لیا تھا۔ نوشا اس کے قریب ہی بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ گھاٹ کے شکستہ برج کے اندر آہستہ آہستہ سسکیاں ابھرنے لگیں۔ راجہ فرش پر پڑا اور رہا تھا۔ وہ دیر تک روتا رہا۔ نوشا کھسک کر اور نزدیک ہو گیا۔ اس کا بازو جھنجھوڑ کر بولا۔

”ابے کب تک یوں عورتوں کی طرح روتا رہے گا۔“

راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرہ ہاتھ سے چھپائے سسکیاں بھرتا رہا۔

نوشا نے کہا۔ ”آؤ اب گھر چلیں۔“

راجہ بیزاری سے بولا۔ ”نہیں یار میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”ابے کچھ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

راجہ ذرا دیر خاموش رہا، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”یار تو نے ناحق روک لیا۔ مر جاتا تو اچھا تھا۔ میرے مرنے سے کسی کو دکھ نہ ہوتا۔ کوئی نہ روتا۔ میرا بیٹھا ہی کون ہے۔ نہ ماں نہ باپ، نہ

مزاحمت: مخالف: طحال: جھکا ہوا ناحق: فضول: بلاوجہ۔

نظر میں بچا کر کمرے میں گھس جائے مگر اس کی نظر پڑ گئی۔ غضب ناک ہو کر بولی۔  
”حرام خور، کھٹو! اب کیوں واپس آیا؟ دن بھر جہاں آوارہ گردی کرتا رہا وہیں جا۔ یہاں کس لیے آیا ہے؟“

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں دیر تک کونے اور طے دیتی رہی۔ وہ چپ چاپ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ کھانا لے کر آئی۔ گرم گرم کھانے کی خوشبو نھتوں میں پہنچی تو وہ مریل کتے کی طرح سہا ہوا اس طرف بڑھا۔ ماں نے اسے بے رخی سے جھڑک دیا۔  
”خبردار جو کھانے پر ہاتھ لگایا۔ میں اپنی ہڈیاں پیل پیل کے اس لیے محنت نہیں کرتی کہ تو مستحرام کام کی کھا کھا کر اینڈ تا پھرے۔“

نوشا کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ سلطانہ نے سفارش کی۔ ماں نے اسے بھی ایسی سختی سے ڈانکا کہ سہم کر رہ گئی۔ اسی وقت انو بھی آگیا۔ ماں نے اسے اپنے قریب بلا کر بٹھالیا۔ تینوں نوشا کے سامنے کھانا کھاتے رہے۔ کسی نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ خاموش بیٹھا رک کر ان کی جانب نظر اٹھا کر دیکھ لیتا۔ اسے توقع تھی کہ ماں ضرور کھانے پر بلائے گی۔ مگر جب سب کھانا کھا چکے اور سلطانہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف چل دی تو وہ تمللا کر رہ گیا۔ اسے سخت ہجوک لگ رہی تھی۔ غصے اور دکھ سے اس کا دل بھر آیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا اور اندھیرے میں بیٹھا سکیاں بھر کر آنسو بہاتا رہا۔

ذرا دیر بعد وہ کمرے سے نکلا اور آنگن سے گزرتا ہوا باہر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ ماں نے تیکھے لہجے میں ٹوکا۔ ”پھر باہر چلا۔“  
نوشا نے جواب نہیں دیا۔

ماں غضب ناک ہو کر بولی۔ ”ایک باپ کا جتا ہے تو اب واپس نہ آتا۔“  
اس نے بھی پلٹ کر ماں کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نہیں آؤں گا۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔



بھائی، نہ بہن کوئی بھی تو نہیں۔“ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دوپہر کے سنائے میں ناگہاں بدوق چلنے کی آواز ابھری۔ دونوں خوفزدہ ہو گئے۔ روزنا بھول کر برج سے باہر دیکھنے لگے۔ دریا کے اوپر پرندے شور مچاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ گھٹا مشرقی جانب، نشیب میں سرکنڈوں اور دریائی گھاس کے اونچے اونچے جھنڈے جن کی اونٹ شکاریوں کی ابھری ہوئی گردنیں نظر آرہی تھیں۔ اوپر فضا میں آبی پرندوں کے غول منزلہ تھے۔ دونوں ذرا دیر چپ چاپ بیٹھے انھیں دیکھتے رہے، پھر برج سے نیچے اتر کر اسی طرف چل دی۔ شکاری دے دے قدموں آگے بڑھتے۔ دھائیں دھائیں کر کے بندوقیں چلتیں۔ کوئی زخمی ہو کر چیختا ہوا نیچے گر تا۔ راجہ اور نوشا کچھڑ اور پانی میں گھس کر اسے نکال لاتے۔ بڑا بڑا مشغلہ تھا۔ بہت دیر بعد جب شکاری تھکے ہارے پڑاؤ پر آکر اکٹھا ہوئے تو انہوں نے دونوں کو بڑا گوشت اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے دیے۔ سہ پہر کو چائے پلائی۔ دن ڈھلے تک وہ شکاریوں کے ہاؤ ہو کرتے رہے۔

شام ہو گئی۔ سورج مغرب میں اتر گیا۔ درختوں کے سائے طویل ہو گئے۔ افق پر گہری تاریکی پھیل گئی۔ دریا کی چٹیل موجیں دلہن کے سرخ آنچل کی طرح لہرائے لگیں۔ شکاریوں کی جیب میں سوار ہو کر جا چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ مغرب میں بکھرے ہوئے شون رنگ پڑتے جا رہے تھے۔

دونوں دن بھر کے تھکے ہارے شہر کی جانب چل دیے۔

(۲)

نوشا گھر میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ ماں بے روزگاری کے باعث ان دنوں اس یوں بھی بیزار تھی۔ بات بات پر برس پڑتی۔ نوشا تمام دن غائب رہا لہذا وہ اور بھی جلی جھتی بیٹھی جیسے ہی وہ صحن میں پہنچا ماں اسی وقت باورچی خانے سے نکل کر دالان میں آگئی۔ نوشا نے ہا

کونے دیکھا: اندھا کھانا: ہڈیاں پیلنا: ہڈیاں کھانا: مرنو بہت زیادہ محنت کرنا: مستحرام: ہٹا کتا: موہ تازہ آدمی: اینڈ تے پھرتا: آکر کر چلتا۔

ناگہاں: اچانک: غول: گردہ: پڑاؤ: ٹھہرنے کی جگہ: سرائے: افق: وہ جگہ جہاں زمین اور آسمان ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، آسمان کا چمچل: بے چین، شونہ: بیزار: تاراش: جلی جھتی: غصے میں بھری ہوئی۔

راجہ اپنی کھولی کے دروازے پر کبڑوں کی طرح جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ نوشا کو دیکھتے ہی حیرت ہو کر بولا۔

”اے بہت جلدی آگیا؟“

نوشا نے اس کی بات خاموشی سے سنی اور زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر چپ چاپ تر جا کر بیٹھ گیا۔

راجہ نے اس کے متمنت ہونے چہرے کو تنکھی نظروں سے دیکھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ ما کچھ گڑبڑ ہے۔

”اے نوشے، کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا؟“

”نوشا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ”راجہ میں اگر تیرے ساتھ رہوں تو مجھے رکھ لے گا؟“

”کیوں؟“ راجہ اور حیرت زدہ ہو گیا۔

”میں گھر نہیں جاؤں گا۔“

”آخر بات کیا ہوئی؟“

نوشا نے آبدیدہ ہو کر بتایا۔ ”اماں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔“ یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار دم راجہ نے فوراً تسلی دی۔ ”اے تو تو رونے لگا۔ گھبراتا کیوں ہے؟ دونوں مزے سے یہاں رہیں گے۔ نوشا سسکیاں بھر کر شکوہ کرنے لگا۔ ”سب مجھے ذلیل سمجھتے ہیں۔ ہر ایک برا کہتا ہے۔ میرا میں کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔“

”اے میں تو موجود ہوں۔ تو کسی کی پروا نہ کر۔“ راجہ نے اس کی دل جوئی کی۔ ”یہ نامہ سالیاں سب ایک نمبر حرام کی جنی ہوتی ہیں۔ اب میری ہی ماں کو دیکھ۔ سنا ہے بہت ٹھاٹھ سے لا میں رہتی ہے اور میں یہاں بھیک مانگتا پھرتا ہوں۔“ یہ کہتے کہتے دکھ کا گہرا سایہ اس کے چہرہ پھیل گیا۔

نوشا کو اس کی بات پر سخت تعجب ہوا۔ ہونق کی طرح آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”اے تیری بھی ہے؟“

راجہ ترش روئی سے بولا۔ ”کیوں نہیں ہے؟“

”اور باپ؟“ نوشا نے دریافت کیا۔

راجہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر نوشا کو دیکھا۔ دکھ بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ ”یارا وہ تو فسادات میں مارے گئے۔ دو بڑے بھائی تھے وہ بھی قتل کر دئے گئے۔ ہم دونوں کو تو دتی ہے وہ سالہا بشیر الایا تھا۔ ایک نمبر حرامی تھا۔ مجھے بہت مارا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے جل کر گالی دے دی۔ سالہا میرے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ جلتی سگریٹ سے میرا منہ چیر کر زبان جلا ڈالی۔ یہ دیکھ۔“ اس نے منہ کھول کر زبان نکالی جس کے ایک گوشے میں بھورا سادھبا تھا۔ نوشا نے غور سے اس کی جلی ہوئی زبان دیکھی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر بولا۔

”سالہا بڑا حرامی تھا۔“

”ایک نمبر حرام کا قحتم تھا۔ میری زبان جلانے پر اماں کو بھی بہت غصہ آیا تھا۔ اس سالے سے تو کچھ کہا نہیں۔ لیکن دوسرے ہی دن مجھے یتیم خانے میں داخل کرادیا۔“

نوشا نے ایک بار پھر اسے امتحان کی طرح گول گول آنکھیں نکال کر دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”اے تو یتیم خانے میں بھی رہ چکا ہے؟“

”یہ سالہا بھیک مانگنے کی عادت دیں سے تو پڑی ہے۔ وہاں سالہا ایک ملاں تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ پر ایک نمبر ہی تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ چھوٹا مہتمم تو ذرا اچھا تھا مگر بڑا بہت پاجی تھا۔ روزانہ شام کو معائنہ کرنے آتا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں بید ہوتا۔ جو لڑکا پیسے کم لاتا اس کی شامت آجاتی۔ یار ایسی مارا کرتا تھا کہ اب بھی یاد کرتا ہوں تو رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ راجہ نے یتیم خانے کے بڑے مہتمم کو ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں دے کر اپنے دل کا غبار ہلکا کیا۔ ”ایک روز مجھے صرف گیارہ آنے ملے۔ بس اسی بات پر اس کے آگ لگ گئی۔ سالے نے مارا کر دہنہ بنا دیا۔ اسی رات میں یتیم خانہ سے نکل بھاگا۔“

نوشا نے پوچھا۔ ”وہاں سے تم ماں کے پاس گئے ہو گے؟“

”نہیں یارا وہ پھر یتیم خانے بھجوا دیتی۔ وہ سالہا ڈھیل میری کھال اوھڑ دیتا۔“

مل کر: نصی میں اگر: حم: جنا: ایک نمبر: ہمدردی کے باز: مہتمم: غیر انتظام کرنے والا: پاجی: بکینہ: بد معاش: رو گئے کھڑے ہوا: خوف کے باعث: کانچا: ڈرنا: دل کا غبار: غصہ: ڈھیل: لمبی داڑھی والا۔

بھانپنا: صورت سے اندازہ لگانا: آبدیدہ: رونے پر آمادہ: دل جوئی: تسلی دی: ٹھاٹھ: بیش آرام: شان و شوکت: ہونق: ہمت۔

”ماں تم کو یاد تو کرتی ہوگی۔“ نوشا نے دہی زبان سے کہا۔

”پتہ نہیں۔ پر میں تو اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گا۔“

نوشا نے سوال کیا۔ ”کیوں؟“

راجہ خاموش بیٹھا رہا۔

نوشا اصرار کرنے لگا۔ ”یار آخر بات کیا ہے؟“ اس نے قدرے توقف کے بعد دریافت کیا۔

”وہ رہتی تو یہیں ہے نا؟“

”نہیں بے۔ وہ تو ابھی تک لاہور ہی میں ہے۔ میں بھاگ کر یہاں آ گیا۔“

”کبھی اس سے ملنے بھی نہیں گئے؟“ نوشا نے کرید کر پوچھا۔

راجہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ ”تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔“ اب اس کے پاس جا کر کیا کروں گا۔ سالہا

منڈی میں رنڈی کا پیشہ کرتی ہے۔ کبھی مل گئی تو خدا کی قسم قتل کر دوں گا۔ بھرے کو بھی نہ

چھوڑوں گا۔ اسی سالے نے تو اسے اس دھندے سے لگایا ہے۔“ وہ نچھنے پھلا کر ہانپنے لگا۔ نوشا

مارے ڈر کے کوئی بات نہیں کی۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد راجہ نے کہا:

”بات میں نے تجھے بتا دی لیکن تو نے اگر کسی سے کچھ کہا سنا تو سمجھ لینا اچھا نہ ہوگا۔“

نوشا نے جلدی جلدی قسمیں کھا کر اسے یقین دلایا۔

راجہ کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجھلاہٹ رفتہ رفتہ مٹتی جا رہی تھی اور دکھ کا احساس سالے

طرح پر چیلتا جا رہا تھا۔ کھولی کے پچھواڑے کھنڈر میں ایک کتا خوفناک آواز سے رورہا تھا۔ بہت دیر

راجہ کی آواز ابھری۔

”یار میرا تو جی چاہتا ہے اس سالے شہر ہی کو چھوڑ دیں۔ بول کیا کہتا ہے؟“

”مگر جائیں گے کہاں؟“

”ابے کراچی چلیں گے۔ بڑے زور زور کا شہر ہے۔ کام تو وہاں پھٹ سانی مل جاتا ہے۔“

نے مسکرا کر بتایا۔

نوشا فوراً رضامند ہو گیا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔ یار واقعی اب یہاں رہنے کا

نہیں چاہتا؟“

راجہ خوشی سے اچھل کر بولا۔ ”تو پھر ملا اسی بات پر بلاؤ والا ہا تھا۔“

دونوں نے گرم جوشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ دبوچ لیا۔ اس وقت وہ کسی انجانی مسرت سے

سرشار تھے۔ ان کے لیے اس احساس میں بڑی دل کشی تھی کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دیں گے جس میں ہر

طرف دکھ ہی دکھ تھے۔ ان دکھوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اب انہوں نے راستہ دیکھ لیا تھا۔ وہ

ابھی اس لذت سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ شامی پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی راجہ نے زور کا نعرہ

لگایا۔ ”آیار۔ بس تیری ہی کسر تھی۔“

لیکن شامی اس پر جوش خیر مقدم سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ وہ اداس اور مر جھایا ہوا نظر

آ رہا تھا۔ نوشا نے اس کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر پوچھا۔ ”ابے چپ کیوں ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ راجہ نے ڈپٹ کر دریافت کیا۔ ”ابے منہ سے تو بول۔ آخر بات کیا ہے؟“

اس نے آہستہ آہستہ بتایا۔ ”سالے ڈاکٹر موٹو نے لبا سے میری شکایت کر دی۔ بس اسی بات

پر انہوں نے مجھے رانا شروع کر دیا۔ اب تک کمر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ اپنی کمر سہلانے لگا۔

راجہ نے کہا۔ ”تو نے لبا سے کہا نہیں کہ اصلی بات کیا تھی۔“

”یار انہوں نے میری سنی ہی کب۔ بس ایک دم دھنکنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر موٹو کے ساتھ

سالا اس کا لڑکا بھی تھا۔ خوب خوش ہو رہا تھا۔ یار کتنی ذلت کی بات ہے۔“ اس کی آواز بھر گئی۔

نوشا نے فوراً سے بتایا۔ ”ابے ہم دونوں تو کراچی جا رہے ہیں۔ یہاں اب رہنا بالکل بیکار ہے۔

نئے دیکھو گا لیاں دے رہا ہے۔ مار رہا ہے۔“

شامی نے حیرت زدہ نظروں سے پہلے نوشا کو دیکھا پھر راجہ سے پوچھا ”کیوں بے راجہ! یہ

نوشے ٹھیک کہہ رہا ہے؟“

”ہاں جی، اپنا تو اب یہی پروگرام ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تو بھی ہمارے ساتھ چل۔ تینوں

ٹھاٹھ سے وہاں رہیں گے۔ نہ کسی سالے کا ڈرنہ کسی کی دھونس۔“

شامی پہلے تو کچھ جھجکا، پھر آمادہ ہو گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ سفر کے لیے رقم کہاں سے مہیا کی

جائے۔ یہ مسئلہ شامی نے حل کر دیا۔ اس کے پاس اخباروں کی بکری کے تیس روپے موجود تھے۔

وہاں سے اٹھ کر وہ گھر گیا اور چپکے سے سارے روپے نکال لایا۔

کر: کٹھنٹ کر: ڈانٹ کر دھکتا: بہت زیادہ مارنا: دھونس: دھمکی۔

رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ پونے گیارہ بجے ایک پنجر ٹرین کراچی جاتی تھی۔ انہر سوچا، کل تک انتظار کیوں کیا جائے۔ سیدھے اسٹیشن پہنچے۔ ٹکٹ خریدے اور ٹوین میں سوار کراچی روانہ ہو گئے۔

(۳)

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

راجہ، نوشا اور شامی ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ فرش پر ٹانگیں پھیلائے بے خبر سو رہا تھا۔ قریب ہی نوشا اور شامی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بجلی کی زور و زشتی میں مسافر سامان کے بندلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ سو رہے تھے۔ کچھ ا رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

نوشا نے اچانک راجہ کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی مگر وہ بڑی گہری نیند میں تھا، بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ نوشا نے جل کر اس دفعہ زور سے جھنجھوڑا۔ راجہ نے آنکھ کرا کر اس کی جانب دیکھا۔ بگڑ کر بولا۔

”یار سونے دے۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان کر رہا ہے؟“

نوشا نے آہستہ سے کہا۔ ”اے اٹھ تو۔“

راجہ لمحہ بھر تو آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہا پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ ایک آنکھ دبا کر شامی کی طرف اشارہ کیا جو دیوار کی طرف منہ کئے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ راجہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گھبرائی ہوئی نظروں۔ شامی کو گھورنے لگا۔

ذرا دیر وہ اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر کھسک کر شامی کے قریب گیا۔ محبت سے اس کے کند پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ تھپ تھپایا۔

”اے رو رہا ہے؟“

شامی نے کوئی جواب نہ دیا۔ برابر سسکیاں بھر رہا تھا۔ راجہ نے اس کے کان کے پاس منہ

کر سرگوشی کی۔ ”اے بات کیا ہے؟“

کئی بار دریافت کرنے پر شامی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”گھریاد آرہا ہے۔“

راجہ کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ اس نے شامی کو گندی سی گالی دی۔ ”جب یہی بات

تھی تو سالے ہمارے ساتھ آیا ہی کیوں تھا۔؟“

نوشا نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اور بھی زیادہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اب اس کی آواز کپکپارٹنٹ کی خاموشی میں صاف سنائی پڑ رہی تھی۔ جو مسافر جاگ رہے تھے وہ مڑ مڑ کر تینوں کی جانب دیکھنے لگے۔ راجہ نے پریشان ہو کر نوشا سے کہا۔ ”یار یہ سالہ تو سب کو پکڑوائے گا۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

نوشا بھی سہا ہوا تھا۔ دبی زبان سے گویا ہوا۔ ”سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔“

دونوں نے چکار کر خاموش کرانے کی کوشش کی تو شامی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ راجہ غصے سے تمللا اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ شامی کی گردن دو بوج کر خوب مارے مگر مسافروں کے ڈر سے کچھ نہ کر سکا۔ آخر دونوں نے طے کیا کہ اگلے اسٹیشن پر شامی کو سمجھا بھا کر منانے کی کوشش کی جائے۔ اب سفر جاری رکھنا ان کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ جیسے ہی ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی دونوں شامی کے ہمراہ کپکپارٹنٹ سے باہر آ گئے۔

یہ جھوٹا ساقصابی اسٹیشن تھا ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ ٹرین ذرا دیر رک کر روانہ ہو گئی اسٹیشن کے سائے میں چند لمحوں کے لیے ہلچل پیدا ہوئی پھر ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ اسٹیشن کی مختصر عمارت میں دھندلا سالیپ روشن تھا جو ہر سمت پھیلے ہوئے اندھیرے میں روشنی کا دھبہ معلوم ہو رہا تھا۔

تینوں اسٹیشن سے باہر جانے کے بجائے پلیٹ فارم ہی کے ایک گوشے میں ٹھہر گئے۔ شامی ابھی تک سسکیاں بھر رہا تھا۔

راجہ جلا ہوا تو تھا ہی اس نے جھنجھلا کر کئی گالیاں دیں۔ مارنے کے لیے بھی جھپٹا۔ مگر نوشا نے سمجھا بھا کر مار پیٹ سے باز رکھا۔ شامی نے خوفزدہ ہو کر رونا بند کر دیا۔

تینوں نے طے کیا کہ صبح تڑکے جو ٹرین آئے گی اس سے سفر کیا جائے۔ شامی نے گھر واپس

تن بدن میں آگ لگنا: سخت غصہ آتا۔ ہو کا عالم: ویرانی: مکمل خاموشی: صبح تڑکے: صبح سویرے



راجہ اور نوشا کو بھوک کے مارے نیند نہیں آرہی تھی۔

(۴)

جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب وہ کسی حد تک مطمئن نظر آرہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تینوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ ہوا میں خشکی آگئی تھی۔ سناہم ہو گیا تھا۔

نیند کا غلبہ ہوا تو تینوں اونگھنے لگے اور وہیں پتھر لیے فرش پر سو گئے۔

\*\*\*

ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔ سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ گیا تھا راجہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا ایک خارش زدہ کتابرا بر بیٹھا اپنی گردن زور زور سے کھجرا ہوا تھا۔ راجہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کتادم دبا کر بھاگ گیا۔ راجہ کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ نوشا تو وہیں پڑا سو رہا تھا مگر شامی کا کپڑا پتہ نہ تھا۔ اس نے فوراً نوشا کو جگایا۔ دونوں دیر تک شامی کا انتظار کرتے رہے کہ شاید کہیں ادھر اُدھر چلا گیا ہو تو آجائے۔

مگر شامی رات کے پچھلے پہر آنے والی ٹرین سے واپس جا چکا تھا۔ اس نے کسی کو کانوں کان نہ ہونے دی۔ چپکے سے کھسک گیا۔

راجہ اور نوشا اس قدر گہری نیند سوئے تھے کہ کراچی جانے والی گاڑی جب صبح تڑکے آئی ان کی آنکھ نہ کھلی۔ دوسری گاڑی سہ پہر کو آتی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ ساری رات شامی ہی کے پاس تھی جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ دونوں کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ خیریت ہوئی کہ ٹکٹ راجہ کے پاس رہ گئے تھے۔

دن بھر وہ پلیٹ فارم پر ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہے۔ چار بجے کے قریب ٹرین آئی تو اس میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہو گئے۔

جب وہ کراچی پہنچے تو پہر رات ہو چکی تھی۔ اجنبی شہر، نہ کسی سے جان نہ پہچان، رات کا وقت دونوں جاتے بھی کہاں۔ سفر کے تھکے ہارے اور دن بھر کی بھوک سے نڈھال وہ مسافر خانے کے ایک کونے میں جا کر پڑ گئے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ مسافر خانے میں اکاد کا مسافر رہ گئے تھے۔ وہ ٹانگیں پسار کر سو گئے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ مگر

رات گئے مسافر خانے میں ایک شخص داخل ہوا۔ وہ چال ڈھال اور وضع قطع سے اوباش اور کایاں نظر آتا تھا۔ اس نے چاروں طرف تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ مسافر خانے کا ایک سرے سے دوسرے تک چکر لگایا۔ اچانک اس کی نظر ان دونوں پر پڑی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹکا اور تکیہ نظروں سے دیکھتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا پھر اطمینان سے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے بیٹھے ہی پوچھا۔ ”گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟“

نوشا تو دم بخود ہو کر ڈر گیا۔ البتہ راجہ نے کسی قدر نڈر ہو کر جواب دیا۔ ”نہیں جی، ہم تو اپنے ماموں کے پاس آئے ہیں۔“

”کہاں رہتا ہے تمہارا ماموں؟“

اس غیر متوقع استفسار پر راجہ گھبرا گیا۔ اسے شہر کے کسی علاقے کا نام ہی معلوم نہیں تھا۔ پہلی بار آیا تھا۔ ہکا کر بولا۔ ”وہ۔۔۔ وہاں رہتے ہیں۔ ادھر۔“ اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

وہ شخص ایک آنکھ دبا کر بد معاشی سے مسکرایا۔ ”جھوٹ بولو گے تو استاد سیدھے حوالات میں ہو گے۔“ اب تو راجہ کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ سہمی ہوئی نظروں سے اجنبی کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، دونوں کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”لو پہلے سگریٹ پیو۔“ نوشا تو خاموش بیٹھا رہا۔ مگر راجہ نے ہچکچاتے ہوئے ایک سگریٹ نکال ہی لی۔

اس نے ماچس جلا کر راجہ کی سگریٹ سلاگائی۔ کندھا تھپک کر بولا۔ ”ڈرو مت۔ مجھ سے تم کو کچھ فائدہ ہی پہنچے گا۔ ویسے یہ کراچی سالہا بہت خراب شہر ہے۔ یہاں ایک سے ایک بڑا دس نمبر یا پڑا ہے۔“ دونوں خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ لمحہ بھر رک کر اس نے کہا۔ ”کسی ایسے ویسے

کے چکر میں پڑ گئے تو سمجھ لو گئے کام سے۔“

انہوں نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔  
نے جیب سے دوبارہ سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس دفعہ اس نے اپنی سگریٹ سلگائی۔ لمبا کش کر  
پوچھا۔ ”تو کمری کرو گے؟“

دونوں نے ایک ساتھ چونک کر اسے دیکھا۔ جلدی جلدی گردن ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار  
کیا۔ وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر تیکھے لہجے میں بولا۔ ”دھندے سے تو میں تم دونوں  
لگوادوں گا مگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اچھا نہیں ہو گا۔“  
ان کی سمجھ میں اس شخص کی بات کا مطلب نہ آیا۔ وہ احمقوں کی طرح اسے دیکھنے لگے۔ مگر  
نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
”اچھا تو پھر آؤ میرے ساتھ۔“

دونوں اس کے ہمراہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے نکل کر باہر سڑک پر آئے اور مختلف راستوں  
چکر کاٹتے ہوئے کوئی پون گھنٹے بعد ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ یہ علاقہ اسٹیشن سے ذرا  
دور نہیں تھا۔ آبادی خاصی کم تھی۔ مگر گندی اور بے ترتیب تھی۔ جس میں تنگ اور پرچہ گلیاں  
تھیں۔ بیشتر مکانات کچے اور نیم پختہ تھے۔ مگر وہ مکان پختہ تھا۔ الگ تھلگ تھا اور ایک گلی کے کنارے  
تھا۔ اس کی دیواریں بلند تھیں۔ اور دھلے ہوئے کپڑوں کی طرح اجلی نظر آرہی تھیں۔ چاروں  
طرف گہرا سناٹا تھا۔ گلی کے اندر اندھیرا بھی تھا۔ راجہ اور نوشا خاموش کھڑے رہے۔ اس شخص  
آگے بڑھ کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔  
دروازہ تو نہیں کھلا۔ البتہ کسی نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر پوچھا۔ ”کون؟“

”میں ہوں جی رحمان۔“ وہ شخص بولا۔  
”اچھا اچھا۔“ اندھیرے میں کسی کی آواز ابھری لیکن اس کا چہرہ نظر نہ آ سکا۔

ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ رحمان دونوں کے ہمراہ اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرے والوں نے  
گزر کر وہ کمرے میں پہنچے جہاں لیپ کی دھندلی روشنی میں گٹھے ہوئے جسم اور میاں قد کا ایک آدا  
آنکھیں بند کئے سر کی مالش کر رہا تھا۔ وہ گھٹنوں تک اونچی لنگی باندھے ہوئے تھا۔ بدن پر صرف بنا

عبداللہ عرف دلا جانے لگا تو اس نے ٹوکا۔ ”دیکھ وہ کونے والا کمرہ خالی کر دینا۔ دونوں اس  
میں رہیں گے۔ آج تو ان کو کہیں اور سلا دے۔“ وہ نوشا اور راجہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”جاؤ جی تم اس

کے ساتھ۔ ڈٹ کر روٹی کھاؤ اور آرام کرو۔“

دونوں خاموشی سے دلا کے پیچھے پیچھے کمرے سے چلے گئے۔

\*\*\*

شاہ جی نے رحمان سے دریافت کیا۔ ”ہاں جی اب معاملے کی بات کرو۔ کیا لو گے؟“  
”شاہ جی آج تو سیدھے ہاتھ سے سوسو کے بیس کرارے کرارے دلوادو۔ خدا قسم بڑے  
کے چھو کرے ہیں۔“

شاہ جی نے اسے جھڑک دیا۔ ”ٹھیک ٹھیک بات کر۔ ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہیں ملے گا۔  
”ارے شاہ جی! کیا ظلم کر رہے ہو۔ اتنے میں سودا نہ ہو گا۔ واپس بلوالو۔ ابھی تو انہوں  
تمہارا نمک بھی نہیں پھینکا۔“

شاہ جی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”دلالی کرتے کرتے دادا گیری تو نے کب  
شروع کر دی؟ کھال میں رہ کھال میں۔ زیادہ پتیرے بازی نہ دکھا۔ مارا جائے گا۔“  
رحمان روٹی صورت بنا کر بولا۔ ”جب ہی تو میں تمہارے لیے مال نہیں لاتا۔“  
”چل چل ٹسوے نہ بہا۔ سواور لے لے۔“

رحمان نے تھوڑی جیل و جھٹ کرنے کے بعد شاہ جی کو پندرہ سو روپے پر راضی کر لیا۔ سو  
اسی وقت مل گئے۔ بقیہ چودہ سو کے لیے شاہ جی نے وعدہ کیا کہ تیسرے دن ادا کر دئے جائیں گے۔  
رحمان سو روپے لے کر چلا گیا۔ شاہ جی خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دلا واپس آ گیا۔  
جی نے پوچھا۔

”دونوں کو روٹی کھلا دی؟“

وہ مستعدی سے بولا۔ ”ہاں جی۔“

”دونوں کو بلا کر یہاں لا۔“

دلا فوراً آ کر دونوں کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ شاہ جی نے انہیں دیکھ کر کسی قدر شفقت سے کہا  
”روٹی پیٹ بھر کر کھائی؟“

اس تمام عرصے میں نوشا پہلی مرتبہ بولا۔ ”خوب پیٹ بھر کر کھائی ہے۔“

”ارے تو بھی بولنے لگا۔“

نوشا شرما گیا۔ شاہ جی بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”چائے پیو گے؟“  
دونوں نے آمادگی کا اظہار کیا تو اس نے گردن موڑ کر دلا کو مخاطب کیا۔ ”دئے دو سنگل چائے

منگوا۔“

راجہ کو سگریٹ کی طلب ستار ہی تھی۔ دبی زبان سے بولا۔ ”شاہ جی! ایک سگریٹ بھی  
منگواؤ۔“

شاہ جی بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ ”او تیرا خانہ خراب، سگریٹ بھی پیتا ہے۔“ اس نے دلا  
کی جانب دیکھا۔ ”ان کے لیے پاسنگ شو کو ایک پاکٹ بھی لادے۔“

دونوں کے چہرے پر تازگی آ گئی۔ شاہ جی اس وقت بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے بے نیازی سے  
پوچھا۔ ”اور کچھ؟“ راجہ اور نوشا نے انکار میں گردن ہلا دی۔ شاہ جی نے دونوں کا جائزہ لیا۔ ان کے  
لباس گندے اور بوسیدہ تھے۔ راجہ ننگے پیر تھا۔ نوشا جوتے پہنے ہوئے تھا۔ مگر ان کی حالت بھی خستہ  
تھی۔ ایک جوتے کے اگلے حصے سے انگوٹھا جھانک رہا تھا۔

”کیوں جی تم دونوں کے پاس کپڑے لے لے بھی ہیں؟“

دونوں ایک ساتھ بولے۔ ”نہیں۔“

شاہ جی نے دلا کے لیے ایک اور حکم صادر کیا۔ ”کل تو نے بازار جانا ہے۔ ان کے لیے دو  
شلواروں اور کرتوں کا کپڑا لے آنا۔ ماسٹر سے کہنا فافٹ سی دے۔ موچی گلی سے دو پشوری چلیاں اور  
ٹوپیاں بھی۔ دئے نواب بنادے ان کو۔“

وہ ان کو ”نواب“ کے لیے ابھی اور نہ جانے کیا کچھ کرتا اسی اثنا میں باہر سے دروازہ کھلنے کی  
آواز آئی۔ شاہ جی نے چونکا ہوا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ باہر دالان میں بھاری قدموں کی آواز  
اُبھری۔ پھر ملی جلی سرگوشیوں کی جھنجھناہٹ سنائی دی۔ شاہ جی لنگی ٹانگ کے اوپر چڑھا کر، ایک ہاتھ  
سے ران کھانے لگا۔

”تم جا کر اب سو جاؤ۔ دئے! ان کو سونے کی جگہ بتادے۔“ شاہ جی نے دونوں کو رخصت  
کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عبداللہ عرف دلا کے ہمراہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

آندگی: رحمان کی بے ڈھنگی: براطریقہ: خستہ: خراب۔

دلالی: سودا کرانے کا پیشہ: داد گیری: بد معاشی: کھال میں رہنا: اوقات میں رہنا: جیت میں رہنا: پتیرے بازی: ہوشیاری: ٹسوے بہانا: لاث موت روکا: دکھاوے کے آئینہ بہانا: جیل و جھٹ: بحث و تکرار۔

قدروہ سوچیں اسی قدر دل میں نئے نئے دوسرے پیدا ہوتے۔  
انواسکول سے واپس آیا تو ماں نے اسے فوراً نوشا کی تلاش میں بھیجا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

گھنٹہ بھر بعد آؤ آیا تو وہ اکیلا تھا۔ اسے تنہا دیکھ کر ماں کے دل پر گھونسا سا لگا۔ آؤ کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمنتار ہا تھا۔ بالوں پر گرد اور آنکھوں میں تھکن تھی۔ وہ صبح کا بھوکا پیاسا تھا۔ ماں نے اسے کھانا کال کر دیا۔ مگر خود کچھ بھی نہ کھایا۔ نڈھال ہو کر کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پیشتر سلمان آیا۔ ماں نے نوشا کی گمشدگی کی اسے بھی اطلاع دی۔ وہ اسی وقت آؤ کو اپنے ہمراہ لے کر نوشا کی تلاش میں نکل گیا۔ جہاں جہاں اس کے ٹھکانے تھے ہر جگہ ڈھونڈنے کے ہر لڑکے سے دریافت کیا۔ کسی نے کوئی سراغ نہ دیا۔ شامی سے بھی انہوں نے پوچھا۔ مگر وہ ڈر کے مارے صاف جھوٹ بول گیا۔

”میں نے تو اسے ہفتے بھر سے نہیں دیکھا۔“

دیر تک وہ جگہ جگہ نوشا کو تلاش کرتے رہے۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا۔ روشنیاں جھلملانے لگیں۔ مگر نوشا کی کوئی خبر نہ ملی۔

سلمان جب آؤ کے ساتھ نوشا کے بغیر واپس پہنچا تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کمرے میں سلطانہ کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ سلمان سر جھکائے دالان میں خاموش بیٹھا تھا۔ لپ کی برقان زدہ زرد روشنی میں سب کے چہرے پر چھائیوں کی طرح دھندلے نظر آرہے تھے۔

سلمان کچھ دیر ٹھہر کر چلا گیا۔

اس روز گھر میں کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ آؤ تو دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھتے اونگھتے سو گیا۔ مگر سلطانہ اور اس کی ماں کو نیند نہ آئی۔ رات کا سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ گلی کی چہل پہل ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ پھر اس سکوت میں ماں کی آواز ابھری۔

”یٰٰن اللہ سے دعا کرو۔“

## فصل چہارم

(۱)

نوشا کے اچانک غائب ہو جانے سے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔

رات کو وہ واپس نہیں پہنچا تو سویرے ہی سویرے ماں نے پوچھا۔ ”ارے یہ نوشا ابھی تک آیا؟“ کوئی اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ وہ جھنجھلا کر نوشا کو کونے پینے لگی اور دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ چڑھ گیا۔ ہر طرف دھوپ پھیل گئی۔ آؤستائیں سنبھال کر اسکول چلا گیا۔ گلی میں پھیری لگانے والی کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ ٹھکے کے بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا لیکن نوشا کا کہیں پتہ نہ چلا۔

ماں نے جھنجھلانا اور بڑبڑانا بند کر دیا تھا۔ اب اسے تشویش لاحق ہوئی۔ بار بار دروازے جانب نظر اٹھ جاتی۔ آج تک نوشا اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر رات کی باتیں آرہی تھیں۔ ہر بار سوچتی کہیں سچ مچ وہ ناراض ہو کر کسی طرف چلا تو نہیں گیا۔ اپنے اس خدشے اظہار اس نے سلطانہ سے بھی کیا جو دالان میں بیٹھی بیڑی کے پتے تراش رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہیں ساری آئی گئی اس کے سر نہ جائے۔ جب وہ ان خدشات کے بارے میں سوچتی تو دل ہی دل نوشا کو کونے دیتی۔ حرامی نے خواہ مخواہ پریشانی میں ڈال دیا۔ نہ جانے کہاں وہاں تباہی گھوم رہا ہوگا۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ پور ہو گئی۔ گھر کے کام کاج میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گلی میں کہ آواز ابھرتی وہ چونک پڑتی۔ دروازے پر آہٹ ہوتی اور اس کے کان کھڑے ہوئے۔ سلطانہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بیٹھ کر قیاس آرائیاں کرنے لگیں کہ نوشا کہاں ہو سکتا ہے۔

پریشان سا نظر آتا۔ لباس میں بے نیازی، بال اٹھے ہوئے، آنکھوں میں دبے دبے کرب کے سائے۔ عام طور پر وہ خاموش رہتا۔ گھڑی دو گھڑی بات کرتا۔ وہ بھی انوکھے بارے میں۔ اس کا ارادہ تھا کہ انوکھی کچھ اسکول میں داخل کرادیا جائے۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلانی جائے۔ انوکھا موجود ہوتا تو بلا کر پڑھائی کے متعلق پوچھتا۔ کتابیں منگواتا اور دیر تک بیٹھا اسے پڑھاتا رہتا۔ اس عرصے میں کبھی کبھار سلطانہ کی جھک نظر آ جاتی۔ یہ لمحہ بڑا حسین ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے خوشبو میں بسا ہوا جھونکا پاس سے گزر جائے۔



شام کا وقت تھا بلکی بلکی بوند اباندی ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ گھر پر ویرانی چھائی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سب خاموش بیٹھے تھے۔ گھر میں صبح سے کچھ نہیں پکا تھا۔ نفاہت کے باعث سب کی طبیعتیں ٹنڈھال تھیں۔ ماں بہت بنی، کھوئی کھوئی نظروں سے آنگن کی دیوار کو تیک رہی تھی جس پر برابر والے نکان میں لگے ہوئے شیشم کے درخت کا مہیب سایہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ انوکھا کر بیٹھی تھی جو بھوک سے بے قرار ہو کر رونے لگا تھا اور سمجھانے سمجھانے پر بھی روتا رہا۔ اب وہ کمرے میں پڑا ہوا سسکیاں بھر رہا تھا۔ مارنے کو تو وہ مار بیٹھی مگر اب خود کو ملامت کر رہی تھی۔ اکیلا وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔

سلمان آیا تھا۔ ماں نے اندر بلالیا۔ اسے دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو گئی۔ سلمان کی قیص پر جبکہ بگڑنے کے سرخ سر نہ دے تھے۔ ایک آنکھ سو جی ہوئی تھی۔ بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ اس نے گہرا کر پوچھا۔

”اے یہ کیا ہو گیا؟“

”بے نیازی سے بولا۔“ تاکے نے آ رہا تھا۔ سڑک گیلی تھی۔ گھوڑے کا پیر پھسل گیا۔ تانگا لٹنے سے چوٹ آ گئی۔“ مگر یہ چوٹ تانگا لٹنے کی نہیں تھی۔ اس کی لال لال آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ کسی سے لڑ کر آیا ہے۔ لیکن نوشا کی ماں کو اس کی بات پر یقین آ گیا۔

ماں نے جلدی سے سلطانہ کو باورچی خانے میں بھیجا۔ پانی گرم کر دیا۔ اور اس کے بازو اور

اس نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر اسی وقت غسل کیا۔ دھلے ہوئے ابلے کپڑے پہنے اور مٹھا کر نماز پڑھنے لگی۔ سلطانہ بھی وضو کر کے اس کے پاس آ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر ماں دروازے پر سجدے میں پڑی اور دو کر دعائیں مانگتی رہی۔

جب رات آدھی ہو گئی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا تو ماں سلطانہ کے ہمراہ باہر مٹی آ گئی۔ آسمان کے نیچے برہنہ سر ہو کر دونوں گڑ گڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔ ان کی آنکھوں سے آجاری تھی۔ ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کبھی کبھی ماں بے قرار ہو کر اونچی آواز میں کہتی۔

”اللہ! میں بہت مصیبت زدہ ہوں۔ میرے بچے کو مجھ سے ملا دے۔ میں رائے بیوہ ہوں۔ کوئی سہارا نہیں، میرا کوئی نہیں۔ ہائے میرا کوئی بھی تو نہیں۔“

وہ بلک بلک کر رونے لگتی۔ سلطانہ کی آواز بھی بھرا جاتی۔ اس کی سسکیاں ابھرنے لگتیں۔ آسمان پر تارے آنسوؤں کے قطروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ رات ڈھلچلی گئی۔ ستارے رنگت کا فوری پڑ گئی۔ ہوا سرد ہو گئی۔ اوس سے درو دیوار بھیگ گئے۔ دونوں برہنہ سر محن میں ٹہل کر دعائیں مانگتی رہیں، گڑ گڑاتی رہیں، اٹک بھاتی رہیں۔

ساری رات پریشانی اور بے قراری میں گزری۔ پھر کئی راتیں اسی عالم میں گزریں۔ ماں رو کر برا حال کر لیا تھا۔ وہ ہر وقت چپ بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھر کے بے خیالی میں کہتا۔

”یا اللہ! میرا بچہ نہ جانے کہاں ہو گا۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔“

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ بیٹھے بیٹھے خود کو کوسنے لگی۔ نوشا کے چلے جانے کا اسے بے حد ہوا تھا۔ اس نے نوشا کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ ضرورت سے زیادہ اس کا لاڈ کیا تھا۔ اس کی معقول بھی تھی۔ سلطانہ کے بعد دو لڑکے پیدا ہوئے مگر سال ڈیرہ سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ نوشا بچپن میں دائم المریض تھا۔ اس کے علاج معالجے کے لیے اس نے نہ جانے کیا کیا جتن کئے تھے۔ انہی دنوں ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ بیڑی کے کارخانے میں ہڑتال ہو گئی۔ آمدنی کا اچانک منقطع ہو گیا۔ یہ بہت بڑی مار تھی۔ ایسی شوکر لگی کہ وہ اف بھی نہ کر سکی۔ صرف ایک ہی بار بار ذہن میں سوال بن کر ابھر تا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ چند ہی روز میں فاقہ کشی کی نوبت آئے۔ نیاز ان دنوں اپنے کسی کام سے کوئٹہ گیا ہوا تھا۔ البتہ سلمان اکثر آتا رہتا۔ مگر وہ بھی

وہ اس سوال کے لیے تیار تھی۔ ”اے وہی خالہ نچو کے بڑے بیٹے اور کون؟“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”تم نے ان کو کہاں دیکھا ہوگا۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”وہ لوگ جب سے پاکستان آئے ہیں ملتان ہی میں ہیں۔ کبھی یہاں آتے تو تم سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ یہ لڑکا کل آیا تھا۔ شام تک اچھا بھلا تھا۔ اس وقت بخار میں بھن رہا ہے۔“

نیاز نے حیرت سے کہا۔ ”بارش میں تو نہیں بھیگ گیا؟“ وہ سلمان کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ لگایا۔ سلمان کی سانس لحظہ بھر کے لیے رک گئی۔ ”اے اس کو تو بڑا تیز بخار ہے۔“ یہ کہتے کہتے اس نے سلمان کو غور سے دیکھا جو چادر اوڑھے دیوار کی طرف منہ موڑے لیٹا تھا۔ نیاز کو کچھ شبہ ہوا۔ مگر سلمان کے چہرے پر اندھیرا اچھلایا تھا۔ لہذا وہ اسے پچان نہ سکا۔

نوشا کی ماں نے جلدی سے بات کا رخ پلٹ دیا۔ وہ نوشا کے اچانک گھر سے چل جانے کی خبر سنانے لگی۔ مگر نیاز نے اس کی بات سن کر کسی تشویش کا اظہار نہ کیا۔ نہ ہمدردی کی نہ دل جوئی۔ بے نیازی سے بولا۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کچھ دن ٹھو کریں کھائے گا۔ ساری آوارہ گردی نکل جائے گی۔“

نوشا کی ماں کو نیاز کا ردیہ اچھا نہ لگا۔ وہ اس سے ہمدردی کے دو بول سننے کی خواہش مند تھی۔ نوشا کا تذکرہ نظر انداز کر کے نیاز کو نیلے کی باتیں بتانے لگا۔

زہ چپ بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔

نیاز زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔

سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ جتنی دیر نیاز بیٹھا باتیں کرتا رہا اتنی دیر اس کی جان سولی پر لٹکی رہی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آئندہ اس گھر میں آتے وقت اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ان کی باتوں سے یہ تو واضح ہو چکا کہ نیاز، نوشا کی ماں کا رشتہ دار ہے اور وہ نیاز سے اس کی آمدورفت چھپاتا بھی چاہتی ہے۔ یہی اس کے حق میں بہتر ہوا۔ ورنہ وہ دوبارہ اس گھر میں آنے جانے کے قابل نہ رہتا۔

کندھے پر جو زخم تھے ان کو اپنے ہاتھ سے صاف کرنے لگی۔ بارش یکایک تیز ہو گئی۔ پانی کے موٹے قطرے شور کرتے ہوئے گرنے لگے۔ رات اور گہری ہو گئی۔ موسلا دھار بارش برابر رہی۔ ہوا کے جھکڑ سیٹیاں بجاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ایسی طوفانی رات میں سلمان کے جا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ گھر جانے کے لیے اصرار بھی کرتا رہا مگر نوشا کی ماں نے ایک نہ سنی۔ والار چارپائی بچھا کر بستر لگا دیا۔ کچھ دیر بستر پر لیٹا وہ باتیں کرتا رہا مگر زخموں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں زیادہ دیر باتیں نہ کر سکا۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ماں اٹھ کر کمرے میں چلا بارش کے قطرے شیشم کے پتوں پر گرتے رہے۔ ہوا کی تیز سرسراہٹ رک رک کر ابھرتی رہی گیارہ بجے کے قریب بارش کا زور ٹوٹا۔ مینہ بند ہو گیا تھا لیکن ہوا تیز چلتی رہی۔ بادل گر جتے۔ اچانک رات کے سناٹے میں دروازے پر نیاز کی آواز ابھری۔ نوشا کی ماں تذبذب میں پڑا اس وقت نیاز کو گھر میں بلایا جائے یا نال دیا جائے۔ سلمان کو دیکھ کر نہ جانے کیا سوچے۔ مزاج کا بھی بھٹی تھا۔ خدا معلوم کیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ وہ خاموش لیٹی یہی سوچ رہی تھی کہ نیاز نے آواز سے اٹھ کر پکارا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتا۔ وہ اسے ناراض بھی کرتا۔ تھی۔ بادل خواستہ خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ نیاز گھر کے اندر آ گیا۔ سلمان کو دالان میں دیکھ کر بولا۔

”یہ کون لیٹا ہے؟“

سلمان نے نیاز کی آواز پہچانی لی تھی۔ وہ گھبرا گیا کہ اگر نیاز نے اسے دیکھ لیا تو بہت برا اس گھر میں اس کا جو بھرم قائم تھا فوراً خاک میں مل جائے گا۔ نیاز اس کے سارے حالات سے اسے کو آگاہ کر دے گا۔ وہ کسی قیمت پر یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ باتیں نوشا کی ماں کو معلوم ہوں۔ وہ سادھے چپ لیٹا رہا اور آنے والے حادثے کا انتظار کرتا رہا۔

نیاز کے اچانک استفسار پر نوشا کی ماں لمحہ بھر کے لیے گھبرائی۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا فوراً بات بتائی۔ ”بھائی اچھن کا منجھلا لڑکا ہے۔“

خیریت یہ ہوئی کہ اس نے سلمان نام نہیں بتایا۔ لیکن نیاز کسی بھائی اچھن کو نہیں جانے لفظ بھر کے لیے اس نے غور کرنے کی کوشش کی پھر بولا۔

”کون بھائی اچھن؟“

جوسان تھادہ بازار میں فروخت ہونے لگا۔ کوئی ایسا کام نہیں مل رہا تھا جس سے پیٹ پالا جاسکے۔ سلائی کی مشین ہوتی تو پاس پڑوس کے کپڑے سی پرو کر بھی گزارہ ہو جاتا۔ اسے خریدنے کے لیے نوشا کی ماں نے کئی بار رقم جوڑی، مگر کوئی نہ کوئی ایسا خرچ نکل آتا کہ ساری بچت صرف ہو جاتی۔

وہ بستر پر لیٹی اپنی پریشانیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ سلطانہ اور آؤب کے سو گئے تھے اور وہ خاموش پڑی رات کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ اسی اثناء میں نیاز آگیا۔ وہ کئی روز بعد آیا تھا بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر ہنس رہا تھا۔ وہ سامان سے لد اچھندا آیا تھا جس میں مٹھائی تھی، پھل تھے اور سنگھار کی کچھ اشیاء تھیں۔ آتے ہی سارے بڈل اس نے نوشا کی ماں کے سامنے ڈال دیئے اور چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ کر بولا۔

”آج تو میں بہت تھک گیا۔“

وہ بولی۔ ”خیر تو ہے۔ کہاں سے تھکے ہارے آرہے ہو؟“

”کچھ نہ پوچھو۔ پہلے تم مجھے پانی پلاؤ۔ پیاس کے مارے گلا سوکھ رہا ہے۔“

وہ نور اپنی لے آئی۔ نیاز واقعی بہت پیاسا تھا۔ پورا گلاس ایک ہی سانس میں غٹا چڑھا گیا۔ پانی پی کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ نوشا کی ماں، نیاز کا لایا ہوا سامان کھول کر دیکھنے لگی۔ شام کو گھر میں کچھ پکا نہیں تھا۔ سلطانہ اور آؤبھو کے سو رہے تھے۔ اس نے سوچا۔ دونوں کو جگا کر کچھ کھلا دے۔ مگر جب اس نے اپنا ارادہ نیاز پر ظاہر کیا تو اس نے منع کر دیا۔

”مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ سب اٹھ جائیں گے تو بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

وہ چپ ہو گئی۔ نیاز پٹنگ اٹھا کر باہر صحن میں لے گیا۔ دونوں وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ دور تک ستاروں کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔ فضا میں خنکی تھی۔ مگر ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ نیاز نے اس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔

”آج میں یہ طے کر کے آیا ہوں کہ مجھے ہاں یا نا کا جواب دے دو۔“

وہ دہلی زبان میں بولی۔ ”کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔“

وہ اور بھی جذباتی ہو گیا۔ ”تم ہر بار یہی کہتی ہو۔ اسی آج کل میں کئی مہینے ہو گئے۔“

صرف: ہستال۔ خنکی: خنک۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ بادل ایک بار زور سے گرے تیز بارش شروع ہو گئی۔ پانی کے قطرے چھت پر شور مچانے لگے۔ سلمان کبھی کبھار درد سے کر بخار تیز ہو گیا تھا۔ اس کا تمام جسم بھیڑی کی طرح چپ رہا تھا۔ آنکھوں کے پوٹے سنگ رہے تھے میں شدید درد تھا۔

ایکایک اس نے اپنے قریب گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اس نے کر نہیں بدلی۔ خاموش لیٹا رہا۔ البتہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سامنے ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ کوئی اس کے سر ہانے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ پھر اسے اپنے رخسار پر ٹھنڈا محسوس ہوئی۔ ایک ہاتھ اس کے چہرے پر آکر ٹپک گیا۔

وہ بے قرار ہو کر آہستہ سے بولا۔ ”سلطانہ۔“

”شی۔“ سلطانہ نے اسے خاموش کر دیا۔

سلمان نے اپنا جلتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے سلطانہ کا نرم نرم ہاتھ کے پاس لاکر چوم لیا۔

سلطانہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ چپ چاپ اس کے پٹنگ کے قریب کھڑی رہی تیز بارش ہوتی رہی۔ ہوا شیشم کے پتوں میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی۔ بادل زور سے گر جتے۔ کمرے کے اندر کروٹ بدلنے کی آواز ابھری۔ سلطانہ نے سلمان کے چہرے پر سے اڑھٹایا اور دور چلی گئی۔ نہ جانے وہ کب کمرے میں گئی۔ کب اپنے بستر پر لیٹی۔ کب اسے نیند آئی۔ کو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ وہ دیر تک خاموش لیٹا سلطانہ کے دوبارہ آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئی صبح ہوئی تو سلمان کا بخار ہلکا پڑ چکا تھا۔ زخموں میں ٹیس بھی کم تھی۔ اب ٹھہرنا مناسب وہ سویرے ہی سویرے نوشا کے گھر سے چلا گیا۔

(۲)

بیزی کے کارخانے کی ہڑتال طول پکڑتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی نوشا کی پریشانیوں بڑھتی گئیں۔ کئی کئی وقت کے فاقے پڑ جاتے۔ گھر میں گرہستی ہی کون سی تھی۔ تھو



وہ ناز سے بولی۔ ”کئی مہینے؟ اے توبہ کرو۔“

”بس اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مبارک دن ہے۔ اسی روز ہو جانا چاہیے۔“

نوشا کی ماں گھبرا کر بولی۔ ”ارے ارے، اتنی جلدی۔“

نیاز نے بڑے پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ رخساروں کو تھپک کر بولا۔ ”مجھ تو اب گھڑی بھر بھی تم سے الگ نہیں رہا جاتا۔ میری بات تم کو ماننی ہی پڑے گی۔“ نوشا کی ماں کچھ کہنا چاہا تو اس نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم کو میری جان کی قسم جو انکار کیا۔ اب پروگرام طے ہو گیا۔“

نوشا کی ماں نے چاہا کہ حسب معمول اس وقت بھی نیاز کو ٹال دے۔ مگر وہ اس کے سر ہو گیا۔ کر بولا۔ ”اگر اس جتنے کو نکاح نہیں ہو سکتا تو پھر کبھی نہ ہو گا۔“ حالات کچھ اس قدر خراب تھے کہ وہ کی دھمکی کا مقابلہ نہ کر سکی۔ روز روز کی فاقہ کشی اور طرح طرح کی پریشانیوں نے اسے بے بس کر دیا اس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ چپ چاپ نیاز کی بات مان لی۔

نیاز نے اسی وقت ضروری اخراجات کے لیے جیب سے نکال کر دو سو روپے دیے پروگرام بھی بتا دیا۔ ”جتنے کو فجر کے وقت میں قاضی کو لے کر آ جاؤں گا۔ وکیل اور گواہ بھی لیتا آ گا۔ میرے خیال میں یہ سب سے مناسب وقت رہے گا۔ میرے ساتھ صرف چند آدمی ہوں۔ تم سارا بندوبست کر لینا۔ جی چاہے تو پودوس سے کسی بڑی بوڑھی کو بھی بلا لینا۔“ گویا ساری اکیس پہلے ہی تیار کر کے آیا تھا۔ ایک ایک بات بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ نوشا کی ماں چپ بیٹھی اور باتیں سنتی رہی۔

جب ساری باتیں طے ہو گئی تو خلاف توقع وہ رات ہی کو اٹھ کر چلا گیا۔

نوشا کی ماں نے ہامی تو بھر لی مگر رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند کا کو سو لپا تھا۔ اسے سب سے زیادہ فکر سلطانی کی تھی۔ دوسرے دن بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی۔ بار خاموش نظروں سے سلطانی کو دیکھتی۔ اس کی پھری ہوئی جوانی کو، اس کے نکھرے ہوئے حسن آب و تاب کو اور ہر بار کسی آنے والے خطرے کے احساس سے کانپ اٹھتی۔

پھری ہوئی، بے جوش، بھرپور۔ آب و تاب، پک دیک، خوبورتی۔

(۳)

اب صرف ایک دن باقی تھا۔ نوشا کی ماں کی الجھن بڑھتی گئی۔ اس بات کو اب سلطانی سے چھپایا بھی نہ جاسکتا تھا۔ مگر یہ بات اس سے کہتی بھی تو کس منہ سے۔ زندگی میں پہلی بار وہ خود اپنی بیٹی سے ڈر رہی تھی۔ بات کرتے ہوئے اسے خوف معلوم ہو رہا تھا۔ آخر ہچکچاتے ہوئے اس نے سلطانی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے گزر گئے مگر ماں سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ بہت دیر بعد اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”تم سے ایک بات کہنی تھی۔“

ماں کے بدلے ہوئے لہجے پر سلطانی کو تعجب ہوا۔ ”کیا بات ہے اماں؟“

”کیا بتاؤں کیا بات ہے!“ وہ آگے نہ کہہ سکی۔ سلطانی نے جلدی سے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات ہے؟“

ماں نے اٹکتے ہوئے بتایا۔ ”کل رات نیاز آیا تھا۔“ سلطانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں ماں نے اس کا رشتہ نیاز سے تو طے نہیں کر دیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

ماں نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”اچھا۔“ سلطانی کی سانس حلق میں رک گئی۔ اس نے لرزتے ہوئے پوچھا۔ ”کس سے؟“

ماں نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ ”میرے ساتھ۔“ اور یہ کہتے کہتے اس کا چہرہ پسینے پسینے ہو گیا۔

سلطانی حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ اس کا جسم اس طرح جھنجھنایا جیسے کہیں قریب ہی چینی کی پلیٹ گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ماں بھی چپ ہو گئی کہنا تو اسے ابھی بہت کچھ تھا۔ اپنی مجبور یوں کا اظہار کرنا تھا اور بیٹی سے معذرت کرنا تھی مگر وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔

”جتنے کو فجر کے وقت نکاح ہے۔“

یہ بات اس نے اس انداز سے کہی گویا گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہی ہو۔ وہ زیادہ دیر سلطانی کے پاس نہ بیٹھ سکی۔ سلطانی سوچتی ہی رہ گئی کہ کیا کہے۔ ماں اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ صندوق کھول کر سامان اٹھنے پلٹنے لگی۔

چند منٹ بعد باہر نکلی سلطانی سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ ”میں ایک کام سے بڑی ممانی کے ہاں جا رہی ہوں۔“ یہ کہتی ہوئی وہ گھر سے باہر چلی گئی۔

سلطانہ اسے دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔

\*\*\*

اتوا اسکول جا چکا تھا۔ سلطانہ گھر میں تنہا تھی۔ وہ خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یا اللہ! یہ سب ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کسی انجانے خوف سے وہ بار بار کانپ اٹھتی۔ اچانک سلمان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

پہلے تو وہ جھجکی پھر ہمت کر کے اسے اندر بلا لیا۔

سلمان حسب معمول کمرے میں جا کر بیٹھ گیا ذرا ہی دیر بعد دروازے پر سلطانہ کا چہرہ نظر آگیا مگر وہ کمرے کے اندر نہ آئی۔ دہلیز سے لگی کھڑی رہی۔ اس روز وہ بڑی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ کم کھوئی آنکھیں اور رخساروں پر ڈھلتی رات کی سی دھند۔ اس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا اور سوچا کہ اب آئندہ وہ اس سے نہ مل سکے گی۔ کل نیاز اس کا سوتیلا باپ بن جائے گا اور جب وہ اس کا سوتیلا باپ بن جائے گا تو یہ گھر اس کا ہو جائے گا۔ وہ کسی صورت میں سلمان کو اپنے گھر میں آنا دے گا۔ سلمان اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ محبت سے اس کا رخسار تھپتھا کر بولا۔

”کیا بات ہے۔ تم بہت اداس لگ رہی ہو۔ اماں نے کچھ کہا ہے؟“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”نہیں۔“

”تو پھر بات کیا ہے؟“

مگر وہ کچھ نہ بولی اور اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ دونوں مبہوت کھڑے تھے۔ ناگاہ ماں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ سلمان اور سلطانہ کو اس آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ اس نے دونوں کو اس عالم میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ لمحہ بھر تک دروازے کے قریب گم صم کھڑی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر چلی گئی۔ دروازہ باہر سے بند کیا اور درخواست کو اڑ کھٹکھٹانے لگی۔ ذرا دیر بعد خود ہی دروازہ کھول کر بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی۔

”اے لودر دروازہ تو کھلا ہے۔ میں سمجھی کہ اندر سے بند ہے۔ نہ جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ سلطانہ اب وہاں نہ تھی۔ وہ دالان کے کنارے کھڑی جلدی جلدی آنسو پونچھ رہی تھی۔ سلمہ کمرے کے اندر جا چکا تھا۔ ماں سیدھی وہیں پہنچی اور سلمان کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔ ”ارے تم“

آئے؟“

”بس ابھی ابھی آیا تھا۔“

”آج تو بڑا جس ہے۔“ اس نے دروازے سے منہ نکال کر سلطانہ سے کہا۔ ”سلطانہ، تم ذرا ہسائی کے پاس چلی جاؤ۔“

سلطانہ نے وہیں سے جواب دیا۔ ”جی اچھا۔“ اور گھر سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا۔ ”یہاں دالان میں آ جاؤ۔ اندر تو گرمی سے دم بولا رہا ہے۔“

سلمان خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ نوشا کی ماں تھکی ہوئی سی پٹنگ پر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر سکوت رہا۔ وہ چپ بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ ”میں تو ایسے چکر میں پھنس گئی ہوں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟“

”خیر تو ہے؟“ سلمان نے دریافت کیا۔

”اب تم کو کیا بتاؤں کہ کس پریشانی میں گرفتار ہوں۔“

سلمان اصرار کرنے لگا۔ ”کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں خاص ہی بات ہے۔ اب تم سے کیا پردہ بات یہ ہے کہ سلطانہ کا بیاہ ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے نکھکیوں سے سلمان کے رد عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ گھبرا کر بولا۔

”کب؟“

”کل۔“ اس نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔ وہ برابر سلمان کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے غور کیا کہ اس دفعہ گھبراہٹ کے بجائے حیرت کا اظہار زیادہ تھا۔ سلمان کہہ رہا تھا۔

”کل یعنی جیسے کو؟ آپ نے پہلے نہیں بتایا۔“

وہ صفائی پیش کرنے لگی۔ ”میں خود بھی اتنی جلدی نہیں چاہتی تھی۔ مگر خاندان کے بڑے بوڑھوں نے مجبور کر کے دن تاریخ مقرر کر دی۔“

سلمان کا چہرہ رفتہ رفتہ اداس ہوتا گیا۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کہاں رشتہ طے کیا؟“

”خاندان ہی کا لڑکا ہے۔ برسر روزگار ہے۔ مزاج کا بھی اچھا ہے۔“

”اللہ! نال گھرنا، دھت ہوتا۔ نکھیوں سے: ترجمہ نظر سے۔“

مبہوت: حیران، گھبراہٹا ہوا، ہچکا: اچانک، گم صم: خاموش۔

(۴)

اس کا تمام وجود سوالیہ نشان بن جاتا۔

تجوین: مروج الرعاش: کپکپاہٹ۔ سیانی: مراد بڑی عمر کی۔ بر: مراد رشتہ۔ توقف: وقفہ۔

خانے کی طرف چلی گئی۔

ماں جلدی سے کمرے میں گئی۔ اس نے ایک صندوق کھول کر سلطانہ کا سب سے قیمتی جوڑا نکالا۔ انشاں کاٹی اور مہندی گھول کر سلطانہ کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ غسل کر کے نکلی۔ ماں قریب بٹھا کر اس کے ہاتھ پیروں پر مہندی لگانے لگی۔ پھر اس نے آؤ کو بازار بھیج کر عطر، پھولوں کے گجرے اور ایسا ہی دوسرا ساز و سامان منگولیا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہی۔ مگر جب وہ سرخ عروسی جوڑا پہنانے لگی تو اس نے پریشان ہو کر کہا۔

”نہاں! یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

ماں نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی۔ مصنوعی غصے سے ڈپٹ کر بولی۔ ”چمکی بیٹھی رہ۔ ہر معاملے میں نہیں بولا کرتے۔“

سلطانہ خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں آؤ سارا سامان بازار سے لے کر آگیا۔ ماں نے اپنے ہاتھوں سے سلطانہ کے بال گوندھے۔ سرخ جوڑے پر عطر سہاگ لگایا۔ بالوں میں انشاں چنی۔ پھولوں کے گجرے پہنائے۔ جب سلطانہ دلہن بن گئی تو ماں نے آہستہ سے کہا۔

”گیارہ بجے سلمان تجھے لینے آئے گا۔“

سلطانہ حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ لمحہ بھر تک سکتے کے عالم میں ماں کے چہرے کو تنقید کرتی رہی، پھر اس نے بیک وقت متضاد کیفیت محسوس کی۔ اس میں خوشی بھی تھی اور بے چارگی بھی۔ ماں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بیٹی! میری تو خوشی تھی کہ میرے گھریلو چڑھتی۔ میں تجھے دھوم دھام سے رخصت کرتی۔ مگر قسمت میں یونہی لکھا تھا۔ میری بچی مجھے معاف کرنا۔“

سلطانہ نے سر جھکا لیا اور خاموش بیٹھی رہی۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ سلطانہ کے بھی آنسو نکل آئے۔

ماں نے اسے روتے دیکھا تو جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے۔ زبردستی

سکے کا عالم ہے جس وحشت ہونے کی حالت۔ متضاد: الٹ۔ شفقت: محبت۔

تھا۔ پتہ نہیں وہ اس رشتے میں کیا کیا رخنے ڈالے۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا ہوتا اس نے چند روز قبل سلمان سے کہی ہو تیں۔ مگر چند روز قبل اسے ان دونوں کی محبت کا کب تھا۔

سلمان اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ ”ابھی تو آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔“ پھر وہ بچوں کی طرح چل کر گویا ہوا۔

”اللہ کے لیے کچھ کیجئے۔“

نوشا کی ماں نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور پورے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ”اب یہی ہو سکتا ہے میں سلطانہ کو تمہارے ساتھ کر دوں۔ دنیا زیادہ سے زیادہ یہی تو کہے گی کہ سلطانہ بھاگ گئی۔ میرا رسوا کی بھی قبول کر لوں گی۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی قاضی یا مولوی کو اپنے ساتھ لے آؤ کہ میں دو بول نکال پڑھوا دوں۔ تم اس کے لیے تیار ہو؟“

سلمان فوراً آمادہ ہو گیا۔

”ابھی جھٹ پنا ہے۔ تم گیارہ بجے تک آ جاؤ۔ میں سلطانہ کو تیار کئے دیتی ہوں۔ جاؤ اب! کرو۔“

سلمان چپ چاپ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

\*\*\*

سلطانہ کھانا پکا چکی تھی۔ چولہے کے قریب بیٹھی تنکے سے گرم گرم راکھ کرید رہی تھی۔

نے سلطانہ سے کہا۔

”جا بیٹی جلدی سے نہالے۔“

اس نے اچنبھے سے پوچھا۔ ”کیوں لہاں؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”بس جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کر لے۔“

وہ اس وقت بڑی سرور نظر آ رہی تھی۔ بات بات پر باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ تذبذب میں پڑ گئی۔ اسے ماں کی معنی خیز مسکراہٹ کا کوئی سبب نظر نہ آیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر

رہنے ڈالنا: رکاوٹیں کھڑی کرنا۔ جھٹ پنا: سوچنا ڈوبنے کا وقت۔ سرور: خوش۔ باچھیں کھل جانا: بہت خوش ہونا۔

مسکرا کر گویا ہوئی۔

”اری بچی تو کیوں رو رہی ہے؟ لو بھی یہ بھی ایک رہی۔“

اس نے سلطانہ کے آنسو پونچھے اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔

سلطانہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا سارا جسم تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ چہرے پر چاندنی کا جمال تھا۔ آنکھوں میں ستارے جھلما رہے تھے۔ دل میں وہ دبا دبا خوف تھا جو ہر دوشیزا عروسی پہننے کے بعد محسوس کرتی ہے۔ ذرا دیر بعد ماں اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ وہ ایک طشتر پھل اور مٹھائی لائی تھی۔

\*\*\*

بھانڈوں کی مدد ماتی رات باہر آنگن میں اتر آئی تھی شیشم کے پتے تالیاں پیٹ رہے۔ بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے، عود و عنبر کے سرمئی مرغولوں کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے۔ رات بھیکتی گئی۔

گیارہ بج گئے۔

ماں کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔

سلطانہ کا دل بار بار دھڑک رہا تھا اور یہ دھڑکن تیز ہوتی گئی۔

رات کی آنکھوں کا کاہل پھیل گیا۔ تاریکی کی زلف پریشاں اور پریشاں ہو گئی۔ بہن ہو گئی۔ گلی سنسان تھی۔

نہ کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری نہ دروازے پر دستک ہوئی۔

رات آدھی ہو گئی۔

رات ڈھلنے لگی۔ راستے قبرستان کی طرح ویران ہو گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا۔

دونوں جاگ رہی تھیں۔

ہر آہٹ پر ماں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ پھر

ہوتے ہوتے اس قدر ست پڑ جاتی کہ ایسا محسوس ہوتا جیسے دل دھڑکن بند ہو جائے گا۔

رات اور ڈھل گئی۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ افقی سرحدوں پر کافوری شمعیں

لباس عروسی: شادی کا لباس۔ طشتری: بڑی پلیٹ۔ مدد ماتی: قیل۔ عود و عنبر: سیارنگ کی خوشبوؤں کے نام۔

ہوئیں۔ اجالا مشرق کے غاروں سے سر ابھار رہا تھا۔  
ماں کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں۔ اچانک گلی میں کتوں کے زور زور سے بھونکنے

کی آواز ابھری۔

کہیں دور چاب سنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

قدموں کی آہٹ قریب ہوئی گئی۔ قریب اور قریب!

قدموں کی آہٹ عین دروازے پر پہنچی تو سلطانہ کا دل دھڑکنے دھڑکنے جیسے ٹھہر گیا۔

ماں ایک نلک دروازے کو تکتی رہی۔ پھر بے قرار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

دروازے پر دستک نہ ہوئی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ جانے والا آگے چلا گیا۔ چاب دور ہوتی گئی۔

دور اور دور۔

اسی وقت برابر والے گھر میں مرغ نے بانگ دی۔

سحر ہو رہی تھی۔ رات کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔

ماں لڑکھڑا کر سلطانہ کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ مردے کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں

بچھے ہوئے چراغوں کی مانند نظر آرہی تھیں۔ ذرا دیر وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی رہی پھر

اس نے آہستہ سے کہا۔

”بیٹی! یہ لباس اتار دو۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے سلطانہ کو سینہ سے لگایا

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دونوں سسکیاں بھر کر دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔

باہر مین کاغذ کا ملگجا دھند کا پھیل رہا تھا۔

وقت کم تھا۔ ماں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سلطانہ سے کہا۔ ”میں نہانے جا رہی

ہوں۔ تم دالان میں چاندنی بچھا دو۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“ یہ کہتی ہوئی وہ غسل کرنے چلی گئی۔

ماں غسل کر کے نکلی۔

اُس نے دیکھا۔ سلطانہ دالان میں چاندنی بچھا رہی تھی۔ سرخ لباس اس نے اتار دیا تھا۔ افشاں

گوگیر: غلوگیر کا کھلے، مرلوگی آواز۔ صبح کاغذ: صبح کی روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا ہو جاتا ہے (جموئی صبح)۔ ملگجا: کچھ میلا کچھ صاف۔

پونچھ ڈالی تھی۔

پھولوں کے گجرے، مٹی کے گھڑوں پر لٹک رہے تھے۔

ماں نے سلطانہ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اس سے نظریں نہ ملا سکی۔ چپ چاپ کمر جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

\*\*\*

## فصل پنجم

مسجدوں میں فجر کی نماز ختم ہو گئی۔

گلی میں تھوڑی بہت چہل پہل شروع ہو گئی۔ پاس پڑوس کے مکانوں سے ملی جلی آواز کا شور ابھرنے لگا۔

(۱)

نیاز نے دروازے پر دستک دی۔ اتونے ماں کی ہدایت پر دروازہ کھول دیا۔ نیاز گھر میں ہوا۔ نکاح خواں کے علاوہ اس کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ان میں وکیل اور گواہ بھی تھے۔ نیاز کے شناسا اور ملنے جلنے والے تھے۔

شاہ جی کے سفید دیواروں والے مکان میں رہتے ہوئے نوشا اور راجہ کو ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ اس تمام عرصے میں نہ تو شاہ جی سے ان کی دوبارہ ملاقات ہوئی نہ کوئی کام کرنا پڑا۔ دونوں وقت ہوٹل سے کھانا آ جاتا۔ صبح شام ایک ایک پیالی چائے کی ملتی اور روزانہ ایک پیکٹ بگلا مارک سگریٹ کا بھی مل جاتا۔ کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ چوبیس گھنٹے مکان کی چار دیواری کے اندر رہنا پڑتا۔ دروازے پر ہر وقت ایک ہٹا کٹا بھٹان مستعدی سے اسٹول پر بیٹھا رہتا۔ وہ ہر آنے جانے والے کو ٹوکتا۔ ایک بار دونوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا تو وہ آنکھیں نکال کر چیخا۔

برسات کی اس دھندلی صبح کو چپ چاپتے نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ حبیب احمد مرحوم کی بیوہ مسافر ضیہ بیگم، نیاز کی منکوحہ اور سلطانہ سوتیلی بیٹی بن گئی۔ اس کنبے کا سر براہ تھا۔ اس گھر کا مالک و مختار تھا۔

”خونم کیدھر جاتا ہے۔ تمہارا باہر جانے کا مناد دی ہے۔ جاؤ کمرے میں جاؤ۔ ایدھر مت آؤ۔“ اس کی ڈانٹ ڈپٹ سے وہ اس قدر خائف ہوئے کہ دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کیا۔ رہنے کو لہر لے گیا تھا۔ دونوں تمام وقت اسی میں پڑے رہتے۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو باہر کی جانب ملتی تھی۔ مگر اس پر لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ دل گھبراہٹا تو وہ بندروں کی طرح جھک جھک کر جھانکتے۔ اس طرف گلی تھی جس کے دونوں طرف اونچے نیچے مکانوں اور جھگیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ گلی میں دن بھر ننگ دھڑنگ گندے گندے بچے شور مچاتے اور عورتیں دروازوں کی بلینز پر بیٹھ کر اونچی آوازوں سے باتیں کرتیں۔

دن کے وقت مکان میں سناٹا چھایا رہتا۔ کبھی کبھار شاہ جی کی بھاری بھر کم آواز سنائی دیتی۔ وہ

ماں: سناٹا مستعدی: ہوشیاری: منادی ہے: مراد منہ ہے: ننگ دھڑنگ: ہانکل بنگے۔

شناسا: واقف کار: چپ چاپتے: خاموشی سے: منکوحہ: بیوی۔

عام طور پر کمرے کے اندر رہتا تھا۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ نکل کر باہر آتا۔ رات کو البتہ شکلیں نظر آتیں۔ جو بھی آتا سیدھا شاہ جی کے کمرے میں جاتا جہاں سے آدھی رات تک کرنے کی آوازیں ابھرتی رہتیں۔

ایک بار چھت پر قوالی بھی ہوئی۔ بڑا جشن رہا۔ اس روز سہ پہر ہی سے چھت پر چڑکا ہو گیا تھا۔ شام ہوتے ہی دو گیس بتیاں بھی آگئیں۔ چھت پر درمی اور چاندنی کافر ش ہو گیا۔ کی چوکیاں آنا شروع ہو گئیں۔

پہر رات گزری۔ شاہ جی چھت پر آیا اور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا اس نے بھی لباس اہتمام کیا تھا۔ ملل کا کف دار کرتا، کھڑکھڑاتی ہوئی لٹھے کی شلوار، ہاتھ میں ریشمی رومال او میں پڑا ہوا خوشبودار تیل جو تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔

شاہ جی نے اشارہ کیا اور قوالی شروع ہو گئی۔ نوشا اور راجہ بھی اس محفل میں شریک ایک کونے میں دیکے ہوئے بیٹھے تھے۔ شاہ جی قوالی سنتا رہا، جھومتا رہا اور قوالوں کو روپے با ایک کے بعد دوسری چوکی آتی رہی۔ اپنے کمالات دکھا کر داد پاتی رہی۔ انعام لیتی رہی۔ سارا یہ سلسلہ چلتا رہا۔

راجہ اور نوشا قوالی سنتے سنتے وہیں چھت پر پڑ کر سو گئے۔

\*\*\*

دن گزرتے رہے۔ مگر دونوں اس زندگی سے جلد ہی اکتا گئے۔ ایک روز راجہ نے ہو کر نوشا سے کہا۔ ”یار ہم دونوں کسی چکر میں تو نہیں پھنس گئے۔ نہ کوئی کام ہے نہ کاج۔ ہر کے اندر بند۔ کہیں آجا بھی نہیں سکتے۔ مجھے تو کچھ معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔“

نوشا نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ”اے تجھے ہر جگہ گڑبڑ ہی نظر آتی ہے۔“ راجہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”یار نہ جانے کیوں مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔“

دیر تک وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ اتفاق سے اسی روز شاہ جی کے پاس دو نور ہوئی۔ وہ اس وقت ایک چوڑی چمکی کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ہنس کر ”ہاں جی! تم دونوں نے خوب آرام کر لیا۔ اب کچھ کام شام بھی ہونا چاہیے۔“

چوکیاں: قوالوں کے گروہ: آلتی پالتی مارے: چار زانو بیٹھا۔

دونوں اس کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔ وہ کہتا رہا۔ ”سوچتا ہوں آج تمہاری بھی ڈیوٹی لگادی جائے۔“ اس نے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ ”لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میرے ساتھ ٹھیک ٹھیک کام کرنا ہوگا۔ میں برے بندوں کے ساتھ بہت برا ہوں۔“ دونوں نے گردنیں ہلا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”یوں ڈنگری طرح گردن ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ میرے سامنے قسم کھاؤ۔“ دونوں نے قسمیں کھائیں۔

شاہ جی نے نور خان کو آواز دی۔ ”نورے ادھر آ۔“ فوراً ہی ایک لمبا ترنگا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں پہلے بھی اسے گھر میں دیکھ چکے تھے۔ مگر کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی نے نور سے کہا۔

”یہ دونوں آج سے تیرے چارج میں رہیں گے۔ ویسے ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ اب ان سے تجھے کام لینا ہے۔ آج ہی ان کو گشت پر لے جا۔“

نور خان عرف نورانے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے جی۔ جیسا حکم کریں اللہ نے چاہا ویسا ہی ہوگا۔“

شاہ جی اب ان دونوں سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو جی! یہ تم دونوں کو کونٹھوں اور بنگلوں پر لے جائے گا۔ صرف تم ہی اندر جاؤ گے۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ وہاں جا کر تم کہنا کہ ہم نوکری کرنی چاہتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کے لیے تھوڑی سی اپنی مصیبت بھی بیان کر دینا تاکہ آسانی سے ملازمت مل جائے۔ جو تنخواہ دیں اسی پر کام شروع کر دینا۔ جس روز تم کو نوکری مل جائے، اس کے دوسرے دن نور اتم سے ملنے آئے گا۔ جو کچھ یہ پوچھے ٹھیک ٹھیک بتانا۔ اس کے بعد یہ جیسا کہے دیا ہی کرنا۔ سمجھ گئے مناسب باتیں؟“

دونوں نے فوراً کہا۔ ”ہاں جی سب سمجھ گئے۔“

”اب تم دونوں جاؤ۔“ شاہ جی نے نور کو دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔ ”لے یہ چائے پانی کو رکھ لے۔“

نورانے سلام کیا اور دونوں کے ہمراہ کمرے سے باہر آگیا۔ وہ انہیں قریب کے کمرے میں لے

ڈنگر: ہاؤس: چارج: عمرانی: گشت: پتھر۔



کیا اور وہاں دیر تک بہت سی باتیں سمجھا تا رہا۔ یہ باتیں تقریباً وہی تھیں جو شاہجی ان سے کہہ چکا تھا۔ شام ہونے سے کچھ دیر قبل نورادونوں کو اپنے ہمراہ جشید روڈ لے گیا۔ بس سے اتر کر نے سڑک کے دونوں جانب بنی ہوئی کوٹھیوں کو غور سے دیکھا۔ اس کی نظروں میں سرسراہٹ والے کھجور کی سی چمک تھی۔ کچھ دور چل کر وہ عامل کالونی کی جانب مڑ گیا۔ تینوں آہستہ آہستہ رہے۔ آگے آگے نور تھا۔ اس کے پیچھے راجہ اور نوشا تھے۔ آخر ایک موڑ پر نور اٹھ رہا تھا۔ نظر سے ایک دو منزلہ کوٹھی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جس کے لان میں کئی بچے کھیل رہے تھے۔ دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا پھر دونوں کو مخاطب کر کے بولا۔

”بس جی بیٹیں سے بسم اللہ کرو۔“

ایک بار پھر اس نے ضروری ہدایتیں دیں اور انہیں دو منزلہ کوٹھی کی جانب روانہ کر دیا۔ نور اور دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھی کے چھانک پر پہنچ گئے۔ نوشا اندر جاتے ہوئے؟ رہا تھا۔ مگر راجہ جھٹ اندر داخل ہو گیا۔ نوشا بھی چلا گیا۔ نورادونوں کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ چند ہی منٹ بعد دونوں واپس آگئے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ فی الحال وہاں ملازم کی ضرورت نہیں۔ نور نے ان کو دل شکستہ نہ ہونے دیا۔ ہنس کر بولا۔

”کوئی بات نہیں۔ دوسری جگہ کو شش کرتے ہیں۔“

وہ ان کو ایک اور کوٹھی پر لے گیا۔ وہاں بھی کام نہ بنا۔ نور کی ہدایت کے مطابق وہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں گئے مگر کام کہیں نہیں ملا۔ آخر رات گئے تینوں اڈے پر واپس آگئے۔ دوسرے روز نور اسویرے ہی سویرے ان کو لے کر گشت پر نکل گیا اس بار وہ اپنے سوسائٹی کی طرف گئے۔ دن چڑھے تک دونوں نے کئی جگہ کو شش کی۔ ایک کوٹھی میں ملازمت رہی تھی مگر وہاں چونکدار تھا اور اس سے بھی زیادہ خطرناک وہ کتا تھا جس کے بھونکنے کی آواز سے سنائی پڑتی تھی۔ جس وقت نور نے دونوں کو اس کوٹھی میں بھیجا تھا چونکدار کتے کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آگیا۔ اسے دیکھتے ہی نور نے فوراً پروگرام بدل دیا۔

دوپہر سے کچھ پہلے ان کا کام بن گیا۔ مگر ملازمت صرف راجہ کو ملی۔ نوشا ڈھلا ڈھلا لگتا بولتا بھی شرمناک تھا۔ مگر راجہ خوب چاق و چوبند تھا۔ اس نے بڑی مستعدی سے ترقی پزیر

\*\*\*

اس رات نوشا کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ اکیلے کمرے میں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ پہلے وہ راجہ کو یاد کر تا رہا۔ پھر راجہ کی یاد کے سہارے وہ بھی دور چلا گیا۔ جہاں اس کا اپنا گھر تھا۔ ماں تھی، بہن تھی، چھوٹا بھائی تھا۔ اسے گھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی اور انہیں یاد کرتے کرتے وہ رو پڑا۔ دیر تک خالی کمرے میں اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ ابھرتی رہیں۔ وہ اسی طرح روتے روتے سو گیا۔ دوسرے روز بھی اس کی طبیعت پریشان رہی۔ تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا بے چینی کے عالم میں وہ اکیلے کمرے میں ٹھہرتا رہا۔ تھک جاتا تو لیٹ جاتا۔ گھنٹوں گلی میں کھنٹنے والی کھڑکی سے لگا خواب ناگ نظروں سے باہر نکلتا رہا۔ شام ہوئی تو نور اس کے پاس آیا اور اپنے ہمراہ ہاؤسنگ سوسائٹی لے گیا۔

نور کو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ اس نے نوشا کو کوٹھی کے اندر بھیجا کہ راجہ کو بلا لائے۔ نوشا نے جا کر دیکھا۔ راجہ ایک شان دار کمرے میں بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ریڈیو پر گانے سن رہا تھا۔ اس کے برابر دو سنہری بالوں والے خوب صورت بچے بیٹھے تھے۔ راجہ نے نوشا کو دیکھا تو اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔

نوشا نے کہا۔ ”ریڈیو پر فلمی گانے سنے جا رہے ہیں۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”اپنے تو یہی ٹھاٹھ ہیں پیارے۔“

”مزے میں ہو؟“

”ہاں یار! میں تو یہاں بڑا خوش ہوں۔“

نوشا نے سرگوشی کی۔ ”نور اباہر کھڑا ہے۔ تم کو بلایا ہے۔“

نور اکا نام سنتے ہی راجہ کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر مری

ہوئی آواز میں بولا۔ ”اچھا چلو۔“ دونوں کو ٹھہری سے باہر آگئے۔

نور ایک سنسان گلی کے کنارے پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔  
”ٹھیک ٹھاک ہے؟“

راجہ نے مختصر جواب دیا۔ ”ہاں۔“

”کسی کو تم پر کوئی شبہ دوبہ تو نہیں ہوا؟“

”بالکل نہیں۔“ راجہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”تمہارے علاوہ اور کتنے نوکر ہیں؟“

راجہ لمحہ بھر تک کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے بتایا۔ ”ایک، دو، تین، ہاں تین ہیں۔“

”سب کو ٹھہری ہی میں رہتے ہیں؟“

”نہیں، آیا اور رحمت تو شام کو گھر چلے جاتے ہیں۔ خانسا ماں ہے۔ وہ باہر اپنی کوٹھری میں

ہے۔“

نور نے ایک لمبی ”ہوں“ کی اور گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے پھر

شروع کر دیے۔ ”گھر میں کتنے مرد ہیں؟“

”صرف بڑے صاحب ہیں اور تو سب بابا لوگ ہیں۔“

”صاحب رات کو باہر جاتے ہیں؟“

”میرے سامنے تو گئے نہیں۔“

”رحمت کیسا بندہ ہے؟“

”سالارہ وقت بیٹھا اونگھا کرتا ہے۔ بی بی جی کہتی ہیں روز سینما دیکھتا ہے۔ وہ اس کو خوب

ہیں۔“

نور نے اس کی پیٹھ گرم جوشی سے تھپتھا کر کہا۔ ”تو تو بہت ہوشیار نکلا۔ جیو میرے

بس تھوڑا سا کام تم کو اور کرنا ہے۔“

اس نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی جانب بڑھایا۔ ”لو اسے رکھ

جی نے خرچے کو دیا ہے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔ میں نوٹے کے ہاتھ پہنچاؤں گا۔“

راجہ نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ لے لیا۔ ”ابھی تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

نور نے پیشہ ور مجرموں کی طرح ایک آنکھ دبا کر کہا۔ ”اب تم یہ پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ

بی بی جی زیور اور نقدی کہاں کہاں رکھتی ہیں۔ جب بھی موقع ملے، اس کمرے کو اچھی طرح دیکھ لینا۔

جن جن بکسوں اور الماریوں میں قیمتی سامان رکھا ہو ان کو اچھی طرح بھانپ لینا۔“

راجہ یہ سنتے ہی لرز اٹھا۔ نور اس کے خوف سے بے نیاز کہتا رہا۔ ”اس کے علاوہ یہ بھی پتہ لگاؤ

کہ رات کو صاحب اور بی بی جی کا کیا پروگرام رہتا ہے۔ کس روز سینما جا رہے ہیں؟ کس روز دعوت

میں جا رہے ہیں اور کب تک واپسی ہوگی۔ مطلب یہ کہ۔“ مگر اس نے مطلب کی بات نہ بتائی۔

صاف گول کر گیا۔ صرف اس قدر کہا۔ ”اب میں تم سے پانچویں دن ملوں گا۔“ ذرا دیر وہ کھڑا کچھ شمار

کر تا رہا۔ ”آج منگل ہے۔ گویا اب میں تمہارے پاس ہفتے کو آؤں گا۔ اس وقت تک تم ساری باتیں

معلوم کر لینا اور مجھ کو پوری رپورٹ دینا۔ سمجھ گئے نا؟“

راجہ نے گردن ہلا دی۔ ”سمجھ گیا۔ سب کچھ سمجھ گیا۔“

نور نے مزید بات چیت نہ کی۔ سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ راجہ کو سگریٹ پلائی اور خود اپنے لیے

بھی لٹائی۔ دونوں لمبے لمبے کش لگا کر دھوئیں کے بھبکے چھوڑنے لگے۔ نوشا خاموش کھڑا سب کچھ

دیکھتا رہا۔

اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اسے رہ رہ کر راجہ پر رشک آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راجہ کو ٹھہری کی

طرف چلا گیا اور وہ نور کے ساتھ اڈے پر واپس آ گیا۔

(۲)

سنچر کا دن تھا۔ راجہ کو ملازمت کرتے ہوئے ساتواں روز تھا۔ اس عرصے میں وہ کوٹھری کے

ماحول سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ سب بچوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ دن بڑے مزے میں گزر

رہے تھے۔

روزانہ کا پروگرام یہ رہتا کہ سویرے ہی سویرے گرم گرم چائے پینے کو مل جاتی۔ ناشتے کی میز

سے جو کچھ بچا کر آتا اس میں سے ایک آدھ ٹوسٹ، انڈیا ایسی ہی کوئی چیز کھانے کو مل جاتی۔ اس

پیشہ ورانہ بات گول کرتا: مال دینا۔ رشک: یہ آرزو کہ جو چیز دوسرے کے پاس ہے مجھے بھی مل جائے۔ مانوس: واقف۔

وقت تک سات سات سات کا وقت ہو جاتا تھا۔ آیاناشے کے بعد دونوں بچوں کو تیار کر دیجے راجہ انہیں اسکول لے جاتا۔ واپسی پر نونج جاتے۔ یہ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہوتا۔ دودھ کر مستعدی سے ان کا ہر کام کرتا۔

اس کے کان ان کی آواز پر لگے رہتے۔ ادھر انہوں نے کچھ کہا اور وہ لپکا۔ ان کا کام زیادہ تھا مگر وہ شور بہت مچاتے تھے۔ پہلے روز تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ مگر رفتہ رفتہ عادی ہوتا گیا۔ جب وہ جانے لگتے تو ان کا ایک ایک سامان اٹھا کر کار کے اندر رکھتا۔ اس کی مستعدی دیکھ کر وہ ایک روز خوش نودی کرتے ہوئے بیوی سے کہنے لگے۔

”بیگم! یہ راجہ تو بڑے کام کا لڑکا ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”دیکھ لیجئے، میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ میں نے تو پہلے ہی روز تاڑ لیا تھا کہ ہو شیار اور کیرا ہے۔“

”ارے بھی تمہارے انتخاب کی کیا بات ہے۔“

دونوں ہنسنے لگے اور راجہ اپنی تعریف سن کر جھوم اٹھا۔ اس روز سے وہ اور بھی مستعد ہو اس کے سپرد زیادہ کام نہیں تھا۔ بارہ بجے بچوں کو اسکول سے واپس لاتا تو سہ پہر تک اس کے کوئی کام نہ ہوتا۔ مگر وہ نچلانا بیٹھتا۔ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا۔ کبھی فرنیچر جھاڑ پونچھ رہا ہے۔ جو توں پر پالش کر رہا ہے۔ کبھی بچوں کے کپڑے دھو رہا ہے۔ یہ کام رحمت اور آیا کے سپرد تھے۔ وہ ان کا بھی کام کر ڈالتا۔ ان دونوں نے شروع شروع میں اس کی آمد پر بڑی تاک بھوں چڑھائی مگر اب وہ بھی اس سے بہت خوش تھے۔

سہ پہر کو دونوں بڑے لڑکے کالج سے آ جاتے۔ ان سے بھی اس نے تھوڑا بہت پارانہ گا تھا۔ ان کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ کوشی کے بچھواڑے وسیع میدان تھا۔ پاس پڑا کوٹھیوں کے لڑکے بھی آ جاتے۔ شام تک کرکٹ ہوتی۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھیلتا اور اب تو الٹی سیدھی گیند پھینکنا بھی آگئی تھی۔ ایک آدھ دن بھی بنالیتا تھا۔ صاحب اور بیگم نے اس با کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ ایک روز دونوں دیر تک کھیل دیکھتے رہے۔

رات کا کھانا آٹھ سوا آٹھ بجے ختم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ بچوں کے ساتھ کمرے میں

خوشنودی: خوشی: کیرا کام کرنے والا۔ نچلانا بیٹھنا: کچھ نہ کچھ کرتے رہنا، چپ نہ رہنا۔ تاک بھوں چڑھنا: ناگواری کا اظہار کرنا۔

ریڈیو سے ڈرامے سنتا۔ گانے سنتا۔ کبھی کبھار تھوڑی بہت ٹھٹھول بازی بھی کر لیتا۔ ان سے اس کی خوب ہنسی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے اپنے بستروں پر چلے جاتے تو وہ چھوٹی بی بی، ناہید کی طرف چلا جاتا۔ اس سے بھی وہ خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ بھی کالج جاتی تھی اور علیحدہ کمرے میں رہتی تھی۔ وہ موٹی موٹی کتیاں پڑھتی۔ ٹیلی فون کار سیور کان سے لگائے دیر تک باتیں کرتی رہتی یا پھر بیانو پر لہک لہک کر گانے گاتی۔ اس کی آواز سریلی تھی۔ راجہ کو اس کا گانا پسند تھا۔ وہ اس کے پیروں کے پاس بیٹھ کر چپ چاپ آنکھیں بند کیے گانا سنا کرتا۔ وہ گانا ختم کرتی۔ اپنے بڑے بڑے سرخ ناخن اس کی کتیاں میں چھو کر کہتی۔

”اے چلو اٹھو۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔“

وہ مکاری سے رونی شکل بنا کر کہتا۔ ”ابھی سے۔“

وہ ہنس کر کہتی۔ ”چل بھاگ۔ مجھے ابھی کالج کا بہت کام کرنا ہے۔“

راجہ فوراً کہتا۔ ”چھوٹی بی بی او لٹین نہیں پیو گی؟“

ناہید رات کو او لٹین شوق سے چیتی تھی۔ وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی۔ ”اچھا جا ایک کپ بنالا۔ مجھے آج دیر تک کام کرنا ہے۔“

وہ فوراً میٹر پر دودھ گرم کر کر تا اور ٹرے میں او لٹین کی پیالی سجا کر لے آتا۔ ناہید بڑی نفاست پسند لڑکی تھی۔ لہذا وہ صفائی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جتنی دیر وہ او لٹین چیتی اس سے کچھ نہ کچھ بات چیت کرتی رہتی۔ وہ نظریں چراچرا کر اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہتا۔ یہ عجیب سی لذت تھی۔ یوں وہ عمر میں اس سے کئی سال بڑی تھی۔ مگر وہ اپنے مخصوص انداز میں کبھی کبھی سوچا کرتا۔ بڑی بڑی غضب کی لونڈیا ہے۔ جی چاہتا کہ بس سالی کو بیٹھے دیکھا کر دو۔ یوں دیکھتی ہے کہ قتل کر کے رکھ دیتی ہے۔

ناہید کے علاوہ محمود اور مسعود تھے۔ ان سے بھی اس کی ہنسنے لگی تھی۔ کرکٹ کے علاوہ رات کو کمرے میں دروازہ بند کر کے ان کے ساتھ چپکے چپکے ناش کی بازی لگتی۔ ناش کھیلنے کا وہ ہمیشہ سے رسیا تھا۔ خوب خوب ہاتھ دکھاتا۔ ایسی ایسی چالیں چلاتا کہ دونوں دنگ رہ جاتے۔

لیکن کوشی میں سب سے زیادہ اس پر مہربان بیگم صاحبہ تھیں جن کو سب ملازم بی بی جی کہتے

مصلوب ہادی: بی بی مذاق: خوب ہنسی: ہر ادا اچھی طرح گزرا رہتی ہوتی۔ نفاست پسند: صفائی کو پسند کرنے والی۔ رسیا: خوشن۔

تھے۔ وہ ان کا کام بھی لگا کر کرتا تھا۔ ایک روز وہ ان کے جو توں پر پالش کر رہا تھا اور انہیں ایسا پکڑا تھا کہ چماچم کر رہے تھے۔ بی بی جی بھی کہیں سے شہتہ ہوئی ادھر آ گئیں۔ اس کے قریب کھڑے ہو کر جو توں کو دیکھنے لگیں۔ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد بولیں۔

”راجہ اگر تو ٹھیک سے آگے بھی کام کرتا رہا تو ج کبھی ہوں بہت اچھا رہے گا۔ خدمتِ عظمت ہے۔ دل لگا کر کام کرے گا تو تیری زندگی بنادوں گی۔ میرا تو ارادہ ہے کہ تو ذرا بڑا ہو جائے صاحب سے کہہ کر تجھے ان کا ردی لگوا دوں۔“

راجہ نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ ”میں اردلی بن جاؤں گا۔ وہ جو سفید کوٹ پر سبز پٹی ڈالے رہتے ہیں۔“ اس نے بڑے کھلنڈرے پن سے اپنی گردن ہلائی۔ ”پھر تو اپنے ٹٹاؤ ہو جائیں گے۔“

”ٹٹاؤ تو ہو ہی جائیں گے۔ ساٹھ روپے تنخواہ ملے گی اور بخشیش اوپر سے۔ کام کاج بھی زیادہ نہیں کرنا پڑتا۔“

”میں کام کاج سے گھبراہٹا توڑی ہوں۔“

وہ مسکرانے لگیں۔ ”بس اب تو تھوڑا سا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لے۔ اردلی بن جائے گا تو کڑا اچھی سی لڑکی دیکھ کر تیرا بیاہ بھی کرادوں گی۔ دونوں میاں بیوی یہیں رہنا۔“

راجہ شرمایا۔ دل ہی دل میں سوچا۔ لویا اپنی ایک عدد جو رو بھی ہو جائے گی۔ مگر یہ خیال اسے عجیب سا لگا دھت تیری کی یہ بھی کیا بات ہوئی۔ لیکن بی بی جی کی باتوں کا یہ اثر ضرور ہوا کہ وہ اور کچھ زیادہ مستعدی اور جانفشانی سے کام کرنے لگا۔ ادھر کسی نے کچھ کہا اور جھٹ اس کا کام کر دیتا۔

یہ دن اس نے بڑے مزے میں گزارے تھے۔ اب اس کا رنگ بھی ذرا نکھر گیا تھا۔ بی بی جی نے محمود اور مسعود کی دو پرانی پتلونیں اور کئی قمیصیں دے دیں جن کو پہن کر پہلے روز جب اس نے قد آدم آئینے کے سامنے اپنا عکس دیکھا تو حیرت سے چونک کر زیر لب بڑبڑایا۔ ”استاد بالکل اشنوڈنٹ لگ رہے ہو۔“

وہ دیر تک آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

\*\*\*

اردلی: ساتھ رہنے والا سپاہی۔ کھلنڈرہاٹن: چمپا، بے پروائی کا انداز۔ جو رو: بیوی۔ جانفشانی: محنت، سرگرمی۔ قد آدم: انسانی قد کے برابر۔

سہ پہر سے راجہ پریشان تھا۔ شام کو نور آنے والا تھا جس کی گھنٹی مونچوں اور پان سے رپے ہوئے کالے کالے دانوں سے اس گھن معلوم ہوتی تھی۔ جوں جوں دن ڈھلتا گیا اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ وہ اس گھر کے رہنے والوں سے دعا بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد زندگی میں اسے پہلی بار ایسی گھریلو زندگی نصیب ہوئی تھی جہاں خوشی تھی سکون تھا۔ نہ کسی کا ڈر تھا نہ خوف۔ مزے سے ہنستے کھیلتے وقت گزرتا تھا۔ رات کو لمبی تان کر سوتا۔ سویرے اٹھتا تو طبیعت بشاش ہوتی۔

شام ہوتے ہوتے وہ بے چین ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ شاہ جی بے حد خطرناک آدمی تھا۔ اسے ناراض کر کے جان خطرے میں ڈالنا تھی۔ نہ جانے وہ کیا کرے۔ اس کے تصور ہی سے وہ کانپ اٹھتا۔ دوسری طرف بی بی جی تھیں جو مہربانی سے پیش آتی تھیں۔ ننھے لٹی اور اکوتے جن سے اس کی گاڑھی چھتی تھی۔ خوب رو اور خوش طبع ناہید تھی جس کی خوب صورت آنکھیں جاتو چلاتی تھیں۔ محمود اور مسعود تھے جن کے ساتھ اس کا یارانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کو کرکٹ ہوتی اور رات کو تاش کی بازی لگتی۔ دونوں وقت گرم گرم کھانا ملتا اور مزے دار ہوتا۔ صرف سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پینا پڑتی تھی۔

سوچتے سوچتے وہ بدحواس سا ہو گیا۔ پریشانی اور بے بسی کے عالم میں باہر درختوں کے نیچے اندھیرے میں چلا گیا اور بے اختیار رو پڑا۔

شام کا دھند لکا جب رات کے اندھیرے میں ڈھلنے لگا تو دروازے پر نوشا کا چہرہ نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی راجہ نے شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے منہ پر تھوک دے اور چیخ کر کہے۔ ”نکل جا سالے کینے یہاں سے۔“ لیکن اس نے کچھ بھی نہ کہا اور خاموش کھڑا رہا۔ نوشا آہستہ آہستہ چلا ہوا اس کے قریب آ کر رسان سے بولا۔

”توڑے نے بلایا ہے۔“

راجہ اس طرح خاموش رہا جیسے اس نے نوشا کی بات ہی نہیں سنی۔

نوشا نے دوبارہ کہا۔ ”باہر نور اکھڑا تم کو بلارہا ہے۔“

گمن: نورت لمبی تان کر سوتا: بے فکر ہو کر سوتا۔ بشاش: تروتازہ۔ گاڑھی چمپنا: آپس میں خوب میل جول ہونا۔ خوب رو: خوبصورت۔ مسعود: خوش طبع۔ زعمہ: دل، اچھی طبیعت کی۔

راجہ نے تکیہ نظروں سے اسے دیکھا اور بے رخی سے بولا۔ ”کھڑا ہے تو کھڑا ہے میں سالے کے پاس نہیں جاؤں گا۔“

نوشا حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”کیا کہا، نہیں جاؤ گے؟“

راجہ جھنجھلا کر بولا۔ ”ہاں جی نہیں جاؤں گا۔ میں اب ان سالے بد معاشوں کے چکر میں پڑنا چاہتا۔“ لمحہ بھر کے لیے اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔

”میرا کہنا تو تم بھی ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ کسی کو بھی کام دلا دوں گا۔ مار گوارا کروں گا۔“

”یار کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں کب ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ تو بڑے خطرناک ہیں۔“

”خطرناک ہیں تو ہوا کریں۔ صاحب سے کہہ دوں گا۔ سب سالوں کو بند کروادیں گے۔ کی ہوا کھانی پڑے گی۔ مذاق نہیں ہے۔“

نوشا اور خوفزدہ ہو گیا۔ ”نہیں یار ایسا نہ کرنا۔ خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ شاہ جی! خطرناک آدمی ہے۔ اس سے بگاڑنا اچھا نہیں۔“

مگر راجہ ذرا مرعوب نہ ہوا۔ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”اچھا جی میں تو کسی کے پاس نہیں ہوا اور دیکھو آئندہ تم یہاں نہ آنا۔“ یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے مڑا اور برادر والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ نوشا اسے دیکھتا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ذرا دیر گم صم کھڑا رہا پھر کوٹھی سے نکل کر سیدھا نورا پاس پہنچا۔

نوشا کو اکیلا آتا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھکا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ گھبرا کر پوچھا۔ ”راجہ! نہیں آیا؟“

نوشا صاف بات بتانے میں جھجکے لگا تو نور نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ٹھیک ٹھیک بتا۔ بات کیا؟ سالاراجہ کیوں نہیں آیا؟“

نوشا کو مجبور آہٹانا پڑا۔ ”وہ کہتا ہے میں نہیں آؤں گا۔“

”تو بات یوں ہے۔“ نور آہستہ آہستہ گردن ہلا کر بڑبڑانے لگا۔

نوشا نے دہلی زبان سے کہا۔ ”اور اس نے آئندہ مجھے بھی آنے سے منع کر دیا ہے۔ بہت غصے

میں تھا۔“

شاہ جی نے نور کی پوری بات بھی نہ سنی۔ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ غضب ناک ہو کر بولا۔ ”اس حرام کے ختم راجہ کا دوسرا بندوبست کرنا پڑے گا۔“ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد شاہ جی کی بھاری بھر کم آواز ابھری۔ ”نورے!“

نور نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”ہاں جی!“

شاہ جی گویا ہوا۔ ”رات زیادہ ہو گئی ہے اب تو جا کر آرام کر۔ کل اپنے ساتھ لوٹن کو لینا اور زیب نمبر لگانا۔ ضرورت ہو تو اور بندے بھی ساتھ لے جانا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ چھو کر ایک نمبر حرامی لگتا ہے۔ لیکن فح کر کہاں جائے گا۔“

”تمہارا حکم چاہیے شاہ جی! کہاں جائے گا نکل کے۔“ نور نے اسے اطمینان دلایا۔

مزید بات چیت نہ ہوئی۔ نور اکمرے سے باہر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی نوشا بھی نکل آیا۔ مگر وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر راجہ پر ترس آ رہا تھا۔ وہ بار بار سوچتا کہ یہ لوگ نہ جانے بے چارے کا کیا حال کریں۔ خوف کے مارے اس نے نور کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے روز کوئی آٹھ بجے رات کو شاہ جی نے اپنے کمرے سے نوشا کو آواز دی۔ وہ فوراً سہا ہوا ہال پہنچا۔ شاہ جی بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”تو بھی کسی کام آئے گا۔ آ ذرا میری پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ ملکیاں تو لگا۔ وہ حرام کا جناؤ دلا نہ جانے کہاں مر گیا۔“

نوشا خاموشی سے جا کر پائنتی بیٹھ گیا اور پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ ملکیاں لگانے لگا۔ شاہ جی خاموش لیٹا رہا۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ اچانک باہر دروازے پر کار کے رکنے کی آواز ابھری۔ پھر دھڑ سے کار کا دروازہ بند ہوا۔ کمرے کے باہر ملے جملے قدموں کی آواز ابھری۔

ذرا ہی دیر بعد نور اور لوٹن کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے نرغے میں راجہ بھیکے ہوئے چوسے کی طرح سہا ہوا نظر آیا۔ لوٹن نے راجہ کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

”لو شاہ جی۔ یہ رہا تمہارا مجرم۔“

شاہ جی اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ سامنے فرش پر اوندھے منہ پڑے ہوئے راجہ کو خونخوارانہ سے گھورنے لگا۔ پھر اس کی آواز گونجی۔

”زنانیوں کی طرح خراکیا دکھا رہا ہے۔ سیدھا کھڑا ہو۔“

راجہ خوف سے کانپتا ہوا اٹھا۔ مگر وہ پورے طور پر کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ شاہ جی نے ہر اس کے گال پر بھر پور تھپڑ مارا۔ راجہ ہائے کر کے زمین پر گر پڑا۔ شاہ جی نے اس کی کمر پر ماری۔ پھر دوسری۔ کئی ٹھوکریں تابڑ توڑ راجہ کے جسم پر لگیں۔ وہ گیند کی طرح فرش پر لڑختا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

ہر ٹھوکہ پر وہ چیختا۔ ”ہائے مر گیا۔“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر شاہ جی کے سامنے جوڑ دیا۔ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ شاہ جی گردن ہلا کر بولا۔ ”ابھی سے۔“ پھر وہ نورا مخاطب ہوا۔

”کچھ مزا نہیں آیا۔ ذرا اس کا ٹین پاٹ تو بناتا کہ اسے پتہ چل جائے کہ قسم کھا کر کمرہ ہوتا ہے۔“

نورا ایک کر راجہ کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے چوڑے چوڑے بھدے ہاتھ سے راجہ گردن دبوچ کر جھکا کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگ پکڑ کر گردن کے اوپر چڑھادی۔ راجہ بل چینا۔ ”ارے مر گیا۔ ہائے مر گیا۔“ نورانے راجہ کی کینٹی پر کہنی سے ضرب لگائی۔ فوراً اس کی بند ہو گئی۔ نورانے راجہ کی دوسری ٹانگ بھی اٹھا کر گردن پر چڑھادی۔

راجہ ذرا دیر تک اس حالت میں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ وہ ٹانگوں کی قینچی میں پھنسی ہوئی اس کی گردن سانپ کا بھن بن گئی تھی۔ راجہ اس عالم میں لمحہ بھر تک کر بیٹھ نہ سکا۔ اس کا جسم کپکپایا اور وہ فرش پر منہ کے بل گر۔ مگر اس طرح بھی چین نہ آیا جاپانی کھلونے کی طرح ادھر ادھر جھولنے لگا۔ ہر بار وہ پہلو بدل کر بڑی دردناک آواز نکالتا۔

”ارے میری گردن ٹوٹی۔“

”ہائے میری ٹانگیں پھٹی جا رہی ہیں۔“

”اللہ کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں مر جاؤں گا۔“

”شاہ جی میری توبہ۔“

”شاہ جی، میں تمہارے قدموں پر پڑتا ہوں۔“

راجہ کی دل دوز چیخیں کمرے میں گونجتی رہیں۔ نورا سہا ہوا سارا تماشا دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ آخر جب راجہ کی آواز بیٹھنے لگی اور وہ رک رک کر تھکے ہوئے فخر کی طرح منہ پھاڑ کر ہانپنے لگا تو شاہ جی نے کہا۔

”نورے کھول دے۔ ابھی کچا ہے۔“

نورانے حکم پاتے ہی راجہ کو ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بے حال ہو کر وہیں پڑ گیا اور گہری گہری سانسیں بھر کر ہانپتا رہا۔ شاہ جی زور سے دھاڑا۔ ”یہ پہلا کورس ہے۔ ابھی چھ اور ہیں اور سب سے آخری یہ ہے۔“ اس نے نیکی کے نیچے سے یہ لمبا چاقو نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔ ”ٹوٹنے کے کرے یہیں دبا دیتا ہوں۔ اس گھر کا آنگن اسی لیے کچا رکھا ہے تاکہ زمین کھودنے میں دشواری نہ ہو۔“

راجہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور خوف سے لرز کر گڑ گڑانے لگا۔ ”نہیں، نہیں۔“ اس نے بڑی بے چارگی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور جا کر شاہ جی کے پیر پکڑ لیے۔ ”اس دفعہ معاف کر دو۔ پھر غلطی کروں تو جان سے مار دینا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شاہ جی نے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا۔ گردن ہلا کر پوچھا۔

”آئندہ سب کام ٹھیک ہو گا؟“

راجہ قسمیں کھا کر یقین دلانے لگا۔ شاہ جی ڈپٹ کر بولا۔ ”قسمیں تو نے پہلے بھی بہت کھائی تھیں بار کھانا دوبارہ کوئی الٹ پھیر کی تو تیری یہاں لاش ہی نظر آئے گی۔ میں خطرناک بندے کو زندہ نہیں چھوڑا کرتا۔“

راجہ گردن جھکائے اس کی باتیں سنتا رہا۔ ابھی تک اس کی ٹانگیں قابو میں نہیں تھیں۔ شاہ جی نے کھن کی دو نکلیاں منگوا کر راجہ کو کھلائیں۔ چائے بھی پلائی۔ سگریٹ بھی سلا کر دی۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو راجہ نے کوٹھی کے اندر کی ایک ایک تفصیل بتائی۔ شاہ جی کرید کرید کر ہر بات پوچھتا رہا۔ پھر یہ ہدایت دی کہ آئندہ نوراً اس کے پاس نہیں جائے گا۔ وہ خود آکر

دلہن ذرا دل ہلکے دلے۔ کچا تاخر بہ کار۔ بے چارگی: عاجزی۔ الٹ پھیر: بکر دفریب۔

بک مدینہ

رپورٹ دے گا۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے وہ نورا کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر سوسائٹی کی طرف چلا گیا۔

(۳)

رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کوٹھی اور نکھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ہر طرف گہر نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ سارے دروازے بند تھے۔ راجہ کمرے میں تنہا تھا۔ اس کے علاوہ انجینئر کی بوڑھی ماں تھی۔ وہ سرشام ہی سو جاتی۔ اس وقت وہ کڑوالے کمرے میں بے خبر سر انجینئر اور اس کے بیوی بچے ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ آدھی رات سے پہلے ان آنے کی توقع نہیں تھی۔ راجہ شام ہی کو یہ اطلاع شاہ جی کو پہنچا چکا تھا اور اب سہا ہوا بیٹھا پشت کمرے کے دروازے کی جانب تھی۔ ذرا سی آہٹ ہوتی۔ اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

رات سنسان ہو گئی۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ عین اس دن کے باہر تین بار سیٹی بجنے کی آواز ابھری۔ یہ اس بات کا گنگنل تھا کہ شاہ جی کے گرگے بچے گئے؟ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہی، پھر کوٹھی کے پڑ جہاں گئے درخت تھے، خشک پتوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی رک رک کر چل رہا تھا۔ رات کے سنائے میں یکایک پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ کھٹ، کھٹ، ہر آہٹ کے ساتھ راجہ کی ٹانگیں کانپ اٹھتیں۔ سانس رک رک کر چلتی۔ دروازے پر کئی بار آہٹ ہو لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ دروازہ نہ کھولے۔ لیکن وہ اپنے اس ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ کمرے کے باہر آیا اور اس دروازے پر پہنچا جس پر آہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے جلد دروازے کی چٹنی کھول دی۔ کسی نے باہر سے دھکا دے کر دروازہ کھولا۔ دھندلی روشنی میں خوفناک چہرہ نظر آیا۔ اس کے پیچھے کئی آدمی اور تھے۔ سب اندر آ گئے۔

شاہ جی نے ایک آدمی کی ڈیوٹی دروازے پر لگائی۔ چار کو اپنے ہمراہ لے کر راجہ کے کمرے کے قریب پہنچا جس میں قیمتی سامان رکھا تھا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ شاہ جی نے بال

بال اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور جھٹ تالا کھول دیا۔ سب اندر چلے گئے۔ کمرے میں اندھیرا۔ راجہ نے سوچ دبا کر روشنی کر دی اور ان الماریوں اور بکسوں کی نشان دہی کرنے لگا جن میں پورات اور نقدی تھی۔

آن کی آن میں بال نے ہر الماری کا تالا کھول دیا۔ سارے بکسوں کے ڈھکنے اٹھادیے گئے۔ شاہ جی عین دروازے کے پتوں بچ کھڑا تھا۔ وہ اس وقت کسی چٹان کی طرح پر شکوہ نظر آرہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر صرف ہاتھ اور آنکھوں کے اشاروں سے اپنے گروں کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں کمرے کے اندر ہر طرف سامان ہی سامان بکھریا۔ کمرہ کسی کباڑیے کی دکان معلوم ہونے لگا۔

باہر خانسامان کی کھڑک سنائی دی۔ وہ رک رک کر کھانس رہا تھا۔ سب ٹھٹک کر جہاں تھے وہیں بگمے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ شاہ جی خونخوار نظروں سے سب کو گھورنے لگا۔ ان کے ہاتھ پھر بجلی اسی پھرتی سے چلنے لگے۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر وہ تمام قیمتی اشیاء نکال کر ایک بڑے سوٹ کیس میں بھر چکے تھے۔ دو لمبوں نے اسے اٹھایا اور کمرے سے باہر آ گئے۔ سب سے آخر میں شاہ جی نکلا۔ راجہ بھی اس کے اٹھ ساتھ سہا ہوا چلا رہا۔ پچھلے دروازے سے جب سب باہر چلے گئے تو وہ ٹھٹکا۔ شاہ جی نے دبی زبان سے کہا۔ ”راجہ تجھے بھی ہمارے ساتھ ہی چلانا ہے۔“

سب کوٹھی کے لان سے گزر کر باہر سڑک پر آ گئے۔ پھانک کے قریب ہی اندھیرے میں ہارنگ کی لمبی چوڑی ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس میں جلدی سے سوٹ کیس رکھا گیا۔ سب پھرتی سے دروازے پر داخل ہو گئے۔

ڈرائیور نے ٹیکسی اشارت کی۔ وہ سنسان سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ ٹیکسی شاہ جی کے مکان پر رکی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سوٹ کیس اندر بھیجا باہر شاہ جی سب کے ہمراہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ راجہ کو اس نے نوشا کے کمرے میں بھیج دیا۔

\*\*\*

مذکورہ ان کی آن میں ڈرائیور ہیں۔ پر شکوہ: عظیم الشان، شان و شوکت والا۔

شاہجی بھی کم پریشان نہیں تھا۔ بات یہ تھی انجینئر کا ایک بھائی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ لہذا اس واردات کے سلسلے میں سخت تفتیش ہو رہی تھی جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ پولیس کو سب سے زیادہ تلاش راجہ کی تھی جس سے سارا سراغ مل سکتا تھا۔ شاہجی کو اپنے مجرموں کے ذریعے پولیس کی کارروائیوں کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں۔ ایسی صورت میں راجہ کی موجودگی اڈے پر بے حد خطرناک تھی۔ روزانہ نئی اطلاع آتی۔ ہر اطلاع پر شاہجی گہری فکر میں ڈوب جاتا۔

(۴)

یہ جولائی کی ایک گرم رات تھی۔ فضا میں جس تھا۔ گھٹن تھی۔ پہر رات گزری تو اڈے پر ایک بردہ فروش آیا۔ وہ شاہجی کا پرانا واقف کار تھا۔ پہلے بھی کئی بار سودا کر چکا تھا۔ شاہجی نے اسے دیکھا تو اس کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ اونچے قد کا باتونی آدمی تھا۔ پان بے حد کھاتا تھا اور جہاں جی چاہتا وہیں بیک تھوک دیتا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے پان کھا کھا کر کمرے کا سارا فرش گندا کر دیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

ایک بار شاہجی نے جل کر اسے گالیاں بھی دی تھیں۔ اس لیے کہ گرمیوں میں وہ فرش پر لیٹ کر باش کرتا تھا۔ مگر اس وقت وہ بالکل مشتعل نہ ہوا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ شخص لگ بھگ ڈیڑھ سال بعد شاہجی سے ملا تھا اور اس تمام عرصے کی اپنی سرگزشت سنا دینا چاہتا تھا۔

اس کی باتوں سے شاہجی کو جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ صرف نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھوانے اور ادھر ادھر کرنے کا دھندا کرتا تھا۔ یہ بات شاہجی کو بھی کھلکی۔ اس نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔ ”چوہدری، میرے پاس دو چھوکرے ہیں۔ بہت سدھے ہوئے اور کام کے بندے ہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”میں نے تو جی یہ لین ہی چھوڑ دی۔ ایسے مال کی آج کل کھپت کم ہی ہوتی ہے۔“

شاہجی نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

تقریباً دو ہفتہ بعد فروش انسانوں کی تجارت کرنے والا۔ مشتعل ہونا۔ غصے میں آنا۔ سرگزشت۔ کہانی۔ داستان۔ کھپت۔ ناگ۔

نو شاہجی تک جاگ رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں لمحے بھر ایک دوسرے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر نو شانے آہستہ سے دریافت کیا۔

”تم آگئے؟“

”ہاں؟“ راجہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

نو شانے سادگی سے پوچھا۔ ”اب تم کو ٹھنی پرواپس نہیں جاؤ گے؟“

”نہیں۔“ راجہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”یہ شاہجی سے پوچھو۔“

راجہ سخت بیزار نظر آ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ فرش پر چٹ لیٹ گیا اور چھت کو تکتے لگا۔

”یار اب کیا ہو گا؟“ نو شانے اپنے تجسس کا اظہار کیا۔

”جو تقدیر میں لکھا ہے۔“

نو شانے غور کیا۔ راجہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ہر بات کا اکھڑا اکھڑا جواب دے

اس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک پڑے کروٹیں رہے۔ دونوں میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

دوسرے ہی روز سے دونوں کی کڑی نگرانی شروع ہو گئی۔ شاہجی ان کے کمرے میں خود آیا

ہدایت کی کہ کمرے کے اندر رہا کریں۔ نہ باہر نکلیں اور نہ اڈے کے کسی آدمی سے بات چیت

لیکن اس دفعہ خود بخود نظر دوں سے گھور کر بات کرنے کے بجائے وہ نرمی اور شفقت سے پیش آیا۔

اس کی یہ شفقت دونوں کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ اکثر ان کے کمرے میں آ جاتا

ان کے لیے پھل اور مٹھائیاں لاتا۔ کبھی سگریٹوں کے نئے نئے قسم کے پیکٹ۔ اس نے دونوں

لیے کئی نئی قمیصیں اور کٹ پیس کی پتلونیں بھی بنوا دی تھیں۔ دل بہلانے کے لیے کیر

تاش کی دو گڈیاں بھی منگوا دی تھیں۔

مگر اس قدر تازہ برداری کے باوجود دونوں سبے سبے رہتے۔ ان کے چہرے زرد پڑتے

رخساروں کی ہڈیاں ابھرنے لگی تھیں۔

بے اعتنائی۔ بے پروائی۔ بیزار۔ خفا۔ ناراض۔ چٹ۔ پست۔ کے بل۔ بالکل سیدھا۔ تازہ برداری۔ تازہ لٹانا۔ نگرے سے رہنا۔



چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس شخص نے کہا۔ ”یاد آیا، سکھر سے اس طرح کا ایک آریا تھا۔ کیوں جی یتیم خانے میں چل سکیں گے؟“

شاہ جی فوراً بولا۔ ”یہ مت پوچھ چوہدری! دونوں آفت ہیں آفت۔ تو یتیم خانے کی بات ہے۔ وہ تو سکھ سازی اور جعلی کرنسی تک میں بڑوں بڑوں کے کان کاٹ لیں گے۔ خراکوں کے بھی چل سکتے ہیں۔“

وہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑ کر بولا۔ ”کہاں سے ہاتھ لگ گئے؟“

”ٹرننگ دی ہے۔ رقم خرچ کی ہے۔“

اس نے دریافت کیا۔ ”کیا لوگ ان کا؟“

”تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پورے تین ہزار میں خریدے تھے۔ پر اب پانچ ہزار میں مال نہیں اٹھے گا۔“

”یہ تو زیادہ ہے۔ ویسے یہ سمجھ لے، میں نے ان سے کچھ نہیں لینا۔“

”چل تیرے لیے کچھ کم کر دوں گا۔“

شاہ جی تو خدا سے چاہتا تھا کہ دونوں کسی طرح کراچی سے باہر چلے جائیں۔ لہذا تھوڑی جہت کے بعد چار ہزار میں سودا ہو گیا۔

چوہدری نے اسی وقت پانچ سو بیعانہ بھی دے دیا۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے روز وہ پوری رقم کر دے گا اور رات گئے دونوں کو اپنے ہمراہ لے جائے گا۔

\*\*\*

رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔

نوشا اور راجہ سوئے نہیں تھے۔ دونوں بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ راجہ نے بے سے کہا۔ ”یار بہت برے چمٹ گئے۔“

”ہاں یار سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ خدا قسم اب تو بہت جی گھبرا رہا ہے۔“

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ ”یہاں سے اب نکلنے کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔“

”ابے ایسی بات مت کر، جان سے مارا جائے گا۔“

”جان سے تو یوں بھی مارے جائیں گے۔“

نوشا خوف سے لرز کر بولا۔ ”کیوں؟“

”تجھے پتہ ہے کہ ہم دونوں پر اتنی پابندی کیوں لگائی گئی ہے؟“

”یار مجھے کیا معلوم؟“

وہ جل کر بولا۔ ”ابے تو یونہی رہا۔ اس لیے کہ سالے پکڑے نہ جائیں۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی تو شاہ جی کمرے سے بھی باہر نکلنے نہیں دیتا۔“

”یار اسی لیے تو ڈر لگتا ہے کہ سالہا ہم دونوں کو قتل نہ کر دے تاکہ کسی کو پتہ بھی نہ لگے۔ ان

بے معاشوں کو تو کیا جانے۔ ایک نمبر حرامی ہوتے ہیں۔“

نوشا بے حد ڈر گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”یار تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شاہ جی بڑا ظالم ہے۔“

راجہ بولا۔ ”میرا کہنا مان تو جان بچ سکتی ہے۔“

”یار میں نے تیری اب تک کون سی بات نہیں مانی۔“

”بس ذرا ہمت کی بات ہے۔ سالوں کو صفا غچا دے جاؤں گا۔“

”ڈر لگ رہا ہے۔“ نوشا نے دہی زبان سے کہا۔

راجہ نے اسے ڈانٹا۔ ”دیکھ یار تو زنجاپن مت کر۔ لگ گیا موقع تو آج ہی نکل جائیں گے۔“

”آج؟“ نوشا نے پوچھا۔ راجہ اطمینان سے بولا۔ ”یہ سب تو مجھ پر چھوڑ دے۔“

اسی وقت کمرے کے باہر شاہ جی کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر شاہ جی اندر نہیں آیا۔ کسی سے ذرا دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر واپس چلا گیا۔ دونوں دم سادھے پڑے رہے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ بہت دیر بعد جب محلے پر قبرستان کی سی خاموشی

چھا گئی تو راجہ اٹھ کر دروازے پر آیا۔ اس نے کواڑ کی اوٹ سے جھک کر باہر دیکھا۔ سامنے دالان میں نور

بے خبر سو رہا تھا۔ البتہ بیرونی دروازے پر چوکیدار کی کھانسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔

پہلے راجہ کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے نوشا تھا۔ دونوں نے دبے قدموں چل کر

محکم عبور کیا۔ دالان میں پہنچے تو رانا کے قریب ہی لیٹا تھا۔ وہ جھکے جھکے اس کے قریب سے گزرے

اور جھٹ پر جانے والے زینے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

مناظرہ: قیاد کو، فریب۔ زنجاپن: مراد بڑی۔

سے بھونکتے ہوئے ان پر جھپٹے۔

دونوں نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کر دیا۔

(۵)

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ رات دم بخود کھڑی تھی۔

راجہ اور نوشا ایک شکستہ دیوار کی اوٹ میں دیکے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ اب وہ شاہ جی کے اڑے سے بہت دور آچکے تھے۔ دونوں خوف سے سہمے ہوئے سوچ رہے تھے کہ رات کہاں گزار دی جائے۔ نہ ان کا کوئی شناسا تھا اور نہ ہی شہر کے راستوں سے آشنا تھے۔ شاہ جی کے اڑے سے فرار ہو کر جس طرف منہ اٹھا اسی طرف چل دئے۔ اگر کہتے ان کو نہ دوڑاتے تو کسی اور سمت نکل جاتے۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ ان کے سامنے گزری کے اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ تھا جو اندھیرے میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ جس سڑک پر چل کر وہ یہاں تک پہنچے تھے وہاں ٹیلوں کے دامن میں اڑدھے کی طرح بل کھاتی چلی گئی تھی اور ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ اسی اثنا میں سامنے سے آنے والی ایک کالا کی روشنی ابھری۔ انہوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ ذرا دیر میں کاران کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کی تیز روشنی میں وہ دور سے صاف نظر آرہے تھے۔ کسی نامعلوم خوف سے دونوں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار کی طرف منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔

کارا کی رفتار ان کے قریب پہنچتے پہنچتے سست پڑ گئی۔ پھر بریک لگنے کی آواز ابھری۔ دونوں کے جسم لرز کر رہ گئے مگر کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ کوئی ان کے قریب نہ آیا۔ کار جس رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے سناں سڑک پر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جب کار دور نکل گئی تو جان میں جان آئی۔

نوشا نے کہا۔ ”بے یہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔ کسی اور طرف چلیں راہ گیروں سے اسٹیشن کا راستہ معلوم کریں۔ رات وہیں اچھی گزر سکتی ہے۔ گھر جانے کے لیے ریل گاڑی بھی مل جائے گی۔“

ہو کا عالم ہو کہ عمل خاموشی اور دیواری شناسا جانے والا۔ آشنا واقف۔

دونوں لمحہ بھر کھڑے کانپتے رہے۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ راجہ نے ہنس کام لیا۔ بچوں کے بل اٹھ کر زینے کی چٹنی کھولنے کی کوشش کی۔ مگر گھبراہٹ میں ہاتھ بے چارہ گہری خاموشی میں کھڑ کھڑا ہٹ ہوئی۔ دونوں کا دم نکل کر رہ گیا۔ اسی وقت نورانے کر دت بل اپنی پیٹھ کھانے لگا۔

جب نورانے بھرنے لگا تو راجہ بچوں کے بل پھراٹھا۔ اس دفعہ اس نے چٹنی کھول آہستہ سے ایک پٹ کھولا۔ دروازہ چرچا لیا۔ راجہ نے دل ہی دل میں دروازے کو گندی سی گالی دی دونوں زینے میں داخل ہوئے اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر پہنچ گئے۔ دور تک چھیل چھت پھیلی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چلا تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے، پھر راجہ نے نوشا اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ گئے جس میں لگا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ نیچے گلی میں چلا گیا تھا۔ راجہ نے پائپ ہاتھ سے پکڑ کر بلایا۔ پائپ منہ سے لگا تھا۔

راجہ پائپ کے سہارے پھسلتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے گلی میں اتر گیا۔ نوشا منڈیر پر جھکا ہوا رہا۔ جب راجہ تاریکی میں غائب ہو گیا تو نوشا نے پائپ پکڑا اور نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے پیروں گمانے لگے۔ وہ منڈیر سے چٹ گیا۔ نیچے راجہ شیشی کر رہا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ کہ وہ جلدی سے اتر آئے۔ مگر نوشا جھک رہا تھا۔ اتنے میں نیچے گلی سے راجہ کی آواز ابھری۔ ”اے اتر، نہیں تو میں چلا۔“

نوشا نے بدحواس ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور پائپ پر پھسل پڑا۔ نیچے راجہ کھڑا تھا۔ فوراً سنبھال لیا اور وہ منہ کے بل زمین پر گر تا۔ راجہ نے اس کی پیٹھ ٹھوکی۔ خوشی سے بولا۔ ”شاباش میرے شیر۔ بس اب بن گیا کام۔“

دونوں اندھیری گلی میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ انہوں نے گلی عبور کی۔ آگے میدان دوسری طرف سڑک تھی جس پر ایک کار تیز روشنی بکھیرتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ وہ اسی سمت دئے۔ لیکن جیسے ہی میدان میں آئے نہ جانے کہاں سے کتوں کا غول نکلا اور ان کے سامنے

مند پر ایک بوڑھا شخص دوزانوں بیٹھا تھا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ سر پر عمامہ تھا ہاتھ میں بڑے بڑے دانوں کی تسبیح تھی۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وضع قطع سے خانقاہ کا سپاہہ نشین یا متولی نظر آتا تھا۔ اس کے روبرو کچھ لوگ عقیدت سے سر جھکائے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ راجہ اور نوشادر کھڑے حجرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک سمت سے شور بلند ہوا۔

”یاسائیں بابا۔ ہو حق اللہ!“

دونوں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا۔ ایک صحنی میں کچھ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ دونوں اسی طرف چل دیے۔ وہاں روشنی کم تھی۔ وہ خاموشی سے حلقے میں شامل ہو گئے۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ان میں ملنگ تھے۔ قلندر تھے اور ایسے ہی دوسرے لوگ تھے۔ کچھ نیم برہنہ تھے۔ کچھ بوسیدہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ جسوں سے پسینے کی بواغختی تھی۔ لمبے لمبے گندے چمک بال اور کالے کالے چہروں پر سرخ سرخ آنکھیں۔ وہ گلوں میں موزوں کے نچے اور ہاتھوں میں کڑے پہنے ہوئے تھے۔ ایک ملنگ کے ہاتھ میں لمبی چلم تھی۔ اس نے چلم پر دم لگایا۔ سرخ شعلہ لہرایا۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور چلم برابر بیٹھے ہوئے ملنگ کی جانب بڑھادی۔ چلم اسی طرح ایک دوسرے سے ہوتی ہوئی راجہ تک پہنچی۔ اسے لیتے ہوئے وہ جھجکا۔ اس شخص نے، جس کے ہاتھ میں چلم تھی، راجہ کو اپنی لال لال آنکھوں سے گھورا۔ اونچی آواز سے گرج کر نعرہ لگایا۔ ”یاسائیں بابا۔“ اس نعرے سے راجہ ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے چلم پر کش لگایا۔ اس کا کلیجہ تک سلگ گیا۔ سانس حلق میں گھسنے لگی۔ اس نے کھانتے ہوئے چلم فوراً نوشاکی طرف بڑھادی۔

نوشانے بغیر سوچے سمجھے چلم پر دم لگایا اور جلدی سے چلم آگے بڑھادی۔ سارے پر دم لگانے سے دونوں کے کلیجے جلنے لگے تھے۔ حلق خشک پڑ گئے۔ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا جسم بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا، دونوں بے اختیار جھوم اٹھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے پردے لہرانے لگے۔ جسم رفتہ رفتہ بے قابو ہوتے جا رہے تھے۔ چرس کا نشہ اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ دونوں خاموش بیٹھے جھومتے رہے۔ ان کی آنکھوں کے پوٹے بوجھل ہو گئے۔

ملاحظہ فرمائیے: عمامہ، بھڑکی، سپاہہ نشین، کسی بزرگ یا سپہ سالار کا نشان، متولی، منتظم، مگر ان۔ مراقبہ: سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کے دھیان میں جھٹلنا۔ عمامہ پر دم لگانا: چرس پینا، نشہ کرنا۔

راجہ اسے گھورنے لگا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”سارے کچھ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ گھاس تو کھا گیا۔ تو ضرور پکڑا جائے گا اور تیرے سنگ میری گردن بھی چھنے گی۔“

نوشانے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیوں؟“

”ابے تو شاہ جی کو الو کا پٹھا سمجھتا ہے۔ وہ نورے اور لوٹن کو سب سے پہلے اسٹیشن پر پولیس الگ اپنی تلاش میں ہے۔“

نوشا حیرت سے منہ پھاڑ کر بولا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔“

”تو ابھی لوٹا ہے۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔“

”یار تو بہت پہنچا ہوا نکلا۔ لیکن اب یہ تو بتا کہ اس وقت جائیں کہاں؟“

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ ”ابے یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

دونوں خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوری دیر بعد انہوں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ان کے ایک طرف فوجی بیرکیں تھیں۔ دوسری طرف بنجر اور اجاڑ ٹیلے تھے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

انہوں نے میل بھر سے کچھ کم ہی راستہ طے کیا ہو گا کہ دور سے ریلوے لائن دکھائی دی۔ ریلوے لائن کے اس پار کچھ فاصلے پر روشنی نظر آئی۔ انہوں نے اپنی رفتار کسی قدر تیز کر لی۔ ریلوے لائن عبور کی اور روشنی کی سمت بڑھنے لگے۔ قریب جا کر دیکھا۔ یہ ایک خانقاہ تھی جو احاطے میں گھنے درختوں کے جھنڈے تھے۔ ایک اونچے درخت پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے اندر تیز روشنی تھی۔ لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

دونوں درختوں کے نیچے سے گزر کر خانقاہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ خانقاہ کے سامنے وسیع مزار تھی جس کے ایک رخ پر حجرے اور دالان تھے۔ صحیحیاں تھیں۔ اونچے گنبد کے نیچے مزار خانقاہ ڈھیروں ہار پھول بکھرے ہوئے تھے۔ مزار کے چاروں طرف دیواروں میں طاق تھے جن پر چل رہے تھے۔ مزار کے قریب دو آدمی سجدے میں پڑے تھے اور کچھ آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے۔ مزار سے متصل کشادہ حجرہ تھا۔ حجرے میں گیس بتی روشن تھی۔ فرش پر اجلی چاندنی

سنگ: ساتھ، ہمراہ، ہمراہ: قابل کاشت زمین۔ خانقاہ: کسی بزرگ کا مزار۔ صحیحی: وہ چھوٹا صحن جو دالان کے پہلو میں بنائے جاتا ہے۔ اجلی چاندنی: صاف ستھری سفید چادر۔

غودگی بڑھنے لگی۔

دونوں وہیں ایک طرف لڑھک کر گہری نیند سو گئے۔

\*\*\*

دن چڑھے تک دونوں سوتے رہے۔ باہر دھوپ پھیل چکی تھی۔ اچانک کسی نے راجہ کی کھینچ کر زور سے جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا بڑے بڑے بالوں والا ایک نیم برہنہ ملنگ اس جھکا ہوا کھڑا ہے۔ وہ ڈپٹ کر بولا۔

”لنگر بٹ جائے گا۔ جاؤ جلدی سے جا کر لے آؤ۔“

وہ اپنے ہاتھوں کے کڑے بجاتا آگے بڑھ گیا۔ راجہ نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو ہاتھ سے ملا اور انگڑائی لے کر کسل مندی دور کرنے لگا۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ گلا خشک تھا۔ ہاتھ ٹوٹ رہے تھے۔ جب وہ گرد و پیش کے ماحول سے کسی قدر مانوس ہو گیا تو اس نے پاس لیے ہوئے نوشا کو جگایا۔ جواب تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بھی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں کو نو پیاس لگی تھی۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کہاں جا کر پانی پیئیں اسی اثنا میں وہ ملنگ پھر واپس آ گیا جس راجہ کو جگایا تھا۔ ”تو ابھی تک لنگر لینے نہیں گیا۔“ وہ برہم ہو کر چیخا۔

راجہ نے پوچھا۔ ”کہاں سے؟“

”اوائے تجھے پتہ نہیں۔ یہ زندہ پیر کا مزار ہے۔ یہاں سب کو لنگر ملتا ہے۔ وہ رہا لنگر خانہ۔ اس نے اس طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا جہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔

ملنگ ایک طرف چلا گیا۔ راجہ اور نوشا اٹھ کر لنگر خانے کی جانب بڑھے۔ لنگر خانے سامنے کنگنوں اور ملنگوں کا جھوم تھا۔ ہر طرف دھکم پیل مچی تھی۔ لنگر لینے والے زور زور سے رہے تھے۔ گالیاں دے رہے تھے۔ کتوں کی طرح لڑنے کے لیے جھپٹتے تھے۔ جھوم کے سامنے آ کر چوتھے پر دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ڈھیری سی توری روٹیاں دبی تھیں۔ دوسرا سی بالٹی لٹکائے کھڑا تھا۔ وہ بالٹی میں ڈونگا ڈال کر دال نکالتا اور سامنے پھیلے ہوئے ٹین کے ڈونگا المونیم یا مٹی کے میلے میلے پیالوں میں ڈالتا جاتا۔ کنگے لنگر لینے کے لیے ٹوٹے پڑے تھے اور تقسیم کرنے والے ان کو نفرت سے جھڑک رہے تھے۔

”خزیر دا پیچھے ہٹو۔“

”تو دوبارہ آیا ہے۔ او خانہ خراب! پیچھے ہٹ۔“

”شور مت مچا۔ او تیرا بیڑہ غرق۔“

نیم برہنہ جسموں والے کنگے اور ملنگ گالیاں سن رہے تھے۔ بندروں کی طرح دانت نکالے بے غیرتی سے ہنس رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ راجہ اور نوشا سہمے ہوئے ان کو دیکھتے رہے۔ آخر راجہ نے نوشا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں بھیڑ میں گھس گئے۔ انہوں نے دھکے کھائے۔ گالیاں سنیں۔ مگر ڈٹے رہے۔ ان کو بھی دودو روٹیاں مل گئیں۔ ان کے پاس برتن نہیں تھے۔ لہذا دال روٹیوں پر ہی ڈال دی گئی۔

لنگر لے کر دونوں ایک درخت کے نیچے پہنچے۔ وہاں دو ملنگ پہلے ہی سے موجود تھے اور ہبڑ ہبڑ لنگر کی دال روٹی کھا رہے تھے۔ قریب ہی ایک مرد قلندر دھوپ میں بیٹھا اپنے لمبے لمبے بالوں سے جوئیں نکال نکال کر مار رہا تھا۔ نوشا نے اسے دیکھا تو جی متلانے لگا۔

”چل یار کہیں اور چل۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑ کر راجہ سے کہا۔

راجہ نے اسے جھڑک دیا۔ ”ابے یہ خڑے چھوڑ۔ بھوک کے مارے اپنا دم نکلا جا رہا ہے۔“

وہ زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ نوشا کو بھی اپنے ساتھ ہی بیٹھالیا۔ دونوں گردن جھکا کر دال روٹی کھانے لگے۔ روٹیاں ٹھنڈی تھیں مگر چنے کی دال گرم تھی۔ دال میں مرچیں زیادہ تھیں اور پتلی بھی تھی۔ دونوں کے منہ میں جیسے آگ لگ گئی۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور کنویں کی طرف بھاگے جس کی منڈیر کے پاس ہی بڑے بڑے مٹی کے مٹکے ایک پختہ چوترے پر رکھے تھے۔

دونوں نے المونیم کے گندے اور بدو وضع گلاسوں میں پانی انڈیلا اور غناغٹ پی گئے۔ پانی پینے کے بعد وہ بھاری بھاری پیپوں کے ساتھ ایک صحیحی کی جانب بڑھے۔ اندر گئے اور ایک گوشے میں خاموشی سے لیٹ گئے۔ صحیحی میں ان کی طرح اور بھی کتنے ہی بے فکرے اور ملنگ فرش پر لیٹے اوندھے رہے تھے یا سو رہے تھے۔

دونوں کچھ دیر تک خافہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے، پھر آنکھیں بند کر کے سو گئے۔ تمام دوپہر وہ بے خبر سوتے رہے۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے ان کی آنکھ کھل گئی۔ اب زندہ پیر کے

ہبڑ ہبڑ جلدی جلدی سی متلانا: تے / ائی آئے کی کیفیت ہوتا۔ پھسکڑا مار کر بیٹھنا: آلتی پالتی مار کر / بے کلف ہو کر بیٹھنا۔

لنگر بیٹھا: غریب یا مسکین کا تقسیم ہونا۔ کسل مندی: سستی۔ دھکم پیل: رش میں دھکے لگانا۔

مزار پر چہل پہل بڑھ گئی تھی۔

”مگر اب جائیں کہاں؟“ نوشا نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

راجہ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”یار میری سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے، مگر تو مانے گا نہیں۔“  
”ہاں تو گائیوں نہیں۔ کچھ بتا تو۔“

راجہ سر کے بال کریدتے ہوئے بولا۔ ”میرا تو جی چاہتا ہے کہ بی بی جی کے پاس جا کر ان کے چہرہ پر کولوں۔ ان کو سب کچھ صاف بتا دوں۔ میں تو دو پہر سے یہی سوچ رہا ہوں۔“

”مگر یار شاہ جی سے دشمنی مول لینی پڑے گی۔ وہ ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔ بڑا خطرناک آدمی ہے۔“

راجہ نے کہا۔ ”یہی تو مجھے بھی ڈر ہے۔ مگر جب پولیس اس کو پکڑ لے گی تو پھر وہ ہمارا کیا بازے گا۔“

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ رات کا اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔

خانقاہ کی اردو نقشبات پر تھی۔ جمہرات کا دن تھا۔ زائرین اور عقیدت مندوں کا خوب ہجوم تھا۔  
نوشا اور راجہ بہت سوچ بچار کے بعد آخر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ خانقاہ چھوڑ دینا چاہیے اور انجینئر کی کوٹھی پر جا کر بی بی جی کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ یہ منصوبہ بنا کر راجہ نے ایک شخص سے ہاؤسنگ سوسائٹی کا راستہ پوچھا اور دونوں خانقاہ سے باہر آ گئے۔ انہوں نے کالا پل عبور کیا۔ ڈرگ روڈ پر پہنچے اور ہاؤسنگ سوسائٹی کی جانب روانہ ہو گئے۔

\*\*\*

راجہ اور نوشا انجینئر کی کوٹھی پر پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے۔ انہوں نے پیدل کئی میل کا راستہ طے کیا تھا۔ تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ راجہ وہاں آ تو گیا مگر جاتے ہوئے جھک رہا تھا۔  
آخر کار وہ ڈرتے ڈرتے پھانگ کے اندر داخل ہوا۔ نوشا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لان عبور کر کے جیسے ہی وہ روشنی میں آیا۔ نہ جانے اس وقت کہاں سے آ کو تو اور لٹی نکل آئے۔ راجہ کو دیکھ کر انہوں نے جتنا شرم و خجما کر دیا۔

”راجہ آ گیا۔ راجہ آ گیا۔“

دونوں بچے آ کر اس سے چٹ گئے۔ شور سن کر بی بی جی بھی آ گئیں۔ انہوں نے راجہ اور نوشا کو ٹپکھ کر غلام غلام کر دیا۔

ہر طرف گیس بیوں کی روشنی پھیل گئی۔ عقیدت مندوں کی آمد و رفت میں بھی تاخیر ہو گیا۔ سفید ڈاڑھی والے سجادہ نشین مزار کے سر ہانے بیٹھے تھے اور اشاروں سے مجاوروں کو احاطہ دے رہے تھے۔ عقیدت مند اور زائرین آتے۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔ دونوں ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر نذرانہ پیش کرتے اور لائے قدموں لوٹ کر مزار کے پاس ہی ایک طرف بیٹھ جاتے۔

قریب ہی صحنی میں قلندر روں اور درویشوں کی محفل جنمے لگی تھی۔ وہ چلم پر لمبے لمبے لگا رہے تھے اور سر خوشی کے عالم میں طرح طرح کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ناگاہ ایک سب ہاپو پولیس چار کانشیلوں کے ہمراہ مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ پہلے وہ سجادہ نشین کے پاس گیا۔ اسے آہستہ آہستہ کچھ دیر بات چیت کی پھر کانشیلوں کے ساتھ حجرہوں، دالانوں اور صحنوں کی طرف لینے لگا۔

پولیس والے جب راجہ اور نوشا کے قریب آئے تو ان کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ انہوں نے ذبح ہونے والے مویشیوں کی طرح اپنی گردنیں لٹکالیں اور آنے والی مصیبت کا درد دلوں سے انتظار کرنے لگے۔ مگر مصیبت ان کے سر سے صاف ٹل گئی۔ پولیس والے چپ چاپ ان کے پاس سے گزر گئے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے دیکھا چرسیوں کے غول میں سے کانشیلوں نے بالکے دبے پتلے ملنگ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے گرفتار کر لیا۔

خانقاہ میں سناٹا چھا گیا۔ چند لحوں کے لیے کھلبلی مچی۔ ذرا دیر خاموشی رہی اور جب پولیس والے اس ملنگ کو حراست میں لے کر احاطے سے باہر چلے گئے تو درویشوں اور قلندروں نے سناٹا دم لگایا۔ چلم کے اوپر شعلہ لہرایا۔ ہر طرف سے نعرہ بلند ہوا۔

”یاسائیں بابا۔“

”ہو۔ حق اللہ۔“

خانقاہ کی زندگی میں یہ غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ البتہ راجہ اور نوشا ابھی تک سہمے ہوئے تھے۔ پولیس والوں کے قدموں کی آواز جب دور ہو گئی تو نوشا نے کہا۔

”یار راجہ، یہ جگہ تو بہت خطرناک ہے۔ اللہ نے بال بال بچالیا۔“

”ہاں یار یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔“

راجہ اس کے سوال کا جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ دفعۃً کمرے کا دروازہ کھلا۔ پولیس والے اپنے بھاری بھاری بوٹ پہنچے فرش پر بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ راجہ اور نوشادام بخود رہ گئے۔ پولیس والوں نے دونوں کے ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال دیں۔ انہیں تھانے لے گئے۔ مار پیٹ اور دھمکی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ دونوں نے اپنے بیان میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش بھی کی۔ روئے، گڑگڑائے مگر انہیں حوالات میں ڈال دیا گیا۔

اسی رات شاہ جی کے اڈے پر چھاپہ مارنے کی غرض سے پولیس کی مسلح پارٹی روانہ کر دی گئی۔ شاہ جی کو اپنے گرگموں کے ذریعہ راجہ اور نوشا کی گرفتاری کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ پولیس پارٹی جب شاہ جی کے اڈے پر پہنچی تو وہاں صرف چوکیدار موجود تھا۔ پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔

پوچھ گچھ کرنے پر چوکیدار سے معلوم ہوا کہ شاہ جی اور اس کے ساتھی گھنٹہ بھر پہلے گھر سے نکل گئے تھے اور یہ کہہ کر گئے تھے کہ صبح کو واپس آجائیں گے۔ شاہ جی کے گھر کی نگرانی شروع کر دی گئی۔

شہر کے ہر تھانے اور چوکی کو مطلع کر دیا گیا۔ وارنٹ پولیس کے ذریعہ حیدر آباد اور ٹھٹھہ کے تمام تھانوں کو بھی خبردار کر دیا گیا۔ پولیس کا اندازہ تھا کہ چند گھنٹوں میں شاہ جی اور اس کے ساتھی زیادہ دور نہیں جاسکتے۔ کسی ریل گاڑی کے جانے کا وقت نہیں تھا۔ شاہ جی صرف کار کے ذریعہ فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔

راجہ اور نوشا حوالات کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ راجہ گم صم تھا۔ مگر نوشادام ہم تھا وہ راجہ کو خونخوار نظروں سے دیکھتا جس نے اپنے ساتھ اسے بھی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔



تھانے میں ایس ایچ او کے کمرے سے بار بار بولنے اور باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ہر ٹینڈنٹ پولیس چونکہ ذاتی طور پر کیس میں دلچسپی لے رہا تھا، لہذا تھانے کا پورا عملہ زبردست مستعدی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ایس ایچ او ٹیلی فون کے پاس بیٹھا تھا۔ چائے پی رہا تھا۔ سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔

کو دیکھا تو حیرت سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ ان کے پاس گئیں۔ لیکن فوراً ہی کسی نامعلوم خوفزدہ گھبرا کر جلدی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ راجہ اور نوشا سر جھکائے ان کے سامنے گنہگاروں کی طرح کھڑے تھے۔ بی بی جی دونوں کو غصے سے گھور رہی تھیں۔ اسی وقت انجینئر کی کار آگئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ٹیکم سے مخاطب ہوا۔ ”تم یہاں کھڑی ہو۔“ اچانک اس کی نظر راجہ پر پڑی۔ حیرت ہو کر بولا۔

”ارے راجہ۔“

وہ لمحہ بھر تک کچھ سوچتا رہا پھر دونوں کو اپنے ہمراہ کوٹھی کے اندر لے گیا۔ ان کو ایک کمرے میں بٹھایا۔ بیوی کو نگرانی پر مقرر کیا۔ پولیس کو ٹیلی فون کیا اور دونوں کی آمد سے مطلع کر دیا۔

کمرے میں پہنچ کر راجہ نے بی بی جی کے پیروں کو پکڑ لیا۔ گڑگڑا کر رونے لگا۔ ”بی بی جی، معاف کر دو۔ اللہ قسم میری ذرا بھی غلطی نہیں۔“

اس نے رورور کر شاہ جی اور اس کے گروہ کا حال بتایا۔ اپنی مجبوری بیان کی۔ وہ خاموشی ساری باتیں سنتی رہی۔ اسے حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر متاثر بھی ہوئی۔ مگر اسے سب سے اہم فکرا اپنے قیمتی زیورات اور سامان کی تھی۔ اس نے جل کر دل ہی دل میں کہا۔ دونوں بھاڑ میں جا پہلے چوری کا مال ملنا چاہیے۔

اسے خاموش پا کر راجہ نے کہا۔ ”بی بی جی! سچ کہتا ہوں، میرا تو جی چاہتا ہے زندگی بھر رہوں۔ آپ ہم دونوں کو پولیس سے بچا لیجئے۔“

”اللہ قسم، ہمارا بالکل قصور نہیں۔“ نوشا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ ”اچھا، اچھا“ کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ذرا دیر بعد راجہ کو پیشاب آنے لگا۔ اس کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھکا۔ پریشان ہو کر نوشا سے کہا۔

”لگتا ہے یار چوٹ ہو گئی۔“

نوشا نے گھبرا کر دریافت کیا۔ ”کیا ہو گیا؟“

”کمرہ باہر سے بند ہے۔“

”کیوں؟“ نوشا اور گھبرا گیا۔

رات تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ تھانے میں گہرا سناٹا تھا۔ کبھی کبھار فرش رکائیلوں بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ابھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

رات کے دو بجنے والے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی۔ انسپکٹر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے اطلاع ملی کہ ٹھٹھہ میں شاہ جی کے حملے کا ایک شخص پانچ افراد کے ہمراہ مشتبہ حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ دو بڑی ٹیکسیوں کے ذریعے سفر کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے جواب میں ہدایت دی انہیں فوراً گراچی پہنچادیا جائے۔

صبح کاذب کے دھندلکے میں شاہ جی، نورے، لوٹن اور دلا کو دو اور مشتبہ افراد کے ساتھ پولیس کی حراست میں تھانے لایا گیا۔ مگر انہیں تھانے کی حوالات میں بند کرنے سے قبل راجہ نوشا کو ریماڈنڈ ہوم پہنچادیا تھا۔

شاہ جی اور اس کے ساتھیوں نے کئی روز تک پولیس کو اپنے جرائم کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ ہر الزام سے انکار کیا۔

وہ کئی بار کے سزا یافتہ اور بڑے گھاگ جرائم پیشہ تھے۔ مگر جب طرح طرح سے زور دیا گیا تو ان کے اعصاب نے جواب دے دیا۔ انہوں نے سب کچھ اگل دیا۔ ان کی نشاندہی پر چور مال بھی برآمد کر لیا گیا۔

پولیس نے بیانات قلم بند کرنے کے بعد عدالت میں ان کے خلاف چالان پیش کر دیا۔ انہیں حوالات سے عدالت کے ریماڈنڈ پر سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

شاہ جی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں ڈاکہ زنی اور بد رفتاری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ راجہ اور نوشا کو وعدہ معاف گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا گیا۔ چار مہینے تک مقدمہ چلتا رہا۔ پیشیاں پڑتی رہیں۔ مقدمے کی سماعت ہوتی رہی۔ شاہ جی کے وکیل اسے اور اس کے ساتھیوں کو بری کرانے کی بہت کوشش کی۔ اپنے موقف کی تائید میں دلائل ساتھ ساتھ گواہ بھی پیش کئے۔

شاہ جی اور اس کے ساتھی ان بیانات سے منحرف بھی ہو گئے جو انہوں نے پولیس کے ذہن دینے تھے۔

چوری کا مال پہلے ہی برآمد ہو چکا تھا۔ سارے ثبوت بھی موجود تھے۔ شاہ جی اور اس کے ساتھیوں کو ڈاکہ زنی اور دوسرے جرائم کی پاداش میں چار چار سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ شاہ جی کے وکیل نے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی۔ مگر اپیل خارج ہو گئی۔ ماتحت عدالت کی سزا بحال رکھی گئی۔

راجہ اور نوشا کو اعانت جرم کی پاداش میں سال، سال بھر کی سزا ہوئی۔ دونوں کو ریماڈنڈ ہوم سے بورٹل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جیل نو عمر اور نابالغ مجرموں کے لیے مخصوص تھی۔

تی چین آجاتی۔ وہ بڑی سدا بہار عورت تھی۔ دیکھنے والوں کو اس پر اور سلطانہ پر چھوٹی بڑی بہنوں کا گمان ہوتا۔ لیکن ماں جس قدر شادماں تھی سلطانہ اس قدر بھیجی بھیجی اور افسردہ نظر آتی۔ اس میں دو شیرازی کا جو لڑکھن تھا اس پر بددی اور بے زاری چھاتی جارہی تھی۔ وہ بہت کم بات چیت کرتی۔ وہ عام طور پر سچی ہوئی سی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

\*\*\*

## فصل ششم

(1)

شہر کی ایک شام کا ذکر ہے۔ ماں نیاز کے ساتھ سینما دیکھے گئی تھی۔ اُو بھی ضد کر کے ساتھ لگ گیا تھا۔ سلطانہ گھر میں تنہا تھی اور نڈھال سی باورچی خانہ میں بیٹھی تھی۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ آگ سے نارنجی شعلے ابھر رہے تھے۔ باہر رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شیشم کے درخت سے زرد زرد پتے ٹوٹ کر آنگن میں گر رہے تھے۔ ہوا چلتی تو بکھرے ہوئے پتے کھڑکھڑاتے۔ بڑی پر

شادی کے چند ہی روز بعد نیاز، دکان کی کوٹھری سے اپنا سامان اٹھا کر نوشا کے گھر میں آ گیا۔ اس نے مکان کی مرمت کرائی۔ اپنی رہائش کے لیے علیحدہ کمرہ بنوایا۔ دیواروں پر ازبک کرایا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر روغن پھیروایا۔ وہ مکان جو کبھی کھنڈر کی طرح شکستہ اور بوسیدہ آتا تھا، اب دلہن کی طرح سجا ہوا لگتا تھا۔

سلطانہ کے ساتھ اس کا رویہ بہت سنبھلا ہوا تھا۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتا۔ کمرے میں نہیں گیا جس میں سلطانہ اور اُور رہتے تھے۔ یوں کاروبار سے اس کا جتنا وقت بچاؤ گزرتا تھا۔ وہ عام طور پر اپنے کمرے میں بیٹھا بیوی کے ساتھ دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتا۔ کون

بازار لے جاتا اور سامان سے لدا پسندالوشت۔ دوبار اسے فلم دکھانے بھی لے گیا۔ رات کو دکان واپس آتا تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ خالی ہاتھ آیا ہو۔ ہمیشہ پھل، مٹھائی یا کچھ اور کھانے پینے کے

لے کر گھر میں داخل ہوتا۔ روزانہ شام کو گل فروش دروازے پر آواز دے کر مہکتے ہوئے گجرے ہار دے جاتا۔

یہ بڑے ہنسی خوشی کے دن تھے۔ گھر میں ہر وقت چہل پہل رہتی۔ سب سے زیادہ سلطانہ کی ماں تھی۔ اس کے رخسار نکھر کر گلہابی پڑتے جارہے تھے۔ آنکھوں میں نرالی چمک تھی۔ شام کو جب وہ بن ٹھن کر بیٹھتی تو عطر اور پھولوں کے گجروں سے جسم مہکتا ہوتا۔ اس

میں خوش رہتی۔ سدا بہار: ہمیشہ تروتازہ رہنے والی۔ شادماں: خوش۔ چھریرا: دلاویز۔ دلاویزی: خوبصورتی۔

گل فروش: پھول بیچنے والا۔ بن ٹھن کے: سوج سوج کے۔



جانب تھی اور وہ ہم لہجے میں رک رک کر بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلاک کرب تھا۔ چہرے پر دکھ لاسایہ پھیلا تھا۔ سلطانہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ سلمان کہتا رہا۔ ”شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میں ایک عرصے سے پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ لہذا جان نے خرچ بھیجا بند کر دیا ہے۔ میری تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ ملازمت تلاش کر رہا ہوں، وہ ابھی تک نہیں ملی۔“ وہ اس وقت اپنی زندگی پر سے ہر پردہ اٹھا دینا چاہتا تھا۔ ہر بات کہہ دینا چاہتا تھا۔ ”زندگی میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ اور اس عذاب میں، میں تم کو شریک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ میری سب سے بڑی تمنا تھی کہ تم میری بن جاتیں اور ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتیں۔“

سلمان نے گہری سانس بھری۔ اس کا چہرہ اور بھی زیادہ اداس ہو گیا۔ سلطانہ کو اس کی باتوں سے صدمہ پہنچا۔ وہ لرز لرزاٹھی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر اس نے کہا۔ ”تو پھر آپ اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے؟“

”میں سلطانہ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ زندگی میں اتنی بہت سی ٹھو کریں کھانے کے بعد میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے کے بجائے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کروں۔ یہ عہد میں نے اسی رات کیا تھا۔ وہ رات میری زندگی کی عجیب رات تھی۔“ ایک بار پھر سلمان نے گہری سانس بھری۔ ”سچ تو یہ ہے سلطانہ! میں نے بڑی بے راہ روی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ مگر اب چاہتا ہوں کہ زندگی میں کچھ باقاعدگی آجائے اور میں۔۔۔۔۔“

اپنی بات کہتے کہتے اس نے اچانک نظریں اٹھا کر سلطانہ کو دیکھا۔ ”تم مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں اتنا برا نہیں ہوں۔“ وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ آواز قدرے بھرا گئی۔ اس سے کچھ بھی نہیں کہا لیا۔ سلطانہ مبہوت کھڑی رہی۔

چند لمحوں کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ صحن میں خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑاتے رہے۔ رات کا اندھیرا اور بڑھ گیا۔ سنا آسب زدہ ہو گیا۔ سلطانہ نے سوچا کہیں سب لوگ واپس نہ آجائیں۔ براغضب ہو گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”ایک بات کہوں۔ برائے مانعے گا۔“ پھر اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی بات کہہ دی۔ ”آئندہ آپ یہاں نہ آیا کریں۔“

لاکھ بہت زیادہ کہ تکلیف۔ لرز اٹھنا۔ خوف سے کانپ جانا۔ بے راہ روی۔ غلط راستے پر چلنا۔ بد چلنی۔

وہ واپس جا رہا ہے  
دیکھ! وہ واپس جا رہا ہے  
خزاں رسیدہ پتے آگن میں کھڑکھڑاتے رہے۔ ہوا سرسراتی رہی۔ دہلی دہلی سرگوشیاں  
رہیں۔ سلطانہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باورچی خانے سے نکلی۔ اس نے آگن عبور کیا اور دروازہ  
کنڈی کھول دی۔ وہ اس وقت کسی سحر زدہ ہستی کی طرح مبہوت نظر آرہی تھی۔  
سلمان نے دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔ دھندلی روشنی میں اس نے سامنے کھڑی ہوئی را  
دیکھا اور ٹھٹک گیا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سلطانہ!“  
”جی۔“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔  
دونوں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموش کھڑے رہے۔  
ذرا دیر بعد سلطانہ کی آواز ابھری۔ ”اب آپ کیوں آئے ہیں؟“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ سلما  
اس کی تلخی شدت سے محسوس کی۔ سر جھکا کر بولا۔  
”تم سے معذرت کرنے آیا تھا۔“  
”کاہے کی معذرت؟“  
”بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔“

سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔  
”سلطانہ! میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ آج میں تم سے سب کچھ صاف صاف  
چاہتا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بات یہ ہے کہ اس رات جب تمہارے گھر سے  
گیا تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ایسی حالت میں، میں  
کیسے اپنے ہمراہ لے جاتا۔ اس رات میں اپنے ہر دوست اور جاننے والے کے پاس گیا۔ مگر کوئی  
میرے آڑے وقت پر کام نہیں آیا۔ میں تمام رات پانگوں کی طرح ویران سڑکوں پر گھوم  
تمہیں کس طرح بتاؤں کہ اس رات مجھ پر کیا ہوتی۔“

سلطانہ اس انکشاف پر چونکی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر سلمان کو دیکھا۔ اس کی پشت دروازے

مسلمان کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ سلطانہ نے اسے خاموش دیکھ کر وضاحت کی۔ ”بات یہ ہے کہ اماں نے شادی کر لی ہے۔“ یہ کہتے کہتے وہ گھبرا گئی۔

مسلمان حیرت سے چونک پڑا۔ ”اماں کی شادی ہو گئی؟“ اسے سلطانہ کی بات پر یقین نہ آیا۔

آہستہ سے بولی۔ ”جی ہاں۔“

وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ ”کس کے ساتھ شادی ہوئی؟“

”آپ انہیں نہیں جانتے۔ ہمارے ایک رشتہ دار ہیں نیاز۔ ان کے ساتھ ہوئی ہے۔“

مسلمان نے گھبرا کر پوچھا۔ ”وہی تو نہیں، جن کا کباڑ خانے کا کاروبار ہے؟“

”ہاں وہی۔ آپ ان کو جانتے ہیں؟“

وہ صاف مکر گیا۔ ”ایسے ہی ایک بار ملاقات ہو گئی تھی۔“

”آپ یہاں آئیں گے تو وہ ناراض ہوں گے۔ وہ بڑے شکی آدمی ہیں۔ کسی دن آپ کی عزتی کر بیٹھے تو کتنی بری بات ہوگی۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آئندہ نہ آئیں۔“

”معلوم ہوتا ہے۔“

مسلمان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”اچھا نہیں آؤں گا۔“

سلطانہ نے ٹھنڈی سانس بھری جیسے اسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں

”اب آپ جائیں۔ سب لوگ سینما گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔“

”اچھا۔“ مسلمان سر جھکا کر فرش تکٹنے لگا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ سلطانہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ مسلمان نے ہچکچاتے ہوئے

”سلطانہ تم نے اپنی شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

وہ حیرت سے بولی۔ ”میری شادی؟“

”اس رات جب میں تم کو لینے کے لیے آنے والا تھا، اس کی صبح تو تمہارا نکاح ہونے والا

تمہاری اماں نے مجھ سے یہی کہا تھا۔“

”لیکن اس صبح تو اماں کا نکاح ہوا تھا۔“

مسلمان کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آیا۔ وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔

سلطانہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے وضاحت کی۔ ”وہ پہلے میری شادی کر دیا

تھیں۔“

مسلمان نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”وہ نیاز کو اچھا آدمی نہیں سمجھتیں۔“ وہ اپنی بات پوری طرح واضح نہ کر سکی۔ مگر مسلمان ذہین

نوجوان تھا فوراً اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ آن کی آن میں نیاز اس کے سامنے رقیب روسیا کے

روپ میں آکھڑا ہوا۔ اپنے دل کے چور کو بہت چھپانا چاہا مگر اس نے بے اختیار پوچھ ہی لیا۔ ”اور نیاز

کے حلقہ تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟“

وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ”مجھے ان سے نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے؟“

اس سادگی پر مسلمان کو پیار آ گیا۔ سلطانہ کا رخسار تھپتھا کر بولا۔ ”میری بھولی بھالی گڑیا۔“ اور

بے قرار ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

لیکن لمحہ بھر ہی بعد وہ سہمی ہوئی آواز سے بولی۔ ”آپ جانیے، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“

مسلمان بھی گھبرا گیا۔ ”مجھے اب چلا جانا چاہیے۔ تم جب بھی کسی پریشانی میں ہو انوکھے ذریعے

مجھے پیغام بھجوادینا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس سے یہ کام لے سکتی ہو۔“

”کہیں وہ کسی سے کچھ کہہ نہ دے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔“

”نہیں تم اسے سمجھا دینا۔“

”اچھی بات ہے۔“

مسلمان نے دروازے کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ”خدا حافظ۔“ اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

گلی میں پہنچ کر وہ آگے جاتے جاتے رک گیا۔ سوچا نہ معلوم سلطانہ سے کب ملاقات ہو۔ کچھ

دیر اس سے اور باتیں کر لے۔ پھر یہ موقع بھی میسر نہ آئے گا۔ ابھی کتنی ایسی باتیں تھیں جو وہ سلطانہ

سے دریافت کرنا چاہتا تھا، جن کا جاننا اس کے لیے ضروری تھا۔ لیکن وہ لوٹ کر دروازے پر نہ گیا۔

آہستہ آہستہ تاریک گلی میں چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دوسری گلی کی جانب مڑنے لگا تو

دفعتاً اس کی نظر نیاز پر پڑی۔ وہ میونسپلٹی کی لائٹیں کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک

مرد پوش عورت تھی اور ساتھ ساتھ اتو بھی چل رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے ان کو پہچان لیا۔ وہ

آگے جانے کے بجائے گھبرا کر فوراً اُڑا اور قریب کی گلی میں داخل ہو گیا۔

رقبہ ہوا

”مسٹر سلمان!“

اس نے بادل ناخواستہ مڑ کر اس طرف دیکھا۔ پروفیسر علی احمد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ خشک بال، سوچتی ہوئی آنکھیں اور مرجھایا ہوا زرد چہرہ۔ لیکن اس کی مخصوص مسکراہٹ اس وقت بھی ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

اس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”بہت دبلے ہو گئے ہو تم۔“

سلمان صاف جھوٹ بول گیا۔ ”بیمار پڑ گیا تھا۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ علی احمد نے دریافت کیا۔

”گھر جانے کا ارادہ تھا۔“

علی احمد نے کہا۔ ”اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو آؤ میرے ساتھ چائے پیو۔ میرا مکان یہاں سے دور نہیں ہے۔“ سلمان انکار نہ کر سکا اور خاموشی سے اس کے ہمراہ ہو لیا۔

علی احمد کا مکان واقعی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ تنہا رہتا تھا۔ اس نے اب تک شادی بیاہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی فی الحال ایسا ارادہ تھا۔ کوئی عزیز اور رشتے دار بھی نہ تھا۔ وہ سیاسیات میں ایم اے کر چکا تھا اور بیشتر وقت مطالعے میں گزارتا تھا۔

دونوں نے مشکل سے دو فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ علی احمد ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر ٹھہر گیا اس نے آگے بڑھ کر زینے کا دروازہ کھولا اور سلمان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ زینے کے اندر اندھیرا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ علی احمد نے جیسے کنجی نکالی اور دروازے پر پڑا ہوا اتالا کھولا۔

مکان کے اندر بجلی کا بلب روشن تھا جس کی روشنی چاروں طرف پھیلی تھی۔ وہ ایک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں تاریکی تھی۔ علی احمد نے سوچ دہلایا۔ فوراً روشنی ہو گئی۔ سلمان نے دیکھا، کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھوکے اندر اُڑ رہے تھے۔ کمرے میں معمولی سا فرنیچر تھا۔ بید کا بنا ہوا سستے قسم کا صوفہ، تین چار کرسیاں، ایک آفس ٹیبل اور اس کے برابر کتابوں کی لماری۔ میز پر چند کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مطالعہ کرتے کرتے وہ اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ علی احمد نے ”لائف“ کا تازہ شمارہ اٹھایا، اور سلمان کی طرف بڑھا کر بولا۔

(۲)

بازار میں دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ البتہ پنواڑیوں کی دکانیں جگمگ رہی تھیں۔ چائے خانہ میں خاصی رونق تھی۔ سلمان کو بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن جیب میں بمشکل بارہ آنے کی ریڑم تھی۔ کسی اچھے ہوٹل میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بازار اس ٹکڑ پر پہنچ گیا جہاں سے ایک سڑک نشیب میں جاتی تھی۔ اس سڑک پر چند قدم چل کر بائیں ہاتھ کو ایک بھٹیاری خانہ تھا۔ ویسے اس کے مالک نے اپنے گاہکوں کی تسکین کے لیے دروازے پر ”پسند ہوٹل“ کا بورڈ لگا رکھا تھا۔

سلمان ”شاہ پسند ہوٹل“ پہنچا۔ وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ لمبی لمبی بوسیدہ میزوں کے گاہکوں کی بھیڑ تھی جن میں زیادہ تر محنت مزدوری کرنے والے نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ وہ آوازوں سے بول رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ سلمان ایک الگ تھلگ گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں روشنی کم تھی اور زیادہ ہنگامہ نہیں اس کے سامنے صرف ایک آدمی بیٹھا تھا جو جڑوں سے آواز پیدا کرتے ہوئے جلدی جلدی کھانا رہا تھا۔ اس نے نفرت سے ایک بار اسے دیکھا اور کھانا لانے کا آرڈر دے دیا۔ ذرا دیر بعد دو تنوری روٹیاں اور سالن کی پلیٹ اس کے سامنے آگئی۔ کھانا چٹ پٹا تھا۔ اس کا ذائقہ سلمان کو اچھا اس کے پاس تھوڑے پیسے ہوتے تو وہ اسی سستے ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر نئے چائے بھی پی۔ پورا اہل ساڑھے سات آنے بنا تھا۔

”شاہ پسند ہوٹل“ سے باہر نکلتے ہی اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ علی احمد تھا۔ کان لچ میں عرصہ اس کا استاد رہ چکا تھا۔ بعد میں اس نے کسی اور کان لچ میں ملازمت اختیار کر لی تھی یا سرے درس و تدریس کا پیشہ ہی ترک کر دیا تھا۔ سلمان کو اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ عرصہ دراز ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سلمان جہاں تھا وہیں رک گیا۔

پروفیسر علی احمد گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ سلمان نے کہ نظر بچا کر گزر جائے۔ مگر وہ چند ہی قدم گیا ہو گا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”تم اسے دیکھو۔ میں چائے تیار کر کے لاتا ہوں۔“

سلمان بولا۔ ”آپ خواہ مخواہ تکلف نہ کریں۔ میں۔۔۔۔۔“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”اس میں تکلف کی کوئی بات ہے۔ میں روزانہ اس وقت چائے ہوں اور ہمیشہ خود ہی تیار کرتا ہوں۔ میرا نوکر کھانا کھلانے کے بعد اپنے گھر چلا جاتا ہے۔“

”میں آپ کی کچھ مدد کروں؟“

”شکریہ! تم مجھ سے زیادہ اچھی چائے نہیں بنا سکتے۔ مسٹر یہ سید হাসادائیسٹ کا سوال ہے

وہ مسکرا کر بولا۔

علی احمد کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلمان خاموش بیٹھا میگزین کے ورق الٹا پلٹتا رہا۔ تصویر دیکھتا رہا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں جہاں علی احمد چائے کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پروفیسر علی احمد کمرے میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ سلمان نے غور علی احمد نے چائے بڑی نفاست سے تیار کی تھی۔ دونوں بیٹھے چائے پیتے رہے اور سگریٹ کے لگاتے رہے۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے اندر آرہے تھے۔ شہر کے ہنگامے سرد ہو جا رہے تھے۔ آوازوں کا شور رفتہ رفتہ دھیمّا پڑتا جا رہا تھا۔

علی احمد نے غور سے سلمان کا چہرہ دیکھا۔ ”سنا ہے تم نے کالج چھوڑ دیا۔“ اس نے قدر توقف کے بعد پوچھا۔ ”آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ سلمان کا مختصر جواب تھا۔

”آئندہ کے متعلق تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”بہر حال مستقبل کے بارے میں تم نے کچھ نہ کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔“

سلمان کچھ اور سنجیدہ ہو گیا۔ ”اس معاشرے نے مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ ہی حق ہی کب دیا ہے۔ یہ حق تو زندگی میں صرف چند خوش نصیبوں کو حاصل ہے اور ان خوش نصیب کی فہرست میں میرا نام نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

علی احمد مسکرا کر نرمی سے بولا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم معاشرے کو برا بھلا کہنے

بجائے صرف اپنے متعلق بات کرو؟“

سلمان اسی تلخی کے ساتھ بولا۔ ”دیکھئے بات یہ ہے۔ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر جاری نہیں رکھ سکتا۔ ملازمت چاہتا ہوں، وہ ملتی نہیں۔ ایک ذمہ دار اور کارآمد شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں، اس کے امکانات نہیں۔ سید হাসادائیسٹ کا مسئلہ ہے اور کوئی اقتصادی مسئلہ معاشرے سے ہٹ کر اپنا وجود نہیں رکھتا۔“

پروفیسر علی احمد ذرا دیر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر ناصحانہ لہجے میں بولا تم تو بڑے ذہین طالب علم تھے۔ افسوس کہ تم نے اپنی ذہانت اور صلاحیت سے کوئی کام نہیں لیا۔

”کیا آپ کے خیال میں، میں واقعی ذہین اور باصلاحیت نوجوان ہوں؟“

”میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی رائے پر فی الحال نظر ثانی کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر میرے ساتھ کسی انٹرویو میں چلے، جہاں سے آج تک مجھے ناکارہ اور گھماڑ ہونے کی سہولت ملتی رہی ہے۔“

علی احمد نرم لہجے میں بولا۔ ”مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے۔“

”معاف کیجئے پروفیسر صاحب! مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ تو میں کسی بھوکے کو ایک دلت کا کھانا کھلا کر آسانی سے خرید سکتا ہوں۔“

وہ گہرا کر بولا۔ ”تم واقعی پیارا ہو۔“

”یہ بات بھی نہیں۔ آپ بند کمروں میں بیٹھ کر زندگی کو کتابوں میں تلاش کرتے ہیں اور میں نے زندگی کو فتنہ خانوں میں دیکھا ہے۔ جھگیوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں دیکھا ہے۔ مسلسل فاقے لگے ہیں۔ ذلتیں برداشت کی ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد تجربہ حاصل کیا ہے۔ زندگی کو برہنہ آنکھ سے دیکھئے وہ کس قدر مظلوم ہے۔“

وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اس کے ذہن میں مدت سے جو آگ سلگ رہی تھی وہ اچانک بڑک اٹھی تھی۔ آج اس کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ وہ ان زخموں کو اپنی تمام آلائش کے ساتھ پروفیسر علی احمد کے سامنے برہنہ کر دینا چاہتا تھا۔ جذبات کی طوفانی رو میں وہ ایسی باتیں بھی

اقتصادی، تعلیمی، سماجی، تاحاتی، لہجہ، صحت کرنے والا انداز۔ نظر ثانی: ترمیم، صحیح کی غرض سے دوبارہ دیکھا۔ گھماڑ: جو قوف، ست۔ فتنہ: فتنہ، عورت کا مکان، روطی کا کونہ۔ زخم ہرے ہونا: تازہ ہونا، کوئی گزشتہ صدمہ یا حادثہ یاد آنا۔ آلائش: غلاطت، گندگی۔

ملا احمد اس نے معلوم کہاں لیے جا رہا ہے۔ نہ اسے منزل مقصود کا پتہ تھا نہ یہ خبر تھی کہ وہ کس لیے جا رہا ہے؟

علی احمد ایک خوبصورت کوٹھی کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے کوٹھی کو غور سے دیکھا اور پھانک کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سلمان بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں جا کر دونوں نے دیکھا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے جو کئی ٹولیوں میں بٹے ہوئے گفتگو میں مصروف تھے۔ سلمان ان کی بات چیت سے صرف اس قدر اندازہ لگا سکا کہ کوئی ملہ ہونے والا ہے۔

جلے کی نوعیت کیا تھی۔ کیوں بلایا گیا تھا؟ کس لیے بلایا گیا تھا؟ اسے کچھ علم نہ تھا۔ نہ ہی اس نے عل احمد سے اس کے بارے میں کچھ پوچھا۔

ٹھیک آٹھ بجے سب اٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے جس میں جلسے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ خوب کشادہ تھا۔ بیچ میں لمبی میز پڑی تھی جس کے چاروں طرف وارنش سے جھلکتی ہوئی اہرنگ دار کرسیاں تھیں۔ ہر کرسی کے مقابل میز پر سفید کاغذ اور پنسلیں رکھی تھیں۔ کمرے کی فضا کچھ ٹینکی مگر قسم کی تھی۔ شیشے کی رنگیں دیوار گیریوں کے پیچھے بجلی کے بلب روشن تھے۔ ان سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ روشنی میں دروازوں اور کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے پردے جمل مار رہے تھے۔

سلمان بھی سب کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے نظر بھر کر صفدر بشیر کو دیکھا جو اس اجتماع کا روح رواں تھا۔ یہ کوٹھی اسی کی تھی۔ اس کی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔ وہ ہونٹوں میں دبے ہوئے پائپ پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ وہ مضبوط اور بھرے جسم کا طویل قامت اور خوش شکل نوجوان تھا۔ وضع قطع سے اچھا خاصا اعلیٰ کلاس لگتا تھا۔

کمرے میں علی احمد اور سلمان کے علاوہ تین بے روزگار گریجویٹ، سرکاری اسپتال کا ایک ریٹائرڈ ڈاکٹر، ایک جونیئر کلرک اور دو مقامی کالجوں کے طالب علم تھے۔ ان کے چہروں پر دھندلی

مولانا کا معاملہ یہ ہے کہ فریجیہ وغیرہ چکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چینی کھل: رنگ، مختلف رنگوں کا مجموعہ جس میں ہر رنگ الگ الگ نظر آتا ہے۔ دیواریں لگانے کا لیمب: روح رواں: کر تا دھرتا: طویل قامت: لمبے قد کا: اعلیٰ کچھو کچھ: دانور۔

۱۰

کہہ گیا جو نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ اس نے یہ بھی لحاظ نہ کیا کہ وہ علی احمد کا طالب علم رہ چکا ہے۔ لیکن علی احمد نے اس کی باتوں پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ چند لمحے خاموش رہے بعد گویا ہوا۔

”مجھے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ حالات نے تمہاری شخصیت کو مس کرنا کی طرف جارہے ہو۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔ مجھے خوف ہے تم اپنی ذات سے انتقام لے کہیں معاشرے سے انتقام لینا نہ شروع کر دو۔ یہ بڑا خطرناک رجحان ہے۔ تم ذہین نوجوان ذہین نوجوان کسی قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔“

مسلمان جیسے اب تھک گیا تھا۔ اس عرصے میں چائے کی کئی پیالیاں پی چکا تھا اور سگریٹ پرکش لگا رہا تھا۔

اس نے نڈھال ہو کر صوفی کی پشت سے پیٹھ ٹکادی اور خاموشی سے پروفیسر علی ہاشمی سناتا رہا۔

”تم مجھے اپنا کچھ وقت دے سکتے ہو؟“ علی احمد نے پوچھا۔

”میرے پاس وقت کا کوئی مصرف نہیں۔ جتنا وقت چاہیں دے سکتا ہوں۔“

”پرسوں شام کو تم میرے پاس آ جاؤ۔ میں تم کو ایک جگہ لے چلوں گا۔“

سلمان نے پوچھا۔ ”کوئی خاص پروگرام ہے؟“

”یہ تم کو وہیں پہنچ کر معلوم ہوگا۔“

مسلمان نے انکار نہ کیا اور آنے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ خاصی بھیگ چکی تھی اور مسلمان کو دور جانا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور باہر جانے کے لیے دروازہ پر دست بٹا دیا۔

مسلمان حسب وعدہ پروفیسر علی احمد کے گھر پہنچا۔ وہ اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دونوں میں زیادہ وقت نہیں گزارا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے باہر سڑک پر بڑی خوشگوار شام تھی۔ دونوں کو سڑک پر چہل قدمی کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ راستے میں نے مسلمان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ وہ خاموشی میں ڈوبا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مسلمان سونچا۔

مسخ: صورت بگڑنا۔ انار کی: بے نظمی، لاقانونیت۔ مصرف: استعمال۔

غزل: یوں مدنی

دھندلی کپڑوں کا جال بکھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں بجھتے چراغوں کی جھلکناٹ تھی۔

\*\*\*

اس کا لہجہ صاف سہرا تھا۔ انداز خطیبانہ تھا۔ اس نے سب سے پہلے ان مقاصد پر روشنی ڈالی جن کے پیش نظر جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں انگلستان کے سماجی کارکنوں اور فلاحی تنظیموں کی سرگرمیوں کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بتایا کہ کس طرح برطانوی نوجوان اور دوسرے شہری مختلف نوعیت اور مختلف ساخت کی انجمنیں اور ادارے قائم کر کے اپنے ملک اور قوم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ان کے عزائم اور بے لوث جدوجہد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے ملک کے عوام کے سماجی اور اقتصادی مسائل پر روشنی ڈالی۔ ان کے صبر آزمایہن سہن، پس ماندگی اور زبوں حالی کے اسباب بیان کیے۔ آخر میں سب سے اپیل کی کہ اس کا خیر میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اس کی مدد کریں۔

صفر بشیر انگلستان سے چند مہینے پہلے واپس آیا تھا۔ وہ کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ اچانک گھر سے ایک روز تار ملا جس میں اس کے باپ کے انتقال کی اطلاع تھی۔ ان کی موت کا قلب بند ہونے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ پی ڈبلیو ڈی میں چیف انجینیئر تھے۔ انہوں نے ترکہ میں لاکھ روپے بینک بیلنس کے علاوہ بہت بڑی جائیداد بھی چھوڑی تھی۔ باپ کا ترکہ چار بھائی بہنوں میں تقسیم ہوا تو صفر بشیر کو کوٹھی کے ساتھ ساتھ ایک سے زائد روپیہ بھی حصے میں ملا۔

اس رقم کے متعلق صفر بشیر عرصے تک غور کرتا رہا۔ باپ کے ملنے والے ایک منہ کے مشورے پر پہلے پہل اس نے سوچا کہ ٹیکسٹائل مل لگانے کی کوشش کرے یا کوئی ایسا کار کرے کہ لاکھ کے کئی لاکھ ہو جائیں۔ شادی کرے گھر بسائے اور آسائش کی زندگی بسر کرے۔ کاروبار کی طرف اس کی طبیعت مائل نہ ہوئی۔

اس رقم کے متعلق صفر بشیر عرصے تک غور کرتا رہا۔ باپ کے ملنے والے ایک منہ کے مشورے پر پہلے پہل اس نے سوچا کہ ٹیکسٹائل مل لگانے کی کوشش کرے یا کوئی ایسا کار کرے کہ لاکھ کے کئی لاکھ ہو جائیں۔ شادی کرے گھر بسائے اور آسائش کی زندگی بسر کرے۔ کاروبار کی طرف اس کی طبیعت مائل نہ ہوئی۔

دوسرا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرے اور انگلستان میں رہائش اختیار کرے۔ مگر وہ انگلستان نہ گیا اور خدمت خلق کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ وہ کارکن بھی رہ چکا تھا اور عقیدے کے اعتبار سے کٹر نیشنلسٹ تھا۔ ایک زمانے میں وہ نیشنلسٹ آرگنائزیشن کا سرگرم رکن بھی رہ چکا تھا اور ۱۹۳۲ء کی ”ہندوستان چھوڑ دو“ تحریک میں عملی شریک ہو کر جیل بھی جا چکا تھا۔ فی الحال اس کا ارادہ سیاست میں براہ راست حصہ لینے کے بجائے سماجی بہبود کا کام کرنے کا تھا۔

دوسرا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرے اور انگلستان میں رہائش اختیار کرے۔ مگر وہ انگلستان نہ گیا اور خدمت خلق کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ وہ کارکن بھی رہ چکا تھا اور عقیدے کے اعتبار سے کٹر نیشنلسٹ تھا۔ ایک زمانے میں وہ نیشنلسٹ آرگنائزیشن کا سرگرم رکن بھی رہ چکا تھا اور ۱۹۳۲ء کی ”ہندوستان چھوڑ دو“ تحریک میں عملی شریک ہو کر جیل بھی جا چکا تھا۔ فی الحال اس کا ارادہ سیاست میں براہ راست حصہ لینے کے بجائے سماجی بہبود کا کام کرنے کا تھا۔

صفر بشیر نے اپنے ان عزائم کا چند مخلص دوستوں سے ذکر کیا۔ انہوں نے اپنے احباب ملنے جلنے والوں سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کیا اور یوں ستمبر کی اس خوشگوار رات کو دس افراد ایک جگہ مل بیٹھے تھے۔

صفر بشیر نے اپنے ان عزائم کا چند مخلص دوستوں سے ذکر کیا۔ انہوں نے اپنے احباب ملنے جلنے والوں سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کیا اور یوں ستمبر کی اس خوشگوار رات کو دس افراد ایک جگہ مل بیٹھے تھے۔

جلے کی کارروائی کا آغاز صفر بشیر کی تقریر سے ہوا۔

جلے کی کارروائی کا آغاز صفر بشیر کی تقریر سے ہوا۔

جلے کی کارروائی کا آغاز صفر بشیر کی تقریر سے ہوا۔

جاچکا تھا۔

کھانا بہت سادہ تھا۔ نہ اس میں کوئی تکلف تھا نہ کسی خاص اہتمام سے کام لیا گیا تھا۔ تھی کہ سب نے بے تکلفی سے کھانا کھایا۔ ایک دوسرے سے جو اجنبیت تھی کھانے کی میز پر تک دور ہو گئی۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ علی احمد کی تجویز پر فلک پیا کے ہر رکن نے کھڑے ہو کر تعارف کر لیا۔ بڑی دلچسپ اور پر لطف باتیں سننے میں آئیں۔ خوب قہقہے لگے۔ ماحول اور نہ ہو گیا۔ اسی نشست میں یہ بھی طے پایا کہ دوسرے روز نوبت شب کو فلک پیا کا دوسرا اجلاس منعقد جائے جس میں ہر رکن لازمی طور پر شریک ہو۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد صفدر بشیر کی اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر فلک پیا کے تمام ارکان اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئے۔

سلمان اس رات دیر تک جاگتا رہا۔ وہ جلسے سے خاصا متاثر ہو کر لوٹا تھا۔ بہت عرصے بعد بے ترتیب اور اجڑی ہوئی زندگی میں اپنچل اور سرخوشی محسوس کر رہا تھا۔

مقررہ پروگرام کے مطابق دوسرے روز رات کے نو بجے صفدر بشیر کی کوٹھی پر فلک اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں لمبی چوڑی تقریریں نہیں ہوئیں۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر نے کی جو عمر میں سب سے بڑا تھا۔ اجلاس میں فلک پیا کے اغراض و مقاصد اور تنظیمی ڈھانچے کا خاکہ پیش کیا گیا جسے صفدر بشیر نے تیار کیا تھا۔ اس پر بحث و مباحثہ ہوا اور ضروری ترمیم کے بعد متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔

ایجنڈے کی دوسری شق کا تعلق فلک پیا کی رکنیت سے تھا۔ صفدر بشیر نے بریف کس رکنیت کے فارم نکالے اور صدر کے حوالے کر دیے۔ صدر نے فارم تقسیم کر دیے۔ ہر رکن نے فارم پڑھا اور خانہ پوری کرنے کے بعد دستخط کر دیے۔ ہر رکن نے سینے پر ہاتھ رکھا عہد بھی کیا کہ پوری دیانت داری اور خلوص دل سے ملک اور قوم کی خدمت کرے گا۔ فلک پیا اغراض و مقاصد کا پورا پورا احترام کرے گا۔ انفرادی خواہشات نظر انداز کر کے تنظیم کے اصولوں کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہے گا۔

ترمیم: جی بی، کی بیٹی، شق: صدر۔

پہلی مدنی

اس کے بعد عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ صفدر بشیر کو صدر، فہیم اللہ کو نائب صدر، لی احمد کو سیکرٹری جنرل اور ڈاکٹر زیدی کو خازن منتخب کیا گیا۔ چھ ارکان پر مشتمل ایک مجلس عاملہ بھی منتخب کی گئی۔ صدر، نائب صدر، سیکرٹری جنرل اور خازن اس کے مستقل رکن تھے۔ اسکاٹی ارکوں نے تالیاں بجا کر انہیں مبارک باد دی اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

اجلاس میں صفدر بشیر کی اس تجویز کو بھی منظور کر لیا گیا کہ جو ارکان برسر روزگار ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ملازمت فلک پیا کی سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے وہ مناسب سمجھیں تو ازمت سے علیحدگی اختیار کر لیں۔

ہر اسکاٹی لارک کے لیے ۸۰ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کیا گیا۔ صفدر بشیر نے فلک پیا کے روزی اخراجات کے لیے بیس ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ آئندہ بھی نظم کے نڈے واسطے رقم مہیا کرتا رہے گا۔

اجلاس میں ابتدائی پروگرام کے طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسکاٹی لارک مختلف بستیوں کا دورہ دیں۔ عوام سے مل کر ان کے بنیادی مسائل معلوم کریں اور ان کی روشنی میں ہفتے بھر بعد اپنی اپنی رپورٹ آئندہ اجلاس میں پیش کریں تاکہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کام کا آغاز کیا جائے۔

\*\*\*

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ اسکاٹی لارکوں کی ٹولیاں عوامی رابطے کی مہم پر مختلف علاقوں کے دوروں پر نکل گئیں۔

انہوں نے اپنے اپنے علاقے کے رہنے والوں کے ساتھ گھل مل جانے کی کوشش کی۔ ان عبادت چیت کی۔ ان کے سماجی اور اقتصادی مسائل معلوم کئے۔

اسکاٹی لارکوں کی رہائش کا بندوبست صفدر بشیر ہی کی کوٹھی میں کیا گیا جس میں وہ تہا رہتا تھا۔ علی کے ایک حصے میں فلک پیا کا ہیڈ کوارٹر بھی قائم کیا گیا۔ کوٹھی کا قدیم نام رونق منزل تھا۔ اسے تبدیل کر دیا گیا اور نیا نام قطب منار رکھا گیا۔

فلک پیا کا ہفت روزہ اجلاس حسب معمول رات کے وقت رکھا گیا۔ اس روز ہر اسکاٹی لارک غنائی اپنا رپورٹ پیش کی۔ ان رپورٹوں پر رات گئے تک بحث ہوتی رہی۔ ان کا باقاعدہ تجزیہ کیا گیا اور پہلے ان کے شہری اور بنیادی حقوق سے آگاہ کیا جائے، باشعور

اس مقصد کے لیے تین اہم فیصلے کئے گئے۔

ہر بستی اور محلے کے چوراہوں اور گلیوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے عام جلسے کے لیے ایسی جگہ بناتا ہوں۔“

اجلاس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تین تین ارکان پر مشتمل تین گروپ: ایک ڈائلاگ ایبلیٹی گروپ رہے ہیں نا آپ؟ اس کو کہتے ہیں لا۔ یہی کھانا لا۔ پانی لا۔ تو صاحب یہ ہو گیا لا۔

گروپ کے کام کا جائزہ لے اور اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے مناسب مشورہ کی روشنی میں بھٹک رہی تھی۔ علی احمد خاموش کھڑا ان کے رد عمل کا مطالعہ کرتا رہا۔ سلمان اور

اچھا مقرر تھا۔ بات کہنے کا اسے سلیقہ تھا۔ بات اس ڈھنگ سے کہتا کہ لوگ توجہ اور دلچسپی کے برابر کھڑے رہتے اور ”لا“ بنایا اور مکرر کر بولا۔ ”دیکھئے یہ ہو گیا لا۔“

دوسرے گروپ کا انچارج علی احمد تھا۔ وہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔

اس کائی لارک بھی طالب علم تھا۔

خوٹوں نے اس زور سے مین بار لالا کا ورد کیا کہ ساری بیسی کوچا بھی۔ علی احمد نے اندازہ لگایا۔

ساحھی اسکا کافی لارک کے ہمراہ ایک پس ماندہ بستی میں پہنچا۔ لوگوں نے انہیں حیرت اور اسباب

لوگوں کے اکٹھا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ان کے گرد خاصا جھوم ہو گیا۔

کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

تعلیم! لغات: جوڑوں کی تعلیم۔ دارالمطالعے: لاجبیریایں۔ عام فہم: آسان۔ تمدنی: محنت۔ پس ماندہ: کم ترقی یافتہ۔

تعلیم بالغان: بڑوں کی تعلیم۔ دارالمطالعے: لائبریریوں۔ عام فہم: آسان۔ تندہی: محنت۔ پس ماندہ: کم ترقی یافتہ۔



”اس دفعہ میں نہیں پڑھوں گا۔ آپ ہی میں سے کوئی صاحب پڑھنے کی کوشش کریں۔“  
 لمحہ بھر تک گہری خاموشی رہی۔ پیٹرو میکس کی تیز روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے غور  
 تحتہ سیاہ کو دیکھا اور ایک بار کسی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”لا لالا لا۔ کیوں ماسٹر جی یہی ہوا؟“  
 احمد اس ادھیڑ آدمی کے ماسٹر جی کہنے پر مسکرایا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔  
 ”بالکل ٹھیک پڑھا آپ نے۔“

اسی وقت دو تین آوازیں ابھریں۔ ”پڑھ تو جی ہم نے بھی لیا تھا پر کہتے ہوئے ڈر لگا۔“  
 علی احمد نے ان کی حوصلہ افزائی کی غرض سے کہا۔ ”یہ تو آپ نے برا کیا۔ جو سمجھ میں آجائے  
 فوراً کہئے۔ ڈرنے اور جھجکنے سے کام نہیں چلے گا۔ یاد رکھیے جو غلط نہیں پڑھے گا وہ کبھی صحیح نہیں  
 سکتا۔“ اس نے سب سے لا لالا لا کا جملہ پانچ مرتبہ بلند آواز سے پڑھوایا۔

اس روز کے لیے صرف اتنا ہی سبق تھا۔ جب وہ پڑھائی ختم کر چکا تو سب نے چاروں طرف  
 اسے گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگے۔ وہ ایک ایک بات کا تسلی بخش جواب دیتا گیا۔  
 سلمان سب کو اچھنبے سے دیکھتا رہا۔

اس وقت اسے اور بھی زیادہ تعجب ہوا جب انہوں نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا  
 پڑھائی کے لیے وہ نہ صرف جگہ کا بندوبست کریں گے بلکہ چندہ کر کے گیس جی اور چٹائیوں کا انفاق  
 بھی کریں گے۔ سلمان کا خیال تھا کہ بجائے دلچسپی لینے کے لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے۔ اسی غلط  
 کے باعث وہ بستی میں داخل ہوتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اول تو انہیں اپنی جہالت  
 پس ماندگی کا احساس ہی نہیں اور اگر تھوڑا بہت ہے تو وہ اس گراہی سے ٹکنا نہیں چاہتے۔  
 کیڑوں کی طرح ہیں جو گندگی میں زندہ رہتے ہیں۔ اسی میں جنم لیتے اور اسی میں مر کپ جاتے ہیں۔  
 دوسرے روز وہ علی احمد کے ساتھ شام کو وہاں پہنچا۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ بستی کے  
 پرکئی آدمی کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ تینوں کو دیکھ کر خوشی سے مسکرائے۔ ایک لڑکا  
 نے آگے بڑھ کر سلمان کی بغل میں دبا ہوا بورڈ اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا۔ دوسرے نے پیڑ  
 لے لیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔

”ماسٹر جی! آپ لوگ یہ بورڈ اور جی اب نہ لایا کریں۔ ہم نے سب بندوبست کر لیا۔“

تینوں نے بستی میں جا کر دیکھا، واقعی انہوں نے ہر چیز کا انتظام کر لیا تھا۔ پڑھائی کے واسطے جو  
 جگہ بنائی تھی وہ ایک مکان سے ملحق سائبان تھا۔ یہاں کل تک ایک تانگے والے کا گھوڑا بندھتا  
 تھا اب گھوڑے کا تھان کہیں اور بنادیا گیا تھا۔ اس اصطبل کو سب نے مل کر دن بھر میں اس طرح  
 منت اور لگن سے صاف کیا تھا کہ کہیں سے بھی یہ نہ معلوم ہوتا کہ یہ جگہ کبھی گھوڑے کی لید اور  
 پیٹاب سے آلودہ رہ چکی ہے۔ اصطبل کی دیواروں پر چونے کی سفیدی تھی جس پر ایک تختہ سیاہ لٹک  
 رہا تھا۔ اس کے برابر ہی معمولی قسم کی میز اور کرسیاں رکھی تھیں۔ میز کے ایک طرف پیٹرو میکس  
 فاجس کی تیز روشنی میں سفید دیواریں جھلک رہی تھیں۔ پڑھنے والوں کے لیے فرش پر کھجور کی  
 چٹائیاں بچھی تھیں۔

سلمان نے یہ اہتمام دیکھا تو بڑا متاثر ہوا۔

اس روز علی احمد نے دوسرا سبق پڑھایا۔ اس میں صرف نقطوں کے استعمال سے ابتدائی سبق  
 آگے بڑھایا گیا تھا۔ اس نے انگلیوں میں کھریا دبائی اور تختہ سیاہ پر خشکیں بنانے لگا۔

تالا، بالا، بالا

لا لا لا

لا لا لا

بالا سے کوئی موزوں جملہ نہیں بنتا تھا۔ لہذا علی احمد نے صرف اس کا مفہوم سمجھایا۔

کل جو لوگ پڑھنے آئے تھے ان کی حیثیت تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آج مختصر سے اسکول  
 کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کے طلباء کی تعداد بائیس تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں نوجوان تھے۔ ادھیڑ تھے اور  
 ایسے بوڑھے بھی تھے جن کی لمبی لمبی سفید داڑھیاں تھیں۔ سب نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ فیکٹریوں  
 اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، دست کار، کاری گر، بریڈر پر سامان رکھ کر پھیری لگانے  
 والے اور چھوٹے موٹے دکان دار۔

تین ہی چار روز میں طلباء کی تعداد بڑھ کر چالیس تک پہنچ گئی۔ ابھی یہ تعداد اور بڑھتی مگر علی  
 احمد نے مزید طلباء قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مشکل یہ تھی کہ نئے آنے والوں کی خاطر سابقہ سبق  
 باہر دہرائے جائیں۔

کسی طرح اس کے ہاتھ پیلے کر دے اور وہ اپنے گھریار کی ہو جائے۔ مگر یہ بات نیاز سے کہتے ہوئے جھپکتی تھی۔ حالانکہ نیاز کا رویہ اب سلطانہ کے ساتھ کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں تھا۔ مگر میں بہر حال سکون اور اطمینان تھا اور اس کے لیے نوشا کی ماں نیاز کی ممنون تھی۔ وہ اب اس کا بے حد خیال رکھتی۔ سویرے ہی سویرے اٹھ کر اس کے لیے غسل خانے میں نہانے کا انتظام کرتی۔ اجلاؤلیہ، منجن اور صابن سنبھال کر رکھتی۔ جو تون پر پالش کرتی۔ پینے کے لیے کپڑے نکالتی۔ ٹوٹے ہوئے ٹین ٹانگتی۔ کسی کپڑے میں مرمت کی ضرورت ہوتی تو سی کر درست کرتی۔ جتنی دیر میں نیاز غسل خانے سے نہا کر نکلتا وہ ناشتہ تیار کر دیتی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نیاز کے دکان جانے سے قبل ناشتہ نہ تیار ہو گیا ہو۔ وہ گھر سے نواب بن کر نکلتا تھا۔ دوست احباب مذاق میں چھیڑتے۔

”ابے نیاز تو چھٹا بن گیا ہے۔“

”سالے پر جوانی چڑھ رہی ہے۔“

واقعی اب اس کا رنگ بھی کھڑک گیا تھا۔ چال ڈھال میں زرا لیج دھج پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ سب بڑھاپے کی بدولت تھا جس سے اسے انیت بھی تھی اور نفرت بھی۔ اور یہ دونوں جذبے بیک وقت کام کر رہے تھے۔ کبھی وہ اس کی محبت سے اتنا سرشار ہو جاتا کہ جی چاہتا کہ ساری زندگی اسی کے ساتھ گزار دے۔ اسے اس عورت کی ضرورت تھی جس نے اس کی زندگی سنوار دی تھی۔ لیکن اس محبت میں پچاس ہزار روپے کا نقصان تھا اور اتنی بڑی رقم وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پچاس ہزار کے لیے ہی اس نے سب کچھ کیا تھا اور اس کے بل بوتے پر آئندہ کے بڑے بڑے منصوبے تیار کئے تھے۔ اس کے علاوہ سلطانہ تھی۔ وہ اس کی بھرپور جوانی اور دل کش چہرہ دیکھتا نہیں بلکہ لاؤڈ کہنے لگتا۔

نیاز کا وقت اسی کش مکش میں گزر رہا تھا۔ شادی کرنے سے پہلے جو پروگرام بنایا تھا اس کے ختم ہونے پر وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے خود علم نہیں تھا کہ آئندہ کیا کرے گا۔ وہ روزانہ دکان پر ہاتھ دھو کر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرتا مگر جب گھر پہنچتا تو سارے ارادے مٹھڑی کے بال کی طرح تار تار ہو جاتے۔

عام طور پر وہ رات کے نو بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا۔

نوٹ: عموں کے چھٹا: عموں کو عمر و جوان، شوخ، انیت، محبت، تذبذب، سوچ بچار، تار تار، کھلے کھلے۔

طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علی احمد، سلمان اور دوسرے اسکالار کو بھی تعلیم کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ دن کے وقت ہیڈ کوارٹر میں طریقہ تعلیم پر لیکچر دیتا شام کو عملی تربیت کے لیے انہیں بستی کے اسکول میں لے جاتا اور باری باری سبق پڑھانے کا موقع بھی دیتا چند ہی روزوں میں وہ اس قابل ہو گئے کہ علی احمد نے قریب کی بستیوں میں ان دونوں کو بھی تعلیم بالغاں کے مرکزوں پر لگا دیا۔ یہ دونوں مرکز ان بستیوں کے لوگوں نے موجودہ مرکز سے متاثر ہو کر کھولے اور علی احمد کے پاس وفد کی صورت میں آکر درخواست کی تھی کہ وہاں بھی تعلیم بالغاں کا مرکز شروع کیا جائے۔

سلمان بڑی تندہی اور لگن کے ساتھ فلک پیا کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ ہر وقت مقررہ وقت پر جاتا اور پوری توجہ سے اپنے مرکز کے طلباء کو پڑھاتا۔

اس کام میں اب اسے ایک خاص لطف مل رہا تھا۔ وہی احساس لذت تھا جو انسان میں ایسا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

(۳)

جس روز عدالت سے نوشا کو سزا ہوئی ٹھیک اسی روز انشورنس کمپنی کے ایگریمنٹ فارم ماں کے دستخط ہوئے۔ کمپنی کے ڈاکٹر نے طبی معائنہ کیا اور اسے صحت مند قرار دیا۔ ضروری پڑی ہوئی۔ نیاز نے پالیسی کی پہلی قسط ادا کی اور اس کی اہلیہ کی زندگی کا ۵۰ ہزار روپے کا بیمہ ہو گیا۔ نوشا کی ماں سوچ رہی تھی کہ عقد ثانی کر کے اس نے غلطی نہیں کی۔ اس دفعہ بھی اسے چاہنے والا شوہر ملا تھا جو اس کی بہتری کا خواہاں تھا۔ ہر طرح کی ناز برداری کرتا تھا۔ اس کی دراز اولادیں بھی اطمینان سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔

اؤدودھ پنی پنی کر خوب موٹا ہو گیا تھا۔ اس کے گال سرخ پڑ گئے تھے۔ البتہ وہ سلطانہ کی طرح سے پریشان تھی۔ سلطانہ چپ چاپ رہتی۔ اس کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ ماں اس کا دکھ جانتی تھی لیکن اس نے کبھی اس کے زخموں کو کیریدنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش

ایثار: دوسروں کے فائدے کے لیے خود نقصان اٹھانا۔ عقد ثانی: دوسرا نکاح۔ خواہاں: خواہش مند۔

نیاز جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوتا ہیو اٹھ کر دروازے پر آ جاتی۔ مسکرا کر کہتی۔  
 ”آپ تو بڑی دیر لگا دیتے ہیں۔ سارا کھانا ٹھنڈا مٹی ہو گیا۔“  
 وہ نیاز کے ہاتھوں میں دبا ہوا سامان لیتی۔

وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ وہ اسے کرسی پر بٹھا کر توپے پیشانی اور گردن کا پسینہ پونچھتی۔ خود اپنے ہاتھ سے اس کا جوتا اتارتی اور پیروں کے نیچے چل دیتی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے باہر چوتے پر جاتا۔ وہاں لوٹے میں پانی ہوتا اور صابن دانی موجود ہوتا۔ بیوی باورچی خانے میں جا کر کھانا گرم کرتی۔ نیاز کو میٹھی چیزوں سے رغبت تھی۔ وہاں کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور تیار کرتی۔

دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ سلطانہ اور اقوام طور پر سر شام ہی کھانا کھا کر اپنے بستر پر سونے کے لیے چلے جاتے تھے۔ نیاز مزالے لے کر کھانا کھاتا اور سوچتا جاتا۔ بے نیاز کبار اس عورت نے تیرے چار چاند لگا دیے۔ بیٹا ایسے عیش تو تم نے باپ کے زمانے میں بھی نہیں کئے

\*\*\*

ایک روز گیارہ بجے دن کو نیاز کسی ضرورت سے دکان سے اٹھ کر گھر آیا۔ اس وقت ملا بالکل اکیلی تھی۔

ماں کسی رشتے دار کی عیادت کے لیے گئی تھی۔ ویسے عام طور پر اب وہ کہیں آتی جاتی نہ تھی اس دن محض اتفاق تھا کہ وہ گھر پر سلطانہ کو تنہا چھوڑ گئی۔ نیاز نے پہلے تو بیوی کو تلاش کیا۔ جب کہیں نظر نہ آئی تو سلطانہ کے پاس گیا۔

وہ پلنگ پر گم صم بیٹھی تھی۔

نیاز اس کی پشت پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پوچھا۔ ”سلطانہ تمہاری اماں کہاں ہیں؟“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”خالہ دلبری کے پاس گئی ہیں۔ سنا ہے ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔“  
 نیاز کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر سلطانہ کی پیٹھ پر پڑ گئی۔

اس کا کرتا مسک گیا تھا اور اندر سے اس کی گوری گوری جلد جھٹک رہی تھی۔ نیاز نے

رغبت: شوق، میلہ، سر شام: شام ہوتے ہی۔ چار چاند لگانا: سرلوہیش کرنا۔ عیادت: تہوار داری۔ مسک جانا: زور پڑنے کی وجہ سے ہنسنے کا اشارہ۔

ہو گیا۔ زردادیر یک سانس رو کے اس کی نرم نرم جلد دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے دریافت کیا۔

”تم چپ چپ کیوں بیٹھی ہو؟“

”سر میں درد ہے۔“ سلطانہ نے حیلہ جوئی سے کام لیا۔

”لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔“ نیاز نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے۔ سلطانہ سر ہرچمک کانپ گئی۔ اس نے اپنا بدن سمیٹا اور ایک طرف کھسک کر بولی۔

”آپ تکلیف نہ کریں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“

وہ کھیانا ہو کر بولا۔ ”تم مجھ سے اس قدر کترانے کیوں لگی ہو؟“

وہ اس کی بات کا جواب کیا دیتی خاموش بیٹھی رہی۔

نیاز نے اصرار کیا۔ ”بولو کیا بات ہے؟“

”کھا ہے کے لیے؟“

”یہی کہ تم مجھ سے دور دور رہتی ہو۔“

سلطانہ کو غصہ تو بہت آیا۔ لیکن وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔

”کیا مطلب؟“

”تم مجھ سے کچھ ناراض ہو؟“

”نہیں! آپ کو وہم ہو گیا ہے۔“

نیاز نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اور بے قابو ہو گیا۔

اس نے جھک کر بے اختیار سلطانہ کا ایک رخسار چوم لیا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پلنگ سے نیچے اتر آئی۔ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے گھورنے لگی۔

نیاز نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو سلطانہ نے اس کے منہ پر ترقا سے تھپھر سید کیا۔

غضب ناک ہو کر بولی۔

”آپ کو شرم نہیں آتی۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو اچھا نہ ہو گا۔“

وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

لیٹا ہوا سر نہ کرنا: بچنا۔ ترقا سے: زور سے۔

بڑا چھیو رقم نکل آئے گی۔

”اچھا چلو مال دکھاؤ۔“ نیاز نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

سردار نے وہیں سے تانگا لیا۔ اس میں سوار ہو کر دونوں ہوٹل پہنچے۔ سردار وہیں ٹھہرا تھا۔

اس نے کمرے میں جا کر مال دکھایا۔ سگریٹ کے پیکٹ پانچ بکسوں میں بھرے تھے۔

دو ہزار میں سودا طے ہو گیا۔ نیاز اسے گھر لے آیا۔ بیوی سے رقم لی اور سردار کو دو سو روپے

پیانہ بھی دے دیا۔ طے ہوا کہ مال رات کو لے کر وہ خود اس کی دکان پر آئے گا اس کے جانے کے

بعد بازار کے لیے اب دو ضروری کام رہ گئے۔ سب سے پہلے اس نے محمد خاں کو تلاش کیا۔ وہ اس کا

واقف کار تھا اور پولیس کا قابل اعتماد اور پرانا منبر تھا۔ انچارج تھانہ سے نیاز کبھی نہیں ملا۔ ہمیشہ محمد

خاں کے توسط سے بات کرتا تھا انچارج کوئی ہو اس کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔

محمد خاں کو اس نے سو روپے دیئے اور مطمئن ہو کر تھانے سے باہر آ گیا۔ بازار جا کر اس نے

سگریٹ فروشوں سے معاملے کی بات چیت کی۔

سگریٹ کی سخت قلت تھی۔ مال کے اچھے دام لگے۔ کچھ دکاندار اس قدر ضرورت مند تھے

کہ انہوں نے کچھ رقم پیشگی بھی دے دی۔

دس بجے کے قریب سردار ایک تانگے میں سگریٹوں سے بھرے ہوئے بکسے لے کر آ گیا۔

نیاز نے مال سنبھالا۔ پوری رقم ادا کی اور سردار کو ایک پیالی چائے پلا کر رخصت کر دیا۔

دوسرے روز دو پہر سے پہلے پہل تمام بکسے خالی ہو گئے۔ سگریٹ کے پیکٹ دکانوں پر پہنچ

گئے۔ اس سودے میں اسے ہزار روپے سے زائد مل گئے۔ نیاز بہت خوش تھا کہ بیٹھے بیٹھے اتنا اچھا

سودا مل گیا۔ زیادہ بھاگ دوڑ بھی کرنا نہیں پڑی۔ دکان میں مال رکھ کر خطرہ بھی مول لینا نہیں پڑا۔

اس روز وہ سر شام ہی دکان بند کر کے گھر پہنچ گیا۔ بیوی اور اٹو کو ساتھ لے کر سنبھالا گیا۔

سلطانہ گھر پر تیار ہو گئی۔ اس نے تنہائی میں بے قرار ہو کر سوچا۔ اس وقت سلمان آجائے تو

کتا بچا ہو۔

بڑی سہانی رات تھی۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے۔ شیشم کے پتے آہستہ آہستہ

تالیاں بج رہے تھے۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ وہ کئی بار دالان سے نکل کر صحن میں آئی۔ کھلے آسمان

کے نیچے اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ ہوا میں رچی ہوئی آمد بہار کی مہک محسوس کی اور گلی میں

لیکن نیاز نے معاملے کو الٹا سمجھنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا۔ سلطانہ اس لیے سخت ناراض ہے کہ اس کے بجائے اس نے ماں سے شادی کیوں کی؟ وہ ذرا دیر تک چپ چاپ دالان میں کھڑا رہا پھر بو جھل قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

دکان پر جا کر اس نے طے کیا کہ اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو سلطانہ ہاتھ سے نکل جائے گی

رات کو وہ گھر واپس آیا تو دو پہر کے واقعے سے کسی قدر سہا ہوا تھا۔ مگر جب بیوی کے در

میں فرق نہ پایا تو اس نے سوچا، معلوم ہوتا ہے سلطانہ نے ماں سے اس کی بے جا حرکت کے

کچھ نہیں کہا۔ اس کے اس مغالطے کو اور بھی تقویت پہنچی کہ سلطانہ کے دل میں ابھی تک اس

لیے گنجائش ہے۔

اس نے رات ہی کو طے کیا کہ کل ہی ڈاکٹر موٹو سے ملے گا۔

\*\*\*

نیاز پروگرام کے مطابق ڈاکٹر موٹو سے نہ مل سکا۔ گھر سے نکلتے ہی سردار سے ٹکرائے

وہ بڑا چلتا پرزہ قسم کا آدمی تھا۔

وہ پسینی کے راستے غیر ملکی اشیاء اسمگل کر کے لاتا تھا۔

سردار ملتے ہی بولا۔ ”کچھ سودا دو اگر تہے ہو؟“

نیاز کا ایک بار پہلے بھی اس سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ مگر وہ سودا ایک دلال کی معرفت ہوا تھا۔

لیے وہ ذرا ہچکچایا۔

”لو نہیں تو بعد میں پچھتاؤ گے۔ اچھی رقم بن جائے گی۔“

نیاز نے دریافت کیا۔ ”مال کس قسم کا ہے؟“

”سگریٹ ہیں۔“

سگریٹ کا سودا اس نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ بے دلی سے بولا۔ ”بھی سگریٹ کا کام تو میں

نہیں۔“

سردار نے ہنس کر کہا۔ ”تم کاروبار میں ابھی کچھ دن مجھ سے ٹریننگ لو۔ تم کو بازار کا پتہ

ہے۔ آج کل شہر میں سگریٹ مل کہاں رہی ہے۔“ نیاز نے سوچا اگر سگریٹ کی شہر میں قلت

ہے جا: غیر ضروری، فضول، مغالطہ، غلط فہمی، تقویت، طاقت، تلی، بڑھاپا، آسمان، ملاقات، چلتا پرزہ، چالاک۔

ابھرنے والی راہ گیروں کی چاپ پر کان لگا دیئے کہ شاید ان میں سلمان بھی شامل ہو۔

سلمان جب تختہ سیاہ کے سامنے سے ہٹا تو سب نے دیکھا اس پر یہ شعر درج تھا۔

چپکنے سے بجلی کے تھا وہ سماں

ہوا میں اڑیں جیسے چنگاریاں

(۴)

اس نے جس شاگرد کی جانب اشارہ کیا اس نے اٹھ کر فوراً شعر پڑھ دیا۔ سلمان نے ایسے ہی کئی اور سادہ اور عام فہم اشعار بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھوائے۔ اشعار لکھتے لکھتے اچانک اسے سلطانہ کی یاد آگئی اور اس کی یاد کے ساتھ ہی وہ خوابوں میں بھٹکتا دور نکل گیا۔ اب وہ ایسے اشعار لکھنے لگا جن کو پڑھتے ہوئے لوگ اٹکنے لگے۔ ایک بار تو خاصی گڑبڑ ہو گئی۔ اس نے بلیک بورڈ پر لکھا۔

رات نس نس کر یہ کہتی ہے کہ میٹھانے میں چل

پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل

یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

سلمان نے جس شاگرد سے پڑھنے کے لیے کہا تھا اس نے پہلا مصرعہ تو روانی سے پڑھ دیا۔ دوسرے مصرعے نے خاصا پریشان کیا۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ چہرے پر چٹکی ڈاڑھی تھی اور دیکھنے میں مرل سا نظر آتا تھا۔ چند لمحوں سوچنے کے بعد اس نے سلمان سے پوچھا۔

”ماٹری لالہ تو سمجھ میں آگیا وہی جو آپ نے پہلے دن پڑھایا تھا۔ پر یہ شہناز کون ہے؟“

پچھے سے کسی من چلنے نے اسے چھیڑا۔ ”بوٹا کی بہن شہناز اور کون؟ وہی جو پرلی گلی میں رہتی ہے۔“

فوراً ہی ایک اور آواز آئی۔ ”یہ سالا جھوٹ بولتا ہے۔ ابے یہ تو صاف کلکتے والی شہناز ہے۔“ کسی بوڑھے نے جل کر اسے ڈانٹا۔ ”کیا بات کر رہا ہے لڑے؟ کلکتے والی تو گوہر جان تھی۔ یہ لٹی اور ہوگی۔“

یہ تمہرے سن کر سلمان پریشان ہو گیا۔ علی احمد نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا۔ سلمان نے نظم کے اس بند کو فوراً جھاڑن سے مٹا دیا اور ایک آسان شعر لکھا۔

سلمان نے جھاڑن سے تختہ سیاہ صاف کیا اور کلاس کی جانب مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے بچہ چٹائیوں پر ۳۶ افراد بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے تیز دھوپ سے سنولائے ہوئے تھے۔ جسم پر لباس تھے جن سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ یہ اس کے شاگرد تھے۔

سلمان نے سب پر ایک نظر ڈالی اور اونچی آواز سے بولا۔ ”آج آپ لوگوں کا امتحان ہوگا۔ کسی نے دہلی زبان سے پوچھا۔ ”امتحان؟“ سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جی ہاں! میں بورڈ پر جملے لکھوں گا اور ہر ایک سے باری باری پڑھواؤں گا۔ جس سے میں کہوں گا وہی پڑھے گا۔ کوئی بیچ میں نہیں بولے گا۔“

سلمان تختہ سیاہ پر کھریا سے لکھتا اور باری باری سب سے پڑھواتا۔ بعض شاگردوں نے ہر حرف پڑھ دیا۔ بعض کو کسی قدر دقت پیش آئی۔ مگر ہر شخص نے جملے پڑھ ڈالے۔ اسے بے حد ہوئی۔ ابھی پورا کورس ختم ہونے میں بارہ سبق باقی تھے۔ مگر اس عرصے میں وہ اچھا خاصا پڑھنے قابل ہو گئے تھے۔ ان میں ذوق و شوق بھی بہت تھا۔ اس امتحان میں بھی ہر شخص بڑھ چڑھ کر لے رہا تھا۔ ان کی دلچسپی دیکھ کر اس نے بلیک بورڈ پر زیادہ مشکل جملے لکھے۔ کچھ نے روانی کے ساتھ کو پڑھا۔ کچھ اٹک کر رہ گئے۔ یہ سلسلہ بھی کچھ دیر چلتا رہا۔ آخر وہ نثر ختم کر کے نظم پر آ گیا۔

عین اس وقت علی احمد بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اکثر اپنے گروپ کے اسکاٹی لارکوں کی سرگرمی کا معائنہ کرتے آتا تھا۔ ان میں جو خامی دیکھتا اس پر ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتا اور اسے کرنے کی کوشش کرتا۔

اس وقت سلمان بورڈ کی طرف منہ کئے لکھنے میں مصروف تھا۔ علی احمد چپ چاپ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

وہ ہمیشہ اسی طرح خاموشی سے آتا تھا۔

علی احمد: شعر۔ میٹھانے: شراب خانہ۔ شہناز: بہت زیادہ تازہ وادوالی۔ لالہ رخ: حسین۔ کاشانہ: رہنے کی جگہ۔ مگر۔ وحشت دل: دل کی ہوائی آہ۔ کلکتے والی: جھکی ڈاڑھی۔ بوٹا کی بہن: بہت کم ہوں۔ مرل: بہت کمزور۔ من چلا: شرف۔ لڑا: لڑکا۔

چاپ: قدموں کی آواز۔ جھاڑن: مٹائی کا پتھر۔ فر فر: تیزی سے۔

بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ  
ہجر کی شب اور آخر شب

ابھی اس نے کسی سے پڑھنے کا اشارہ بھی نہ کیا تھا کہ ایک نوجوان نے اٹھ کر بڑی سادہ  
کہا ”ماسٹر جی! آخری شب کی سی“ چھوٹ گئی ہے۔“ اس نے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس  
گردن اونچی کر کے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ابے ہم تو ماسٹر جی کی بھی غلطیاں پکڑ لیتے ہیں۔ سلا  
دار سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک بوڑھے نے اٹھ کر پوچھا۔

”ماسٹر جی! یہ ہجر کی شب کیا ہووے ہے؟“

اسی وقت کسی نوجوان نے ٹوکا۔ ”چاچا بیٹھ جا۔ یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“  
دوسرا اس سے بھی دو قدم آگے گیا۔ ”اے یہ عاشقی معشوقی کی باتیں ہیں۔“ اس نے  
ہاتھ رکھا اور زوردار نعرہ لگایا۔

”ہائے مدھو بالا۔ پلاوے شربت وصل کا پیالا۔“

اس بات پر خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے اٹھ کر احتجاج کیا کہ جس نوجوان نے  
بالاوالی بات کہی ہے اسے سزا کے طور پر فوراً کلاس سے نکال دیا جائے۔ مگر وہ نکلنے پر کسی طور پر  
نہ تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اس نے صرف شعر پڑھا تھا۔ گالی نہیں بکی تھی۔ کچھ اس کے حمایت  
پیدا ہو گئے۔ اس طرح دو ٹولیاں بن گئیں اور ایک دوسرے کے خلاف شور مچانے لگیں۔  
گھبرا گیا۔

فوراً ہی علی احمد سامنے آگیا۔ اس نے انہیں سمجھا بھجا کر کلاس کو قابو میں کیا اور دیر تک  
سیاہ پر عام فہم اور دلچسپ جملے لکھ کر پوچھتا رہا۔

اس رات سلمان اور علی احمد تعلیم بالغاں کے مرکز سے دیر میں لوٹے۔ راستے میں علی احمد  
سلمان کو سمجھایا کہ جن لوگوں کو وہ پڑھاتا ہے وہ بہت پس ماندہ اور پچھڑے ہوئے ہیں۔ فلک  
مقصد فی الحال یہ ہے کہ انہیں اتنا علم سکھا دیا جائے کہ وہ کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔  
ذہنی نشوونما مطالعے سے ہوگی، جو بعد کا مرحلہ ہے۔

سلمان چپ رہا۔

بیت گئی، گزر گئی، ہجر، جدائی، شرم و حوصل، مراد اوقات۔ پچھڑے ہوئے، مراد کم علم۔

عزیز مدنی

علی احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہارے رومانٹک موڈ نے تو پوری کلاس کو رومانٹک بنا دیا تھا۔“  
سلمان پہلے ہی شرمندہ تھا۔ اس جملے پر اور شرمندہ ہو گیا۔ اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ خاموشی  
علی احمد کا طنز جھیل گیا۔

\*\*\*

فلک بیجا کا ہانہ اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر زیدی نے ہر گروپ کے بارے میں رپورٹ پیش کی۔ اس  
کے تجربے سے یہ اندازہ ہوا کہ علی احمد کا گروپ سب سے زیادہ کامیاب اور موثر ثابت ہو رہا تھا۔  
دارالمطالعے قائم کرنے والے گروپ کا کام افسوس ناک حد تک سست اور غیر موثر تھا۔  
حقیقت بھی یہی تھی۔ فی الحال ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا تھا۔ وہ ایسی بستی میں تھا جہاں کی بیشتر  
آبادی بالکل ان پڑھ تھی۔ دارالمطالعہ ہر وقت خالی رہتا۔ کبھی کبھار کوئی آتا تو صرف رسالوں اور  
اخباروں کی تصاویر دیکھ کر چلا جاتا۔ لہذا اجلاس نے یہ فیصلہ کیا کہ دارالمطالعہ گروپ ختم کر دیا جائے  
اور اسے تعلیم بالغاں گروپ میں مدغم کر دیا جائے۔

تعلیم بالغاں کے ساتھ ساتھ تقریروں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ صفدر بشیر اپنے گروپ کے دو  
سکانی لارکوں کے ہمراہ وزانہ کسی پس ماندہ بستی میں جاتا اور اچھا شہری بننے اور صاف ستھری زندگی بسر  
رہنے اور تعلیم کی اہمیت پر زور دیتا۔ تو ہم پرستی اور فرسودہ رسم و رواج سے پیدا ہونے والی سماجی برائیوں  
کا نشانہ بن کر تھیں ترک کرنے اور ان کے خلاف موثر طور پر جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا۔ وہ  
اہم فہم انداز میں ان کی ذہنی تربیت کرتا۔ ان کا سیاسی اور سماجی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتا۔

ہر شام وہ کسی چوراہے یا گلی کے کنارے پر کھڑا ہو جاتا۔ اپنی تقریر شروع کرتا۔ اس کی تقریر سننے  
کے لیے لوگ اکٹھا ہوتے۔ دلچسپی اور توجہ سے اس کی باتیں سننے اور اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ  
جاتے۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد صفدر بشیر یہ محسوس کرنے لگا کہ ان جلسوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد  
نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی حیثیت مجمع گیر عطائی معالج یا دوا فروش کی مانند ہے جو اپنی لکھے دار اور پر لطف  
افواہ سے لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کی جیبوں سے رقم نکلوانے کا گر جانتا ہے۔

صفدر بشیر اپنی کوششوں کے بارے میں اسی انداز سے سوچ رہا تھا۔

اہم فہم انداز، تو ہم پرستی، مراد پرانے خیالات کو ماننا، فرسودہ پرانے، مجمع گیر، مجمع لگانے والا، عطائی، وہ شخص جس نے کسی فن  
کا مقصد تعلیم حاصل نہ کی، لکھے دار، مزیدار، لہجہ باتیں، گر، فارمولہ، کسی کام کے کرنے کا خاص طریقہ کار۔

ہدایت اور مشورے سے کرتے۔

ڈاکٹر زیدی ان دنوں اس قدر مصروف رہتا کہ سرائٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اکثر رات کو طبی مرکز میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ ذرا آنکھ لگتی کہ اطلاع ملتی فلاں مریض کی حالت تازک ہے۔ اور اس کے پاس پہنچتا۔

کچھ عرصے بعد یہ اندازہ ہو گیا کہ ایک ڈاکٹر سے کام نہ چلے گا۔ ڈاکٹر زیدی کی کوشش سے دو ڈاکٹروں کی رضا کارانہ خدمات حاصل کی گئیں۔ دونوں نیک دل اور خدا ترس تھے۔ ان میں خدمت خلق کی لگن بھی تھی۔ اب فلک پیانے دو طبی مراکز اور کھول دیئے تھے۔ ہر مرکز کا انچارج ایک ڈاکٹر تھا۔

ان کمپوں کے اخراجات کے لیے مزید پانچ ہزار کی رقم منظور کی گئی۔ شہر کے سرکاری اور خیراتی اسپتالوں کا انتظام انتہائی ناقص تھا اور ان سے بھی زیادہ افسوس ناک رویہ بیشتر پرائیویٹ ہسپتال کرنے والے ڈاکٹروں کا تھا۔ لہذا مریض فلک پیانے کے طبی امداد کے مراکزوں میں علاج لانے کو ترجیح دیتے۔ ہر وقت وہاں مریضوں کا ہجوم رہتا۔

\*\*\*

ٹائی فائیڈ کی وبارفتر رفتہ کم ہوتی گئی۔ مگر اس سلسلے میں فلک پیانے جو کام کیا اس نے اسکاٹی لارکول کو پس ماندہ علاقوں اور بستیوں میں بہت مقبول بنادیا۔

آئندہ اجلاس میں جب ہر گروپ کے کام کا جائزہ لیا گیا تو یہ تجویز سامنے آئی کہ اب چونکہ ٹائی فائیڈ کی وبا ختم ہو چکی ہے لہذا طبی امداد کا گروپ توڑ دیا جائے۔ لیکن بعض اسکاٹی لارکول نے اس کی شدید مخالفت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس گروپ کو برقرار رکھا جائے اور کسی بستی میں جگہ حاصل کر کے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کیا جائے۔ اس منصوبے میں چونکہ اخراجات زیادہ تھے اس لیے متفقہ طور پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کئی گھنٹے تک بحث جاری رہی۔ آخر رائے شماری ہوئی اور اکثریت اس بات کے حق میں نکلی کہ اسپتال ضرور قائم کیا جائے۔

اسپتال کے لیے سب سے پہلے ایک قطعہ اراضی حاصل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مقصد

انگلینڈ، غیر ملوث ارضیت کے اپنی خدمات ملک و قوم کے لئے پیش کرنا۔ قطعہ اراضی: زمین کا گروہ

وہ عوام میں جس تبدیلی کے دیکھنے کا خواہاں تھا کہیں نظر نہ آتی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر زیدی اپنی رپورٹ میں اس کے گروپ کی کوششوں کو سراہا تھا اور یہ موقف اختیار کیا تھا کہ تحریک بالغاں کو کامیاب بنانے میں صفدر بشیر اور اس کے گروپ کے دوسرے اسکاٹی لارکول کی قمر نے بڑی حد تک زمین ہموار کی ہے۔

\*\*\*

شہر کے پس ماندہ اور نشیبی علاقوں میں ناگہاں ٹائی فائیڈ کی وبا پھوٹ پڑی۔ تعلیم بالغاں مراکزوں میں طلباء کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگی۔ ہر طرف بیماری کا زور تھا۔ صورت حال تشویشناک تھی۔

صفدر بشیر نے فوراً فلک پیانے کا ہنگامی اجلاس بلایا اور یہ تجویز پیش کی کہ اس کا گروپ بھی جائے۔ ڈاکٹر زیدی کی سربراہی میں ایک نیا گروپ تشکیل دیا جائے جو ٹائی فائیڈ کے مریضوں کو امداد مہیا کرے۔ اس تجویز کو صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر اتفاق رائے سے منظور کرا فلک پیانے کے فنڈ سے پانچ ہزار روپے ابتدائی اخراجات کے لیے منظور کئے گئے۔ ڈاکٹر زیدی کا، لیے چار اسکاٹی لارک دیئے۔

سلمان نے بھی اس سلسلے میں ایک تجویز پیش کی اور وہ یہ تھی کہ تعلیم بالغاں کا کام چونکہ کم ہوتا ہے لہذا اس گروپ میں کام کرنے والوں کو دن میں اپنے وقت کا کچھ حصہ طبی امداد دینا چاہیے۔ تجویز معقول تھی اور ہنگامی حالات میں نہایت مناسب تھی۔ چنانچہ اسے بھی کر لیا گیا۔

صفدر بشیر نے سلمان کے اس جذبے کی دل کھول کر داد دی۔ جلد ہی فلک پیانے کی جانب سے ٹائی فائیڈ کے مریضوں کے لیے ایک متاثر علاقے میں طبی مراکز کھول دیا گیا۔ بڑے جوش و خروش اور لگن سے طبی امداد کا کام شروع ہوا۔ اسکاٹی لارکول سویرے ہی سویرے ہیڈ کوارٹر سے نکلتے اور رات گئے لوٹتے۔

وہ مریضوں کو دوا دیتے۔ ان کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے۔ بیماری کے خلاف احتیاطی اختیار کرنے کے طریقے بتاتے۔ گندگی سے پرہیز اور صفائی پر زور دیتے۔ وہ ہر کام ڈاکٹر زیدی

زمین ہموار کی: سرانجام قلم کی: ناگہاں: اچانک: وبا: وہ بیماری جو ہوا کے خراب ہونے سے پھیلتی ہے۔ نزاکت: ہزارک ہوتا

اسکائی لارکوں نے ایک اجلاس میں مالی مشکلات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ اسپتال کی تعمیر کا ام خود اپنے دست و بازو سے انجام دیا جائے۔

اس اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ علاقے کے عوام سے اسپتال کی تعمیر کے لیے چندہ لینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن کئی اسکائی لارکوں نے تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اختلاف رائے کے باعث اس تجویز پر اجلاس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اسے آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا۔ البتہ اسکائی لارکوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ علاقے کے رہنے والوں سے بات چیت کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ اگر چندے کی مہم شروع کی جائے تو اس کی کامیابی کے کس قدر امکانات ہیں۔

\*\*\*

اتوار کی صبح صفدر بشیر کی کوٹھی پر ایک جھلکتی ہوئی کیڈلک آکر رکی۔ ایک ادھیڑ آدمی کار کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس کا جسم کسی قدر بھاری بھر کم تھا، سر کے بال اڑے ہوئے تھے، چہرے پر رنج، آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا۔ اپنی آن بان اور وضع قطع سے وہ خاصا معزز لگتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چھتری کے سہارے چلتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہوا اور صفدر بشیر سے ملنے خواہش ظاہر کی۔

صفدر بشیر اس وقت کوٹھی میں موجود تھا۔

ڈرائنگ روم میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اجنبی نے صفدر بشیر سے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام خان بہادر فرزند علی تھا۔ اس کے پاس ہزاروں ایکڑ زرعی اراضی اور جائیداد تھی۔ یہ راکہ الماک تھی جو اس نے اپنے کلیم کی بنیاد پر الاٹ کرائی تھی۔ زمین داری کے ساتھ ساتھ اس نے زمین کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کی مستقل رہائش بھی شہر ہی میں تھی۔ وہ خاندانی رئیس تھا۔ اس کا باپ بھی خان بہادر تھا۔ مگر تاج برطانیہ کی گراں قدر خدمات انجام دینے اور تمام تر داری اور جاں نثاری کے باوجود سر کا خطاب حاصل کرنے کا ارمان دل میں لیے دنیا سے رخصت لیا تھا۔

خان بہادر فرزند علی نے ملاقات کا مقصد یہ بتایا کہ وہ چندے کی صورت میں فلک پیا کی مالی لو کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی کچھ تجاویز بھی تھیں۔ مسئلہ چونکہ اہم تھا لہذا سینئر

بانیانہ محنت و کوشش وضع قطع، صل و صورت۔ حرد کہ الماک: چھوڑی ہوئی جائیداد۔

کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی جس نے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر ایک ایسی جگہ نثر سڑک کے کنارے تھی اور اس کے نقطہ نظر سے نہایت موزوں تھی۔ دوسرے ہی دن فلک ایک وفد متعلقہ حکام سے ملا۔ حکام سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ آخر دھوپ کے بعد ایک قطعہ اراضی کا الاٹ منٹ مل گیا۔ مگر اس قطعہ اراضی کے ساتھ مشکل کہ اس پر چند خاندان ناجائز طور پر قابض تھے اور ایک مدت سے وہاں آباد تھے۔ وہ اسے خالی کر کسی طور پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی بے دخلی کا حکم نامہ جاری کیا گیا تو لڑنے جھگڑنے پر آمادہ، خاصی نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ فوراً فلک پیا کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا جس میں یہ طے کر مسلمان اپنا اثر و سونخ کام میں لائے۔ اس لیے کہ اس علاقے میں تعلیم بالغاں کا جو مرکز قائم انچارج مسلمان ہی تھا۔

دوسرے ہی روز مسلمان نے اپنے شاگردوں سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ ماسٹر کی کس طرح خالی جاسکتی تھی۔ دوبارہ اس مسئلے کی جانب توجہ دلانے کی نوبت نہ آئی۔ پوری لوگوں کے سر ہو گئی کہ پلاٹ خالی کرو۔ منت ساجت بھی کی اور دھمکی بھی دی کہ پلاٹ خالی انکا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

وہ لوگ تعداد میں تھوڑے تھے۔ بستی کے ہزاروں افراد سے دشمنی مول نہیں تھے۔ آخر انہوں نے جگہ خالی کر دی۔ بستی والوں نے دوسری جگہ ان کے مکانات تعمیر کر لیے چندہ جمع کیا۔ پھر سب نے خود ہی مل جل کر پہلے ہی کی طرح جھگیاں اور نیم پختہ مکانات کر لیے۔ یہ سارا کام آٹا ٹاٹا ہوا۔ نہ کوئی کھلی مچی نہ ہنگامہ ہوا، سب کام اطمینان اور سکون سے ہو اسکائی لارکوں نے ایک روز جا کر دیکھا تو پلاٹ خالی تھا۔ لمبے تک صاف کر دیا گیا تھا۔ زمین سرما کی بلکی بستی دھوپ میں اجلی اجلی نظر آرہی تھی۔ جگہ کا مسئلہ حل ہو گیا تو اسپتال کا کام زیر بحث آیا۔

نقد میں صرف چھ ہزار روپے رہ گئے تھے۔ صفدر بشیر نے مزید دس ہزار روپے دے رقم بھی اسپتال کے لیے کم تھی۔

نقطہ نظر: خیال / اندازہ بے دخلی، اخراج، نکال۔ اثر و سونخ: تعلقات۔ آٹا ٹاٹا: دیکھتے ہی دیکھتے۔ چٹیل: صاف میدان جہاں درخت نہ ہوں۔



اسکائی لارکوں سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ صفدر بشیر نے علی احمد، فہیم اللہ اور ڈاکٹر زبیر ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ خان بہادر نے ان کے سامنے امداد کی پیش کش کی اور اس خواہش کہ اسے اپنی تجاویز تمام ارکان کے سامنے پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ یہ بات فلک پنا کے خلاف تھی۔ مگر صفدر بشیر کی سفارش پر خان بہادر کی درخواست منظور کر لی گئی۔

تمام اسکائی لارک اتفاق سے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔ لہذا اسی وقت فلک پنا کا ہاں بلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تمام اسکائی لارک کانفرنس روم میں جمع ہو گئے۔ خان بہادر بھی کے ہمراہ کمرے میں پہنچ گیا۔ اجلاس کی صدارت کے لیے علی احمد کا نام تجویز کیا گیا۔ لارکوں کی تائید سے منظور کر لیا گیا۔ علی احمد صدر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اجلاس کی کاروائی کا آغاز ہوا تو صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر خان بہادر فرزند علی کا لارکوں سے تعارف کرایا اور اس کی مالی پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خان بہادر اگر اجلاس کے سامنے کچھ تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جب صفدر بشیر اپنی بات کہہ کر بیٹھ گیا تو خان بہادر نے کھڑے ہو کر صدر سے اجازت کر گلا صاف کیا۔ رومال سے چہرے کا پینہ خشک کیا۔ چشمہ آنکھوں پر درست کیا۔ اس تیزی تقریباً ایک منٹ صرف کیا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کی آواز اور لہجے میں نرمی تھی۔ بات کرتے وقت وہ بار بار اپنی گردن کو ایک خاص انداز سے خم دیتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے فلک پنا کے فلاحی کاموں کی تعریف و توصیف کی۔ اسکائی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی۔ وہ اس وقت بڑے سر پر ستانہ انداز میں بول رہا تھا۔ بار بار مس کے ہلکے ہلکے کش لگاتا اور سامنے بیٹھے ہوئے اسکائی لارکوں کو ایسی نظروں سے دیکھتا: درس گاہ کے طالب علم ہیں، جن کا تجربہ محدود اور مشاہدہ زندگی کے ابتدائی مراحل میں اسکائی لارکوں نے اس کی باتوں پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ نہ صرف سن و سال بڑا تھا بلکہ خاصا بادقار بھی نظر آ رہا تھا۔

خان بہادر اپنی بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے رکا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا۔ نکالا اور اسکائی لارکوں کے روبرو پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ کی

”مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ ضرور اسپتال تعمیر کر لیں گے۔ آپ میں وہ جذبہ و عمل پایا جاتا ہے جس سے زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دیے جاسکتے ہیں۔“

اچانک اس نے اپنا لہجہ بدل دیا۔ گردن کو اپنے مخصوص انداز میں خم دیا۔ ”مگر آپ اسپتال لائیں گے کس طرح؟ میرا مطلب اس کے اخراجات سے ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

لومٹ کی امداد یا ذاتی فنڈز اور یہ دونوں ہی صورتیں فی الحال ممکن نہیں۔“ خان بہادر فرزند علی نے ہار کے دو چار کش لگائے۔ سامنے بیٹھے ہوئے اسکائی لارکوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور سلسلہ کلام

رہی رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی تنظیم نے اس مسئلہ پر کیا سوچا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں میری

ب تجویز ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ دیکھئے بنیادی بات یہ ہے کہ اسپتال کے

رابطات کے لیے ایک مستقل آمدنی کا وسیلہ ہونا ضروری ہے۔ کیوں نہ آپ ایسا کریں کہ اسپتال

لے نام پر دوائیں امپورٹ کرنے کا لائسنس حاصل کر لیں۔ یہ لائسنس تو بہر حال آپ کو حاصل

ہو چکا ہوگا۔ مگر اس میں اتنا اور کرنا پڑے گا کہ لائسنس اسپتال کی ضروریات سے زیادہ ہو۔ کم از

کم از کم دواؤں کا جو فاضل کوٹا بچے اسے بازار میں بہت اچھی قیمت پر فروخت کیا جاسکتا

ہے۔ میرا مطلب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔“

اس نے بلیک مارکیٹ میں دوائیں فروخت کرنے کی بات کہنے سے حتی الوسع احتراز کیا۔

رف مسکرا کر اسکائی لارکوں کو دیکھا۔ ”امپورٹ لائسنس اور دواؤں کی فروخت کے بارے میں

فکر و مہار، شان و شوکت والا۔ طائرانہ: سرسری۔ فاضل: بچ جانے والا۔ حتی الوسع: جہاں تک ہو سکے۔ احتراز: پرہیز۔

آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا بند و بست میں کر دوں گا۔ البتہ یہاں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ دواؤں کی فروخت سے جو منافع ہو گا اس میں وہ اس پارٹی کو دیتا پڑے گا جو آپ کے لیے اپورٹ لائسنس مہیا کرے گی اور دواؤں کی فروخت کر بھی ذمہ دار ہوگی۔ اس لیے کہ یہ کام آپ لوگوں کے بس کا نہیں۔“

اس کی تجویز سن کر اسکاٹی لارکوں نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ کمرے کی فضا میں پیدا ہوا۔ مگر کسی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔ خان بہادر بدلی ہوئی فضا کو محسوس کیا اور بڑے شگفتہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

”مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے  
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں  
”بس مجھے ہی عرض کرنا تھا۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی۔ میں نے خلوص دل اور نیک نیتی سے اپنی معروضات پیش کر دیں۔“

”ممکن ہے کہ آپ لوگ میری اس تجویز پر چونکیں کہ یہ شخص کیا بک رہا ہے۔ ہم مارکیٹنگ کی ترغیب دے رہا ہے۔“ اس دفعہ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”ہے تو بھی یہ بلیک مارکا مگر صاحب کبھی کبھی یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ سر سید مرحوم کو اپنے مشن کے لیے طوائفوں سے چند املا تھا۔ مولویوں نے بڑا شور مچایا کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ اس کا استعمال قطعی غیر شرعی سر سید اگر ان کی باتوں سے مرعوب ہو جاتے تو جناب آج یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نظروں جس نے سچ پوچھے تو برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی بصیرت اور بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔ غالب نے غالباً اسی موقع کے لیے کہا تھا۔“

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ سگار پر کش لگاتا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر کئی اسکاٹی لارکوں نے صدر سے بولنے کی اجازت چاہی۔ مگر اس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ خان بہادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”خان بہادر صاحب! ہم آپ کے فیصلوں کی باتوں کے لیے بے حد ممنون ہیں۔ اب ہمیں اس بات کا موقع دیجئے کہ ہم اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔“

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی  
اس نے اسکاٹی لارکوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ ”کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نیک کام کے لیے کبھی برائی کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔“

خان بہادر نے کہا۔ ”آپ اپنے فیصلے سے مجھے کب تک مطلع کر سکیں گے؟“  
”مجھے یقین ہے کہ اسی اجلاس میں کچھ نہ کچھ ضرور طے ہو جائے گا۔“  
وہ بولا۔ ”اگر آپ مجھے بھی بحث میں حصہ لینے کا موقع دیں تو مجھے اپنا نقطہ نظر سمجھانے میں کھولت ہوگی۔“

خان بہادر نے ذرا دیر کے لیے خاموشی اختیار کی۔ سگار سے تھوڑا سا شغل کیا اور فاتحانہ سے سر اونچا کر کے تمام اسکاٹی لارکوں کے رد عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اسکاٹی لارکوں کشیدگی کا احساس زائل ہو رہا تھا۔ ان کے چہرے سوچتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ خان بہادر نے کھڑا کرکھا صاف کیا اور لہجے میں شفقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔  
”جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کچھ کام کروں۔ بھاگ دوڑ کر تباہ میرے بار بات نہیں۔ عمر بچپن سے بھی تاجواڑ کر چکی ہے۔ مگر کام کرنے کا حوصلہ ضرور ہے۔ آپ لوگ

علی احمد نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں ایسی اجازت نہ دے سکوں گا۔ یہ بے ضابطہ بات ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اپنی بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دی۔ اب اس سے زیادہ وضاحت کی اور کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔“  
خان بہادر فرزند علی نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ رات کے نوبے آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ مقررہ میٹنگ نے تمام اسکاٹی لارکوں کی جانب سے اس کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے لگے۔

نگار خان بہادر کی معروضات: معروضہ کی جمع، گزارشات، بے ضابطہ قانون کے خلاف، قاعدہ کے خلاف۔

اور تعاض: بے چینی، سناہٹ۔ مضمر: چھپی ہوئی، پوشیدہ کشیدگی: کھجواڑ، زائل ہونا، دور ہونا، کم ہونا۔

ہوئی۔ جب شام کا دھند لگا کوٹھی کے در و دیوار پر پھیل گیا اور کانفرنس روم کی دیوار گیر یوں سے ہر جگہ میں پھونکنے لگیں تو علی احمد بولنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ آنکھوں میں سونہرا تھا۔ اس نے جذبات سے عاری نرم اور شگفتہ لہجے میں اپنی تقریر شروع کی۔

”اسکاٹی لارک ساتھ! میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام اسکاٹی لارک کی حیثیت سے۔ یہ میری انفرادی رائے ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکاٹی لارکوں نے خان بہادر فرزند علی کی تجویز کے بنیادی مقصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ خان بہادر ہار دہائی قسم کے آدمی ہیں۔ روپے سے روپیہ پیدا کرنا ان کا مقصد حیات ہے۔“

سلمان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بھی خان بہادر کے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی نہیں ہے۔ ہم ان کو فرشتہ نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ دیکھنا چاہیے۔۔۔۔۔“

علی احمد نے سلمان کو آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ”میں اسکاٹی لارک سلمان احمد سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیں۔“ سلمان نے اسے مشتعل کرنے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ علی احمد نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خان بہادر کا مقصد حیات زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنا ہے، یعنی ہمارے دیات سے بہت زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ خواہش ایک مجرمانہ فعل ہے۔ اس مطلب سے دوسروں کے گھروں سے روشنی چھین کر اپنے ایوانوں میں چراغاں کرنا۔ غریبوں کے پیسے سے جھگڑتی ہوئی کاروں کے لیے پیٹرول مہیا کرنا۔ لاکھوں انسانوں کے لیے برہنگی اور اپنے لیے طلسم و کھواب۔“ علی احمد کا لہجہ بتدریج تینکھا ہوتا گیا۔ اس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہو گئی۔ ”یہ محنت استحصال ہے۔ ڈاکہ زنی ہے۔“

اسکاٹی لارکوں میں سنسنی پھیل گئی۔ وہ سحر زدہ انسانوں کی طرح خاموش بیٹھے علی احمد کو دیکھتے تھے۔ جواب اونچی آواز سے بول رہا تھا۔

”خان بہادر سے ہمارا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری راہیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ فلک بیا کو اپنے مقاصد کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے دواؤں کی بلیک مارکیٹ ہوگی اور خان

اس کے جانے کے بعد اجلاس کی کاروائی از سر نو شروع کی گئی۔ صدر نے خان بہادر پر اسکاٹی لارکوں کو اظہار رائے کی دعوت دی۔ وہ بہت دیر سے بولنے کے لیے بے چین رہا۔ بارہی کئی اسکاٹی لارکوں نے بولنا شروع کر دیا۔ اس طرح اجلاس میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ وہ بول رہے تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو خان بہادر کے ہم خیال تھے اور وہ بھی تھے جو اس مخالفت کر رہے تھے۔ اجلاس کا رنگ بگڑتا جا رہا تھا۔ علی احمد نے بڑی مشکل سے صورت حال میں کیا اور بحث کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک اسکاٹی لارک اگر تجویز کی حمایت میں دوسرے کو مخالفت میں بولنے کا موقع دیا جاتا۔ پھر بھی بار بار مداخلت کی جاتی۔

اس بحث سے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اسکاٹی لارکوں کی اکثریت خان بہادر کی ہم خیال میں سلمان پیش پیش تھا۔ وہ اس وقت بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں نہ مرا بات پر زور دیا کہ خان بہادر کی تجویز قبول کر لی جائے بلکہ جذبات کی رو میں اور بھی بہت کچھ ا تقریر کرتے کرتے ایک بار اس نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو دواؤں کی چور بازاری پر اعتراض ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ہمیں بیٹکوں پڑے، سرمایہ داروں کی تجویزیاں توڑنا پڑیں، جاگیروں کے محلوں پر ڈاکہ ڈالنا پڑے تو ہمیں بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں روپیہ چاہیے۔ غریب اور پس ماندہ عوام کی فلاح و بہبود کے ان کی بھلائی کے لیے۔ ہم اس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہمارا نصب انہیں بلند اور ہمارا عظیم ہے۔ ہمیں جھوٹی اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کس طرح جلد اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ ہمیں وقت کی اہمیت کسی حال میں بھی فراموش نہیں چاہیے۔“

وہ دیر تک اسی انداز میں بولتا رہا۔ اس نے تقریر ختم کی تو اس کے ہم خیال اسکاٹی لارکوں کا زور زور سے تالیاں بجائیں۔

فلک بیا کا یہ اجلاس سہ پہر کو شروع ہوا تھا اور شام تک جاری رہا۔ اسکاٹی لارکوں نے اس سہ پہر کی چائے بھی کانفرنس روم ہی میں پی اور اجلاس کی کارروائی جاری رکھی۔ بڑی گرما گرم

تمام اسکائی لارکوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اجلاس ختم ہوا تو اسکائی لارکوں کے چروں پر اطمینان اور سکون تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر جانے کی تباہیاں کر رہے تھے۔

\*\*\*

رات کے نو بجے تھے۔  
خان بہادر کی کار فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر کے سامنے ایک بار پھر نمودار ہوئی۔ وہ مسکراتا ہوا ڈرائیگ روم میں داخل ہوا۔  
مفسر بشیر، علی احمد اور فہیم اللہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ خان بہادر نے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو کی پھر حرف مطلب پر آگیا۔

”کہنے کیا فیصلہ ہوا آپ کے اجلاس میں؟“

مفسر بشیر نے جواب دیا۔ ”خان بہادر صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی تجویز پر عمل نہیں کر سکیں گے۔ البتہ اگر آپ اسپتال کی تعمیر کے لیے ہماری مالی امداد کرنا چاہیں تو ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے۔“

خان بہادر کا چہرہ فنی ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔ ”ایسی صورت میں سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

علی احمد نے نہایت خاموشی سے بیس ہزار کا چیک نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ چیک مانر ہے۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔“

خان بہادر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے برامانے کہاات نہیں۔ روپیہ بڑی محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا آپ مجھے یہ حق تو دیں گے کہ اگر میں کسی مسئلہ کے لیے چندہ دوں تو یہ بھی دیکھوں کہ میری رقم صحیح کام پر صرف ہو رہی ہے یا نہیں۔ پھر آپ یہ بھی غور کریں کہ بیس ہزار بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔“

”یہ حق آپ سے کون چھین سکتا ہے۔“ علی احمد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ فلک پیمائے پروگرام سے متفق نہیں ہیں تو پھر کسی تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

مقرر ہوا: جہاں سے کارنگ لانا۔ صرف استعمال۔ متفق: ہم خیال۔

بہادر کے مشوروں پر یوں ہی عمل ہوتا رہا تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اسپتال میں دوڑنے بجائے رنگین پانی کی بوتلیں نظر آئیں گی۔ دوائیں چور بازار میں پہنچ جایا کریں گی اور بیمار یوں بے سہارا اور محتاج انسان سسک سسک کر دم توڑتے رہیں گے۔“ علی احمد نے ہاتھ اٹھا کر شہادت سے بلندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں اس تجویز کے پس پردہ فلک پیما کی جانی دیکھ رہا ہوں۔ اسکائی لارکوں کا عہدہ انجام“ اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود تھا۔

”کیا ضروری ہے کہ فلک پیما ایک شاندار اسپتال تعمیر کرے جس کے کثیر اخراجات نہ صرف بلیک مارکیٹنگ بلکہ بعض اسکائی لارکوں کے مطابق ڈاکہ زنی اور لوٹ مار تک کی جائے اس کا اشارہ براہ راست سلمان کی جانب تھا۔

”جناب من! یہ رابن ہڈ کے شاہ رچرڈ کا عہد نہیں ہے جب چند امیروں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کی جاتی تھی۔ یہ علم و آگہی کا دور ہے۔ سائنس اور جمہوریت کا دور ہے۔ آج انہ اپنے مسائل کا بخوبی ادراک ہے۔ وہ اس کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ جو لوگ ان مسائل کا حل جانتے وہ ہشت گردی اور لاقانونیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بہت سے نوجوان ہا ہو کر اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ یہ گمراہ کن رجحان ہے یہ جانی کاراستہ ہے۔“

علی احمد نے تمام اسکائی لارکوں کے چروں کا جائزہ لیا اور اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”جہاں تک خان بہادر کا تعلق ہے میں ان کے ساتھ اس حد تک تعاون کرنے کا مشورہ گا کہ وہ اسپتال کی تعمیر کے لیے جو چندہ دے رہے ہیں اسے قبول کر لیا جائے اور ان کی تجویز کردی جائے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی تجویز منظور نہ کی گئی تو وہ فلک پیما کو چندہ آمادہ نہ ہوں گے۔ یہی ان کے خلوص اور نیک نیتی کی آزمائش ہوگی۔ مجھے اس سے زیادہ اور کچھ کہنا۔ میں نے اپنی رائے کا پوری دیانت داری سے اظہار کر دیا۔ فیصلہ آپ سب مل کر کریں گے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

علی احمد نے اجلاس کی فضا بدل دی۔

چنانچہ رائے شماری کی بھی ضرورت نہ پڑی۔

وہ خوشی خوشی سارا مال ٹرکوں میں بھر کر دکان پر لایا۔ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کسبوں کے اچھے دام مل جائیں گے۔

لیکن جب اس نے بندلوں کو کھولا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سارے کبیل بوسیدہ اور گلے ہوئے تھے۔ ذرا سادہ بڑا تانکا غذائی طرح مسک جاتے۔ ڈپو کے جس اسٹور میں کبیل رکھے تھے وہاں نشیب قدر سات کا سارا پانی اسٹور کے اندر کسی نہ کسی طور داخل ہو گیا۔ کبیل عرصے تک اس میں پڑے رہے۔ منافع تو ایک طرف رہا لاگت نکلنے کے لالے پڑ گئے۔ دو ایک دالوں کو اس نے مار کھایا۔ وہ بازار میں نمونہ لے کر گئے اور چپ چاپ دکان پر لا کر ڈال گئے۔ کوئی کوڑیوں کے مول بھی کبیلوں کو لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نیاز کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔

وہ ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ چند ہی روز میں اس کا چہرہ مر جھا گیا۔ پیشانی پر سیاہ لکیریں ابر آئیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں ایک روز وہ گھر پہنچا تو خلاف معمول بیوی کو دالان میں نہ پا کر اسے تعجب ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سہ پہر سے اس کی طبیعت گڑبڑ ہے۔ وہ اس وقت کمرے میں لیٹی تھی۔ نیاز نے جا کر دیکھا۔ تیز بخار تھا۔ حرارت سے چہرہ متملر ہوا تھا۔ آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ بیوی کے سر ہانے کھڑے کھڑے نیاز نے سوچا کہ اب اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا ہے جس پر وہ عرصہ دراز سے غور کر رہا تھا۔

بظاہر اس نے بیوی سے دل جوئی کی باتیں کیں اور تسلی دے کر ڈاکٹر موٹو کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر مطلب بند کر کے جانے ہی والا تھا۔ اس وقت کوئی مریض موجود نہ تھا۔ کپاڈنڈر بھی جا چکا تھا۔ دونوں نے تنہائی میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کیں۔

معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ اب نیاز کو معاہدے کے مطابق ایک ہزار روپے پیشگی ادا کرنا تھے۔ نئے مہیا کرنا فی الحال اس کے لیے مشکل تھا۔ ان دنوں اس کا سارا سرمایہ کبیلوں کے علاوہ دو ایک اور سودوں میں بھی پھنسا ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کچھ مہلت چاہی تو اس نے بڑے رد کھے پن سے کہا۔

”نہیں بھی پیشگی رقم پہلے ملنی چاہیے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہوگا۔“

اس انکار پر نیاز سمٹ پنا کر رہ گیا۔ اس نے ڈاکٹر کو اپنی مالی پریشانیاں بتائیں۔ منت ساجت کی تو

مسکراتے بہت جاتے۔ نشیب بھرائی۔ لالے پڑنا۔ مشکل ہونا۔ کوڑیوں کے مول: کم قیمت پر۔ دل جوئی: تسلی۔ شہنا: پریشان ہونا۔

”اوہو! آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ آپ کے پروگرام سے تو مجھے فیصد اتفاق ہے۔ لیکن جس طرح آپ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اس سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔“

بھی آپ لوگوں نے میری تجویز پر معلوم ہوتا ہے جذباتی انداز سے غور کیا ہے۔ ورنہ اسے منظور کرنا بڑی عجیب سی بات لگتی ہے۔“

صفر بشیر نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس سے قبل فہیم اللہ بول پڑا۔ ”خان بہادر صاحب! آپ تجویز کے ہر پہلو پر اجلاس میں غور کیا گیا اور جو فیصلہ ہو چکا ہے، اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔“

”صاحب! بات کچھ میری سمجھ میں آئی نہیں۔“ خان بہادر نے بے زاری سے منہ کاٹا۔

فہیم اللہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خان بہادر کو دیکھا اور کسی قدر تنکھے لہجے میں بولی۔

”معاف کیجئے آپ کی سمجھ میں یہ بات ابھی نہیں نکستی۔ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے طریقے بنیادی فرق ہے۔“

خان بہادر کی پیشانی پر بل آگیا۔

فہیم اللہ کی بات اسے سخت ناگوار گزری۔ ذرا دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے چک اٹا۔ اطمینان سے بریف کیس میں رکھا اور شگفتہ مزاجی کے اظہار کے طور پر زبردستی مسکرا کر گویا بول۔

”بھی! آپ لوگ ماشاء اللہ نوجوان ہیں۔ تازہ خون ہے۔ اب یہ آپ کی مرضی، میری بات مانیں یا نہ مانیں۔“

وہ زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ چند ہی منٹ بعد اٹھ کر چلا گیا۔

(۵)

نیاز ان دنوں سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ ہوا یہ کہ ملٹری ڈپو سے ڈسپوزل کا کچھ سامان نکالنے کے نیلام میں وہ بھی گیا۔ اس میں ادنی کبیلوں کی ایک بڑی لاٹ تھی۔ بولی خلاف توقع اونچی گئی۔ گھر سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اسے یہ لاٹ خریدنا ہے۔ وہ بولی بڑھاتا چلا گیا۔ اٹھارہ ہزار میں پوری لاٹ اس کے نام چھوٹ گئی۔

وہ ذرا نرم پڑا اور بڑی مشکل سے مہینہ بھر کی مہلت دی۔ مگر ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وقت پر نہ ملی تو وہ انجکشن لگانا بند کر دے گا۔

نیاز اسی وقت ڈاکٹر موٹو کے ہمراہ گھر آیا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کی نبض دیکھی۔ ٹپر پمپ تشریش کی قطعی کوئی بات نہ تھی۔ موسمی بخار تھا۔ دو ایک روز میں علاج معالجے کے بغیر صحت یاب ہو جاتی۔ مگر ڈاکٹر نے ایک عجیب و غریب بیماری کا نام لے کر مرض کو پیچیدہ اور خطر بنایا۔ اس کی تشخیص کے مطابق مریضہ کا جگر بالکل خراب ہو چکا تھا اور آنتوں میں زخم پڑ گئے اس نے مریضہ کے سامنے ہی نیاز کو مشورہ دیا کہ علاج پابندی سے ہونا چاہیے ورنہ جان کا خطرہ علاج کے لیے اس نے انجکشنوں کا کورس تجویز کیا۔ پہلا انجکشن اسی وقت لگایا اور مریضہ کو ہارہ کہ پانی کم پیئے۔ غذا میں نمک کا استعمال زیادہ کرے اور جسمانی مشقت سے پرہیز کرے۔

دو تین روز میں سلطانہ کی ماں کا بخار اتر گیا۔ طبیعت سنبھلنے لگی۔

ڈاکٹر موٹو ہر چوتھے روز آکر خود اپنے ہاتھ سے انجکشن لگاتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مریضہ طبیعت کچھ عرصہ تک ٹھیک رہی۔ لیکن اچانک پھر بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے کچھ پیینٹ دوایں کیں جن سے کسی قدر افادہ ہو گیا۔

مگر وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے سخت مشقت کی عادی تھی۔ ڈاکٹر نے کرنے کے باوجود گھر کے کام کاج میں دلچسپی لیتی۔ لیکن ذرا سا جسمانی کام کرنے کے بعد سانس پھول جاتی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا۔ وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑتی۔ دیر تک طبیعت میں نہ آتی۔

ایک روز اس نے دبی زبان سے اپنی بگڑتی ہوئی حالت کا نیاز سے تذکرہ کیا۔

وہ خفگی سے بولا۔ ”تم کو وہم ہو گیا ہے۔“

”آپ کو کیا پتہ میری کیا حالت ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ ڈاکٹر کیسا علاج کر رہا ہے۔“

سنبھلنے کے بجائے دن بدن گرتی جا رہی ہے۔“

”تم ہمیشہ کی شکلی ہو۔ ہر وقت الٹی سیدھی باتیں سوچا کرتی ہو۔ مجھے تو کہیں سے نہ حالت بگڑتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ پہلے سے اب صحت اچھی ہے۔ یوں وہم کا علاج تو

ان کے پاس بھی نہیں تھا۔“

”زوج ہو کر بولی۔“ میں کیسے بتاؤں کہ میری کیا حالت ہے؟“

نیاز غصے سے آنکھیں نکال کر چیخا۔ ”تو پھر خیراتی اسپتال چلی جاؤ۔ تم کو تو وہیں کے علاج سے آرام ملے گا۔“

لحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دیکھو آج کل میں یوں ہی ایک جگر میں پھنسا ہوا ہوں۔ تم خواہ مخواہ مجھے پریشان نہ کرو۔ ورنہ کہیں اپنا منہ کالا کر کے چلا جاؤں پھر بیٹھی جس سے چاہے علاج کرائی رہنا۔“ اس کی دھمکی سن کر وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

نیاز تھوڑی دیر بیٹھا غصے سے بڑبڑاتا رہا۔ پھر اٹھ کر گھر سے باہر جانے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر جھجھلاہٹ تھی۔ وہ بار بار انگلیوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا۔ اسے جاتے دیکھ کر بیوی نے ٹوکا۔

”اتنی رات گئے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

وہ جھلا کر بولا۔ ”جہنم میں!“

وہ اٹھ کر اس کی جانب بڑھی۔ ”آپ کو میری قسم جو گھر سے باہر گئے۔“

نیاز کے قدم دروازے تک پہنچتے پہنچتے سست پڑ گئے۔ وہ اس کے قریب پہنچی اور بازو تھام کر لمبے لمبے آئی۔

نیاز روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر بستر پر لیٹ گیا۔ بیوی سرہانے بیٹھی دیر تک اس کا رہائی رہی۔

اس واقعے کے بعد اس نے نیاز سے اپنی گرتی ہوئی صحت کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ علاج کا سلسلہ جاری رہا۔

انجکشن لگتے رہے اور اس کا جسم سرسوں کی طرح پیلا پڑتا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے دل اندر غلامی بیٹھا جا رہا ہے۔

اس کا دم بولا جاتا اور اختلاجی کیفیت طاری ہو جاتی۔

نہایت ہی بوجھ میں آتا: گھبرا کر دم بخود / خاموش ہو جاتا: دم بولا: جی گھبرا نا: وحشت ہونا: اختلاجی کیفیت: بے چین ہونا: حالت



علاج کرتے ہوئے چوتھا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ نیاز کو ڈاکٹر کی رقم کی فکر تھی۔ وہ ایک روپے دے تو سکتا تھا مگر اتنی رقم نکل جاتی تو اس کی دکان ٹھپ ہو جاتی۔ ان دنوں وہ دوڑوڑا رہا تھا۔ روپے کے لوٹ پھیر سے کاروبار چلا رہا تھا۔ نیاز کی پریشانی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ رہ رہ کر سوچنے ڈاکٹر نے انجکشن لگانا بند کر دیئے تو بہت برا ہو گا۔ پر بیم کی یہی قسط جو اس نے کئی ہزار روپے صورت میں انشورنس کمپنی کو ادا کی تھی، ڈوب جائے گی۔ بغیر انجکشنوں کے سینے کی پالیسی پا رکھنا فضول تھا۔

وہ اسی ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ خان بہادر فرزند علی کی فرم کا کارندہ ایک شام نیاز کے آیا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ خان بہادر کو کسی دلال کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ نیاز کے خاصی بڑی تعداد میں کمبل موجود ہیں۔ خان بہادر کمبلوں کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہے۔

دوسرے ہی روز وہ خان بہادر فرزند علی سے خود ملا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ شاندار دفتر میں بیٹھا اس نے نیاز کو نہایت پر تکلف چائے پلائی۔ پاس رکھی ہوئی فائل کھول کر ٹائپ کیا ہوا کاغذ نکالا اور نیاز کو دکھا کر بولا۔ ”میرے پاس پانچ ہزار کمبلوں کی سپلائی کا یہ مرا آرڈر ہے۔ اگر معاملہ پٹ جائے تو آپ کا سارا اشاک ٹکڑا دوں گا۔“

نیاز نے فوراً کہا۔ ”تو پھر سوچنا کیا ہے۔ کچھ ایسا بھاولگادیتے کہ مجھے بھی دو پیسے مل جائے میں سارا مال دینے کو تیار ہوں۔“

خان بہادر نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”دیکھئے میں کمبل خود نہیں خریدوں گا۔ آپ کا میرے توسط سے جائے گا۔ ریٹ طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے ٹینڈر میں دس فی کمبل کا ریٹ دیا تھا۔ گورنمنٹ نے وہ ریٹ منظور کر کے سپلائی کا آرڈر جاری کر دیا ہے۔“

نیاز کی سمجھ میں خان بہادر کی پوری بات نہ آئی۔ ”حکومت تو آپ کو دس روپے فی کمبل حساب سے پے منٹ کرے گی۔ مگر آپ مجھے کیا دیں گے؟“

خان بہادر کو مزید وضاحت کرنا پڑی۔ ”دیکھئے اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے میں آپ سے کمیشن لوں۔ مگر میں کمیشن پر سودا کرتا نہیں چاہتا۔ میری شرائط یہ ہوں گی کہ

دکان ٹھپ ہو جاتی۔ مراد دکان کا کام سناڑ ہوتا۔ کارندہ ملازم۔ خندہ پیشانی سے۔ خوش اخلاقی سے۔ معاملہ پٹنا۔ معاملہ طے ہونا۔

پلائی سے جو منافع ہو گا اس کے تین حصے دار ہوں گے۔ میرا اور آپ کا چالیس چالیس فیصد کا برابر کا حصہ ہو گا۔ بیس فی صد کا حصہ دار وہ سرکاری افسر ہو گا جس کے ذریعہ یہ ٹینڈر منظور ہوا ہے اور جس سے آئندہ سپلائی میں بھی مدد ملے گی۔ اب جیسا آپ مناسب سمجھیں وہ طے کر لیں۔“

نیاز نے سوچا سودا تو بہت اچھا ہے۔ کئی ہزار روپے سیدھے سیدھے بچتے تھے۔ اس کے لیے تو کمبلوں کو نکالنا ہی ایک مصیبت تھی۔ کہاں اتنا بڑا منافع۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی خوشی پر قابو پالے چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ”مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے اور کوئی شرط ہو تو وہ بھی بتا دیجئے۔“

خان بہادر نے ہنس کر کہا۔ ”یہی بنیادی شرط ہے اور کوئی چھوٹی موٹی قانونی شرط ہوئی، وہ ہم معاہدے کرتے وقت طے کر لیں گے۔“

نیاز کو بڑی مسرت تھی کہ اتنا اچھا سودا اس قدر آسانی سے طے ہو گیا۔ دونوں نے سپلائی کے متعلق کچھ کاروباری باتیں کیں اور یہ طے کیا کہ جلد ہی ہی معاہدہ کر لیا جائے۔ نیاز گھر واپس آ گیا۔ اس روز وہ خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت جو غبار چھایا رہتا تھا فرغ ہو گیا۔

چند روز بعد معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ سرکاری افسر کے حصے کا اس میں تذکرہ نہ تھا۔ اسے فراہمات کی فاضل مد میں ڈال دیا گیا۔ نیاز نے معاہدے کی نقل لے کر جیب میں رکھی تو کچھ ایسا لگس ہوا جیسے اس کی جیبیں نوٹوں کی گڈیوں سے بھر گئیں ہیں۔ اس وقت خان بہادر اسے بھلا اُس اور فرشتہ خصلت معلوم ہوا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ خان بہادر چاہتا تو اس کی مجبوری سے ہاروا فرما کر اٹھا سکتا تھا۔ اصل لاگت سے بھی کم قیمت پر کمبل خرید کر اچھی رقم پیدا کر سکتا تھا۔

اس سپلائی کی نوعیت یہ تھی کہ شدید بارشوں کے باعث پنجاب اور سندھ میں زبردست لونی آگئی تھی۔ سیلاب سے بستیاں اجڑ گئیں۔ لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔ ہر طرف وبائی امراض پھیل گئے۔ لوگ دھڑا دھڑ پیار پڑ رہے تھے۔ حکومت نے ان کی امداد کے لیے جگہ جگہ ریلیف کیپ لول دیئے تھے۔ سیلاب زدگان کے لیے جن اشیاء کی فوری ضرورت تھی، ان میں کمبل بھی شامل تھے ان کی سپلائی کے لیے ٹینڈر طلب کئے گئے۔ ریلیف کمیٹی کا جو افسر ٹینڈر منظور کر رہا تھا، اس سے خان بہادر کے مراسم نکل آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں بات کچھ اس ڈھب سے چلی کہ اسی وقت

نیاز نے غلطی نہ ہو، ختم ہونا۔ فاضل مد: مراد دیگر اخراجات۔ بھلا مانس: شریف۔ فرشتہ خصلت: فرشتوں جیسی عادت۔ مراد فیصل کیس: محکمہ کے کیس۔ مراسم: میل جول۔ ڈھب: طریقہ، انداز۔

معاملہ پٹ گیا۔

نار نے اپنی مالی پریشانیوں کے باعث اب تک اس کی حالت پر زیادہ توجہ نہ دی تھی۔ اب جو

لے فور سے دیکھا تو اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔

وہ اسے بد صورت اور کھٹ معلوم ہوئی۔

اس نے نفرت سے سوچا۔ اب تو اس عورت کو مر ہی جانا چاہیے۔ یہ مرجھایا ہوا مرل جسم

اس کے لیے بالکل ناکارہ ہو چکا ہے۔

اس نے قریب بیٹھی ہوئی سلطانہ کو دیکھا۔ اس کے گداز جسم کا ایک ایک خم پھڑک رہا تھا۔

اس کے چہرے پر ایک خاص دل کشی تھی۔

بے خیالی میں ایک بار سلطانہ نے نظریں اٹھا کر نیاز کی جانب دیکھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کنول

طرح کل گئیں۔ وہ اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ آہستہ سے دریافت کیا۔

”کیسی طبیعت ہے؟“

”اچھی خاصی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔“

”شام کو نہائی ہوں گی۔“ نیاز نے قیاس آرائی کی۔

سلطانہ نے فوراً تردید کی۔ ”جی نہیں۔ انہیں تو اکثر ایسا ہی دورہ پڑتا ہے۔ کبھی ہیں، سینے میں

بلب ہوتی ہے۔“

نار نے مزید گفتگو نہیں کی۔

وہ فوراً گھر سے نکل کر سیدھا ڈاکٹر موٹو کے پاس پہنچا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں مجرمانہ

لمحہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ تاخیر کے لیے معذرت کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

”ڈاکٹر صاحب سال بھر کے بجائے پہلے ہی معاملہ صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا مگر تم راضی نہ ہوئے۔ یوں بھی دیر کرنے میں خطرہ ہے۔“

نیاز اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! جیسی آپ کی مرضی۔ میں اب اس

لمحے تک کچھ نہیں بولوں گا۔“

اس روز ڈاکٹر نے مریضہ کی حالت کے بارے میں اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ کچھ ضروری

بات بھی دیں جن پر عمل کرنے کے لیے وہ بار بار تاکید کرتا رہا۔

غلام نبی مدنی کا خیال کا اعتبار کیا۔ تردید: انکار، نفی۔

خان بہادر اور نیاز دونوں معاہدہ ہو جانے کے بعد اپنی اپنی جگہ بہت مطمئن تھے۔ لیکن

منظوری کے لیے نمونے کا کسبل بھیجا گیا تو کچھ عرصے کے لیے وہ پریشانی میں ضرور پڑ گئے۔ اس

کہ اگر نمونہ مسترد ہو جاتا تو ان کا سارا پروگرام ریت کے محل کی طرح بیٹھ جاتا۔ لیکن نمونہ

نا منظوری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جو افسر اسے منظور کر رہا تھا اس کا سپلائی میں بیس فیصد مبالغہ

چنانچہ فوراً ہی نمونے کی منظوری آگئی اور مال سپلائی ہونا شروع ہو گیا۔

گلے ہوئے بوسیدہ کسبل نیاز کی دکان سے نکل کر ریلیف کیمپوں میں پہنچنے لگے اور پھر

حال سیلاب زدگان میں تقسیم کر دیے جاتے۔

ہفتہ بھر کے اندر سپلائی کا کام ختم ہو گیا۔

پندرہ روز بعد خان بہادر نے اپنے اثر و سونخ سے بل منظور کرالیا۔ کسبلوں کا سارا

وصول ہو گیا۔ اصل رقم اور خرچ نکال کر ۲۵ ہزار کا منافع ہوا۔ دس دس ہزار روپے خان بہادر

نیاز نے لے لیے اور پانچ ہزار روپے معاہدے کی رو سے ریلیف کمیٹی کے متعلقہ افسر کو پہنچا دیے

جس نے ٹینڈر کے ساتھ نمونہ بھی منظور کیا تھا۔

\*\*\*

اس روز نیاز بے حد خوش تھا۔

اس نے بازار سے مٹھائی اور پھولوں کے گجروں کے علاوہ بیوی کے لیے بھی کئی سوا

خرید اور مسرت سے جھومتا ہوا گھر کی جانب چل دیا۔ گھر میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ چو

پر آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔

قریب ہی سلطانہ بیٹھی تھی۔

نیاز نے نزدیک جا کر دیکھا۔ بیوی دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچے بے سدھ لیٹی تھی۔

رنگ لیمپ کی روشنی میں ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے

رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کے نشانات تھے۔ چہرے کی کھال کا تناؤ کم ہو گیا تھا

وقت وہ خاصی سن وراز نظر آرہی تھی۔

بے سدھ: بیہوش۔ سن وراز: زیادہ عمر کی۔



بادی ہے۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ دونوں اسکاٹی لارک بھی چکر اگئے۔ یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ مسجد کس نے بنوائی؟ کیوں بنوائی؟ اب افقی سرحدوں پر روشنی پھیلنے لگی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دن کی آمد آ رہی تھی۔ بستی دھوپ آہستہ آہستہ بلند یوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ بستی میں ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے کام دھندے پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان تینوں کو چار دیواری کے قریب حیرت کے عالم میں کھڑے دیکھ کر کچھ لوگ ادھر بھی آگئے۔ مسجد دیکھ کر وہ بھی اچنبھے میں پڑ گئے۔

## فصل ہفتم

(1)

ایک بوڑھا بولا۔ ”دس بجے جب میں دکان سے لوٹا تو میدان بالکل صاف تھا۔ رات بھر میں نہ ہانے کس نے مسجد کھڑی کر دی۔ اللہ میاں نے فرشتے بھیجے ہوں گے اور تو سمجھ میں کچھ آتا نہیں۔“  
 فوراً ہی اس کے برابر کھڑا ہوا شخص گویا ہوا۔ ”یار نبی جان، تو بھی کمال کرتا ہے لو بھی آج تک ذہن نہ سنا نہیں کہ فرشتے آکر مسجد بنائے۔ یہ تو کچھ اور ہی پتھر معلوم ہوتا ہے۔“  
 ”وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی اثنا میں برابر والی گلی سے ایک شخص تہ بند رات کرتا ہوا نکلا اور ان لوگوں سے کہنے لگا۔ ”اب کیا دیکھ رہے ہو۔ رات کو دیکھتے یہاں کیا ہوا تھا۔“ اس نے سڑک کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”وہاں تین چار ٹرک کھڑے تھے۔ ان میں سے سامان نکال نکال کر دبا دبا دیواریں کھڑی کی جا رہی تھیں۔“  
 ”یہ کسے بجے رات کی بات ہے جی؟“  
 ”میں کارخانے سے واپس آ رہا تھا۔ تین بج رہا ہو گا۔ اماں خدا جھوٹ نہ بلوائے پچاسیوں آدمی ماہر تھا۔“

”تو یار میرے تو نے ان سے پوچھا تو ہوتا۔“  
 ”میں تھکا ہارا آ رہا تھا میں نے کہا نہ جانے بھی یہاں کیا ہو رہا ہے؟“  
 ”تو ان تو فخر کی میں نے بھی سنی تھی اور اماں نے تو نمازیوں کو بھی مسجد سے نکلنے دیکھا تھا۔ مگر اچھا کہ اپنے نکلے کا تو اس میں کوئی تھا نہیں۔ نہ جانے کون لوگ تھے؟“  
 ”یار واللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔“  
 ”ہاں مگر ایہ سب اس کی قدرت کے کرشمے ہیں۔“

سرما کی کھر آلود رات تھی۔ دس بج چکے تھے۔ کانفرنس روم میں تمام اسکاٹی لارک موجود تھے۔ فلک پیا کا ماہانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے تنظیم کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ کے بعد اسپتال کی تعمیر کے منصوبے پر بحث شروع ہوئی جسے بعض ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا۔ اسپتال کی تعمیر کے لیے جو گروپ بنایا گیا اس میں سب ہی اسکاٹی لارک شریک تھے۔ گروپ کا سربراہ محمد علیم تھا۔ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں کچھ عرصہ کام کر چکا تھا۔ تعمیر کے کاموں اسے عملی تجربہ تھا۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ سب سے پہلے محمد علیم پلاٹ کا سروے کرے گا۔ نقشہ بنوائے گا اور جب یہ کام ہو جائے تو مکدالیں، نیلچے اور ایسا ہی دوسرا ساز و سامان کرائے پر لے جائے اور اسکاٹی لارک خود اسپتال کی نیو کھودنا شروع کر دیں۔

دوسرے روز محمد علیم دو اسکاٹی لارکوں کے ساتھ سویرے ہی سویرے پلاٹ کا سروے کرنے گیا۔ مگر یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ پلاٹ کے گرد قد آدم چار دیواری موجود تھی۔ ایک شے ٹین کا سا تان تھا۔ مشرقی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس پر ایک بورڈ آویزاں تھا۔ بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ ”نورانی مسجد۔“

محمد علیم نے سوچا شاید غلطی سے کسی دوسری جگہ آ گیا ہے۔ مگر جب اس نے دونوں لارکوں کے ہمراہ گھوم پھر کر معائنہ کیا تو یہ عقدہ کھلا کہ کسی نے اسپتال کی زمین پر راتوں

مندر بشیر گھبرا کر بولا۔ آپ کے پاس وفد آیا ہے؟“

”جی ہاں میں نے عرض کیا تھا کہ وہ تو صبح سے یہاں موجود ہے۔“

”تو پھر ایسا کیجئے کہ آپ ان لوگوں کو میرے پاس بھیج دیں۔ اس وقت فلک پیکا کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ہم اسی مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی موجودگی میں مسئلے کو سلجھانے میں آسانی ہو جائے گی۔“

”میرا کہنا تو اب اس خیال کو ترک ہی کر دیجئے۔ اس لیے کہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ شہر کے تین علمائے دین سے مسجد کی تعمیر کے شرعی ہونے کا فتویٰ لیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ میں بھی ابھی وفد کے ہمراہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل کر آ رہا ہوں تاکہ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو خبردار کر دیا کہ نقص امن کا خطرہ ہے۔ لہذا اس نے پولیس کا پہرہ لگانے کا حکم دے کر لیا ہے۔“

اس دھمکی پر صدر بشیر کو سخت غصہ آیا۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ”مگر یہ ساری کارروائی کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔“

خان بہادر بڑے اطمینان سے گویا ہوا۔ ”بھئی وہ ہوا یہ کہ انہوں نے مجھے غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”بہر حال اس وقت تک جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا میں درخواست کروں گا کہ آئندہ اس مسئلے میں آپ دلچسپی نہ لیں تو مناسب ہو گا۔“ صدر بشیر نے مشورہ دیا۔

خان بہادر برہم ہو کر بولا۔ ”کیا کہا آپ نے؟ یعنی میں اس مسئلے میں دلچسپی نہ لوں۔ بات ذرا سوچا کچھ کر منہ سے نکالا کیجئے۔ واہ صاحب واہ! آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ یہ بھی خوب کہی۔ اجی آپ سے تو صرف صاحب سلامت ہی ہے۔ اگر میرا حقیقی بھائی بھی مجھ سے یہ بات کہتا تو بخدا میں اس کا نہ ٹوٹ لیتا۔ جناب یہ دینی معاملہ ہے۔ میں تو اس کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔“

انگدہ اپنے جذبہ ایمانی کے اظہار میں نہ جانے اور کیا کیا لہجے میں کرتا لیکن صدر بشیر نے اس کی بات کاٹ کر فوراً معذرت کی۔ ”معاف کیجئے آپ میری بات کا مطلب قطعی غلط سمجھے۔ میرا ہرگز مقصد نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔“

خان بہادر کے ہنسنے کی آواز ریسور میں سنائی دی۔ ”بھئی غلط اطلاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔“

ان لوگوں کا ایک وفد صبح سے میرے پاس بیٹھا ہے۔“

وہ سب اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ علیم کے لیے اب وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ وہ اسکاٹی لارکوں کے ہمراہ ہیڈ کوارٹر واپس آیا اور صدر بشیر کو فوراً اس واقعے کی رپورٹ دے دی۔ لارکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کسی کو بھی محمد علیم کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ صدر بشیر نے کیرلنگ کارٹنگی اور علی احمد کے ہمراہ صورت حال معلوم کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

واپس آ کر اس نے فلک پیکا کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اسکاٹی لارکوں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ محمد علیم کی اطلاع کی اس نے تصدیق کی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس سلسلے میں کیا کارروائی جائے۔ نوجوان اسکاٹی لارکوں میں بڑا جوش پایا جاتا تھا۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ جوش بول رہے تھے۔

صدر بشیر اور علی احمد پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے فریادیں دیکھا تھا، اس کی وہ ایک ایک تفصیل بتا چکے تھے۔ مگر اسکاٹی لارکوں کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ مسجد بنی کیسے اور کس نے بنوائی؟ اجلاس میں اچھا خاصا برپا ہو گیا تھا۔ اسی دوران کو انٹیلیجنس کے ایک ملازم نے صدر بشیر کو اطلاع دی کہ ٹیلیفون آیا ہے۔ بشیر نے جاکر ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف سے خان بہادر کی آواز ابھری۔

”میں خان بہادر فرزند علی بول رہا ہوں۔“

صدر بشیر نے پوچھا۔ ”مزاج تو اچھا ہے۔ فرمائیے اس وقت ٹیلیفون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”بھئی ایک بہت تازک مسئلہ سامنے آ گیا ہے۔“

صدر بشیر نے دریافت کیا۔ ”کیا مسئلہ آگیا؟“

خان بہادر کی آواز آئی۔ ”میں نے سنا ہے کہ جس زمین پر آپ اسپتال بنانا چاہتے تھے اہل محلہ نے مسجد تعمیر کر لی ہے۔“

”مجھے کے لوگ تو قطعی لا علمی ظاہر کر رہے ہیں۔ میں خود وہاں گیا تھا۔ آپ کو کسی نے اطلاع دی۔“

خان بہادر کے ہنسنے کی آواز ریسور میں سنائی دی۔ ”بھئی غلط اطلاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔“

”بہر حال آپ کا کچھ بھی مطلب ہو۔ ایک بات ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ مسئلہ بہت ہے۔ آپ لوگ تو اب اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں۔“

خان بہادر نے اپنا لہجہ کچھ نرم کیا۔ ”یہ میرا برادرانہ مشورہ ہے۔ پھر آپ لوگ بھی تو مسلمان ہیں۔ کچھ اپنے ایمان ہی کا پاس کیجئے۔ اسپتال تو حکومت بھی بنوا دیتی ہے۔ مجبور بنواتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کی حرارت اور اسلام کا سچا جذبہ ہوتا ہے۔“

صدر بشیر نے کسی جھنجھلاہٹ کا اظہار کئے بغیر جواب دیا۔ ”ہم کوشش کریں گے کہ رائے پر عمل کریں۔ آپ کے ان بیش بہا مشوروں کا بہت بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔“ اس نے رکھ دیا۔

کانفرنس روم میں واپس پہنچ کر اس نے صدر سے اجازت لی اور اسکائی لارکوں کو بتایا کہ ہوا ہے اس کے پیچھے خان بہادر کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ ٹیلیفون کی گفتگو سے اس نے یہی اندازہ تھا۔ پھر اس نے خان بہادر کی دھمکی سے بھی سب کو آگاہ کر دیا۔ اس کی ذاتی رائے اس سلسلے میں کہ فلک پیا کو خان بہادر کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا منہ توڑ جواب دیا کہ کئی جو شیے اسکائی لارکوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان میں سلمان بھی تھا۔ ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر رات بھر میں چار دیواری کھڑی کی جاسکتی ہے تو ایک ہی رات اسے مہار کر کے برابر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔“

فہیم اللہ نے، جو اسکائی لارکوں میں بڑا معاملہ فہم سمجھا جاتا تھا اور مزاج کے اعتبار سے جذباتی قسم کا نوجوان تھا، فوراً کھڑے ہو کر سلمان سے کہا۔

”استغفر اللہ، آپ مسجد شہید کریں گے۔“

فہیم اللہ کی اس بات پر سلمان کے آگ ہی تو لگ گئی۔ جھلا کر بولا۔ ”آپ اس گھر؟“ مسجد کہہ رہے ہیں۔ کل چند شر پسند فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو کر نماز پڑھنا شروع اور دروازے پر مسجد کے نام کا کتبہ لگوا دیں تو کیا آپ ان کے دعوے کو تسلیم کر کے اس ما دست بردار ہو جائیں گے؟ اسکائی لارک فہیم اللہ کو معلوم ہوتا چاہیے کہ قانون بھی کوئی؟

پاس: لحاظ۔ بیش بہا: قیمتی۔ مرعوب ہونا: رعب میں آنا۔ منہ توڑ: مبرا اور بھرپور۔ مہار کرنا: بگڑنا۔ معاملہ فہم: معاملات کو سمجھنے والا۔ سخت غصہ آنا: شر پسند: فساد کی دست بردار ہونا: الگ ہونا۔

اور اس کی خلاف ورزی جرم ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر کسی کی نجی ملکیت پر اس طرح قبضہ نہیں کیا جاسکتا۔“

فہیم اللہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”لیکن اس طرح لوگوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہونے کا اندیشہ ہے۔“

اسی وقت ایک اور اسکائی لارک نے کہا۔ ”اس کے علاوہ نقص امن کے پیش نظر پولیس کا بھی شاید لگ گیا ہے۔“

سلمان اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا۔ ”اگر یہ تجویز پسند نہیں تو ہم اس چار دیواری کے سامنے کھڑا ہونا چاہیں گے۔“ اس کی تائید میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

”یہ تجویز بالکل ٹھیک ہے۔“

”جو کہ ہڑتال بڑا موثر حربہ رہے گا۔“

فہیم اللہ ان کا جوش و خروش دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کی حمایت میں علی احمد اٹھ کر کھڑا ہوا۔

اس نے سلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے یہ بہت نازک مسئلہ ہے۔ اس میں جذباتی مائے کام نہیں چلے گا۔ اگر ہم نے بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم اٹھایا تو اس کے نتائج خطرناک بھی نکل سکتے ہیں۔ مجھے آپ کے جذبات کا پورا پورا احساس ہے۔ میں اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔ میرے ہاتھیں سب کچھ سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے۔ یہ ہماری خودداری کو چیلنج ہے۔“ لہجہ بھر کر وہ بولا۔ ”اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اس کا تعاون حاصل کریں۔ ہمارا ایک وفد شہر کے اعلیٰ حکام سے ملے۔ ان کو صورت حال سے آگاہ کر کے مناسب کارروائی کا مطالبہ کرے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا بھی اندازہ لگانا چاہیے کہ ان کے لوگوں کا اس سلسلے میں کیا رد عمل ہے۔ ان کی ہمدردی اور تعاون حاصل کئے بغیر ہماری نمائندوں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔“

علی احمد کا سلیکھا ہوا انداز بیان، اس کی شخصیت کا دبہ اور صورت حال کا تجزیہ، ان سب باتوں نے اسکائی لارکوں کو خاصا متاثر کیا۔ ان کے چہروں پر مشتعل جذبات کے بجائے سنجیدگی

لہجہ: ہلکا سا تکیہ: حمایت۔ موثر: اثر کرنے والا، کامیاب۔ حربہ: ہتھیار، مبرا طریقہ۔ دبہ: رعب۔

چھانے لگی۔

کمرے میں ذرا دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر اسکاٹی لارک علی احمد کی تجویز پر کر رہا تھا۔

آخر جب انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو سب علی احمد سے متفق تھے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ سلمان کو ہدایت کی گئی کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ بستی کے لوگوں کا رد عمل کیا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو کس انداز سے دیکھ رہے ہیں؟

\*\*\*

رات کے آٹھ بجے سلمان بستی میں پہنچا۔ تعلیم بالغاں کے مرکز میں کلاس کو سبق پڑھا۔ جب پڑھائی سے فراغت ہو گئی تو اس نے سب کو روک کر کہا۔

”مجھے آپ لوگوں سے آج کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ملک میں اس علاقے میں ایک اسپتال تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے ہم نے زمین بھی حاصل کر لی ہے۔ آپ سب نے مل کر اسے خالی کرانے میں ہماری مدد بھی کی تھی۔ مگر اس پر کچھ لوگوں نے راز

رات ایک گھر وندنا کر مسجد کا نام دے دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ اسپتال نہ بنے۔ ورنہ ہی بنائی تھی تو کسی اور جگہ بھی بنائی جاسکتی تھی۔ اسپتال کی زمین پر اس طرح ناجائز قبضہ کرنا مقصد، آپ ہی بتائیے اور کیا ہو سکتا ہے؟“

اس نے سب پر ناقدانہ نظر ڈالی اور ان سے سوال کیا۔ ”میں آپ لوگوں سے یہ دریافت چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ظاہر ہے کہ اس مسئلے کا تعلق آپ سب سے ہے۔ یہ اسپتال آپ ہی لوگوں کے علاج معالجے کے لیے تعمیر کیا جا رہا ہے۔“

فورا ہی کئی آوازیں ابھریں۔

”یہ ضرور کسی نے بد معاشی کی ہے۔“

”یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اس میں یہاں کے رہنے والوں کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ تو سب

کے لوگوں کا کیا دھرا ہے۔“

”یہ چودھویں صدی ہے جی۔ ہمارے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ چودھویں صدی میں جو کچھ

چلے چورس کی طرح مسجد بنا ڈالی۔ سالوں نے خدا کے گھر کو بھی مذاق بنا ڈالا۔“

”نہیں جی اس کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔“

”ہاں جی یہ تو بہت واہیات حرکت ہے۔“

ان باتوں سے سلمان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک ان سے اسی موضوع پر گفتگو

کر رہا۔

اسکول سے باہر آکر اس نے دیکھا کہ چوراسے پر کئی گیس بتیاں روشن ہیں۔ ان کی تیز روشنی میں بہت سے لوگ فرش پر بچھی ہوئی دریوں پر بیٹھے ہیں۔ جلسہ غالباً ذرا ہی دیر قبل شروع ہوا تھا۔

وہی طرف چلا گیا۔

قریب جا کر دیکھا۔ لمبی ڈاڑھی والا ایک مولوی تقریر کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی کرسی پر خان

ہادر شیر والی پہنے، جناح کیپ لگائے، بڑی آن بان سے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ جلسے کی صدارت کر رہا تھا۔ سلمان کے ساتھ اس کے شاگرد بھی تھے۔ پانچ چھ سو افراد کا اجتماع تھا۔ مولوی ان سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تو بھائیو! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ بہت بڑی بات ہے۔ جی ہاں ایک بڑی بات ہے۔ ایک زندگی تو کیا اگر ایک ہزار زندگیاں بھی نصیب ہوں تو خانہ خدا کی حفاظت کے لیے قربان ہو سکتی ہیں۔ وہ کانپور والی مسجد کا واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا کانپور کے غیور مسلمان

اسے کفن باندھ کر نکل آئے۔ جام شہادت نوش کرنے والوں کا یہ عالم تھا کہ ایک گرتا تھا دس بیٹھے تھے۔ اللہ اللہ کیا مسلمان تھے اور یہ مسجد شہید گنج کا واقعہ توکل کی بات ہے۔ جن کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن تھی وہ یوں سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے کہ گولی چلانے والوں کے ہاتھوں میں

دھڑا آجاتا۔ کیا شان تھی ان مومنوں کی۔ دست قاتل بھی ہیبت سے لرزتا تھا۔ آج بھی کچھ لوگ آپ کے ایمان کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ کے جذبہ ایمانی کی آزمائش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مسجد کو شہید کرنا چاہتے ہیں۔ خانہ خدا کو نعوذ باللہ ڈھانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس مسجد کو شہید ہو جانے دیں گے؟ کیا آپ کا ایمان اس کو گوارا کر لے گا؟“

یہ کہہ کر وہ رک گیا اور حاضرین جلسہ کی جانب دیکھنے لگا۔ اچانک بہت سی ملی جلی آوازوں کا

صوت بلند ہو گیا۔ فورا ہادر شیر والی، بکچی، ہیبت، خوف۔

جب وہ سوچتے سوچتے اس انتہا تک پہنچا تو اے فلک پیاسا سرِ مسخر اپن اور اسکا ئی لارک احس  
اور پھر معلوم ہونے لگے۔  
نیز آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹپلنے لگا۔ اس وقت وہ  
خفا خاس کے ساتھ جو دوسرا اسکا ئی لارک مقیم تھا وہ اپنے کسی بیمار رشتہ دار کی عیادت کے لیے گیا  
تھا اور اب تک لوٹا نہ تھا۔

کرے میں اندھیرا تھا اور باہر گلابی جاڑوں کی شفاف چاندنی پھیلی تھی۔ سلمان در پیچے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا نرم اور پرسکون تھی۔ اس میں آغازِ بہار کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک تھی۔ چاند ایک اونچی عمارت کی منڈیر کے پیچھے سے ابھر رہا تھا۔ شبنم سے بھیکے ہوئے درختوں پر اس کی روشنائی میں جھلملا رہی تھیں۔ رات مسکرا رہی تھی اور سلمان کا دل افسردہ تھا۔

وہ ٹھنکی باندھے خوابناک نظروں سے جاگتی ہوئی رات کے دلاویز حسن کو دیکھتا رہا۔ اسی عالمِ محاسن سلطانہ یاد آگئی۔ وہ سیاہ آنکھوں والی دو شیزہ جو اس کے کندھے پر سر ٹکا کر رو پڑی تھی جسے گلہ بیا کی طوفانی سرگرمیوں میں وہ فراموش کر چکا تھا۔ اس نے سوچا نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟ کیا کہتی ہوگی؟ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے، کیسی ہے؟ وہ دیر تک سلطانہ کے حلق سے ہنستا رہا۔

سفرِ ہندوستان کی، ہمیں مذاق۔ چھو: آلو، بیوقوف۔ دریچہ: کھڑکی۔ منڈیر: کنارہ۔ دلاویز: دل کو بھانے والا۔

”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔“

سلمان نے گھبرا کر دیکھا۔ شور مچانے والوں میں اس کے شاگرد بھی شامل تھے۔ وہ اس قریب ہی بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے غضب ناک ہو رہے تھے۔ گردن کی رگیں تپتی ہوئی قبر مولوی پھر تقریر کرنے لگا۔

”برادران اسلام! آپ کو خان بہادر فرزند علی صاحب کا ممنون ہونا چاہیے جن کی کوشش سے یہ مسجد تعمیر ہوئی۔“ اس نے برابر بیٹھے ہوئے خان بہادر کی طرف اشارہ کیا۔ خان بہادر انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا سر ڈر اساجھکا لیا۔

”باری تعالیٰ نے ان کو دولت اور عزت کے ساتھ ساتھ ایک ایمان بھرادل بھی عطا کیا۔ اب ان ملعونوں کو دیکھئے جو ان پر طرح طرح کے الزام لگا کر بدنام کر رہے ہیں۔ اس مسجد کو کرنے کے درپے ہیں۔ آپ ان کو بتادیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت ابھی باقی ہے۔ وصال کیا، ہم راہ خدا میں سر بھی کٹا سکتے ہیں۔ سینوں کو گولیوں سے چھلنی کر سکتے ہیں۔“ حاضرین جوش میں آ کر نعرہ تکبیر بلند کیا۔

”اللہ اکبر۔“

”اللہ اکبر۔“

ساری بستی نعروں کے شور سے گونج اٹھی۔ مسلمان نے غور کیا کہ اس کے برابر بیٹھے لوگوں کے چہرے دپکنے لگے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ و فور جذبات سے مٹھیاں پٹتی تھیں۔ اس نے بدحواس ہو کر سوچا کہیں جذبہ ایمانی سے سرشار ہو کر اس کے شاگرد ہی اس کی امر نہ شروع کر دیں۔ اس نے خیریت اسی میں دیکھی کہ چپ چاپ جلسے سے اٹھ کر کھسک جائے۔ وہ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت اداس اور دل گرفتہ تھا۔ اس نے صفدر بشیر کو تمام باتوں کی اطلاع دی اور تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ یہ رات اس نے بڑی بے چینی اور دکھ میں بسر کی۔ خیال آتا کہ جن کی بھلائی اور بہتری کی خاطر اس کا لارک اپنی ہر مسرت توجہ کر جفا کشی کی زندگی

اکھلاری: عاجزی۔ دل گرفتہ: اداس، رنجیدہ۔ تہج کر: مراد چھوڑ کر۔

دوسرے روز، دوپہر سے کچھ پہلے وہ نیاز کی دکان کی جانب گیا۔ دکان پر تالا لگا تھا اس قریب کے چائے خانہ میں ایک پیالی گرم چائے پی اور رستوران سے نکل کر اس گلی میں داخل ہوا جو نوشا کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اس روز وہ گلی اسے کچھ اجنبی سی معلوم ہوئی۔ گلی سے گزرتے ہوئے اسے نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نوشا کے گھر کے سامنے پہنچا وہی نچی چار دیواری۔ وہی کچیریل کی چھت اور کبڑوں کی طرح جھکا ہوا شیشم کا پیڑ۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔

نوشا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھکرا۔ فوراً ہی اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ آگے چلا گیا۔ گلی میں بہت دور تک جانے کے بعد کچھ سوچ کر واپس آ گیا ایک بار پھر وہ نوشا کے دروازے پر تھا۔ اس بار بھی وہ چپ چاپ دہانے گزر گیا۔ یہ عجیب سا خوف تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ اس کا دل ہر بار زور سے دھڑکتا۔ طرح طرح کے دوسوے پیدا ہوتے۔

جب وہ تھکا ہوا سا گلی سے نکل کر سڑک کی جانب مڑ رہا تھا تو اچانک نیاز سے آنا سامنا ہوا۔ مسلمان نے چاہا کہ اس کی نظر بچا کر چپکے سے گزر جائے۔ مگر نیاز نے اسے دیکھ لیا۔ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔ ”اوہو! مسلمان صاحب ہیں۔ بھئی آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ کہاں رہے اتنے دنوں؟“ مسلمان سوکھا سامنا بنا کر بولا۔ ”کچھ دنوں کے لیے گھر چلا گیا تھا۔“ ”جیسی میں نے کہا کہ یکا یک کہاں غائب ہو گئے۔ خیریت تو ہے؟ کہیں نوکری دو کر لی؟“

”ہی؟“

”نی الحال تو تعلیم شروع کرنے کا ارادہ ہے۔“

وہ بڑے سر پر ستانہ انداز میں بولا۔ ”چلو یہ بھی اچھا ہے۔ میں بھی ادھر بہت سے چکر دوں گا۔ گھر ادب۔ کچھ تو کاروبار کا بکھیرا تھا۔ پھر بیوی کی روز روز کی بیماری نے الگ جان عذاب میں کر دی۔ اور ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں نے شادی کر لی ہے۔“ مسلمان نے مسکرا کر کہا۔ ”مبارک ہو۔“

وہ بیڑاری سے بولا۔ ”ارے بھئی کہاں کی مبارک باد۔ کبھی فرصت سے ملاقات ہوگی تو بیٹا۔“

مسلمان گھبرا گیا۔ اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

اشفاق: فرق، خواہش۔ عمل: وقت۔ تذبذب: سوچ بچار۔

ٹھکانا: حیرت سے اچانک رکنا۔ کھمبڑا: مسئلہ، الجھناؤ۔

اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد سلطانہ کی آواز ابھری۔ ”کون ہے؟“ کہیں دور سے بول رہی تھی۔ سلمان شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے ایک بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس دفعہ سلطانہ بیزاری سے بولی۔

”ارے بھی کون ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟“

ساتھ ہی صحن میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ چاہے نزدیک گئی۔ سلمان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

دروازے کے بالکل قریب سے سلطانہ کی آواز ابھری۔ ”کون ہے؟“

اب خاموش رہنا ناممکن تھا۔ سلمان نے آہستہ سے کہا۔ ”میں ہوں سلمان۔“

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ دروازے کے اس پار چوڑیوں کے کی آواز آئی۔ ایک منٹ، دو منٹ، چار منٹ، خاصی دیر ہو گئی نہ کوئی آواز ابھری نہ دروازہ سلمان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا وہ ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹائے، خاموش کھڑا کر تارے یا واپس چلا جائے۔ عین اس وقت جب وہ ناامید ہو چکا تھا آہستہ سے دروازے کی کڑکی کی آہٹ ہوئی۔ دروازے کا ایک پٹ چرچاتا ہوا تھوڑا سا کھل گیا۔

سلمان نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ اور کھول دیا اور دہلیز پر ایک قدم رکھ کر اندر داخل ہوا۔ سلطانہ دروازے سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ سلمان نے محبت سے اس کی ٹھوڑی کو چھو لیا۔

سلطانہ نے پیچھے ہٹ کر سرگوشی کی۔ ”اماں جاگ رہی ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا۔ آپ آئے ہیں۔“

سلمان نے مڑ کر صحن کی جانب دیکھا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ باورچی خانے کی دیوار ملحق ایک اور کمرہ بن گیا تھا۔ اس میں روشنی ہو رہی تھی۔

سلطانہ نے اس کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ ”اماں اس کمرے میں۔ وہیں چلے جائیے۔“

سلمان نے پوچھا۔ ”نیاز کو سنہ چلا گیا؟“

”ہاں! مگر آپ کو کس نے بتایا؟“

بن مدنی

”وہ مجھے آج دوپہر ملا تھا۔“

”حیرت زدہ ہو کر بولی۔“ ”اچھا!“

زیادہ بات چیت کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سلمان فوراً نئے کمرے کی جانب چلا گیا کمرے میں باکر اس نے دیکھا۔ سامنے پلنگ پر سلطانہ کی ماں لیٹی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بالہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا جسم بہت لاغر ہو گیا تھا۔ وہ نحیف آواز سے بولی۔

”بہت دن بعد آئے۔ کیسے رہے؟“

وہ کمرے میں رکھی ہوئی کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں تو اچھا رہا مگر آپ

خفا کیا حالت بنائی۔“

”پتہ نہیں کیا بیماری ہے۔ بس بیٹھے بٹھائے اچانک دورہ پڑتا ہے۔“

سلمان نے پوچھا۔ ”علاج کس ڈاکٹر کا ہو رہا ہے؟“

”ڈاکٹر تو سنا ہے کہ بہت اچھا ہے۔ مگر میری حالت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ خدا معلوم اب می کئے انجکشن لگ چکے ہیں۔ آئے دن نہ معلوم کون کون سی دوائیاں آتی ہیں۔ مگر میرا حال جیسا ہے وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔“

سلمان نے غور سے اسے دیکھا۔ واقعی اس کی صحت بہت گر چکی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ بار بار ہانپنے لگتی۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر صاف معلوم ہوتا کہ کی خطرناک مرض میں مبتلا ہے۔ سلمان نے سوچا کہ وہ ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لے کر آئے گا اور اسے معلوم کرے گا کہ آخر بیماری کیا ہے۔ اس کی حالت اتنی ابتر کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ ”یہی سوچا کہ اس نے کہا۔“

”میرے ایک دوست ہیں۔ بڑے ہوشیار ڈاکٹر ہیں۔ میں کسی روز ان کو لے کر آؤں گا۔“

”ہانپتے ہوئے بولی۔“ ”کوئی یہ تو بتا دے کہ آخر مرض کیا ہے؟ یہاں تو اب تک یہی پتہ نہیں لگ سکا کہ کتنی ہوں کسی اور ڈاکٹر کو دکھاؤ تو ناراض ہوتے ہیں۔ وہ اس ڈاکٹر کو نہ جانے کیا سمجھتے۔ ٹیڈ کچا پوچھو تو میرا اس پر یقین ہی نہیں رہا۔ جب اعتقاد نہ ہو تو علاج کیا خاک فائدہ کرے گا۔“ وہ لکھنا نہیں کرنے لگی جن سے ناامیدی جھلکتی تھی۔ سلمان نے تسلی دی۔ دل جوئی کی باتیں کیں۔

بن مدنی کے ہاں نہ صرف: نکرور: ابتر: خراب: اعتقاد: یقین۔

بہارِ دہلی کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”اچھا ہوا کہ آپ لوگ بھی آگئے۔ کل خان بہادر نے علی احمد کو ایک وفد کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔ دونوں فریقین کے بیانات میں نے سن لیے ہیں۔ میں عنقریب اس کی تحقیقات کرنے والا ہوں۔“

علی احمد نے دریافت کیا۔ ”کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مسجد کے نام پر تعمیر خان بہادر صاحب کا نام رکھا ہوا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ان کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد علاقے کے لوگوں ہی نے بنائی ہے۔ صرف اپنی مذہبی فریضے کے تحت اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“

علی احمد نے اسے مطلع کیا۔ ”میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس تعمیر سے ملنے والے لوگوں کا کوئی تعلق نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کی اطلاع درست نہیں ہے۔ متعلقہ علاقے کے لوگوں ہی کا وفد ہے اس آیا تھا۔ ان کے اس علاقے میں مکانات ہیں اور وہ ایک مدت سے وہاں آباد ہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ سلمان نے جو اس کائی لارکوں کے وفد میں شریک تھا، ڈسٹرکٹ جیل کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

”خان بہادر نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ہستی کے لوگوں کو تو اس بات کا علم بھی نہیں ہے صرف خان بہادر کی سازش ہے۔ وہ اس طرح اسپتال کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کو ان کے خلاف فوری کارروائی کرنی چاہیے۔ ورنہ مجبوراً ہم کو جوابی اقدام کرنا پڑے گا۔ یہ تو کر دھاندلی ہے۔ مذہب کے نام پر ڈاکہ زنی ہے۔“

سلمان بالکل اس انداز سے بول رہا تھا گویا اس کائی لارکوں کے اجلاس میں تقریر کر رہا ہو۔ وہ مبالغہ کیا کہ شہر کے ایک اعلیٰ حاکم کے روبرو بات کر رہا ہے۔ جو سی ایس پی آفیسر تھا اور اپنے ڈیوٹی کے لیے سی ایس افسروں کی روایات برقرار رکھنا چاہتا تھا جو نئے مظاہرین پر گولیاں چلا کر اپنے آپ کو ان کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط کرتے تھے اور کلب میں دھسکی کا ہتھاکر تحرات سے کہتے تھے۔

”آج پانچ حرام زادے مارے گئے۔“

صدر امر بمثل پورے طور پر نیچے خالی ہاتھ۔

سلطانہ نے یا تو ساری باتیں بتادی تھیں یا پھر ماں نے جان بوجھ کر اس رات کے بارے میں ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا جب وہ وعدہ کرنے کے باوجود واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اس وقت بیمار کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی سے ہار چکی ہے۔ سلمان نے حتی الوسع دلاسا دینے کی کوشش کی اور چلتے وقت وعدہ کیا کہ وہ ڈاکٹر زیدی بہت جلد آئے گا۔

کمرے سے نکل کر صحن میں آیا۔ دیکھا، والان کے کھبے سے لگا کوئی اندھیرے میں یہ سلطانہ تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بھی اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی۔ سلمان کو اس طرف جانے نہ ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ صحن سے گزرتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا اور وہاں رک کر سلطانہ کا نظارہ لگا۔ سلطانہ والان سے باہر نکلی۔ اس نے آنگن عبور کیا اور سلمان کے قریب پہنچ گئی۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر سلمان نے سلطانہ کا نرم نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جذباتی انداز میں بھینچ لیا۔ آہستہ سے بولا۔

”میں پھر آؤں گا۔“

اس نے دہلی زبان سے کہا۔ ”دیکھئے آئیے گا ضرور۔“

سلمان نے جواب دینے کے بجائے اقرار میں گردن ہلا دی۔ دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔

(۳)

فلک پیا کا ایک وفد علی احمد کی سرکردگی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ملا۔ وہ حال تبدیل ہو کر اس شہر میں آیا تھا۔ وہ اونچے قد کا نوجوان افسر تھا۔ اس وقت سرمنی رنگ کا ہوٹلوں میں پائپ دبانے، بڑے وقار کے ساتھ بیٹھا تھا وفد کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے بات چیت شروع ہوئی۔ علی احمد نے مسجد کا قضیہ اس کے سامنے پیش کیا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کی باتیں پوری توجہ سے سنیں۔ پائپ پر کس لگایا۔ ذرا

حتی الوسع: جہاں تک ہو سکا۔ آنگن: صحن۔ سرکردگی: سربراہی۔ وقار: عزت، جاہ و جلال۔ قضیہ: جھگڑا۔



بقات کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہیڈ کوارٹر کی جانب جا رہے تھے۔  
 وفد کے ارکان میں جو اسکاکی لارک سب سے زیادہ مضطرب اور نڈھال نظر آ رہا تھا وہ سلمان  
 تھا اس طرح تھا کہ ماندہ چل رہا تھا جیسے اس کی پشت پر منوں بوجھ لدا ہو۔ ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد  
 اس کا یہی حال رہا۔  
 علی احمد اپنی رپورٹ لکھنے چلا گیا۔

سلمان کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے زیادہ علی احمد پر تاؤ  
 پاتا جس نے بڑے اعتماد سے یقین دلایا تھا کہ حکومت اس معاملے میں ضرور کچھ نہ کچھ کارروائی  
 کی۔  
 سلمان سہ پہر تک لیٹا رہا اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔



دن داخل رہا تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ کوٹھی کے باہر اسکول سے لوٹنے والے بچوں کا ملا  
 شور مچ رہا تھا۔ سلمان کو یہ شور و غل بہت برا معلوم ہوا۔ اس نے کھڑکی کے قریب جا کر سڑک  
 لڑنے والے بچوں کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور غصے سے کھڑکی کے دونوں پٹ زور سے بند کر  
 دیے۔

شام کو سلمان نے ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لیا۔ نوشا کے گھر پہنچا۔ ابھی تک سلطانہ کی ماں کی  
 بت سنبھلی نہیں تھی۔ دو روز قبل جو دورہ پڑا تھا اس سے نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ  
 بحال پڑی تھی اور رک رک کر گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ ڈاکٹر زیدی نے بڑی توجہ سے اس کا  
 انکیزا کیا۔ بیماری کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

نوشا کی ماں نے دریافت کیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کوئی گھبرانے کی تو بات نہیں؟“  
 ڈاکٹر زیدی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”جی نہیں، آپ انشاء اللہ جلد اچھی ہو جائیں گی۔“  
 ”مگر میری حالت تو دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اب بچوں  
 جیسا کہ یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھڑکتی۔“  
 ڈاکٹر زیدی نے اسے تشفی دی۔ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا جس سے مرئیضہ کو خاصی ڈھارس

ملتا تھا۔ بہت زیادہ تھا ہوا اوٹ پٹانگ۔ فضول۔ ڈھارس بندھنا۔ بہت بڑھنا۔ تسلی ہو۔

سلمان کی باتیں سن کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی گردن کو ہلکا  
 دیا اور پائپ پر کئی لمبے لمبے کش لگا کر بہت سادھواں منہ سے اگل دیا۔ اس نے وفد کے ارکان  
 نظروں سے دیکھا۔ ”دیکھئے آپ لوگوں نے کوئی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو میں سب کو اڑ  
 کر دوں گا۔ اس قسم کی دھمکیاں آپ لوگ وزیروں کو دیا کریں۔ اس لیے کہ ان کو آپ کے  
 ضرورت پڑتی ہے۔“

سلمان اس کی اس دھمکی پر بہت بھنایا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ مگر علی احمد نے اسے  
 موقع نہ دیا۔ اس نے نوجوان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہا۔ ”ہماری جانب سے دھمکی کا سوال  
 نہیں ہوتا۔ ہم تو آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں اس قسم کی بھڑاند  
 کی سرکوبی کی جائے۔ ورنہ اس سے نہ صرف عوام میں اسلام کے خلاف بد فطنی پیدا ہوگی بلکہ  
 کی حوصلہ افزائی ہوگی۔“

وہ بولا۔ ”آپ مسئلے کو جس قدر معمولی سمجھ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ مسئلہ بڑا  
 ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کس قدر جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اگر  
 خطرناک صورت حال پیدا ہوگئی تو آپ بھی الٹا حکام ہی کو مورد الزام ٹھہرائیں گے۔“

اب وہ اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت چھا گئی تھی۔ بات کرنے  
 سے یہ حقیقت صاف جھلکتی تھی کہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ محض آٹو کے ہٹھے ہیں۔  
 اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اور نہ قانون کا کوئی احترام۔ اس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے  
 ”بہر حال میں آج ہی اس معاملے کی تحقیقات کے لیے حکم جاری کر دوں گا۔ یوں  
 نقص امن کے خطرے کے پیش نظر متاثرہ علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی ہے اور  
 دروازے پر پولیس کا چہرہ لگوا دیا ہے۔ ضرورت پڑی تو پولیس فورس میں اور اضافہ کر دیا جا  
 یہ سیدھے سادے الفاظ میں وفد کو تنبیہ دی گئی تھی۔

اس نے سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔  
 وفد کے ارکان جب باہر نکلے تو دل برداشتہ تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے تو  
 آہستہ آہستہ رہے تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس بہت سی توقعات لے کر گئے تھے اور

سرکوبی۔ سرکوبی۔ بد فطنی۔ برے خیالات۔ مفید۔ جھگڑا کرنے والے۔ خشونت۔ سختی۔ غصہ۔ جھجک۔ خبردار کرنا۔

بندھی۔ اس نے ایک کاغذ پر چند دائیں لکھ کر دیں۔ ان کے استعمال کے متعلق ضروری ہدایات اور تاکید کرتے ہوئے بولا۔

”جس قدر جلد ہو سکے یہ دائیں استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔“

وہ دہلی زبان سے بولی۔ ”مگر اس کے لیے مجھے اپنے ڈاکٹر سے بھی تو پوچھنا پڑے گا۔“

ڈاکٹر زیدی اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ پڑ گیا۔ وہ جواب دینے بجائے گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ نوشا کی ماں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

”ڈاکٹر صاحب آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ ڈاکٹر خیرات محمد کا علاج فوراً بند کر دیں ورنہ آپ کی زندگی خطر میں پڑ جائے گی۔“

نوشا کی ماں اور سلمان دونوں حیرت زدہ ہو کر ڈاکٹر زیدی کو دیکھنے لگے۔ کمرے میں چھا گیا۔ لیمپ کی لوہو کے تیز جھونکے سے بھڑکی۔ دیواروں پر پھیلی ہوئی پرچھائیاں جھونے لگیں۔ کمرے کی فضا آسیب زدہ معلوم ہونے لگی۔ مریضہ کا چہرہ گہرا زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں حلقوں اندر بے حس پڑی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ کسی لاش کی طرح بے جان آ رہی تھی۔

آخر اس ہیبت ناک سنائے میں ڈاکٹر کی آواز ابھری۔ ”مسٹر سلمان! اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

سلمان کھڑا ہو گیا نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا۔

”تم واپس آؤ گے؟“

سلمان کے پاس اب وقت بہت کم تھا۔ اسے تعلیم بالغاں کے مرکز جانا تھا۔ اس نے ہاں دیا۔ ”جی نہیں۔ اس وقت تو میں واپس نہیں آؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

”کل تو آؤ گے؟“

”جی ہاں، کل دوپہر کو آؤں گا۔“

وہ اصرار کرنے لگی۔ ”دیکھو آنا ضرور۔“

”نہیں، نہیں، میں ضرور آؤں گا۔“

دونوں کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گئے۔ آگے آگے ڈاکٹر زیدی تھا۔ سلمان اس کے

پچھے چل رہا تھا۔ کمرے سے نکلنے ہی اس نے چاروں طرف تجتس انگیز نظروں سے دیکھا۔ سلطانہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ نے ہنسی صمیمیت سے اپنا دہنہا تھ اٹھا کر ماتھے پر رکھ لیا۔ سلمان مسکرا دیا۔

ڈاکٹر زیدی اور سلمان گھر سے نکل کر باہر گلی میں آ گئے۔ ڈاکٹر کچھ دیر تک اندھیری گلی میں ہوش چلا رہا۔ اچانک اس کی بھاری آواز ابھری۔ وہ سلمان سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے تعجب ہے کہ مریضہ اب تک زندہ کیوں ہے۔ اسے تو بہت پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔“

”مگر یہ بیماری کیا ہے؟“

ڈاکٹر نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا بلکہ بڑا بے ہنگام سوال کیا۔ ”تم بتا سکتے ہو کہ شوہر کے ساتھ مریضہ کے تعلقات کیسے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ چند ہی مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی ہے۔“

ڈاکٹر زیدی نے پلٹ کر اسے تنکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تو یہ ان کی دوسری شادی ہے۔ ان کے شوہر کی عمر کیا ہوگی؟“

سلمان نے بتایا۔ ”دیکھنے میں تو وہ خاصا جوان معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی عمر پالیس سے کم ہی ہوگی۔“

”مریضہ کی کچھ جائداد وغیرہ بھی ہے؟“

”نہیں۔“ سلمان نے وضاحت کی۔

ڈاکٹر ذرا دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تب تو مجھے اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔“ وہ زور ب مسکرایا۔ ”یہ ڈاکٹر خیرات محمد اس قدر بدنام ہے کہ اس کا نام سنتے ہی خواہ مخواہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل وہ مریضہ کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکا اور اگلے سیدھے انجکشن لگانا شروع کر دیے۔ ان عطائی ڈاکٹروں کے علاج میں ہمیشہ جان کا خطرہ رہتا ہے۔“

سلمان چپکچپاتے ہوئے بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے پہلے آپ کوئی خطرناک بات سوچ رہے تھے۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔ میں نے کچھ ایسی ہی بات سوچی تھی۔ بات یہ ہے کہ میں آٹھ سال تک پولیس اسپتال میں سرجن رہا ہوں۔ مجرموں سے میرا بہت عرصے تک واسطہ رہا ہے۔“

اہل بیت جو حصہ تھا اس میں دس دکانیں نکالی گئیں۔ مسجد کی دیکھ بھال کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا۔ جس کا تاحیات صدر خان بہادر فرزند علی تھا۔ پانچ ٹرسٹیوں میں خان بہادر کے دو بھتیجے تھے ایک داماد بھی شامل تھا۔ خان بہادر فرزند علی نے اس ٹرسٹ کو باقاعدہ رجسٹر کروالیا تھا۔

دکانیں، چونکہ بازار کے رخ تھیں لہذا مسجد کی تعمیر سے پہلے ہی ٹکڑی پکڑی پراٹھ گئیں۔ بیک مسجد کی تعمیر ہوتی رہی خان بہادر ہر روز اپنی جھلکتی ہوئی بنزر رنگ کی کار میں وہاں آتا۔ بیکار سے گفتگو کرتا۔ ضروری ہدایات دیتا اور جب اپنی کار کی جانب واپس جاتا تو ٹھیکیدار دوڑ کر کاروازہ کھولتا۔ خان بہادر اندر بیٹھ کر سر کے خفیف اشارے سے مزدوروں اور ٹھیکیدار کے کام کا جواب دیتا۔ کار خروماں خروماں آگے بڑھ جاتی۔

\*\*\*

اسکائی لار کوں میں پہلے پہل تو بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا مگر جوں جوں مسجد مکمل ہوتی گئی ان کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ ان میں جھنجھلاہٹ اور احساس شکست خوردگی پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اکثر پرائیویٹ سے لاپرواہی برتتے اور چائے خانوں میں بیٹھے گھنٹوں فضول باتیں کرتے رہتے۔ اس زمانے میں فلک پیما کے تین اجلاس ایسے ہوئے جن میں کورم بھی پورا نہ ہو سکا۔ صدر کو رکنا کارروائی کے مجبور اجلاس ملتوی کرنا پڑتے۔ یہ بڑا نازک اور حوصلہ شکن دور تھا۔ ایسا نظر آتا کہ جلدی فلک پیما شیرازہ بکھر جائے گا۔

اس مرحلے پر علی احمد نے جرأت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اس نے فوراً اسٹڈی سرکل قائم کر لیا جس میں وہ زندگی کے بنیادی مسائل پر بحث کرتا۔ ان کا حل بتاتا۔ اسکائی لار کوں کے کام کی تباہیوں کے نصب العین کی عظمت پر روشنی ڈالتا۔ ہر رات دس بجے جب تمام اسکائی لارک اپنے مہم کو ختم کر دیتے تو کافرنس روم میں اسٹڈی سرکل کی کلاس شروع ہوتی۔ ان کا زیادہ تر علی احمد لیکچر دیتا تھا۔ صفدر بشیر اور فہیم اللہ بھی مختلف موضوعات پر بولتے۔ پھر ان پر

ملک کی تباہی کی پوری دور قلم جو دکان یا مکان کرے پر لینے وقت انسانی / مکانہ حقوق حاصل کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ خفیف: ہکاسا۔ تہو: کورم ہو۔ کورم: لارکان کی وہ تعداد جن کی موجودگی سے جلسہ کی کارروائی جائز اور موثر ہو سکتی ہے۔ شیرازہ بکھرتا: بکھرتا: بکھرتا: بکھرتا: اصل مقصد۔

مسلمان نے اصرار کر کے پوچھا۔ ”مگر یہ تو بتائیے، آخر مرض ہے کیا؟“  
”مریضہ کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ دل کو خون سپلائی کرنے والی رگیں سکڑتی جا رہی ہیں اور تہدیلی اچانک رو نما ہوتی ہے۔“  
مسلمان خوفزدہ ہو کر سوچنے لگا، یہ تو بہت خطرناک بیماری ہے۔

ڈاکٹر زیدی اسے پولیس اسپتال کے تجربات بتانے لگا۔ اس نے مسلمان کو ایک بوڑھے کمرے واقعہ سنایا۔ جس کے جسم میں انجکشن کے ذریعہ پاگل کئے کا خون داخل کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ دیوانہ ہو گیا۔ ایک روز دیوانگی کے عالم میں اس نے ریوالور چلا کر خود کشی کر لی۔ اس واقعے کی تفصیلات بڑا ہیبت ناک تھیں۔ مسلمان بار بار حیرت زدہ نظروں سے ڈاکٹر زیدی کو دیکھتا جس کا سر مچھتا تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہیڈ کوارٹر پہنچے اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہا کوارٹر میں زیادہ دیر ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مسلمان فوراً تعلیم ہالوں کے مرکز کی جانب چل دی۔ اس روز بھی وہ جلد ہی پڑھا کر واپس آ گیا۔ ان دنوں وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لے رہا تھا۔ فلک پیما کی سرگرمیوں کی جانب سے اس نے بے نیازی برتاؤ شروع کر دی تھی۔ اب وہ سلطانہ ادرال کے گھر کے متعلق زیادہ سوچا کرتا۔

کئی روز بعد وہ پھر نوشا کے گھر گیا۔ اس نے سڑک عبور کی اور جیسے ہی اس گلی میں داخل ہوا نوشا کے گھر کی جانب جاتی تھی، نیاز سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً لوٹا۔ اب نوشا کے گھر کا خطرے سے خالی نہ تھا۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اسکائی لار کوں کا ایک وفد وزیر داخلہ سے ملنے کرانی گیا ہے۔ اس کے بعد وہ اکثر ایسی اطلاعات سنتا رہا۔ حکام اور وزرا سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ اس عرصے میں مسجد کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری رہا۔ پرانی چار دیواری گرا کر نئی دیواریں کھڑی کی گئیں۔ اونچے اونچے ستون تعمیر کئے گئے۔ ان پر محرابیں بنائی گئیں۔ کام ان قدر تیز رفتاری سے ہو رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے مسجد کی عمارت ابھر کر سامنے آگئی اور حکام یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کارروائی کی جائے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مسجد اس انداز سے بنائی گئی تھی کہ سڑک

مباحثہ شروع ہوتا۔ ہر اسکائی لارک اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اظہار خیال کرتا۔ اپنی ذہنی تر کر تا اور معلومات میں اضافہ کرتا۔

ابتدا میں اسکائی لارک اسٹڈی سرکل میں بے دلی کے ساتھ شریک ہوتے۔ مباحثے میں لینے سے کتراتے۔ خاموش بیٹھے سگریٹ کے کش لگایا کرتے۔ مگر یہ بے تعلقی زیادہ عرصے تک نہ رہی۔ ان میں مطالعے کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ اب وہ چائے خانوں میں اپنا وقت برباد کرنے بجائے لائبریری میں نظر آتے۔ علی احمد جو کتابیں تجویز کرتا ان کو پوری توجہ سے پڑھتے۔ ان نوٹ لیتے اور رات کو اسٹڈی سرکل میں شریک ہوتے تو بڑھ چڑھ کر بولتے۔

مسلمان کا انداز فلک پیما کے جلسوں میں ہمیشہ جارحانہ ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے رویے تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر بات کرتا۔ اس کا لہجہ غیر جذباتی اور سنبھل ہوا ہو بات میں وزن اور استدلال ہوتا۔ ان دنوں وہ اکثر رات گئے تک جاگتا رہتا۔ اس کی گردن میڑھا ہوتی۔ سامنے کوئی کتاب ہوتی اور ٹیبل لمپ کے شیڈ سے پھوٹی ہوئی ہلکی دودھیا روشنی اس کے چہرے کے نقوش ٹھوس اور جھکے نظر آتے۔

اسٹڈی سرکل قائم ہونے کے چند ہی ہفتوں بعد فضا بدلنے لگی۔ اسکائی لارکوں میں پائی جانے والی شکست خوردگی اور بے حسی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔ علی احمد کے لکچروں نے ان میں نئی پھونک دی تھی۔ اب پھر وہ فلک پیما کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ مگر علی احمد ہنوز مطمئن نہیں تھا۔ اس نے اسکائی لارکوں کی بنیادی کمزوری کا سراغ لگا لیا تھا۔ چنانچہ جب فلک پیما کا اجلاس ہوا تو علی احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ اسکائی لارکوں کا ہیڈ کوارٹر صفدر بیکر کی کوشی سے کر کے کسی پس ماندہ بستی میں بنایا جائے۔

علی احمد نے جس وقت یہ تجویز پیش کی تو اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود گیا۔ یہ جائزوں کی رات تھی۔ بات باہر ہوائیں چل رہی تھیں۔ اسکائی لارک گرم کرے میں تھے۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوار گیر یوں سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ تھیں۔ بیئر پر سوار رکھا تھا جس سے قبوے کی مہکتی بھاپ نکل رہی تھی۔ کمرے کے اس خوبصورت

مباحثہ شروع ہوتا۔ ہر اسکائی لارک اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اظہار خیال کرتا۔ اپنی ذہنی تر کر تا اور معلومات میں اضافہ کرتا۔

ابتدا میں اسکائی لارک اسٹڈی سرکل میں بے دلی کے ساتھ شریک ہوتے۔ مباحثے میں لینے سے کتراتے۔ خاموش بیٹھے سگریٹ کے کش لگایا کرتے۔ مگر یہ بے تعلقی زیادہ عرصے تک نہ رہی۔ ان میں مطالعے کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ اب وہ چائے خانوں میں اپنا وقت برباد کرنے بجائے لائبریری میں نظر آتے۔ علی احمد جو کتابیں تجویز کرتا ان کو پوری توجہ سے پڑھتے۔ ان نوٹ لیتے اور رات کو اسٹڈی سرکل میں شریک ہوتے تو بڑھ چڑھ کر بولتے۔

مسلمان کا انداز فلک پیما کے جلسوں میں ہمیشہ جارحانہ ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے رویے تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر بات کرتا۔ اس کا لہجہ غیر جذباتی اور سنبھل ہوا ہو بات میں وزن اور استدلال ہوتا۔ ان دنوں وہ اکثر رات گئے تک جاگتا رہتا۔ اس کی گردن میڑھا ہوتی۔ سامنے کوئی کتاب ہوتی اور ٹیبل لمپ کے شیڈ سے پھوٹی ہوئی ہلکی دودھیا روشنی اس کے چہرے کے نقوش ٹھوس اور جھکے نظر آتے۔

اسٹڈی سرکل قائم ہونے کے چند ہی ہفتوں بعد فضا بدلنے لگی۔ اسکائی لارکوں میں پائی جانے والی شکست خوردگی اور بے حسی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔ علی احمد کے لکچروں نے ان میں نئی پھونک دی تھی۔ اب پھر وہ فلک پیما کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ مگر علی احمد ہنوز مطمئن نہیں تھا۔ اس نے اسکائی لارکوں کی بنیادی کمزوری کا سراغ لگا لیا تھا۔ چنانچہ جب فلک پیما کا اجلاس ہوا تو علی احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ اسکائی لارکوں کا ہیڈ کوارٹر صفدر بیکر کی کوشی سے کر کے کسی پس ماندہ بستی میں بنایا جائے۔

علی احمد نے جس وقت یہ تجویز پیش کی تو اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود گیا۔ یہ جائزوں کی رات تھی۔ بات باہر ہوائیں چل رہی تھیں۔ اسکائی لارک گرم کرے میں تھے۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوار گیر یوں سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ تھیں۔ بیئر پر سوار رکھا تھا جس سے قبوے کی مہکتی بھاپ نکل رہی تھی۔ کمرے کے اس خوبصورت

کمرات: چمک، ذوق، شوق، جارحانہ، تیز، وزن، سنجیدگی، استدلال، دلیل، ثبوت، شکست خوردگی، سرواڑے کا احساس، رومان، کسی کام/چیز میں جان ڈالنا، ہنوز، ابھی تک، سوار، پائی گرم کرنے کا برتن۔

لہذا کی غریب، قرینہ، طریقہ، سلیقہ۔

خدا کا نام

علی احمد لمحہ بھر کے لیے رکا۔ پھر اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ”لیڈر! دولت سے بھی حاصل ہو جاتی ہے اور دولت کمانے کے نسخے تلاش کرنے کے لیے بازار سے دولت کماؤ اور لکھ جی بن جاؤ، قسم کی کتاب خریدنے کی بھی ضرورت نہیں۔ خاں بہادر فرزند سے رجوع کیجئے۔ وہ دولت پیدا کرنے کا اچھا خاصا چلتا پھرتا اشتہار ہے۔“

زور کا قہقہہ بلند ہوا اور کانفرنس روم دیر تک گونجتا رہا۔

مسلمان نے بلند آواز سے کہا: ”وہ تو کفن کھسوٹ ہے۔“

”شائے لاک بھی برا خطاب نہیں۔“ فہیم اللہ نے مسکرا کر کہا۔

”کیا خاں بہادری کو آپ چھوٹا خطاب سمجھتے ہیں؟“ صفدر بشیر نے بھی طنز کیا۔

علی احمد خاموش کھڑا زیر لب مسکراتا رہا۔ جب خاموشی ہو گئی تو اس نے پھر اپنی تقریر شروع کی۔

”کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسکاٹی لارک پیشہ ور لیڈر بننے کے بجائے اس کسان کی زندگی میں اپنی جدوجہد کا عکس تلاش کریں جو مٹی سو نگھ کر بتا سکتا ہے کہ زمین کیسی ہے؟ جو بنجر زمین کو زرخیز

چیل میدانوں کو لہلہاتی فصلوں میں بدل دیتا ہے۔ جو زمین کا سینہ چیر کر خوشہ گندم پیدا کرتا ہے۔“

علی احمد دیر تک تقریر کرتا رہا۔ اپنے موقف کی تائید میں اس نے ٹھوس دلائل پیش کیے

آخر اس کی جو بزم منظور کر لی گئی۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے صفدر بشیر کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی گئی۔

صفدر بشیر نے دوڑ دو سوپ کر کے ہفتے بھر کے اندر گنتی کی مضامین بستی میں سستی بنت

زمین بھی حاصل کر لی۔ یہ بہت بڑی بستی تھی اور ایک بنجر پیڑی کے دامن میں آباد تھی۔

زیادہ تر فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی آبادی تھی۔ ان کے علاوہ گوا

کے کچھ خاندان تھے۔ گنتی میں تعلیم بالغاں کا مرکز قائم تھا اور کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ جب

میں ٹائی فائیڈ کی دبا پھیلی تھی تو اسکاٹی لارکوں نے اپنا پہلا طبی مرکز یہیں بنایا تھا۔

نیا ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے منصوبے پر برابر کام ہوتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب

اسکاٹی لارک سویرے ہی سویرے اپنے پلاٹ پر پہنچ گئے۔ وہ خاکی نیکریں اور ملیشیا کی سر

کفن کھسوٹ: مرلوگوں کا بل کھا جانے والا۔ مضامین: تقریبی۔

نیا ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے منصوبے پر برابر کام ہوتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب

اسکاٹی لارک سویرے ہی سویرے اپنے پلاٹ پر پہنچ گئے۔ وہ خاکی نیکریں اور ملیشیا کی سر

کفن کھسوٹ: مرلوگوں کا بل کھا جانے والا۔ مضامین: تقریبی۔

نیا ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے منصوبے پر برابر کام ہوتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب

اسکاٹی لارک سویرے ہی سویرے اپنے پلاٹ پر پہنچ گئے۔ وہ خاکی نیکریں اور ملیشیا کی سر

کفن کھسوٹ: مرلوگوں کا بل کھا جانے والا۔ مضامین: تقریبی۔

زمین کے سینے سے ابھر کر سامنے آگئی۔ اس پر اربس ٹوڑ کی چھتیں تھیں۔ آٹھ بڑے بڑے کمرے۔ ایک میں فلک پیکا دفتر قائم کیا گیا اور اس کمرے کو، جو سب سے زیادہ کشادہ تھا، لاہر برائے جلوس کے لیے وقف کر دیا گیا۔ پانچ کمرے اسکائی لارکوں کی رہائش کے لیے تھے۔ ایک کمرے ڈاکٹر زیدی نے معمولی سی ڈیسری بھی کھول دی۔

ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے مکمل ہوتے ہی تمام اسکائی لارک اس میں منتقل ہو گئے۔ یہ بڑی سادہ تھی۔ وہ سویرے اٹھ کر بستر درست کرتے۔ کمرے صاف کرتے۔ فلک پیکا کے کام علاوہ ان کا بیشتر وقت لاہریری میں گزرتا۔ علی احمد اور صفدر بشر روزانہ اسٹڈی سرکل میں ہلے۔ مہینے میں ایک دن انہوں نے چھٹی کار کھا تھا۔ موسم خوشگوار ہوتا تو وہ کبھی بکھار شہرے دور نکل جاتے اور کسی پر فضا مقام پر پک تک مٹاتے۔

تبستی میں رہائش اختیار کرنے سے اسکائی لارکوں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس علاقے میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ہر اسکائی لارک شدت سے محسوس کرنے لگا کہ ان چاروں طرف غلاظت ہی غلاظت ہے۔ گندے پانی کی نکاسی کے لیے گٹھی میں تالیوں کا باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ گھروں کے پاس جگہ جگہ گڑھے تھے جن میں گندہ پانی جمع ہو کر سڑا کرتا۔ گلی کوچوں کی طرف کوڑا کرکٹ بکھرا رہتا۔ رات ہوتی تو تبستی پر گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ راہ گیر رات کے وقت راستوں پر ٹھوکریں کھاتے کیچڑ پر پھسل کر گر پڑتے۔ قدم قدم پر گندہ پانی کے گڑھوں میں گرنے کا خطرہ رہتا۔

ہر چند کہ یہ علاقہ میونسپلٹی کی حدود میں تھا مگر اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ پیکا کے ایک اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور یہ طے کیا گیا کہ اسکائی لارکوں کا ایک وفد ڈاکٹر زیدی کی رہنمائی میں میونسپلٹی کے متعلقہ افسروں سے ملے اور ان کو صورت حال سے آگاہ کرے۔

چند روز بعد فلک پیکا وفد میونسپلٹی کے چیئرمین سے ملا۔ اس نے ان کے مطالبات سن کر کہ شہر کی مضافاتی بستیوں کے لیے میونسپلٹی نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ بورڈ کے آئندہ اجلاس وہ اس منصوبے کو منظور کرانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے وفد کو یقین دلایا کہ منصوبہ منظور ہونے ہی مضافاتی بستیوں کا ترقیاتی کام تیزی سے شروع کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر زیدی نے

آپنا رپورٹ پیش کر دی۔  
بعض ممبر بعد میونسپل بورڈ کا اجلاس ہوا مگر مضافاتی بستیوں کا ترقیاتی منصوبہ پیش کرنے کی نیت ہی نہ آئی۔ اجلاس میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ صورت حال اس قدر نازک ہو گئی کہ سیکرٹری کو بلایا کر کے پولیس کی امداد حاصل کرنا پڑی۔ چیئرمین کو اجلاس برخاست کر کے میز کے نیچے

رہائش ہونا پڑا۔  
اس ہنگامے کی ابتدا اعتراضات سے شروع ہوئی۔ پھر گالی گلوچ ہونے لگی جس نے بڑھ کر ہاتھ پائی کی صورت اختیار کر لی۔ جوتے ہوا میں پرندوں کی طرح اڑنے لگے۔ گریبان چاک اور بال پڑنا ہوئے۔ ہر ممبر قیس عامری کے روپ میں اسٹیج کا ایکٹر نظر آنے لگا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ ہر کانوں کے الاٹمنٹ کا قضیہ تھا جو واکس چیئرمین نے اپنے بھائی کے نام الاٹ کر دی تھیں۔ اس ریلے پر ایک دوسرے کی عقدہ کشائیاں ہونے لگیں۔ کسی ممبر پر ٹھیکیداروں سے رشوت لینے کا الزام تھا۔ کسی نے گر لڑا اسکول کی استانیوں کی عصمتیں خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نے سرال عزیزوں کو ملازمتیں دلوا کر پورے پورے محکموں کو اپنی سرال بنادیا تھا۔ غرض کہ اس حمام

میں سب بگڑے تھے۔  
فلک پیکانے کچھ عرصے تو چیئرمین کے وعدوں پر اعتماد کر کے انتظار کیا۔ مگر جب اسکائی لارکوں کو یہ معلوم ہوا کہ مضافاتی بستیوں کے ترقیاتی منصوبے کو تیار ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے ہیں اور آج تک بورڈ کے کسی اجلاس میں اسے پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تو فلک پیکا ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا۔

اس اجلاس میں اتفاق رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ یہ کام اسکائی لارک خود ہی انجام دیں گے۔

چند روز بعد فلک پیکا وفد میونسپلٹی کے چیئرمین سے ملا۔ اس نے ان کے مطالبات سن کر کہ شہر کی مضافاتی بستیوں کے لیے میونسپلٹی نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ بورڈ کے آئندہ اجلاس وہ اس منصوبے کو منظور کرانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے وفد کو یقین دلایا کہ منصوبہ منظور ہونے ہی مضافاتی بستیوں کا ترقیاتی کام تیزی سے شروع کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر زیدی نے

آپنا رپورٹ پیش کر دی۔  
بعض ممبر بعد میونسپل بورڈ کا اجلاس ہوا مگر مضافاتی بستیوں کا ترقیاتی منصوبہ پیش کرنے کی نیت ہی نہ آئی۔ اجلاس میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ صورت حال اس قدر نازک ہو گئی کہ سیکرٹری کو بلایا کر کے پولیس کی امداد حاصل کرنا پڑی۔ چیئرمین کو اجلاس برخاست کر کے میز کے نیچے

نورانی مدنی

ہفتہ بھر کے اندر بستی کا حلیہ تبدیل ہو گیا۔

میں اللہ پیش آیا تھا۔ ایک آدھ بار بیوی نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو اس نے بے بسی بھر میں نالیاں کھود کر بڑے نالے سے ملا دی گئیں۔ گڑھے پاٹ دئے گئے۔ گھیلانہ

کر کے جگہ جگہ کوڑا رکھنے کے ڈرم رکھ دئے گئے۔ چار لائینیں خرید کر بستی کے مختلف کونوں لگادی گئیں جن کو ہر شام روشن کرنے اور کیر و سن آئل سپلائی کرنے کا بندوبست ایک اسکاٹلار کے سپرد کیا گیا۔ یہ ڈیوٹی ہر مہینے بدلتی رہتی۔

بستی کے قریب جو خالی میدان تھا اسے صاف کر کے بچوں کے کھیل کود کے لیے ایک پارک کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ جن مکانوں کی دیواریں اور چھتیں شکستہ تھیں ان کی سب سے مرمت کی۔

ہفتہ بھر ہر شام کو حفظان صحت کے موضوع پر تقریریں کی گئیں۔

ہفتہ صفائی و توحات سے زیادہ کامیاب رہا۔ بستی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے الف لیلہ داستانوں کے کسی جن نے راتوں رات پرانی بستی کی غلاطت کھرچ کر نئی بستی بنا دی ہے۔ اب صاف ستھری نظر آتیں۔ رات کو اسٹریٹ لیمپوں کی روشنی درو دیوار پر جھلکتی۔ اسکاٹلار کا مہم کی اس کامیابی پر بے حد مسرور تھے۔ ان میں کام کرنے کا جذبہ اور تیز ہو گیا تھا۔

بیوی نے اونی شال سینے کے نیچے ڈھلا کر اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نیاز کا بازو جھنجھوڑ کر بولی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

نیاز نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ بیوی ایک خاص اداسے مسکرائی۔ نیاز اس کی جانب توجہ دئے بغیر بیزاری سے بولا۔

”دیکھو اس وقت پریشان نہ کرو۔ میری طبیعت خراب ہے۔“

بیوی کے دل پر گہرا چرکا لگا گرا وہ جھیل گئی اس دفعہ اس نے اپنا نصف جسم اس کے سینے پر جھکا دیا۔ ”ناراض ہو مجھ سے؟“

”بھلا کر بولا۔“ ”افو ابھی حد ہو گئی۔ خدا کے لیے تم مجھے اسی طرح پڑا رہنے دو۔“

”یاد اس پر کہ تھا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر وہ شکوہ کرنے کے انداز میں ”مترم کو ہو کیا گیا ہے؟ لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔“ اس کے لہجے سے خوشامد جھلک رہی تھی۔ نیاز نے بھی نہ پوچھا۔ اس کی جانب دیکھے بغیر گویا ہوا۔

”مترم کو ہو کیا گیا ہے؟“ ”ناراض ہو مجھ سے؟“

بستی بھر میں نالیاں کھود کر بڑے نالے سے ملا دی گئیں۔ گڑھے پاٹ دئے گئے۔ گھیلانہ کر کے جگہ جگہ کوڑا رکھنے کے ڈرم رکھ دئے گئے۔ چار لائینیں خرید کر بستی کے مختلف کونوں لگادی گئیں جن کو ہر شام روشن کرنے اور کیر و سن آئل سپلائی کرنے کا بندوبست ایک اسکاٹلار کے سپرد کیا گیا۔ یہ ڈیوٹی ہر مہینے بدلتی رہتی۔

بستی کے قریب جو خالی میدان تھا اسے صاف کر کے بچوں کے کھیل کود کے لیے ایک پارک کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ جن مکانوں کی دیواریں اور چھتیں شکستہ تھیں ان کی سب سے مرمت کی۔

ہفتہ بھر ہر شام کو حفظان صحت کے موضوع پر تقریریں کی گئیں۔

ہفتہ صفائی و توحات سے زیادہ کامیاب رہا۔ بستی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے الف لیلہ داستانوں کے کسی جن نے راتوں رات پرانی بستی کی غلاطت کھرچ کر نئی بستی بنا دی ہے۔ اب صاف ستھری نظر آتیں۔ رات کو اسٹریٹ لیمپوں کی روشنی درو دیوار پر جھلکتی۔ اسکاٹلار کا مہم کی اس کامیابی پر بے حد مسرور تھے۔ ان میں کام کرنے کا جذبہ اور تیز ہو گیا تھا۔

بیوی نے اونی شال سینے کے نیچے ڈھلا کر اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نیاز کا بازو جھنجھوڑ کر بولی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

نیاز نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ بیوی ایک خاص اداسے مسکرائی۔ نیاز اس کی جانب توجہ دئے بغیر بیزاری سے بولا۔

”دیکھو اس وقت پریشان نہ کرو۔ میری طبیعت خراب ہے۔“

بیوی کے دل پر گہرا چرکا لگا گرا وہ جھیل گئی اس دفعہ اس نے اپنا نصف جسم اس کے سینے پر جھکا دیا۔ ”ناراض ہو مجھ سے؟“

”بھلا کر بولا۔“ ”افو ابھی حد ہو گئی۔ خدا کے لیے تم مجھے اسی طرح پڑا رہنے دو۔“

”یاد اس پر کہ تھا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر وہ شکوہ کرنے کے انداز میں ”مترم کو ہو کیا گیا ہے؟ لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں۔“ اس کے لہجے سے خوشامد جھلک رہی تھی۔ نیاز نے بھی نہ پوچھا۔ اس کی جانب دیکھے بغیر گویا ہوا۔

”مترم کو ہو کیا گیا ہے؟“ ”ناراض ہو مجھ سے؟“

داغ بیل ڈالنا کسی کام کی ابتداء کرے۔ شکستہ، ٹوٹی ہوئی۔ حفظان صحت، صحت کی حفاظت، بنیادیں، خوش، سوغات، مراد وغ۔

”جاؤ تم اپنے بستر پر لیٹو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“

اس نے منہ پھیر کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ وہ جل بھن کر رہ گئی۔ اس نے غصہ کر کے کمرے کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے۔ جس سے اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اس نے گہری سانس لی اور دل گرفتہ ہو کر سوچنے لگی۔ کیا واقعی اب اس میں کوئی دلکشی نہیں رہی؟ بیماری نے دیگر طرح چاٹ کر اسے کھوکھلا کر دیا ہے اور اس کھوکھلے جسم سے نیاز کو ذرا بھی دلچسپی نہیں باقی رہی۔ وہ بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ ایک شوہر کے ساتھ زندگی کے بارہ سال گزر چکے تھے۔ پہلا شوہر زندگی بھر اس کا مرید رہا۔ وہ اسے نت نئے حربوں سے زلف گرہ گیر کا سیر کئے رہی۔ اس کا جی چاہا کہ نیاز کو آزما کر دیکھے۔ یہ بڑا خطرناک اقدام تھا؟ اس وقت وہ ہر خطرہ مول لینے پر آمادہ تھی۔ اس نے سلطانہ کو آواز دی۔

”سلطانہ، اے سلطانہ!“

سلطانہ اپنے کمرے سے بولی۔ ”جی امّاں!“ وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔

ماں نے کہا۔ ”ذرا یہاں تو آؤ۔“

کچھ ہی دیر بعد پھر دروازہ کھولنے کی آواز ابھری، صحن میں چاپ سٹائی دی۔ سلطانہ آ رہی تھی۔ کمرے کے باہر سے اس کی آواز آئی۔ ”امّاں!“

ماں نے کہا۔ ”دروازہ کھلا ہے۔ چلی آؤ۔“

سلطانہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ اس وقت سردی سے تھر تھرا رہی تھی۔ ماں نے

اپنے پاس بٹھالیا۔ پوچھا۔ ”کیا اُتو سو گیا؟“

”وہ تو سر شام ہی سو گیا تھا۔“

ماں بولی۔ ”دل گھبرا رہا تھا۔ سوچا تم سے کچھ باتیں کروں۔ شاید دل بہل جائے۔“

سلطانہ نے گردن گھما کر نیاز کی جانب دیکھا جو پیٹھ موڑے خاموش پڑا تھا۔ ماں لاہر اُڑ

باتیں کرنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد نیاز کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر

کھانے لگا۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہیں۔ انکیٹھی میں ابھی تک انگارے دھک رہے

گہری سرخ روشنی میں سلطانہ کے چہرے کی دلکشی نکھر گئی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں شبنم کے

جہاں دیدہ: جس نے دنیا کی سبھی چیزیں آزمو کر: تجربہ کار: مرید: مراد: تابعدار: زلف گرہ گیر کا سیر: مراد: عاشق: فرمانبردار:

ظاہر ہے تھے۔ ترو تازہ زرخشاںوں پر برسات کی سہانی شاموں کی شفق پھیل گئی تھی۔

نیاز نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں ملتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔ ”ارے یہ سلطانہ کب آئی؟“

”صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”ذرا ہی دیر پہلے آئی ہے۔“

”اس سردی میں اسے باہر نکلنے کی کیا سوچھی؟“

سلطانہ سر جھکا کر پان لگانے لگی۔ وہ اس سے نظریں ملاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اس نے جب بھی

اس کی جانب دیکھا اسے نیاز کی آنکھوں میں شکار پر جھپٹنے والے تیندوے کی سی تیز چمک نظر آتی۔ وہ

معلوم خوف سے تھرا کر رہ جاتی۔

بیوی نے نیاز سے پوچھا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے؟“

”کل ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ آج کل طبیعت کچھ گڑبڑی رہتی ہے۔“

”میں تم سے خود یہی کہنے والی تھی کل یاد کر کے ڈاکٹر کے پاس چلے جانا۔“

”فرصت مل گئی تو ضرور جاؤں گا۔“

اس نے پیار سے ڈانٹا۔ ”فرصت تو تم کو کبھی نہیں ملے گی۔ تم نے اپنی جان کے ساتھ

لمبے ہی اتنے لگا رکھے ہیں۔ مگر کچھ اپنا بھی تو خیال رکھو۔ واہ بھی اچھی مصروفیت ہے۔ ڈاکٹر کے

الہ جانے تک کا وقت نہیں ہے۔“ نیاز اس کی باتوں پر بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

دونوں کوباتوں میں مصروف دیکھ کر سلطانہ اٹھ کر جانے لگی۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ کہنے

لگے۔ ”امّاں! کون سی زیادہ رات ہوئی ہے۔“

سلطانہ بولی۔ ”نیند آرہی ہے۔“

”تمہاری آنکھوں میں تو چراغ جلتے ہی نیند آ جاتی ہے بیٹھ، چلی جانا۔“

دراصل وہ چاہتی تھی کہ سلطانہ ابھی نہ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ سلطانہ کے جاتے ہی نیاز

بے حال کر منہ پھیر لے گا۔

نیاز کی یہ بیزاری اس کے لیے بڑی اذیت ناک تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی ذات میں

کچھ ایسا ہے جو اس کے لیے بڑی اذیت ناک ہے۔ تیندو: چپے کی جسم کا ایک جانور: چراغ جلتے ہی: مراد: شام

نکھر: نکلنے والا: طلوع اور غروب ہوتے وقت آسمان پر پھیل جاتی ہے۔ تیندو: چپے کی جسم کا ایک جانور: چراغ جلتے ہی: مراد: شام



نیاز کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ وہ اپنی دل کشی اور بچی کھچی جوانی تک کھو چکی ہے۔ وہ بڑی بد صورت ہو گئی ہے۔ یہ احساس اس کے سینے میں نشتر بن کر چھب گیا۔ یہ ایسا دکھ تھا جسے بردہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

\*\*\*

انگیٹھی میں انگارے دھکتے رہے۔ سلطانہ کے چہرے پر شفق پھونتی رہی۔ اس کے م جادو جاگتا رہا۔ باہر ہوا سردی سے بلبلاتی رہی۔ کھر آلودرات چپ چاپ کھڑی تھی۔

اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر موٹو آیا تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شال اچھی طرح اپنے جسم کے چاروں طرف لپیٹی اور دیوار کی جانب منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ نیاز باہر گیا اور ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لایا۔ وہ اس وقت سیاہ اوور کوٹ پہنے تھا اور بڑا کیم شیم نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر نے کہا۔ ”معاف کرنا نیاز۔ میں ایک کیس دیکھنے چلا گیا سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں۔“

”انجکشن کل بھی لگ سکتا تھا۔ آپ نے اس جاڑے پالے میں خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی۔“ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ”ارے بھی ہمیں کہاں آرام نصیب۔ اپنا پیشہ ہی ایسا ٹھہرا۔“ وہ دیوار قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور نیاز کی جانب مڑ کر دیکھنے لگا۔ ”مگر تو خوب گرم ہے۔ اس بڑا باش نظر آ رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ سہ پہر ہی کو نیاز نے اسے ایک ہزار روپے کی دوسری قطاری سلطانہ کی ماں خاموش بیٹھی ڈاکٹر کی باتیں سنتی رہی۔ ڈاکٹر نے ذرا ہی دیر بعد اپنے چپڑے کے اندر سے سرنج نکالی اور انجکشن لگانے کے واسطے اس میں دو ابھر لگا۔ نیاز خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر کی پشت اس کی جانب تھی۔ سامنے دیوار پر ڈاکٹر کا سایہ بڑا ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ دوا سے بھری ہوئی سرنج لے کر مریضہ کے پاس گیا۔ مسکرا کر پوچھا۔

”کہئے طبیعت کیسی ہے؟“

”آج تو ذرا بہتر ہے۔“

ڈاکٹر تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ”اب آپ کی طبیعت انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

سرخ والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ہاتھ ادھر کیجئے۔ میں انجکشن لگا دوں۔“

”ڈاکٹر صاحب میں انجکشن نہیں لگواؤں گی۔“

پہلی بار اس نے انجکشن لگوانے سے انکار کیا تھا۔ ڈاکٹر بے نیازی سے ہنس کر بولا۔ ”کیوں،

نہیں تو ہے۔ یہ آج آپ کو کیا سوچھی؟“

”یہ جانے کیوں انجکشن لگوانے سے میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا جو دیوار کی جانب منہ موڑے بیٹھی تھی۔ وہ نرم

لہجے میں بولا۔ ”آپ کو خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ کہیں انجکشن سے طبیعت خراب ہوتی ہے۔“ اس نے ہلکا ہتھ لگایا۔ ”لایئے ہاتھ ادھر کیجئے۔ گھبرا ئیے نہیں۔ اب زیادہ انجکشن نہیں لگاؤں گا۔“

مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اب میں

نکشن نہیں لگواؤں گی۔“

نیاز کو اس کے انکار پر سخت غصہ آیا۔ ”خواہ مخواہ کی باتیں نہ کرو۔ انجکشن لگواؤ۔“

”میں نے کہہ دیا کہ اب میں کوئی علاج نہیں کراؤں گی۔“

نیاز نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔ مگر ڈاکٹر نے اسے اشارہ سے منع کر دیا اور نرمی سے بولا۔

”دیکھئے انجکشن کا ناغہ ہو گیا تو یہ آپ کے مرض کے واسطے بہت برا ہو گا۔ میں تو تین رات گئے سردی

لے آپ کی خاطر یہاں آیا اور آپ ہیں کہ انجکشن لگوانے سے انکار کر رہی ہیں۔ یہ تو ٹھیک بات

نہیں۔“ وہ ابھی تک غیر سنجیدہ تھا۔ مسکرا مسکرا کر بات کر رہا تھا۔

مگر جب وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئی تو ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ اس

لہجے میں دے خوف کا احساس بھی شامل تھا۔ اب اصرار کرنا فضول تھا۔ اس نے سرنج خالی کر کے

ہالکے اندر رکھی اور نیاز سے مخاطب ہوا۔

”معلوم ہوتا ہے اب یہ گھبرا گئی ہیں۔ ابھی ان کو کچھ روز کی چھٹی ملنی چاہیے۔“ اس دفعہ اس

ناراضی کے مخاطب کیا۔ ”لیجئے اب تو خوش ہو جائیے!“

وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

ڈاکٹر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ نیاز بھی اس کے ہمراہ چلا گیا۔

علاؤ اللہ

دونوں خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف کو سناٹا تھا۔ کڑا کے کا جاڑا پڑا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلے گئے۔ ان کے قدموں کی آواز سنسن رات میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ گھر سے کچھ دور آگے جا کر ڈاکٹر نے نیاز سے کہا۔ ”پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ایک خاص اسٹیج پر پہنچنے کے بعد مریض کا مزاج ایلان ضدی اور چڑچڑاہو جاتا ہے۔“

”مگر ڈاکٹر صاحب! یہ تو اس نے بڑی خراب حرکت کی ہے۔“

”تم اس بات کا کچھ خیال نہ کرو۔ مریض کو کچھ وہم ہو گیا ہے۔ یہ عورتیں تو شکی مزاج ہوتی ہیں۔ اس شک کو تم ہی دور کر سکتے ہو۔ دیکھو زبردستی نہ کرنا۔ ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔“

”کہیں اسے کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا؟“

ڈاکٹر کے دل میں بھی چور تھا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نیاز کی بات سن کر اس کے بدن میں خفیف سی لرزش ہوئی۔ آہستہ سے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ فی الحال ایسی کوئی بات نہیں اس کی آواز میں دہلی دہلی تھر تھر ہٹ تھی۔“

”پچھلے دنوں میں کوئی گھبراہٹ نہیں میری غیر موجودگی میں کسی ڈاکٹر کے پاس نہ چلی گئی ہو۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“

”یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انجکشن لگوانے سے آج اس نے پہلی بار انکار کیا ہے۔ مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے سوچتا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلے رہے۔ کمر کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے وہ سنسن رات میں بھوتوں کی طرح ڈراؤنے نظر آ رہے تھے۔ پھر سناٹے میں ڈاکٹر کی آواز ابھری۔

”میرا خیال ہے کہ تم کو ایسی بات نہیں سوچنا چاہیے۔ جب تک کوئی بہت ہی ہوشیار ڈاکٹر ہو اسے شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ بہر حال تم چوکنا رہو کہ وہ اسپتال نہ جائے اور نہ کسی ڈاکٹر سے مشا کرے۔ احتیاط کرنا بہر حال میں ضروری ہے۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے گلی کی ٹکڑ پر پہنچ گئے۔ سامنے سڑک پر ڈاکٹر کی کار کھڑی تھی۔ دونوں اس کے قریب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے نیاز سے مصافحہ کیا اور کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

علاؤ اللہ

وہ بھرائی ہوئی آواز سے بولی۔ ”خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں کوئی علاج نہیں کروں گی۔ خدا کی ذات میں بڑی قوت ہے۔ زندگی ہے تو یوں ہی اچھی ہو جاؤں گی۔“ کہتے کہتے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

نیاز کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ جل کر بولا۔ ”عجیب آؤ کی ہٹھی عورت سے پڑا ہے۔“

نیاز نے پہلی بار گالی دی تھی۔ بیوی کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ چیخ کر بولی۔ ”زبان سنبھال کر بات کرو۔ مرنے والا مر گیا۔ وہ اپنی جگہ میں اپنی جگہ۔ کبھی گالی دینا تو درکار مجھ تو کر کے بھی بات نہیں کی۔“ یہ سلطانہ کے باپ کا ذکر تھا اور اس کے ذکر سے نیاز ہمیشہ جھنجھلا اٹھتا۔ اس وقت تو وہ یوں بھی جلا ہوا تھا۔ ٹپ کر بولا۔

”اسی سالے بھڑوے نے تو تمہارا دماغ خراب کیا ہے۔“

”مرے ہوئے کو گالی دیتے تم کو شرم نہیں آتی۔“

نیاز زور سے چیخا۔ ”بس زبان بند کرو۔ جتنا منع کرو اسی قدر حرامزادی سر پر چڑھے چلی جا رہے۔ تیری تو۔“ اس نے ایک گندی سی گالی دی اولپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”اچھا تو اب تم مجھ ہاتھ بھی اٹھاؤ گے۔“

نیاز نے کئی گالیاں دیں۔ اور اس کے منہ پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کیا، پھر دوسرا تھپڑ اس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا۔ وہ خاموش کھڑی مار کھاتی رہی۔ نیاز نے اس کی کمر پر کئی لاتیں ماریں۔ شور سن کر سلطانہ ننگے پیر بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دیکھا، ماں فریاد اوندھے منہ پڑی تھی اور نیاز اس کے قریب کھڑا خنجر کی مانند زور سے ہانپ رہا تھا۔ اس آنکھیں خونخوار ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ سلطانہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی جلدی سے جاکر ماں کو فرش پر سے اٹھایا۔ اس کے بال خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ مردے طرح سفید ہو رہا تھا۔ نیچے ہونٹ سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ لیپ کی میلی میلی زرد روشنی بڑی ڈراؤنی نظر آرہی تھی۔

نیاز نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ کھونٹی پر لٹکا ہوا کوٹ اتار کر پہنا۔ گلے میں نظر

آواز گلوگیر ہو گئی: آواز گلے میں بھنس کر رہ گئی۔ سابقہ: واسطہ۔ تن بدن میں آگ لگنا: سخت غصہ آنا۔ تھوک، جھانگ

لٹکا کر دی: بہت زیادہ سردی۔ پلٹھین لٹکانا: بچو مراد سردی کی وجہ سے حالت بہت خراب ہوئی۔

اُو خوشفردہ ہو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”لماں نے بلایا ہے۔“

نیاز نے دل ہی دل میں کہا اب حرامزادی کو پتہ چلا۔ ابھی کیا ہے۔ چند روز بعد سالانہ غور ہوئی آئے گی۔ یہی سوچ کر اس نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

”اپنی اماں سے کہ دینا کہ اس گھر سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”اُو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں خوف تھا اور چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ نیاز نے اسے خاموش دیکھ کر زور سے ڈانٹا۔ ”اے اب میرا سر پر کیوں کھڑا ہے۔ جا کے کہہ دینا اس حرامزادی سے کہ میں اب کبھی اس گھر پر پیشاب بھی کروں گا۔“ لمحہ بھر کے لیے وہ رکا اور آنکھیں نکال کر زور سے دھاڑا۔

”اے جا رہا ہے یا کچھ لے کر جائے گا۔“

وہ گالیاں دیتا ہوا اُو پر چھٹا۔ وہ سہا ہوا چپ چاپ دکان سے باہر چلا گیا۔

اُو کے جانے کے بعد نیاز گردن اونچی کر کے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ اے تھا کہ اب بیوی خود منانے آئے گی۔ اسی خیال سے وہ دکان سے نکل کر کہیں گیا بھی نہیں۔ بے سے بیٹھا بیوی کا انتظار کرتا رہا۔ رات دے قدموں آکر کوچہ و بازار پر چھاگئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ جب پہر رات ہو گئی اور راستوں پر سناٹا چھا گیا تو اس کا انتظار شدید ہو گیا۔ مگر بیوی تو آئی البتہ ڈاکٹر موٹو کا کپاؤ نڈر آگیا۔ ڈاکٹر نے اسے بلوایا تھا۔ نیاز کی طبیعت پریشان تھی۔ اس کپاؤ نڈر کو ٹالنا چاہا۔ مگر وہ گیا نہیں۔ زور دے کر بولا۔

”ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ انہیں اپنے ساتھ لانا۔ بڑا جنت کام ہے۔“

نیاز نے زیادہ حیل و حجت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خاموشی سے اس کے ہمراہ چلا گیا۔ اس وقت تنہا تھا۔ نیاز کے پیچھے ہی اٹھ کر عقبی کمرے میں چلا گیا۔ نیاز کو اپنے ساتھ آنے کا کیا یہ مختصر سا کمرہ تھا۔ اس کی چھت بھی نیچی تھی۔ اندر دھندلا سا بلب روشن تھا۔ چمکا روشنی میں دو نوں بڑے پر اسرار نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”میں کئی روز سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

نیاز نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ رضامند نہیں ہوتی۔“

ذات مدنی

ڈاکٹر کا چوڑا چمکا چہرہ لمحہ بھر کے لیے پریشان ہو گیا۔ ”یہ تم نے بہت بری خبر سنائی۔ بھی کسی

رہا ہے مٹاؤ۔“

”وہ کسی طرح مانتی ہی نہیں۔ اسی بات پر میرا اس سے جھگڑا بھی ہو گیا۔ میں تو تین روز سے رنجی نہیں گیا۔“

ڈاکٹر اور پریشان ہو گیا۔ اس نے کسی قدر ناراض ہو کر کہا۔ ”میں نے تم کو منع بھی کیا تھا۔ پھر تم باز نہ آئے۔ یہ تم نے بڑی غیر دانش مندی کا ثبوت دیا۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ اسے نہیں جانتے۔ وہ بڑی ضدی عورت ہے۔“

”اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ تم کسی نہ کسی طرح اسے منانے کی کوشش کرو۔ یہ بہت قیمتی ن ہے۔ اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔“ ڈاکٹر نے نیاز کو نظر بھر کر دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”تم ابھی گھر جاؤ اور پری کو ششے میں اتارنے کی کوشش کرو۔“ اس کا لہجہ اچانک بڑھ گیا۔

”تم بھی کیسے مرد ہو۔ ایک عورت تمہارے قابو میں نہیں آتی۔“

نیاز روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر بولا۔ ”لیکن ڈاکٹر صاحب میں اب اس کے پاس آں گا نہیں۔“

ڈاکٹر نے ہلکے کر کہا۔ ”نہ جاؤ۔ مگر میری ایک ہزار کی تیسری قسط دے دو اور جا کر موج کرو۔“

”دیکھو ڈاکٹر صاحب بات یہ ہے۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر نے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”بات دات سے کام نہیں چلے گا۔ انجکشن زبردستی نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کے لیے تو مریفہ کو منانے کی ہی پڑے گا۔ اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو علاج بند کر دو اور کہیں تم اس خیال میں ہو کہ اتنے ہاتھوں سے اس کا کام تمام ہو جائے گا تو یہ تمہارا مغالطہ ہے۔ اس میں زبردست قوت مدافعت ہوگی اور عورت ہوتی تو اب تک قبرستان میں ایک عدد قبر الاٹ کر اچکی ہوتی۔“

نیاز کے لیے اب انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً کہنا پڑا۔ ”اچھی بات ہے۔ جیسا کہ کہہ رہے ہیں، وہی کروں گا۔ مگر اب آپ یہ جھنجھٹ جلد ہی صاف کر دیجئے۔“

نیاز نے صاف کر دیا۔ قوت مدافعت بہتر ہو چکی تھی۔ جھنجھٹ جھگڑا۔

بیوی نے گردن گھا کر دیکھا۔ نیاز کھلے ٹریک پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی پیٹھ بیوی کی جانب تھی۔  
 ”یہ اس وقت دھوپ کے چشتے کی کون سی ضرورت پڑ گئی؟“ بیوی کے لہجے میں مصالحت کا  
 لہجہ تھا۔ نیاز شاید بیوی سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس نے فوراً پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔  
 ”تمہیں معلوم ہو تو بتا دو۔“  
 وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”یہ اتنی رات گئے تم سارا سامان کیوں الٹ  
 رہے ہو؟“

اس دفعہ اس نے بیوی کی جانب نہیں دیکھا۔ پڑمرہ لہجے میں بولا۔ ”اب میں یہاں سے اپنا  
 کالہ کر کے جا رہا ہوں۔ تم من مانی کرنا۔ کوئی تم کو ستانے والا نہیں ہوگا۔“ صاف لفظوں میں اب  
 گلہ کرنے لگا تھا۔

”تھوڑے دن اور صبر کر لو۔ نہ میں اس دنیا میں رہوں گی نہ تم کو اس طرح گھر چھوڑ کر جانا ہوگا۔“  
 اس کے بعد شکوہ شکایت کا دفتر کھل گیا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ”قسم  
 کہ تم نے میرا سارا پروگرام ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ تمہیں کیا پتہ کہ میں کیا کیا سوچ رہا تھا۔“  
 ”کبھی تم نے مجھ سے کچھ بتایا بھی۔ اس قابل ہی نہیں سمجھتے۔“

”نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلے تم اچھی ہو جاؤ تو کچھ بات کروں۔ اب بات  
 کرنا ہی تو لوں لو۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطانہ کسی طرح اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ میں سب سے  
 بالآخر فرض سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں۔“

”بڑی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کی بیوی کی سب سے بڑی  
 بات یہ ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے سلطانہ کا بیاہ کر دے۔ اس وقت وہ اس کی اس کمزوری سے فائدہ  
 اٹھا رہا تھا۔ نیاز کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ بیوی یہ بات سنتے ہی چونک پڑی۔ پہلے اس کے چہرے پر  
 غصہ بھرا ہوا، پھر کسی دبی ہوئی مسرت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ جلدی سے بولی۔  
 ”تم نے کوئی لڑکا دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“  
 ”میرا وہ دوسرا لڑکا؟“

ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھر آئی۔ مسکرا کر بولا۔ ”یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ جازا ختم  
 سے پہلے ہی میں اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔“  
 اس کی آنکھوں کی چمک اور خوشنوا ہو گئی۔ جھگی ہوئی چھت والے اس تنگ کمرے میں  
 مولو اپنے بھاری بھر کم جسم کے ساتھ ڈریکولا کی مانند خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

\*\*\*

نیاز ڈاکٹر کے مطب سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ مگر دونوں  
 کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ نیاز چپ چاپ بستر پر بیٹھ گیا اور یہ سوچنے لگا کہ بیوی سے کس طرح  
 چھیڑی جائے۔ وہ نظریں نیچی کئے خاموش بیٹھی تھی۔ لیپ کی پیلی پیلی روشنی میں اس کے چہرے  
 نصف حصہ نظر آ رہا تھا جس کی زد دی سے اس کے رخساروں پر ایک روغنی چمک پھیلی ہوئی تھی۔  
 نیاز کئی منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ بیوی نے اس کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کا  
 حرکت نیاز کو بہت شاق گزری۔ وہ جھنجھلا کر اٹھا اور اپنا ٹریک کھول کر اس میں سامان رکھنے لگا۔  
 نے کھونٹیوں پر سے کپڑے اتارے۔ پٹنگ کے نیچے سے جوتے اور چپلیں نکالیں۔ ان کو پرانے  
 میں لپیٹا۔ الماریوں سے کاغذات اور ضرورت کی دوسری اشیاء نکالیں اور ہر چیز سنبھال سنبھال  
 ٹریک میں رکھنے لگا۔

وہ چپ بیٹھی اس کی ہر حرکت دیکھتی رہی۔  
 کئی بار اس کا جی بھی چاہا کہ اس سے پوچھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اسے  
 سے بات کرتے ہوئے جھجک معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ نیاز اس طرز  
 سامان اٹھا کر گھر سے نہ جائے۔

بات یہ تھی کہ بیماری نے اسے اپنا بیٹا بنا دیا تھا۔ اب وہ گھر میں بیٹھ کر محنت مزدوری کرنے  
 بھی قابل نہ رہی تھی۔ نیاز کے جانے کے بعد گھر کا دھند اکس طرح چلے گا؟ سارے اخراجات  
 طرح پورے ہوں گے؟ یہ احساس بڑا لرزہ خیز تھا۔  
 وہ اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھی کہ اچانک نیاز نے اسے مخاطب کیا۔ ”میرا وہ دوسرا“

چشمہ کہاں ہے؟“

مطب: دو خانہ۔ شائق: ناگوار۔ دھند: کام کاج۔ لرزہ خیز: مراد پریشان کر دینے والا۔ غلطاں و پیچاں: الجھی ہوئی، پریشان۔

ن مدنی

لیکن دوسرا انجکشن لگنے کے چند ہی گھنٹے بعد پھر دورہ پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ دھوپ میں سلطانہ کے جہیز کا جوڑا کاٹ رہی تھی۔ باہر گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ شیشم کے درخت پر بوڑھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ سلطانہ غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ پانی گرنے کی آواز رک رک کر بر رہی تھی۔ فضا میں سرگرمی اور ہلچل تھی۔ اچانک اس نے اپنے سینے میں سخت گھٹن محسوس کی۔ ساتھ ہی پہلو میں زور کی ٹیس اٹھی۔ اسے گہرا کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ وہ بے حال ہو کر فرش پر گر گئی۔

نوروزی دیر بعد سلطانہ غسل خانے سے باہر نکلی۔ اس نے دیکھا، ماں زخمی پرندے کی طرح ہارٹ رہی ہے۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ گہرا کر کے ہاس گئی۔ جسم چھو کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے بدحواس ہو گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اسی وقت اٹو آگیا۔ سلطانہ نے اُسے فوراً ڈاکٹر موٹو کے ڈاکٹر لگا کر اسے بلا لائے۔ وہ بے چینی سے ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگی۔

ڈاکٹر اور دیر بعد انونے واپس آکر بتایا کہ ڈاکٹر گھر پر موجود تھا مگر آیا نہیں۔ کہنے لگا میں ایک ڈاکٹر کو کہنے جا رہا ہوں۔ سلطانہ کو ڈاکٹر پر بہت غصہ آیا۔ ماں کی طبیعت اس وقت تک ذرا سنبھل گئی۔ وہ اب آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آہستہ آہستہ ڈاکٹر سید دونوں ہاتھوں سے بھیج لیتی۔

سر ہر تک مریضہ کی حالت اس قابل ہو گئی کہ وہ آنگن سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور ڈاکٹر کو جاکر لٹ گئی۔ لیکن ابھی وہ اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ بات چیت کر سکے۔ کئی بار اس بات کرنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر سینے کی ٹیسوں نے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اسی عالم میں ڈاکٹر لگا گئی۔

اسٹامپ تک پڑی سوئی رہی۔

رات کو اس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی۔ اس نے گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ پیا اور نیچے سے کالہ لہجے ہو کر بیٹھ گئی۔ سلطانہ اس کا سر دبائے گئی۔ رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ سردیوں کی کھر لہجے سر شام ہی سنا پڑ گیا تھا۔ نیاز ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ سلطانہ دیر تک بیٹھی ماں کا

وہ سوچنے لگی۔ کیا واقعی نیاز کو سلطانہ کے بیاہ کی اس قدر فکر ہے یا وہ محض اسے خوش کرنے کے لیے یہ بات کہہ رہا ہے؟ نیاز کے متعلق اس کے دل میں جو شبہات تھے رفتہ رفتہ مٹنے لگے۔ ”لڑکائیں نے دیکھ لیا ہے۔ نہر کے جھکے میں ملازم ہے۔ سوا سو روپے تنخواہ ہے لیکن ابھی آمدنی اچھی ہو جاتی ہے میٹرک تک انگریزی پڑھا ہے۔ باپ پی ڈبلیو ڈی کا ٹھیکیدار ہے کھانے پینے لوگ ہیں۔ میرے پرانے ملنے والے ہیں۔ ہزاروں روپے کا سامان مجھ سے لے چکے ہیں۔ نیاز بڑے اطمینان سے جھوٹ بولتا چلا گیا۔

اس کی باتیں سن کر بیوی کو کسی قدر پشیمانی ہوئی کہ وہ اب تک نیاز کی نیت پر کیوں شک کر رہی۔ ویسے وہ خاصی ہوشیار عورت تھی مگر تھی تو گھر کی بیٹھنے والی۔ سادگی میں مار کھا گئی۔ اپنا بھرے لہجے میں بولی۔

”تم نے کبھی اس بات کا اشارہ تک نہیں کیا۔“

”پہلے تم اچھی تو ہو جاؤ۔ میں کل ہی رشتہ طے کئے لیتا ہوں۔ تم میں انتظام کرنے کی کہ ہے۔ روز تو تم پر بیماری کا دورہ پڑتا ہے۔ اب میں تو بیٹھ کر جہیز تیار کرنے سے رہا۔“

نیاز نے اور بہت سی تفصیلات بتائیں۔ وہ بچوں کی طرح ہنس ہنس کر ایک ایک تفصیل پڑ رہی۔ پھر تو باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ نیاز اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اس کے ہاتھ سے کھیلا جا رہا تھا۔

دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔

\*\*\*

ڈاکٹر موٹو انجکشن لگانے آیا۔ نیاز گھر پر موجود نہیں تھا۔ مگر بیوی نے بغیر کسی حرج و مرج کے انجکشن لگانے کی اجازت دے دی۔ وہ اب کسی طور نیاز کو ناراض ہونے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہونے والی تھی۔ وہ ان دنوں صرف سلطانہ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی زردی مٹنے لگی تھی اور اس پر صحت مندی کے آثار ابھر رہے تھے۔ اب وہ ہر وقت بشاش رہتی۔ بات بات پر ہنس پڑتی۔ بڑی تن دی سے بڑی بھال کرتی۔

سر دبا رہی اور آہستہ آہستہ ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی رہی۔ بہت دیر بعد جب ماں کی آنکھیں گئی تو سلطانہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے نیاز گھر میں آیا۔ اس وقت وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گہری نیند سو رہی تھی۔

نیاز نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ مگر جگانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

\*\*\*

کمرے کے سوگوار سکوت میں سلطانہ کی آواز آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے اچپاں لے کر رو رہا ہے۔ کوئی بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ لیپ بھڑک کر بجھ جائے گا۔ میں قبر کی سی تاریکی چھا جائے گی۔ دروازہ آہستہ سے کھلے گا اور موت کا فرشتہ اندر آجائے گا۔ سلطانہ نے سورہ یٰسین پڑھتے پڑھتے محسوس کیا کہ باہر آگن میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ چپ رک رک کر ابھر رہی تھی۔ سلطانہ کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ اس نے خوف زدہ نظروں دروازے کی جانب دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کواڑ سے لگا اندھیرے میں کھڑا ہے۔

سلطانہ کی ماں پر اب ہر دوسرے تیسرے روز دورہ پڑتا۔ سینے میں رہ رہ کر ٹیس اٹھتی۔ موٹو ان دوروں کو رفع کرنے کی آڑ میں انجکشن پر انجکشن لگاتا رہا۔ وہ عام طور پر رات گئے آتے ہی مریضہ کا حال پوچھتا۔ تسلی دیتا۔ سرخج میں دوا بھر کر انجکشن لگاتا اور اپنا چریک بیک ہاتھ لٹکائے گھر سے باہر نکل جاتا۔

اچانک اس کی آواز گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ رک گئی۔ کمرے میں ہیبت ناک خاموشی چھا گئی۔ سلطانہ کو گھورنے لگا۔ وہ سہمی ہوئی پتھر کے مجسمے کی طرح چپ بیٹھی تھی۔ اسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ پلنگ آہستہ آہستہ چرچر لپا۔ ساتھ ہی ماں کی نحیف آواز

سنسان گئی میں اس کے قدموں کی آواز دور تک سنائی پڑتی۔

ایک روز سویرے ہی سویرے سلطانہ کی ماں کے سینے میں شدید درد اٹھا۔ وہ بے حال، فرش پر گر پڑی۔ دن میں کئی بار اس پر غشی کا دورہ پڑا۔ ان دنوں نیاز کسی کام کے سلسلے میں کراہے ہوا تھا۔ سلطانہ نے ماں کی حالت بگڑتے دیکھی تو فوراً ڈاکٹر موٹو کو بلوایا۔ وہ آتو گیا مگر کوئی دوا دی۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ طبیعت خود بخود سنبھل جائے گی۔

سلطانہ نے جلدی سے گردن گھما کر ماں کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے دیوار کو تک رہی۔ سلطانہ فوراً تخت سے اتر کر ماں کے پاس پہنچی۔ سر ہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔ رات کے آٹھ بجے تک ماں کی طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ وہ اب آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ ماں کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ماں کے چہرے سے مردنی مٹ چکی تھی۔ اب وہ قدرے بہتر لگتی تھی۔

شام کو سخت دورہ پڑا۔ آنکھیں پھر گئیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ بتتی بیٹھ گئی۔ نے ماں کا یہ حال دیکھا تو رور و کر آنکھیں سجالیں۔ صبح سے اس کے منہ میں کھیل تک نہیں گئی۔ دن بھر کا فاقہ اور یہ پہاڑ سا غم۔ اس کا چہرہ کملا گیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے پاگوں کی طرح گھر میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔

پھر اسے خود ہی خیال آیا۔ جلدی سے اٹھ کر وضو کیا۔ جزدان سے قرآن شریف نکالا۔ کے سر ہانے بیٹھ کر سورہ یٰسین کی تلاوت کرنے لگی۔

کمرے میں لیپ روشن تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی میں ماں بستر پر آنکھیں بند کئے پڑی

ماں نے باتیں کرتے کرتے ایک بار سلطانہ کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور لمحہ بھر تک بغور اسے دیکھا۔ پھر اس نے گہری سانس بھری اور آواز سے مخاطب ہوئی ”بیٹا جا کر آپا کنیز کو بلالو۔ کہنا کہ ماں اب بہت ضروری کام ہے۔ اپنے ساتھ ہی ان کو لے کر آنا۔“

اُس عادت مند بچے کی طرح اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ سوچنے لگی۔ اس وقت اماں

گھر میں موت کے آہار۔

آنکھیں بھرتا: آنکھوں کے ڈیلے پلٹ جاتا۔ کھیل: مر اپانی کا قطرہ جزدان: مر اولیٰ غلاف۔

نے خالہ کنیر کو کیوں بلایا ہے؟ وہ ہمیشہ ان کے نام سے چڑتی تھیں۔ اچانک اتنی مہربان کیوں ہو  
تھوڑی دیر بعد تو ایک ادھیڑ عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا جسم بھر  
داہنے گال پر سیاہ مساجد تاجو بھونرے کی طرح چہرے پر بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ نہ چڑا تھا  
میں پان کی گھوری دبی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سلطانیہ کی ماں کو نظر بھر کر  
قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اے اب کیسی طبیعت ہے؟“

سلطانیہ کی ماں نے جواب دیا۔ ”بس اچھی ہی ہے۔ زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔“  
”اے ہے، کیا اول فول بک رہی ہو۔ نہ وقت دیکھتی ہو نہ گھڑی۔ جو منہ میں آیا بھر  
دیا۔ دشمنوں کے منہ میں خاک۔ تم کیوں زندگی کے دن کاٹنے لگیں۔ اللہ میاں تم کو اپنے بچ  
سہروں کی بہار دیکھنا نصیب کرے۔ اے بیماری ہی تو ہے۔ کون نہیں بیمار پڑا۔ اچھی ہو جاؤ  
کیوں چھوٹا کرتی ہو۔“ وہ روانی سے بولتی رہی۔

سلطانیہ نے جھنجھلا کر سوچا۔ یہ لپ جتنی تو گھٹنوں پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ پان چاتی با  
اور ہاتھ مٹکا مٹکا کر بولتی رہے گی۔ اسے بھوک بھی شدت سے لگ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ  
کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماں نیکی سے کمر نکائے آپا کنیر سے باتیں کرتی رہی۔

سلطانیہ کی ماں نے باتوں باتوں میں پوچھا۔ ”آپا! شمت آج کل کیا کر رہا ہے؟“  
”وہیں بجلی گھر میں ہے۔ اب تو بڑا اچھا کارگر ہو گیا ہے۔ تین روپے روز ملنے لگے  
کے علاوہ پریوٹ کام سے کبھی دو کبھی ڈھائی کمالاتا ہے۔ ماشاء اللہ اس وقت سب بھائیوں  
مزرے میں ہے۔“

سلطانیہ کی ماں کچھ دیر خاموش بیٹھی دیوار کو بکتی رہی، پھر بغیر اس کی جانب دیکھتے  
پوچھا۔ ”کہیں اس کا رشتہ بھی ملے کیا۔ ایک زمانہ میں تم گھر لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی تھیں  
”کل ہی ایک جگہ سے بات آئی تھی۔ مگر لڑکی مجھے پسند نہیں آئی۔ ہاتھی کی سوڈ کی  
تھی اس کی۔“

دہانہ: منہ کا سوراخ۔ اول فول بکنا: فضول باتیں کرنا۔ بھڑے: جلدی سے۔ لپ جتنی: بہت باتوں۔ ہاتھی کی سوڈ کی ہانک  
بھری ہانک۔

سلطانیہ کی ماں نے کہا۔ ”اے لڑکی تھی یا کوئی ہتھی۔“ دونوں کو ہنسی آگئی۔  
زلا پر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر سلطانیہ کی ماں کی آواز ابھری۔ ”آپا میری سلطانیہ کو  
دن کے لیے لوگی؟“

آپا کنیر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے اس طرح دیکھا جیسے یقین نہیں آیا ہو۔ مسکرا کر  
”میں نے تو ہمیشہ تم سے کہا کہ گھر کا لڑکا ہے۔ دیکھا بھالا ہے۔ کوئی عیب نہیں۔ کسی فعل میں  
نہ ایک ذرا رنگ سا نولا ہے تو مرد کا کیا روپ رنگ دیکھنا۔ کماؤ پوت ہوتا چاہیے۔ بیوی کو اچھی  
مارنے۔ شمت کو تم جانتی ہی ہو۔ گھوڑا لڑکا کا ہے کو ہے، لڑکیوں سے گیا گزرا ہے۔ کیا مجال کسی  
رانی نظر اٹھا کر بھی دیکھ لے۔“ وہ اپنے منھلے بیٹے کی خوبیاں گنتا رہی اور سلطانیہ کی ماں چپ  
ماں کی باتیں سنتی رہی۔

جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو سلطانیہ کی ماں نے کہا۔ ”دیکھو آپا! میں اب زندگی سے ناامید ہو چکی  
ہم نہ جانے کس وقت آنکھ بند ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں سلطانیہ میری زندگی ہی میں اپنے گھر بار  
بائے دن نہ قبر میں میری روح بکتی رہے گی۔“ یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار رونے لگی۔  
”اے کسی باتیں کر رہی ہو۔ جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔“

”نہیں آپا! اب میں بچوں کی نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے اس فرض سے  
ڈٹ ہو جاؤں۔“

”تم کو تو میں کل ہی لڑکے کو لے آؤں۔ نکاح پڑھوا لو۔ رخصتی چاہے بعد میں کر دینا۔“  
سلطانیہ کی ماں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جس قدر جلد وہ سلطانیہ کے فرض سے فارغ ہو جائے  
اٹھائے۔ وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا وہ نیاز کی واپسی کا  
رکے پاس کے آنے سے پہلے ہی نکاح کر دے؟ یہ بھی ممکن تھا کہ نیاز اس رشتے کو نا منظور  
منہب سے اس نے چند پیسے کمالیے تھے وہ اپنے خاندانی ہونے کا جھنڈا گاڑنے لگا تھا۔  
اور شمت کا باپ سرکاری اسکول میں چیرا سی تھا۔ وہ نچلے طبقے کا آدمی تھا۔ ویسا ہی اس کا  
کل کوئی تاریخ ہے؟“

لکھنؤ: درمیان والا۔ منھلا: درمیان والا۔



”چاند کی ۱۳ تاریخ ہے۔“

”نہیں بھی یہ ۳، ۱۳، ۲۳ ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد تم گھر کے ساتھ قاضی اور گھر کے چند لوگوں کو لے کر آ جاؤ۔“ نوشا کی ماں نے اپنا عندیہ دیا۔

”اچھی بات ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔“

دونوں اس سلسلے میں باتیں کرنے لگیں۔ سلطانہ کی ماں کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ بڑے آہستہ بول رہی تھی۔ آپا کنیز کی بات بات پر باجھیں کھلی جارہی تھیں۔ وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے گال کا سیاہ مسابار بار روشنی میں آ جاتا تو بھونرے کے پر لرزتے ہوئے معلوم ہوتا تھا۔ انشاء میں اتو حشمت کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔

حشمت نے سلطانہ کی ماں کو سلام کیا اور دیوار کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت گہرے نیلے رنگ کی پتلون اور ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ گردن میں انگوٹھ لپٹا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں ماں کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں۔ جسم مضبوط تھا۔

سلطانہ کی ماں نے گردن موڑ کر حشمت کی طرف دیکھا اور بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ اس کالے کلوٹے کے قابل تو نہ تھی۔ اسے تو کسی محل میں بیاہ کر جانا چاہیے تھا۔ وہ تو شہزادی اس نے گہری سانس بھر کر دل میں کہا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کوئی اچھا بر مل جائے۔ مگر اللہ کی یہی تھی۔ سلطانہ کی قسمت ہی میں یہ کالا دھیمہ لکھا تھا۔

حشمت کے آنے کے بعد سلطانہ کی ماں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ادھر ادھر کی بات کرنے لگی۔ حشمت گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت ماں کو بلانے آیا تھا۔ اس گھر کا آنا جانا بہت کم تھا۔ آپا کنیز، سلطانہ کی ماں کی سگی رشتہ دار نہیں تھی۔ بہت دور کا تنہا رشتہ ویسے آپس میں میل جول بھی کم تھا۔ سلطانہ کے لیے وہ کئی بار اشاروں اشاروں میں کہہ چکا تھا۔ دوسروں کے ذریعے بھی پیغام بھجوایا مگر ہر بار سلطانہ کی ماں نے انکار کر دیا۔

آپا کنیز کچھ دیر بعد حشمت کے ساتھ اٹھ کر چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد ماں نے اکیلی لیٹی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ سلطانہ کا رشتہ تو اس نے حشمت کے ساتھ لے کر دیا تھا۔ دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آپا کنیز مزاج کی بہت تیز ہے۔ بڑی بہو سے آئے دن

دن مدنی

نہی رہتی ہے۔ خاموش بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ اس انشاء میں سلطانہ کمرے میں آگئی۔ وہ اس کے لیے دروازہ کھلیا۔ لے کر آئی تھی۔ اس نے ماں کو دودھ پلایا اور بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ چند لمحوں خاموشی چھائی رہی۔ پھر سلطانہ نے پوچھا۔

”اماں! اب کیسی طبیعت ہے؟“

وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں بچوں کی نہیں۔“

”خدا کے لیے اماں ایسی باتیں نہ کرو۔ ہمارا بیٹھا ہی کون ہے۔ لے دے کے ایک تمہارا دم ہے۔“ سلطانہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

”ہاں بیٹی! یہی سوچ رہی تھی کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ اتو پھر بیٹا ذات ہے۔ مجھے تو سب زیادہ تیرا خیال رہ رہ کر سنا تا ہے۔“ ماں نے دلدوز آہ بھری اور سر اوپر اٹھا کر بولی۔

”یا اللہ! ان لا اور ٹوں کا تو ہی نگہبان ہے۔“

سلطانہ نے جلدی سے کہا۔ ”ایسی باتیں نہ کرو اماں۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔“ اس کی آواز رانگی اور وہ بے اختیار رو پڑی۔

ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ”رو نہیں بیٹی!“ اور اس کے سر پر آہستہ آہستہ نو میجرنے لگی۔ سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سسکیاں بھرتی رہی۔ ماں نے نحیف لہجہ میں کہا۔ ”تو رونے بیٹھ گئی۔ مجھے تو تجھ سے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ اس نے گہری سانس بھر لی۔ ”میں تیری ماں بھی ہوں، باپ بھی اور سہیلی بھی۔ میرے علاوہ تیرا اور کون بیٹھا ہے؟“ اس نے گہری سانس بھر لی۔ ”میں تیری ماں بھی ہوں، باپ بھی اور سہیلی بھی۔ میرے علاوہ تیرا اور کون بیٹھا ہے؟“ اس نے گہری سانس بھر لی۔ ”میں تیری ماں بھی ہوں، باپ بھی اور سہیلی بھی۔ میرے علاوہ تیرا اور کون بیٹھا ہے؟“ اس نے گہری سانس بھر لی۔

سلطانہ خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔

ماں کی آواز آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”آپا کنیز نے آج پھر حشمت کا پیغام دیا تھا۔ مجھے تو اس میں کوئی عیب

نظر نہیں آیا۔ سیدھا اور سعادت مند لگتا ہے۔

سلطانہ نے گھبرا کر سوچا۔ ہائے اللہ، یہ املاں کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ وہ تو ایک نمبر نمبر بد معاش ہے۔ پچھلی گرمیوں ہی کی تو بات ہے۔ وہ اس کے گھر میلاد شریف میں گئی تھی۔ وہ پڑھنے کے بعد اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ وہ پانی پینے کے لیے گھڑو پٹی کی طرف گئی۔ وہ کالا کلاہور کی طرح دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ کچھت اندھیرے میں نظر بھی تو نہیں آتا۔ اس زور سے پکڑ کر کہ چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ منہ سے کیسی سڑی ہوئی بو آرہی تھی۔ حرام زادے نے سارا تھوک گالوں چڑھ دیا۔ سلطانہ کو سخت کراہت محسوس ہوئی۔

ماں کہتی رہی۔ ”میں نے تو رشتہ منظور کر لیا ہے۔ آپا کنیر تو کل ہی قاضی کو لانا چاہتی تھی میں نے پر سون عشاء کے بعد کا وقت رکھا ہے۔“

سلطانہ کے سینے پر جیسے کسی نے زور سے پتھر دے مارا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اس نے وحشت نظروں سے ماں کو دیکھا جو تکیے سے پشت ٹکائے رک رک کر بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر درد چھائی تھی۔ آنکھیں بجھتے چراغوں کی طرح دھندلی نظر آرہی تھیں۔ بات کرتے کرتے وہ کہہ پانے لگتی۔

ماں بیٹی کی نظریں ایک بار ملیں اور ماں نے محسوس کیا کہ بیٹی کی آنکھوں میں غم کی برچھا منڈلا رہی ہیں۔ اس کے غم کو وہ جانتی تھی اور جب اس کی شدت اس نے محسوس کی تو بیٹی سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا۔ سلطانہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ زخمی گائے کی طرح بیٹی بڑی آنکھوں سے ماں کو دیکھنے لگی۔

ماں نے اچانک پوچھا۔ ”مسلمان بہت دنوں سے نہیں آیا؟“

سلطانہ اب خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”اُتو کہتا تھا وہ آج کل مصروف ہیں۔“

”نہیں بیٹی! وہ بڑے گھر کا لڑکا ہے، ہم غریبوں کی اسے کیا پرواہ۔ کہیں روزگار سے ملے ہو گا۔ کھاتا کھاتا، عیش کرتا ہو گا ہمارا اس سے کیا میل جول۔ ٹاٹ کا بیوند ٹاٹ ہی میں لگتا ہے۔“

سعادت مند: فریاد دار۔ چھٹا ہوا بد معاش: بڑا بد معاش۔ گھڑو پٹی: کڑی کا وہ چمکنا جس پر گھڑے رکھتے ہیں۔ چڑھ دیا: لگا دیا۔ غرت: کمن۔ مردی چھٹا: موت کے آثار ظاہر ہونا۔

علاؤ الدین

سلطانہ سر جھکا کر ہنچکپاتے ہوئے بولی۔ ”آپ ان کو بلا کر بات تو کیجئے۔“

”بات کرنے کا وقت ہی کہاں رہ گیا ہے۔“

”اس وقت تو مل جائیں گے۔ اُتو کو بھیج کر بلا لیجئے۔“

”تو اتنی رات گئے کیسے جائے گا۔ بچہ ہے اسے ڈر لگے گا۔“ ماں نے عذر پیش کیا۔

سلطانہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”میں اس کے ساتھ چلی جاؤں؟“

ماں نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ سلطانہ کی ماں نہیں سہیلی ہے۔

بیٹی اپنی ماں سے ایسی بات نہیں کہہ سکتی اور جب بیٹی نے منہ پھوڑ کر اس سے سب کچھ کہہ ہی دیا

ناتے اب کیا کرنا چاہیے؟ وہ اسے ایک نامحرم کے پاس جانے کی اجازت دے دے؟ یہ تو بڑی بے

بالی کی بات ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ میرے اللہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے؟ ان

بیٹیوں نے اسے کہیں کانہ رکھا۔ نہیں، اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن میری بیٹی تو رورو کر براہ

ہل کر لے گی۔ زندگی بھر مجھے کو سننے دے گی۔ کہے گی اپنا دل چاہا تو خصم کر کے بیٹھ گئی۔ سو تیلابا

ار پر بٹھا دیا۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اپنی بیٹی کے سامنے گناہ گار ہے۔

سلطانہ نے ماں کو خاموش دیکھ کر کہا۔ ”املاں تم ناراض تو نہیں ہو گئیں؟“ اس کی آواز کانپ

رہی تھی۔

ماں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔ ”نہیں میری بیٹی!“ اس کی سانس بو جھل ہو گئی۔ وہ

بیٹی کی طرح ہانپنے لگی۔ سلطانہ اس کے دل کی دھڑکن صاف سن رہی تھی۔ اس کا سینہ بار بار غبارے کی

لڑا تھن کر سمٹ جاتا۔

ماں ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”جاؤ اُتو کو جگا کر اپنے ساتھ لے لو۔ مگر دیکھو، جلدی آ جانا۔

ایکسٹ میرا دل بڑا گھبرا ائے گا۔ جب تک تم آؤ گی نہیں میں جاگتی رہوں گی۔“

سلطانہ نے آہستہ سے کہا ”اچھا!“

اس کا دل تلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ پٹنگ سے اتر کر نیچے آ گئی۔ جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو

املاں ایک بار پھر ٹوکا۔

”دیکھو جلدی آ جانا۔“

فریاد دار: غیر راجسی۔ کو سننے دینا: برا بھلا کہنا۔ خصم: شوہر۔ دل بلیوں اچھلنا: بہت بے تاب ہونا۔

برکھ دی۔ روشنی ہوتے ہی کمرے کی سفید دیواریں جھلکنے لگیں۔

سلطانہ سیاہ برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ موم بتی کی پوری روشنی اس کی دل کشی نکھر گئی تھی۔ لانبی لانبی پلکوں کے سائے میں اس کی آنکھیں گھنے درختوں سے لاپٹی جھیلوں کی طرح شفاف نظر آرہی تھیں۔

سلمان لمحہ بھر تک اس کے تابندہ چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ اتنی رات گئے یہاں آئیں؟“

”وہ آہستہ سے بولی ”میں اس وقت یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا سنا؟“ اس نے نگاہیں اٹھا کر سلمان کی جانب نہیں دیکھا۔

سلمان تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ کسی ایسی بات کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دراصل اب تک اس سلطانہ کے متعلق سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ اس کی بات کا کیا بدلے اسے خاموش پا کر سلطانہ کا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا۔ اس نے رک رک کر کہا۔

”اب شاید مجھے اس طرح گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ملے۔“

”کیوں؟“ سلمان نے پوچھا۔

سلطانہ نے ہنچکپاتے ہوئے کہا۔ ”اماں میری شادی کر رہی ہیں۔“

سلمان کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ ”کب؟“

”پرسوں رات کو۔“

اسے بھر بھی یقین نہ آیا۔ ”ارے اتنی جلدی!“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”یہ ویسی ہی شادی تو نہیں لائیک بار پہلے ہو رہی تھی۔“

سلطانہ نے اسے تنکھی نظروں سے دیکھا۔ سلمان کی بات اسے پسند نہ آئی۔ اس نے قدرے لہجہ میں کہا۔

”وہ اور بات تھی۔ آپ اس کی وجہ بھی جانتے ہیں۔“

لمحہ بھر وہ خاموش رہی۔ پھر بجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ اماں کی طبیعت دن بدن گرتی جا رہی

اندھ ٹھنڈ تذبذب سوچ بچار، فکر۔

سلطانہ نے ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”نہیں، اماں میں جلدی آجاؤں گی۔“

ماں نے دیکھا، سلطانہ کے چہرے پر سرخی آگئی تھی۔ اس کی آنکھیں مسرت سے ستر طرح جھلملا رہی تھیں۔ اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ اس نے جسم ڈھیلا کر دیا اور نیچے پر سر کر وٹ بدل لی۔

\*\*\*

جاڑوں کی رات تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ راستوں پر اکادکاراہ گیر نظر آرہے تھے۔ سلطانہ اپنے چھوٹے بھائی اٹو کے ہمراہ فلک پینا کے ہیڈ کوارٹر پر پہنچی تو دس بج چکے تھے۔ ملا وقت لا بھریری میں بیٹھا مطالعے میں غرق تھا۔

اچانک باہر اٹو کی آواز سنائی دی۔

وہ اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔ سلمان باہر آیا۔ اٹو کے ساتھ سلطانہ کو اتنی رات گئے حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”ارے تم؟“

سلطانہ نے رساں سے کہا۔ ”آپ تو اب آتے ہی نہیں۔ میں نے سوچا۔ چلو میں“

”چلوں۔“

وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں آج کل بے حد مصروف ہوں۔ ذرا بھی فرصت

ملتی۔ اماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”اب تو روز درودہ پڑنے لگا ہے۔“

سلمان نے سوچا اس طرح باہر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں۔ اس نے سلطانہ

”میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ اندر گیا۔ ڈاکٹر زیدی سے ڈپنری کی کنجی لی اور باہر آکر سلطانہ اور اٹو

ساتھ ڈپنری پر پہنچا۔ قفل کھولا۔ اندر جا کر موم بتی روشن کی۔

اٹو کی موجودگی میں سلطانہ اس سے بات کرتے ہوئے ہنچکپا رہی تھی۔ سلمان نے ا

پریشانی جلد ہی بھانپ لی۔ اس نے الماری سے ایک اور موم بتی نکالی اور سلطانہ کے ہمراہ چھلکا

میں چلا گیا۔ اس میں ایک لمبی میز تھی۔ سلمان نے سلطانہ کو کرسی پر بٹھایا اور موم بتی روشن

ہے۔ بار بار کہتی ہیں کہ میں اب بچوں کی نہیں۔ چاہتی ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے میرا بیاہ کر دیا۔ وہ اپنی زندگی سے بڑی ناامید ہو چکی ہیں۔ آپ نے ادھر ان کو دیکھا نہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر انہیں پھٹتا ہے۔“

سلطانہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے دوپٹے کے آٹھلے سے اڑ پونچھے اور گردن جھکالی۔ موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ سو گوار نظر آ رہا تھا۔

سلمان نے خاموش نظروں سے سلطانہ کے غمگین چہرے کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ یہ بھول گیا معصوم لڑکی جو سرما کی اس سنسن رات کو اس سے ملنے آئی ہے، اسے پسند ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن کیا وہ اس کے لیے فلک پیا چھوڑ سکتا ہے؟ اس جماعت کو جس میں شامل ہونے کے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی ڈگر تبدیل دے گا۔ یہ زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالے لگن تھی جس میں اس کے ارمان، اس کی خوشیاں اور اس کے غم پھیل کر لاکھوں انسانوں میں بٹ رہے تھے۔ یہ ایک اسکائی لارک کی زندگی تھی جس کا نصب العین خدمت خلق تھا۔ عوام کی بھلائی بہتری کے لیے سرگرم عمل رہنا۔ پس ماندگی اور استحصال کے خلاف جدوجہد کرنا۔

اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ سلطانہ سے شادی کرنے کے بعد وہ اسکائی لارک نہ رہے گا اسے فلک پیا چھوڑنا پڑے گا۔ وہ ایک بیوی کا شوہر بن جائے گا۔ پھر اسے اپنی ضروریات پوری کر کے لیے ملازمت کرنا پڑے گی۔ چند سال بعد وہ باپ بن جائے گا۔ اس کے اخراجات بڑھ جائے گا۔ اس کو اور زیادہ کمانا پڑیں گے۔ ایک بچہ، دوسرا بچہ، کئی بچے۔ آمدنی، زیادہ آمدنی۔ یہ ساری زندگی چلتا رہے گا۔ صبح سے شام تک ایک ہی فکر، ایک ہی چکر۔ دنیا میں کروڑوں انسان ہوتے ہیں اور اسی چکر میں ساری عمر پھنسے رہتے ہیں۔ اور ایک روز، ایک بیوی کو، چند بچوں کو، بچوں کے بچوں کو روٹا، بلکتا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں۔

زندگی کا نجات کی طرح وسیع ہے۔ ہر لمحہ ہر گھڑی ارتقا پذیر ہے۔ وہ اس قدر محدود ہو سکتی تو کیا وہ اس لڑکی کو، جس کے لیے کبھی روایا بھی تھا، پاگلوں کی طرح پریشان رہا تھا دوسرے کو سو نہ دے؟ کیا مضائقہ ہے۔ زائد سے زائد یہی ہو گا کہ وہ اس کی زندگی کی ایک لپٹ کا کچھ چھٹا، عمدہ، تکلیف ہوتا، نصب العین، اصل مقصد، استحصال، علم، زیادتی، دنیا سے سدھارنا، مرجانا، ارتقا پذیر ہونا، زندگی کا حزن، مضائقہ، ہرج۔

سلمان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ ہم دونوں ہی کے لیے بہتر ہے۔“ سلطانہ نے دل گرفتہ ہو کر سوچا۔ میں یہاں کیوں آئی؟ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کم سے کم شوق منی جس نے اس کا کلیجہ چیر ڈالا۔ یا اللہ! یہ کیسی تکلیف ہے؟ یہ کیسا دکھ ہے؟ میں کیا کروں؟ اسے میں کیا کروں؟ اس نے محسوس کیا کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ کہیں وہ لڑکھڑا کر گر نہ

سلمان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ ہم دونوں ہی کے لیے بہتر ہے۔“ سلطانہ نے دل گرفتہ ہو کر سوچا۔ میں یہاں کیوں آئی؟ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کم سے کم شوق منی جس نے اس کا کلیجہ چیر ڈالا۔ یا اللہ! یہ کیسی تکلیف ہے؟ یہ کیسا دکھ ہے؟ میں کیا کروں؟ اسے میں کیا کروں؟ اس نے محسوس کیا کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ کہیں وہ لڑکھڑا کر گر نہ

پڑے۔ گہرا کر وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور اکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔

”اب میں چلوں گی۔“

سلمان نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نرم لہجے میں بولا۔

”دیکھو سلطانہ بات یہ ہے۔“ لیکن سلطانہ نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔ آہستہ سے کہا۔

”بات تو اب ختم ہو چکی۔“

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے سلمان کو تکتے لگی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ سلمان کے ذہن

گئی اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں لے لیا۔ جھکی اس کی پیشانی کو چومنا اور

ہو گئی۔ نہ وہ روئی نہ اس نے زبان سے ایک لفظ نکالا۔ چپ چاپ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اُن

اونگھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

سلطانہ نے اسے اپنے ساتھ لیا اور ڈپنسری سے باہر جانے لگی۔ سلمان اس کے پیچھے پیچھے

رہا تھا اس نے کہا۔

”چلو میں تم کو گھر تک چھوڑ آؤں۔ رات بہت گزر چکی ہے۔“

سلطانہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”نہیں، میں اس سردرات میں آپ کو ٹا

نہیں دینا چاہتی۔“ اس کی آواز تھر تھرا رہی تھی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔

سلطانہ چپ چاپ باہر آ گئی۔

دونوں بہن بھائی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ سناٹا تھا۔ رات اور بھیگ چکی تھی۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ د

کے جسم سردی سے کانپ رہے تھے۔

سنان کو چہ بازار سے گزرتے ہوئے دونوں محلے کی گلی میں داخل ہوئے۔ اچانک کتار

زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ رات کے پر ہول سناٹے میں، ان کی آواز بڑی ڈراؤنی

ہو رہی تھیں۔

دونوں سہم کر رہ گئے۔

مگر کے قریب پہنچ کر سلطانہ نے دیکھا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہے۔ اس کا دل زور زور سے

دھکنے لگا۔ وہ گہرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

اس نے سہی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ گھر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ ماں

کمرے میں روشنی تھی۔ وہ سیدھی وہیں پہنچی۔

ماں بچے پر سر رکھے خاموش پڑی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور ایک ہاتھ پلنگ کے

بچے چھل رہا تھا۔

وہ جھپاک سے قریب پہنچی۔ اس نے ماں کا ہاتھ اٹھایا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے

جس ہو کر کہا۔

”اماں، اماں!“

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسی طرح خاموش پڑی رہی۔

سلطانہ نے گہرا کر ماں کے جسم کو ہلایا اور بے قرار ہو کر چیخنے لگی۔

”اماں، اماں! میری اماں! منہ سے تو بولو۔“ ماں اب کیا بولتی۔ وہ تو کب کی مر چکی تھی۔ سلطانہ

نارہ گئی۔ اس کو آواز دیتی رہ گئی۔ اس نے پیچھے میں دیر کر دی۔

ابن علی جامہ نہ پہن سکی۔

ہوا یہ کہ ایک روز کوئی دو بجے شب کو ایک شخص ڈاکٹر زیدی کے پاس آیا۔ ڈاکٹر آدھ گھنٹہ باہر کسی مریض کو دیکھ کر آیا تھا اور تھا ہار اباے خبر سو رہا تھا۔ اسے مجبور اٹھنا پڑا۔ آنکھیں ملتا ہوا ہنری میں گیا۔ ایمر جنسی دواؤں کا بیگ اٹھایا اور اس شخص کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کا چہرہ ڈھلتی ت کے چاند کی طرح زرد تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا اور جلدی جلدی بول رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ڈاکٹر نے اندازہ لگایا کہ کسی عورت کا کیس ہے۔ مریضہ اس کی بیوی تھی اور اس کی حالت بہت لخمی۔

## فصل ہشتم

(۱)

ڈاکٹر زیدی نے جا کر دیکھا۔ مریضہ ایک سیلے ہوئے تنگ و تاریک کمرے میں بوسیدہ چٹائی پر بدمذہبی تھی۔ کمرے میں چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی میں وہ لاش کی مانند بے جان نظر آرہی ت۔ اس کے بال دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکل رہے تھے۔

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا۔ اس نے کوئی زہریلی چیز کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا۔ اس نے مریضہ کا معائنہ کیا تو اس کا خیال درست نکلا۔ اس نے مریضہ کے شوہر سے پوچھا۔

”تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟“

”جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔“ اس شخص کی بات میں ذرا بھی جھجک اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

ڈاکٹر نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا۔ ”پھر اس نے زہر کھانے کی کیوں کوشش کی؟“

اس کا زرد چہرہ حیرت اور خوف کے طے جلے تاثر سے سیاہ پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو دھپکات میں جلدی جلدی گردش دے کر کہا۔ ”زہر؟“ لمحہ بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ ”نہیں“

”امامیہ زہر تو کھا ہی نہیں سکتی۔“ یہ بات اس نے بڑے اعتماد سے کہی تھی۔

”تو پھر آج اس نے کیا کھایا ہے؟“

ڈاکٹر کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ جھجکتے لگا۔ اس کی ہچکچاہٹ سے زیدی کو ایک بار پھر شبہ

ظہر ہوا۔ عمل میں لانا۔ بے سدھ۔ بے ہوش۔

اس کائی لار کوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔

شہر کی پس ماندہ بستیوں میں تعلیم بالغاں کے پانچ مرکز قائم تھے۔ دو دارالمطالعہ ڈپنسری صرف ایک تھی۔ مگر صبح سے شام تک اس پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کئی کئی بل مریض آتے۔ ڈاکٹر زیدی کو سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اکثر راتوں کو لوگ گہری نیند سے کر کے اسے اپنے ہمراہ لے جاتے۔ مگر اس کی پیشانی پر کبھی شکن تک نہ آئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اور کبھی کبھی تو کپڑے تبدیل کئے بغیر مریض کو دیکھنے چلا جاتا۔ اس حلقے میں وہ ڈاکٹر کے بجائے میلیا لگتا۔ اسے ڈاکٹر تسلیم کرنے میں اکثر مریضوں کو مشکل سے یقین آتا۔

ان اداروں کے علاوہ فلک پیانے دستکاری اور گھریلو صنعت کو فروغ دینے کے لیے انڈسٹریل ہوم بھی کھولا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک میں مرد دست کار اور کارگیر کام کرے اور دوسرا خواتین کے لیے تھا۔ اس میں بیوہ اور لاوارث عورتوں کو تربیت بھی دی جاتی اور ان گھریلو مصنوعات بھی تیار کرائی جاتیں۔

انڈسٹریل ہوم کا بیٹا ہوا مال بازار میں فروخت کیا جاتا فلک پیانے پر وگرام تھا کہ شہر بازار میں انڈسٹریل ہوم کی جانب سے ایک شوروم کھول دیا جائے جہاں مصنوعات کی نمائش اور ان کو فروخت بھی کیا جائے۔ اس طرح دکان داروں کو جو کمیشن دیا جاتا تھا وہ بچ جائے۔

سرگرمیاں: مصروفیات، کام کاج، دارالمطالعہ، لائبریری، کان سیلیا، کان صاف کرنے والا، دست کار، ہنرمند، شوروم، ہارون

خانہ کا بیٹا

اس سلسلے میں ڈاکٹر زیدی نے یہ تجویز پیش کی کہ چھوٹے پیمانے پر ایک امدادی بینک قائم کیا جائے جس سے آسان قسطوں اور منافع کی بہت معمولی شرح پر ضرورت مندوں کو قرضے دیئے جائیں تاکہ وہ کوئی کاروبار شروع کر سکیں۔ اس تجویز کو اسکائی لار کوں نے پسند کیا اور یہ طے کیا گیا کہ بینکی بنائی جائے جو بینک کے قیام کے لیے منصوبہ تیار کرے۔

بغیر ہر کے اندر ہی اندر کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ صفدر بشیر نے اس مقصد کے لیے ایک نو مزید ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ امدادی بینک قائم ہو گیا۔

فلک بیباک کام جس قدر وسیع ہوتا جا رہا تھا اسکائی لار کوں کی مصروفیت بھی اسی قدر بڑھتی رہی تھی۔ ہر اسکائی لار کوں کو کئی کئی شعبوں میں کام کرنا پڑتا۔ چنانچہ مجلس عاملہ کے سامنے یہ تجویز پیش آئی کہ اسکائی لار کوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ بہت سے نوجوان اس کے لیے آمادہ نہ رہے۔ ہاشور اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسکائی لار کوں کی تعداد بڑھا کر پندرہ کر لی جائے۔ اس سے زیادہ تعداد بڑھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ صفدر بشیر اب تک پچاس ہزار روپے بیک کے فنڈ کے لیے دے چکا تھا۔ تنظیم اس پر زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ چندے کے بوجھ میں کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر اس کے لیے ہنوز کسی مہم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ فلک اپنے منصوبوں کے لیے روپے کی ضرورت تھی جو روز بروز شدید ہوتی جا رہی تھی۔

\*\*\*

فلک بیباک کی مجلس عاملہ سنجیدگی سے فنڈ کے مسئلے پر غور کر رہی تھی کہ ایک رات خان بہادر نے اس کی اطلاع ملی۔

اسکائی لار کوں کو اس کی آمد پر سخت حیرت ہوئی۔ صفدر بشیر اور علی احمد نے لاہور میں تھوڑے ملاقات کی۔

برمانچ کی ایک خوشگوار رات تھی۔ اس وقت نونج چکے تھے۔ خان بہادر ہلکے پھلکے لباس میں صبح معمول اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ لڑائی جھگڑے کی کوشش کر رہا تھا جس سے اس کے انداز میں تسخیر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہاتھ باندھ کر سگریٹیں لایا تھا جو بازار میں تالیب تھیں۔ اس نے دونوں اسکائی لار کوں کو اصرار کیا کہ سگریٹ پلائی اور لائٹر نکال کر ان کو سلگایا بھی۔ یہ لائٹر خالص سونے کا بنا ہوا تھا اور اس پر

ہوا کہ یہ ضرور خود کشی کا کیس ہے۔ اسے ضرور اس کا علم ہے اور چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

نے کسی قدر تھکے لہجے میں کہا۔

”بتاتے کیوں نہیں اس نے کیا کھایا ہے؟“

اس شخص کا چہرہ مردے کی طرح خاکستر نظر آنے لگا۔ وہ ڈاکٹر سے نظریں نہ ملا سکا۔ طرہ کی طرح گردن جھکا کر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور حلق سے اس طرح نکلتی رہی تھی جیسے سسکیاں بھر رہا ہو۔ اس نے جوابات بتائی اسے سن کر ڈاکٹر زیدی لرز کر رہ گیا۔

وہ شخص چار مہینے سے بے روزگار تھا۔ پہلے کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ عام تحفہ چھاننی کے زمانے میں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اب تک نہ تو اسے ملازمت ملی تھی اور نہ سرمایہ تھا جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیتا۔ پرسوں صبح سے دونوں میاں بیوی سڑ فاقہ کشی کر رہے تھے۔ مگر سب سے زیادہ پریشانی شیر خوار بچے کی جانب سے تھی جس نے دو روز کے لیے ماں کی چھاتیوں کو نونج نونج کر زخمی کر دیا تھا۔ آج شام وہ قرض ادھار کا بندوبست کرنے کے لیے واپس آکر دیکھا۔ بیوی بار بار تکتے کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ جب بچے نے زیادہ پریشان کیا اور اس کا بلکنا اس سے دیکھا نہ گیا تو وہ کوڑا ڈالنے والے ڈرم میں سے کھانے کی ٹاپا ڈھونڈ کر لائی تھی اور ان کو کھلایا بھی تھا۔ اس کے بعد اس کی یہ حالت ہو گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اس شخص کو دیکھا جو ملزموں کی طرح گردن جھکائے شرمسار کھڑا تھا۔ چہرہ سانپ کے پیٹ کی طرح مثیلا نظر آ رہا تھا۔ دیوار کے قریب اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی اس کے سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر گندے کپڑے مثیلا ہوا ایک بچہ لاش کی مانند پڑا تھا۔ طاق میں رکھا ہوا چراغ بار بار بھڑکتا۔ روشنی سے آنکھ بھٹی کر رہی تھی۔ اندھیرا کبھی اجالا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ اچانک خوفناک چیخیں بلند ہونے والی ہیں۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دوا دی۔ اس کی جیب میں اس وقت پانچ روپے تھے، وہ بھی اسے دیئے اور واپس ہیڈ کوٹر آگیا۔ بستر پر لیٹا دیر تک مریضہ اور اس کے شوہر کے متعلق غور کر رہا مہینے کے آخر میں جب اس نے فلک بیباک کے اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کی تو اس واقعے کا نام لے کر پرڈ کر گیا۔

ڈاکٹر: جی کے رنگ کا تخفیف کی۔

ایک قیمتی پکھراج بڑا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں پکھراج جھللاتا تو کمرے میں ستارے جگمگانے لگے۔  
خان بہادر نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی لائن سے کیا۔

مگر علی احمد کو ان باتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ خان بہادر کے آنے سے پیشتر ہمارے سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ تیار کر رہا تھا اور یہ سوچ کر آیا تھا کہ خان بہادر سے جلد ہی ہمارے حاصل کر لے گا صفر بشیر کچھ اور بھی زیادہ اس کی باتوں سے اکتایا ہوا تھا۔ آخر اس نے خان بہادر کی بات کاٹ کر کہا۔

”معاف کیجئے خان بہادر صاحب! ٹھیک ساڑھے نو بجے ہماری ایک میٹنگ ہے۔“

خان بہادر جہاں دیدہ اور صحبت یافتہ آدمی تھا۔ اس نے ایک ہی جملہ سے اندازہ لگالیا کہ وہ زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔  
”بھئی میں کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔“

صفر بشیر نے حیرت سے پوچھا۔ ”یعنی؟“

خان بہادر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنا بریف کیس کھولا۔ چاکر ایک نکالی اور پچیس ہزار کا چیک کاٹ کر صفر بشیر کے سامنے ڈال دیا۔ دونوں اس کائی لارک فور۔ چیک دیکھنے لگے۔ خان بہادر مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

”یہ آپ کی امانت ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ آج میں نے سوچا ہے۔“

علی احمد نے کہا۔ ”بڑا نیک جذبہ ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خندہ تھا۔  
خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بس آپ لوگوں کے تھوڑے سے تعاون فراہم کر رہا ہوں۔“ اس کے لہجے میں عجز تھا۔  
صفر بشیر نے فوراً پوچھا۔ ”کس قسم کا تعاون؟“

”بات یہ ہے کہ آج سے تقریباً تین ماہ بعد یعنی مئی میں میونسپل بورڈ کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ اس حلقے سے امیدوار ہوں۔ ویسے میرا اپنا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا۔ آپ ہی جیسے بعض کرم مند لوگوں کا اسرار ہے کہ میں انتخابات میں ضرور حصہ لوں۔ مجبوراً مجھے آمادہ ہونا پڑا۔“ خان بہادر نے مزید بول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ”سارا پروگرام بن چکا ہے۔ مگر آپ کے

پکھراج: ایک قیمتی پکھراج بڑا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں پکھراج جھللاتا تو کمرے میں ستارے جگمگانے لگے۔  
خان بہادر نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی لائن سے کیا۔  
مگر علی احمد کو ان باتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ خان بہادر کے آنے سے پیشتر ہمارے سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ تیار کر رہا تھا اور یہ سوچ کر آیا تھا کہ خان بہادر سے جلد ہی ہمارے حاصل کر لے گا صفر بشیر کچھ اور بھی زیادہ اس کی باتوں سے اکتایا ہوا تھا۔ آخر اس نے خان بہادر کی بات کاٹ کر کہا۔  
”معاف کیجئے خان بہادر صاحب! ٹھیک ساڑھے نو بجے ہماری ایک میٹنگ ہے۔“  
خان بہادر جہاں دیدہ اور صحبت یافتہ آدمی تھا۔ اس نے ایک ہی جملہ سے اندازہ لگالیا کہ وہ زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔  
”بھئی میں کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔“  
صفر بشیر نے حیرت سے پوچھا۔ ”یعنی؟“  
خان بہادر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنا بریف کیس کھولا۔ چاکر ایک نکالی اور پچیس ہزار کا چیک کاٹ کر صفر بشیر کے سامنے ڈال دیا۔ دونوں اس کائی لارک فور۔ چیک دیکھنے لگے۔ خان بہادر مسکین سی شکل بنا کر بولا۔  
”یہ آپ کی امانت ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ آج میں نے سوچا ہے۔“  
علی احمد نے کہا۔ ”بڑا نیک جذبہ ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خندہ تھا۔  
خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بس آپ لوگوں کے تھوڑے سے تعاون فراہم کر رہا ہوں۔“ اس کے لہجے میں عجز تھا۔  
صفر بشیر نے فوراً پوچھا۔ ”کس قسم کا تعاون؟“  
”بات یہ ہے کہ آج سے تقریباً تین ماہ بعد یعنی مئی میں میونسپل بورڈ کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ اس حلقے سے امیدوار ہوں۔ ویسے میرا اپنا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا۔ آپ ہی جیسے بعض کرم مند لوگوں کا اسرار ہے کہ میں انتخابات میں ضرور حصہ لوں۔ مجبوراً مجھے آمادہ ہونا پڑا۔“ خان بہادر نے مزید بول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ”سارا پروگرام بن چکا ہے۔ مگر آپ کے



تعاون کے بغیر یہ پروگرام ادھر رہا ہے۔“

صفر بشیر نے مسکرا کر کہا۔ ”ہمارے تعاون کے بغیر بھی آپ الیکشن لڑ سکتے ہیں۔“

”آپ لوگوں کا تعاون ضروری ہے۔ آپ کی تنظیم نے اس علاقے کے لوگوں کی بہتری لیے جو کچھ کیا ہے اور جس قدر آپ لوگوں کی یہاں عزت ہے اسے کون نہیں جانتا۔ بلکہ اگر بات کو آپ خوشامد نہ تصور کریں تو میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ گنتی کے رہنے والے تو آپ کی پرستش کی حد تک عزت کرتے ہیں۔ اور وہ بے جا بھی نہیں۔ آپ کے کارنامے اسی جذبہ مستحق ہیں۔“

علی احمد نے کہا۔ ”دیکھئے خان بہادر صاحب! فلک پیا کافی الحال کوئی سیاسی پروگرام نہیں اس لیے اگر آپ ہم کو ان کا نمٹوں میں نہ گھسیٹیں تو بہتر ہے۔“

”میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ہمدردی مجھے مل جائے۔ یہی بہت ہے۔“

بہادر نے چیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال آپ میرا یہ نذرانہ قبول کر لیں۔ آ بھی جو کچھ ہو سکا خدمت کرتا رہوں گا۔“

علی احمد نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ ”یہ تو آپ ایک طرح کی فلک پیا کو رشوت دے رہے ہیں۔“

”نہیں صاحب! یہ رشوت کیسے ہو سکتی ہے؟“

صفر بشیر نے کہا۔ ”چلے رشوت نہ سہی۔ فلک پیا کے تعاون کی قیمت تو بہر حال آپ رہے ہیں۔“

علی احمد نے صفر بشیر کی تائید کی۔ ”اور اگر یہ تعاون کی قیمت ہی ہے تو معاف کیجئے خان! صاحب! آپ نے بہت کم قیمت لگائی۔ میں اس پر احتجاج کروں گا۔“

خان بہادر دونوں کی باتوں سے سخت چکرایا۔ گھبرا کر بولا۔ ”آپ لوگ مجھے غلط سمجھا رہے ہیں۔ میں تو پورے خلوص کے ساتھ آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

دونوں اس کے خلوص کو ایک بار آزما چکے تھے۔ وہ تجربہ ان کے لیے کافی تھا۔ لہذا ان کو بہادر کی باتوں پر ذرا بھی اعتبار نہ آیا۔ علی احمد نے کہا۔

”دیکھئے خان بہادر صاحب! آپ کا روبرو آدمی ہیں۔ اس بات سے تو آپ انکار نہیں کرتے۔“

پیش بھی کریں تب بھی آپ کسی مسئلہ کو کاروباری انداز سے دیکھے بغیر ہی نہیں سکتے۔“

صفر بشیر نے کہا۔ ”اور آپ تو بڑے مجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔ یہ صلاحیت خدا کی کو کم ہی ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک کامیاب تاجر بننا چاہوں تو کبھی نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے بے مخصوص سپر امنٹ کی ضرورت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔“ وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔

خان بہادر بہت شپٹایا۔ مگر وہ اتنی جلد ہتھیار ڈالنے والا اسامی نہیں تھا۔ اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”اگر آپ حضرات نے تعاون کیا اور خدا کا فضل شامل رہا تو میں میونسپلٹی کا ممبر بنی ہو جاؤں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ میں عوام کی کس خلوص اور نیک نیتی سے خدمت کرتا ہوں۔“

”آپ کے خلوص کا تو ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔“ صفر بشیر نے طنز کیا۔

علی احمد نے بھی معاف نہ کیا۔ فوراً ہی وار کیا۔ ”اور آپ کی نیت پر کون کافر شبہ کر سکتا ہے۔ آپ کے ایسے مرد مومن کی نیت پر تو شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

خان بہادر پر لانا گھاگ تھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ بات بننے کے بجائے جھڑپ جاری ہے۔ اس نے ہٹ پٹا ہٹا دیا۔ چہرہ باوقار بنا کر بولا۔

”دیکھئے یہ بات تو آپ لوگ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی جماعت یا تنظیم کا کوئی سیاسی اکرام نہیں ہے۔ آپ انتخابات میں کسی نہ کسی امیدوار کی مدد تو ضرور ہی کریں گے۔ اگر وہ بہادر آپ مجھے ہی مان لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری ذات سے آپ کو فائدہ ہی پہنچے گا۔“

علی احمد نے کہا۔ ”یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فلک پیا کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔“

خان بہادر کی رقم تو بہت تھوڑی ہے۔ میں اس پر پہلے ہی احتجاج کر چکا ہوں۔“

خان بہادر نے جواب دیا۔ ”چیتیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اس سے آپ ایک بہتر دفتر تعمیر کئے۔ یہ عمارت تو آپ کی تنظیم کے ہر گز شایان شان نہیں۔ یہاں بجلی تک تو ہے نہیں۔“

میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔ بہر حال آپ کی بات کا احترام بھی ضروری ہے۔ چلے ۳۰ ہزار لپٹا چیک کاٹ دیتا ہوں۔“

علی احمد بولا۔ ”نہیں خان بہادر صاحب یہ تو بہت کم قیمت لگائی آپ نے۔ کچھ اور بڑھائیے۔“

بولی۔ ”خان بہادر نے اس کے طہر پر زیادہ توجہ نہ دی اب وہ قطعی کاروباری موڈ میں آگیا۔“ جناب ۳۰ ہزار روپے میں آپ دو اچھے خاصے اسکول قائم کر سکتے ہیں جن کو قاعدے سے جائے تو پانچ ہزار ہر ماہ آسانی سے کمائے جاسکتے ہیں۔ اس رقم سے سال بھر بعد آپ دو نئے اسکول کھولنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

صفر بشیر نے کہا۔ ”خان بہادر صاحب آپ کے اس قیمتی مشورے کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔ اس وقت پانچ تعلیمی مرکز قائم ہیں۔ فی الحال مزید مرکز کھولنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ان سے بھی زیادہ اہم تجاویز ہیں جن پر فوری طور پر کام شروع کرنے کی ضرورت ہے۔“

خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے دوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گٹھی میں گواہوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو روز دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔“

خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لا جواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

خان بہادر نے فوراً جواب دیا۔ ”آپ کی سوجھ بوجھ کا تو میں پہلی ہی ملاقات میں قائل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا ذریعہ خیر و خیر داغ عطا کیا ہے۔ ضرورت پڑی تو ان بیش بہا مشوروں کے لیے ضرور آپ کو زحمت دیں گے۔ مگر خان بہادر صاحب یہ چالیس ہزار کی رقم بھی کم ہے۔“

خان بہادر نے ۵ ہزار اور بڑھادی۔ دونوں اسکائی لارکوں نے اس رقم کو بھی قبول کر کے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر جیل و جت کرنے کے بعد خان بہادر ۵۰ ہزار تک پہنچ گیا۔

”یہ میرا آخری آخر ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ مگر اس کے لیے یہ بنیادی شرط“

صفر بشیر نے کہا۔ ”خان بہادر صاحب آپ کے اس قیمتی مشورے کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔ اس وقت پانچ تعلیمی مرکز قائم ہیں۔ فی الحال مزید مرکز کھولنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ان سے بھی زیادہ اہم تجاویز ہیں جن پر فوری طور پر کام شروع کرنے کی ضرورت ہے۔“

خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے دوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گٹھی میں گواہوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو روز دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔“

خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لا جواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

خان بہادر نے فوراً جواب دیا۔ ”آپ کی سوجھ بوجھ کا تو میں پہلی ہی ملاقات میں قائل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا ذریعہ خیر و خیر داغ عطا کیا ہے۔ ضرورت پڑی تو ان بیش بہا مشوروں کے لیے ضرور آپ کو زحمت دیں گے۔ مگر خان بہادر صاحب یہ چالیس ہزار کی رقم بھی کم ہے۔“

خان بہادر نے ۵ ہزار اور بڑھادی۔ دونوں اسکائی لارکوں نے اس رقم کو بھی قبول کر کے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر جیل و جت کرنے کے بعد خان بہادر ۵۰ ہزار تک پہنچ گیا۔

”یہ میرا آخری آخر ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ مگر اس کے لیے یہ بنیادی شرط“

خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے دوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گٹھی میں گواہوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو روز دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔“

خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لا جواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے دوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گٹھی میں گواہوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو روز دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔“

خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لا جواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے دوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گٹھی میں گواہوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو روز دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔“

خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لا جواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے دوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گٹھی میں گواہوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو روز دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔“

خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لا جواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے دوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گٹھی میں گواہوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو روز دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔“

خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی جانتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لا جواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

عبداللہ

علی احمد نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اور میرا بہت صاف سی بات ہے۔ دیکھئے نا، جب آپ میونسپل بورڈ کے ممبر بن جائیں گے تو آپ آسٹریلیا اپنے جیتنے اور بھانجوں کے نام سے ٹھیکے لے سکتے ہیں۔ اگر ہر سال دو تین ٹھیکے بھی مل گئے تو دو لاکھ کمایا کوئی مشکل نہیں۔ پھر آپ تو پانچ سال ممبری کریں گے۔ بیس پچیس لاکھ بھی آپ ایسے تجربہ کار شخص نے نہ پیدا کئے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ رشوتوں سے جو رقم ملے وہ علیحدہ رہی۔ کوشش کی جائے تو سماں کی اور بھی بہت سی صورتیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔“

علی احمد بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔ خان بہادر کا چہرہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار ہونٹ چارہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔

علی احمد نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کسی فیکٹری یا کارخانے پر دس بارہ روپے لگانے سے تو یہ کہیں اچھا پروجیکٹ ہے کہ میونسپلٹی کی ممبری حاصل کی جائے۔ بلکہ خداوند دے تو چیز مین بننے کی بھی جوڑ توڑ کرنی چاہیے۔ پھر تو دارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں غلط نہیں کہہ رہا؟“

خان بہادر سے ضبط نہ ہو سکا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”کیا آپ مجھے اتنا خود غرض اور کردار سمجھتے ہیں؟ میں ایک معزز شہری ہوں۔ میں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

علی احمد نے تسلی دیتے ہوئے رساں سے کہا۔ ”خان بہادر صاحب! کاروبار میں اس طرح جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا پھر آپ تو ماشاء اللہ بڑے منجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔“

”لا حول ولا قوۃ! بزنس سے میونسپلٹی کے الیکشن کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

صفر بشیر کے لیے اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا وہ حقیقت پسند فوجوان تھا۔ کئی سال تک یورپ اور انگلستان میں رہ چکا تھا گفتگو میں بے جا رسمی تکلفات اور چٹاں چٹیں کا قائل نہ تھا۔ اس نے جھکے لہجے میں کہا۔ ”تو پھر یہ پچاس ہزار روپے کی رقم آپ فلک بیا کو کیوں پیش کر رہے ہیں؟ کیا آپ اسکاٹی لارکوں کو ضمیر فروش اور ایکسپلاٹر سمجھتے ہیں؟ آپ کا ابتدا اسی سے ہمارے ساتھ بھرا رہا ہے۔ مگر ہم نے کبھی آپ کی باتوں پر تارا منگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس لیے کہ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے انداز میں بنیادی فرق ہے۔ آپ کے نزدیک دولت، زندگی کی سب سے بڑی قوت

\*\*\*

صفر بشیر نے کلام کرتا: کسی کی بات کاٹنا۔ دو ٹوک بات کہنا۔ صاف صاف بات کہنا۔ سستا نا آرام کرنا۔

حقیقت پسند۔ سچائی کو پسند کرنے والا۔ بے جا فضول۔ چٹان چٹیں۔ بکرہ مار، بیادید۔ ضمیر فروش۔ بے غیرت۔

(۲)

علی احمد اور صفدر بشیر کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے فلک پیا کا اجلاس منعقد ہوا رپورٹ دیر تک بحث ہوتی رہی۔

تمام اسکائی لار کوں نے متفقہ طور پر ان دونوں کے اقدام کو سراہا اور خان بہادر کی خدمت کی۔ اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ فلک پیا کو میونسپلٹی کے انتخاب میں اس طرح سے اپنا امیدوار کھڑا کرنا چاہیے۔ مگر کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکا۔ اجلاس دوسرے دن بھی جاری رہا اور یہ تجویز زیر بحث رہی۔

اسکائی لار کوں کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ فلک پیا کو کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ جو لوگ الیکشن لڑنے کے حق میں تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر انتخابات میں حصہ لیا گیا تو خان بہادر یا اسی قبیل کے لوگ میونسپلٹی کے ممبر بنیں گے جو خدمت خلق کی آڑ میں ناجائز طریقے پر عمل کریں گے۔

دوروز کی طویل بحث کے بعد اسکائی لارک آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ فلک پیا صرف اسی طرح سے الیکشن کے لیے اپنا امیدوار کھڑا کرے۔ اس لیے کہ شہر کے دوسرے حصوں میں ان کے کامیابی پر فخر ہنوز ست تھی۔ اس کے علاوہ فنڈ کی کمی تھی۔ کام کرنے والے بھی زیادہ نہیں تھے۔

فلک پیا کے امیدوار کی نامزدگی کے لیے تین اسکائی لار کوں کے نام پیش کئے گئے۔ صفدر بشیر علی احمد اور ڈاکٹر زیدی۔ لیکن رائے شماری شروع ہونے سے پہلے ہی علی احمد نے اپنا نام واپس لے لیا۔ وہ الیکشن میں حصہ لینے کے حق میں تھا مگر خود امیدوار بننا نہیں چاہتا تھا۔ دو ٹک ہوئی اور ایک مقابلہ میں ۱۰ کی اکثریت سے ڈاکٹر زیدی کو منتخب کر لیا گیا۔ اسے منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ اس حلقے میں وہ بے حد ہر دلعزیز تھا۔

نامزدگی کا اعلان ہونے کے بعد اسکائی لار کوں نے دیکھا کہ صفدر بشیر کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ اس وقت کسی قدر بے چین نظر آ رہا تھا۔ بار بار پائپ پر لمبے لمبے کش لگا کر بہت سادہ حواس نکالتا اگل دیتا۔

مگر ڈاکٹر زیدی کی کامیابی پر سب سے پہلے اسی نے مبارک باد پیش کی۔

خدمت کی بھائی کی۔ قبیل: حم۔ ہر دلعزیز: جس کو سب پسند کریں۔

لعلق گروہ کے گروہ: خوش و خوش: گرم جوش: رخنہ اندازی کرتا: رکاوٹ ڈالتا: سینہ سپر ہونا: ڈٹ جانا۔

خدا کی مدد

چھوڑا اسادھیڑ آدمی تھا۔ نیلام کرنے والوں کی طرح ایک بات کئی کئی بار دہراتا۔ اور بات بات پر قہقہہ لگاتا۔ پچھلے سال تک وہ محکمہ سول سپلائی میں بڑا عہدے دار تھا۔ مگر رشوت خوری کے اسکینڈل میں ملوث ہونے کے باعث ملازمت سے مستعفی ہو گیا تھا۔ سرکاری حلقوں میں ان کی اس کا اثر و سونخ تھا۔ ملازمت چھٹ جانے کا اسے ذرا ملال نہ تھا۔ بینک میں اس کا ۵ لاکھ روپیہ موجود تھا شہر میں چار شاندار کوٹھیاں تھیں۔ کئی کارخانوں میں اس کے حصے تھے اور ایک آئل مل کا بھی ڈائریکٹر تھا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر خان بہادر کے مقابلے میں اس کا پروپیگنڈا کا خیال خان بہادر اپنی انتخابی مہم پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ اس کے کارکن جھگڑتی ہوئی کاروں آتے اور ووٹروں کو خریدنے کے لیے نت نئے ریٹ مقرر کرتے۔ جوں جوں انتخابات کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھیں ووٹوں کا ریٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر قسم کی ٹھیکیدار مقرر کر دیے تھے جن کے ایجنٹ ووٹوں کا سودا کرنے میں مصروف تھے۔

کاغذات نامزدگی منظور ہو چکے تھے اور ہر امیدوار نے انتخابی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ عبد الحمید کی حمایت میں ووٹروں پر سرکاری حکام دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس حلقے کے جو بازنوگ نے ان کو آئے دن تھانوں میں بلایا جاتا اگر وہ عبد الحمید کی مخالفت کرتے تو پولیس کے افسران ان کے خلاف مقدمے قائم کرنے کی دھمکی دیتے۔ غنڈوں کے ذریعے ان کو پریشان کرتے۔ جو لوگ سرکاری ملازم تھے ان کو اپنے محکمے کے افسروں کی جانب سے ہدایتیں دی گئی تھیں کہ عبد الحمید کی طرح سے مدد کریں۔

خان بہادر نے فی ووٹ دس روپے تک کاریٹ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے تین انتخابی دفاتر تھے جن میں آئے دن ضیافت ہوتی۔ دیکھیں چڑھتیں۔ بڑی فیاضی سے مرغن کھانے کلاتے جاتے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے تھے اور سیدھے سادے لوگوں کو چمکے دینے کا جانتے تھے، خان بہادر نے انہیں چھانٹ چھانٹ کے اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔ ان کی یومیہ اجرت مقرر تھی اور ۵ روپے سے ۱۵ روپے تک کاریٹ تھا۔ اس کے علاوہ ووٹروں کو کھانے کی الاٹمنٹ اور ملازمتیں دلوانے کا لالچ بھی دیا جاتا۔

خان بہادر خود بھی حلقے کا دورہ کرتا۔ اس کی شاندار کار نمودار ہوتی تو اس کے اہلی موال بھی خان بہادر کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ خرم، چاق چوبند، ہوشیار، پھنکارا مار کر، آلتی پالتی مار کر، پاؤں پھیلا کر، بلا کے، زبردست، محاذ، جگہ۔ چھوڑا، بد تیز، ملال، افسوس، ضیافت، دعوت، فیاضی، سخاوت، چمک، دھوکا، گر، فن، بہر، اہلی موالی، نوکر چاکر۔

خان بہادر نے فی ووٹ دس روپے تک کاریٹ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے تین انتخابی دفاتر تھے جن میں آئے دن ضیافت ہوتی۔ دیکھیں چڑھتیں۔ بڑی فیاضی سے مرغن کھانے کلاتے جاتے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے تھے اور سیدھے سادے لوگوں کو چمکے دینے کا جانتے تھے، خان بہادر نے انہیں چھانٹ چھانٹ کے اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔ ان کی یومیہ اجرت مقرر تھی اور ۵ روپے سے ۱۵ روپے تک کاریٹ تھا۔ اس کے علاوہ ووٹروں کو کھانے کی الاٹمنٹ اور ملازمتیں دلوانے کا لالچ بھی دیا جاتا۔

خان بہادر نے فی ووٹ دس روپے تک کاریٹ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے تین انتخابی دفاتر تھے جن میں آئے دن ضیافت ہوتی۔ دیکھیں چڑھتیں۔ بڑی فیاضی سے مرغن کھانے کلاتے جاتے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے تھے اور سیدھے سادے لوگوں کو چمکے دینے کا جانتے تھے، خان بہادر نے انہیں چھانٹ چھانٹ کے اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔ ان کی یومیہ اجرت مقرر تھی اور ۵ روپے سے ۱۵ روپے تک کاریٹ تھا۔ اس کے علاوہ ووٹروں کو کھانے کی الاٹمنٹ اور ملازمتیں دلوانے کا لالچ بھی دیا جاتا۔

دنوں دیوانہ وار کام کر رہا تھا۔ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے چند گھنٹے اسے رات کو سونے لیے ملتے۔ ہفتوں شیوہ تک کرنے کا ہوش نہ رہتا۔ وہ روزانہ سویرے ہی سویرے اپنے گروہ میٹنگ کرتا اور دھوپ نکلنے سے پہلے ہی کام پر نکل جاتا جگہ جگہ تقریریں کرتا۔ پوسٹر لگا رہا، میں ہینڈل بانٹتا۔ ان سے تبادلہ خیال کرتا اور رات کو پابندی سے تعلیم بالغاں کے مرکز میں لیتا۔ اس عرصے میں ایک روز بھی وہ غیر حاضر نہیں رہا۔

رات گئے ہیڈ کوارٹر لوٹنا تو دن بھر کے کام کی پوری رپورٹ پیش کرنا ان دنوں فلک بیا اجلاس بھی ہوتے۔ سلمان ہر اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتا۔ بحث میں بڑھ چڑھ کر بھڑیہ ان مصروفیات کے علاوہ فلک بیا کی جانب سے اسے یہ بھی ہدایت ملی کہ وہ صفر ریٹر ساتھ مزدوروں کی یونین میں کام کرے۔ یہ ٹریڈ یونین کچھ ہی دنوں پہلے قائم ہوئی تھی اور اس قیام میں فلک بیا کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے قیام کی صورت یہ ہوئی کہ مزدور آئے دن اپنی کوئی شکایت لے کر آتے اور اس کا ٹی لار کوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت بیا کی کوئی باقاعدہ یونین نہ تھی۔ ایک آدھ بار ایسی کوشش بھی کی گئی مگر مالکان نے طرح طرح کے کنڈوں سے اسے ختم کر دیا۔ لہذا فلک بیا کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ مزدوروں کی بیا یونین بنا کر اسے رجسٹر کر لیا جائے۔

اس کے تمام عہدے دار مزدور ہی تھے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے فلک بیانے مسافر بڑا مقرر کیا تھا۔ مگر جب یونین کا کام بڑھنے لگا تو سلمان کی ڈیوٹی بھی یونین میں لگا دی گئی۔ اس نے میں بھی سلمان پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہا تھا۔

سلمان جس قدر سرگرم اسکائی لارک بنتا جا رہا تھا صفر بشیر اسی قدر بے حس اور لا پرواہ تھا۔ اس کے انداز میں بے نیازی آگئی تھی۔ اس کی یہ بے نیازی اسکائی لارک اس وقت سے کر رہے تھے جب سے ڈاکٹر زیدی اس کے مقابلے میں میونسپل بورڈ کے انتخابات کے لیے ٹک امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔

اب وہ کھویا کھویا سار ہوتا۔ بیشتر وقت لائبریری میں نظر آتا یا اپنے کمرے میں سوتا رہتا۔

دیوانہ دہر: دیوانوں کی طرح۔ جیسے کنڈا: چالاکی، عیاری۔

”اس اجتماع کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہاں بہت سے کچھوے اکٹھا ہو گئے ہیں۔“  
 حاضرین نے چونک کر بے چینی سے پہلو بدلے۔ صفدر بشیر کہتا رہا۔ ”جی ہاں کچھوے، ایسے  
 کچھوے جنہوں نے اپنے پیر سمیٹ کر پیٹ کے اندر کر لیے ہیں اور گردن نکالے یوں دیکھ رہے ہیں  
 جیسے کوئی مداری ہوں اور ابھی کوئی شعبہ دھکھاؤں گا۔“

اس نے ہنسی کی۔ ذرا سا ڈگر گایا اور حاضرین کو گھورنے لگا۔ جلے میں سرگوشیوں کی جھینساٹ  
 اڑ رہی تھی۔ کچھ لوگ ہونق کی طرح صفدر بشیر کا منہ تک رہے تھے۔

صفدر بشیر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کچھووں کی چال  
 بے کار نامہ نہیں ہے۔ یہ سائنس کی ترقی کا عہد ہے۔ آج ایک شخص ریڈیو سے تقریر کرتا ہے اور  
 تمام دنیا کے لوگ اس کو سن سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر دیکھ سکتے ہیں۔ بولتے ہوئے حرکت کرتے  
 ہیں ہر انداز میں ہر عالم میں۔ جناب ترقی کی اس دوڑ میں آپ کہاں ہیں؟ افسوس تو یہی ہے کہ  
 آپ کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں۔ یہ گمراہی جرم ہے۔ آپ کچھوے نہ سہی، حضرت عیسیٰ کی  
 بڑائی ہیں، جس کا جی چاہتا ہے ہانک کر لے جاتا ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا اسی طرف نکل گئے۔“

جلے میں اب گڑبڑ کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ لوگوں کو اس کا انداز تحاطب سخت ناگوار گزر رہا  
 تھا ہر گز کچھوے اور بھیڑیں بننے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ وہ ہاتھ اونچے کر کے اس طرح ہلارہے  
 تھے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

”پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے۔“

دوسری طرف سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ”ابے گھاس کھا گیا ہے؟“

کچھ نوجوان باقاعدہ مرغ کی بولی بولنے لگے۔

”گڑوں کوں، گڑوں کوں۔“

اب مختلف سمتوں سے صفدر بشیر پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ وہ ذرا سنبھلا۔ پریشان ہو کر  
 ان کی طرف سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ”ابے گھاس کھا گیا ہے؟“

ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور اس کے بعد قہقہوں کی آواز دیر تک جلے میں گونجتی رہی۔  
 جلے درہم برہم ہو رہا تھا۔ لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملی جلی آوازوں کا شور مچ رہا تھا۔

”اللہ تعالیٰ شعبہ: تماشا، جادو، ہونق، بیوقوف، احمق، انداز تحاطب، مخاطب کرنے کا طریقہ۔ آوازے کتنا مذاق بڑا۔“

سرخ دودڑ جاتی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے۔ اس کی تقریر میں یہ سحر تھا کہ اگر جلسہ گاہ میں کچھ  
 گڑبڑ مچ جاتی اور وہ مائیک پر آجاتا تو چشم زدن میں جلسہ قابو میں آجاتا۔ اس کی تقریر کی تکنیک یہ تھی  
 کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز کا حجم بڑھاتا جاتا۔ اسی رفتار سے اس میں روانی پیدا ہوتی جاتی اور جب  
 خوب بڑھ جاتا تو اس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہو جاتی۔ اس کا لہجہ الہامی معلوم ہوتا۔ ایسا محسوس  
 ہوتا جیسے ہر چیز پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ صرف ایک چیز زندہ ہے۔ ایک آواز اور صرف ایک آواز  
 اور وہ آواز صفدر بشیر کی ہوتی۔ حاضرین جذبات سے بے قابو ہو کر نہایت جوشیلے نعرے لگاتے۔  
 بار تالیاں بجاتے۔ لیکن ایسی جذبات انگیز تقریریں وہ کسی بڑے اجتماع میں کرتا تھا اور اس روز ایسا  
 بڑا اجتماع تھا۔

جلے کا آغاز ڈاکٹر زیدی کی تقریر سے ہوا۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور بات سمجھا کر کہنے  
 عادی تھا۔ وہ دھیمے لہجے میں سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ جلے میں بددلی سی پائی جاتی تھی۔ لوگ  
 آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈاکٹر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہر آنکھ صفدر بشیر کی تلاش میں تھی اور صفدر  
 اس وقت ایک بار میں بیٹھا اس کاج سے مشغول کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ ذہنی طور پر پریشان تھا اور اس کا  
 لار کوں سے چھپ کر کبھی کبھی شراب پی لیتا تھا۔ جب بھی وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوتا تو مشغول ہادو  
 کرتا اور اس سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح اس نے ذہنی سکون حاصل کرنے  
 ایک بہانہ پیدا کر لیا تھا۔

وہ اسی عالم میں جلے میں آ گیا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھیں  
 چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی وہ ڈاکٹر پر پہنچا جلے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ بکھرا ہوا مجمع اکٹھا ہونے لگا  
 لوگ صفدر بشیر کی تقریر کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ ایک ہیرو کی طرح اٹھ کر مائیک  
 سامنے آیا۔ حاضرین نے اس کی آمد کا پر جوش تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ صفدر بشیر نے اپنی تقریر  
 شروع کی۔

”دوستو! ساقیو! جی چاہتا ہے آج آپ سے کھل کر باتیں کروں۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے  
 آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حاضرین کی طرف دیکھا۔

سحر: جادو، چشم زدن میں: دیکھتے دیکھتے گھن گرج، کڑک: الہامی، سراوا: انتہائی غیر معمولی۔ ہادو: ناشی، شراب چلنے میں مدد  
 سے چور۔ ہمہ تن گوش ہونا: مکمل توجہ کے ساتھ سنا۔

علی احمد قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے صفدر بشیر کا دامن پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ تمام اسکائی لارک بطور کا یہ عالم دیکھ کر بدحواس ہو گئے تھے۔ صفدر بشیر تقریر کرنے پر بضد تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ نشے کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ اب اس نے اول فول بکنا شروع کر دیا تھا اور یہ تمام آوازیں لاؤڈ اسپیکر سے نکل نکل کر گونج رہی تھیں۔ حاضرین جلسہ زور زور سے قہقہہ لگا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ علی احمد نے گھبرا کر ایسپلی فارمنڈ کر دیا۔ لاؤڈ اسپیکر خاموش ہو گیا۔ اسکائی لارکوں نے بڑی مشکل سے صفدر بشیر کو بٹھایا۔

اب علی احمد جلے کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے فوراً سلمان کو اشارہ کیا۔ وہ مائک پر پہنچ گیا۔ بیڑی کا سوئچ کھول دیا گیا۔ جلسہ گاہ میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر سلمان کی آواز ابھر نہ گئی۔ حاضرین سے معذرت کر رہا تھا۔ سلمان نے ان کو بتایا کہ صفدر بشیر ایک عرصے سے بیمار ہیں۔ دن رات ان کو تیز بخار رہا۔ چونکہ حاضرین کو ان کی تقریر سننے کا بے حد اشتیاق تھا لہذا ان کو بخار کی حالت میں ۱۴۴۲ھ میں ان کو قادی کر دی گئی۔

یہاں لایا گیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ سراسمی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ سلمان نے یہ سب کچھ اس انداز سے کہا کہ بات بن گئی۔ ورنہ اس روز صفدر بشیر نے اسکائی لارکوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

اس افسوس ناک حادثے نے اسکائی لارکوں کو صفدر بشیر کی جانب سے سخت برگشتہ کر دیا۔ فلک بیا کے آئندہ اجلاس میں اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرنے والے تھے۔ صفدر بشیر نے اس دوران میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کا ایک اور ثبوت دیا۔ یہ واقعہ ۱۴۴۲ھ میں پیش آیا کہ جوہلی ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ نے چار مزدوروں کو ہر طرف کر دیا۔ یونین

طرح پیش کیا کہ جوہلی ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ نے چار مزدوروں کو ہر طرف کر دیا۔ یونین انتظامیہ کی ایک طرف کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور یہ دھمکی دی کہ چاروں مزدوروں جہنم بھر کے اندر واپس نہ لیا گیا تو ہڑتال کر دی جائے گی۔

ماکان نے یونین کا مطالبہ مسترد کر دیا اور ہر طرف شدہ مزدوروں کی ملازمت بحال کر کے صاف انکار کر دیا۔ اسی روز مزدور یونین کا جلسہ ہوا۔ اس میں صفدر بشیر اور سلمان دونوں شریک ہوئے۔ جلسے میں ہڑتال کا نوٹس دینے کی قرارداد پیش کی گئی۔ سلمان نے قرارداد کی پوری تائید کی۔ ہڑتال کے لیے ہرگز ہمت نہ ہٹا کر دیا۔ اس نے اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ نہ اس نے کسی سے ہولناکی کی بے چینی کا مظاہرہ کیا۔ پتھر کے مجسمے کی طرح چپ بیٹھا رہا۔



جلے کی صدارت فہیم اللہ کر رہا تھا۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی تو مسلمان نے صفر بصر کے خلاف چارج شیٹ پیش کی۔ بہت سے الزامات کے علاوہ اس کے خلاف سب سے بڑا چارج یہ تھا کہ وہ خان بہادر فرزند علی سے ساز باز کر کے فلک پیا کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ صفر بصر نے سنگین الزامات سے تو غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہ فلک پیا کا صدر تھا۔ اس کا بانی تھا اور باقاعدہ تحریک کی شکل دینے میں اس نے ساٹھ ہزار روپیہ دیا تھا۔ سخت جدوجہد کی تھی اور بیس عشرت کی زندگی تہ کر رکھی تھی۔ بے مزہ زندگی اختیار کی تھی۔ فلک پیا کے خلاف سازش کرنے الزام عائد کر کے اس کے ساتھ سخت زیادتی کی گئی تھی۔ یہ بات کبھی اس کے ذہن میں بھی نہ آئی تھی۔ اسے فلک پیا سے صرف اس قدر شکایت تھی کہ ڈاکٹر زیدی کے بجائے میو نیپلی انتخابات میں اسے فلک پیا کا امیدوار کیوں نامزد نہیں کیا گیا۔ وہ خود کو ڈاکٹر زیدی سے زیادہ بہتر مستحق امیدوار سمجھتا تھا۔ اس کا لار کون نے یہ فیصلہ کر کے اس کے ساتھ نا انصافی کی تھی۔ خان بہادر کے ساتھ ساز باز کرنے کا سوال تھا صفر بصر کو خود بھی خان بہادر سے شدید نفرت تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ اس شام جب وہ فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر سے اپنی کوٹھی کی جانب جا رہا تھا تو راستے میں خان بہادر مل گیا اور اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں خان بہادر نے ان کے متعلق اس سے گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس نے خان بہادر کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

(۳)

میو نیپلی کی شروع تاریخیں تھیں۔ میو نیپلی کے انتخابات میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔ تمام میو نیپلی آسمان پر گہرا زرد غبار چھایا رہتا۔ درختوں کے پتے جھلس گئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں ہم موتی کی طرح پکھلتے تھے۔ پھر دن گزرتے ہی شہر میں سناٹا پڑ جاتا۔ دوپہر تک کوچہ و بازار سناٹا ہو جاتے۔

گرمیوں کی ایک ایسی ہی سنسان دوپہر تھی۔ علی احمد کمرے میں بیٹھا ایک نیا انتخابی پوسٹر تیار کر رہا تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر مسلمان داخل ہوا۔ اس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تھما رہا تھا۔ بالوں پر گرد کے ذرات بکھرے تھے۔ بدن پسینے سے شرابور تھا۔ علی احمد نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔

”کیا خبر لائے ہو اس کا لار ک مسلمان؟“

مسلمان نے ہاتھ میں دبا ہوا تھیلیا میز کے ایک کونے پر رکھ دیا اور چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے لگا ہوا۔ ”ابھی ابھی ایک بڑی شاندار خبر ملی ہے۔“

”شاندار خبر ہے تو ضرور سناؤ۔“

”ایک حریف تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔“

علی احمد چونک پڑا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا؟“

”عبدالحمید تو اڑن چھو ہو گیا۔“ مسلمان اس وقت بڑی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ ”آج اس نے کائنات نامزدگی بھی واپس لے لیے۔“

لو بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔ ”کہتے ہیں نا، زوردار خبر۔ اب تو صرف خان بہادر ہی بھانسنے لگا ہے۔ یہ کہہ کر مسلمان نے تہقہہ لگایا۔ مگر اس اطلاع پر علی احمد نے

نہیں مانا۔ اس نے اس سے استعفیٰ مانگا۔

کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے اس طرح خاموش پا کر سلمان کو کسی قدر تعجب ہوا۔ ہچکچاتے ہوئے پوچھا: ”خاموش کیوں ہو گئے؟“

علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ ”بھی یہ تو کچھ اچھی خبر نہیں ہے۔“

سلمان حیرت سے چونک پڑا۔ ”کیوں؟“

”میرے اندازے کے مطابق اسے دو ہفتے پہلے ہی انتخابات سے دست برداری کا اعلان چاہیے تھا۔ مجھے خود حیرت تھی کہ عبد الحمید ابھی تک کیوں ڈٹا ہوا ہے؟“

سلمان اس کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟“

علی احمد اسے سمجھانے لگا۔ ”تم نے غالباً غور نہیں کیا کہ عبد الحمید کے پیٹھ جانے سے کسے پہنچے گا۔ اگر عبد الحمید الیکشن لڑتا تو خان بہادر کے ووٹ تقسیم ہو جاتے۔ اس کے زیادہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایسا طبقہ ہے کہ جو کسی بھی وقت جذباتی فردوں سے گمراہ ہمارا مخالف بن سکتا ہے۔ اس کے طبقاتی کردار کا یہی تقاضا ہے۔ یہ ناقابل اعتماد طبقہ ہے۔ ان ڈھول اور ڈھول یقین کہ اس پر قطعی انحصار نہیں کیا جاسکتا۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور سلمان سے دریافت کیا۔ ”یہ تو بتاؤ صفدر بشیر کس عالم میں ہے؟ سلمان نے مختصر جواب دیا۔ ”مجھے ان کے متعلق کوئی خاص اطلاع نہیں۔ صرف اتنا کہ اب وہ کثرت سے شراب پینے لگے ہیں اور ان کا مزاج بھی بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔“

علی احمد کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس خبر سے اسے بہت صدمہ پہنچا۔ ”وہ اپنی جذباتیت اور خود پسندی کا شکار ہو گیا۔ ہائے بے چارہ صفدر بشیر ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سلمان سے کہا۔

”عبد الحمید کی کنارہ کشی کسی صورت میں ہمارے لیے مفید نہیں۔ اس کے سارے ووٹ بہادر کے حق میں جائیں گے۔ فلک پیا کی جڑیں کہیں مضبوط ہیں تو وہ علاقے کے غریب اور لوگ ہیں۔ کارخانوں کے مزدور ہیں جو ہمارے کچے ووٹ ہیں۔ ہمیں یونین میں اپنا کام ختم چاہیے۔ یوں بھی اب ہمیں اپنی اجتماعی مہم زیادہ تیز کرنا پڑے گی۔“

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہا۔ علی احمد نے سگریٹ کا کین

فرانز  
ہی مدنی

ایک سگریٹ سلمان کو دی۔ دوسری اپنے ہونٹوں میں دبائی اور اسے سلا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر لو کے جھگڑا غراتے ہوئے چل رہے تھے۔ قریب کے اصطبل میں بندھا ہوا گھوڑا بار بار ہنہنارہا تھا۔ سنسان دوپہر میں اس کی آواز کسی پاگل کی چیخوں کی طرح ذہن کا معلوم ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہادر نے عبد الحمید کو جگزی رقم دی ہے ورنہ وہ آسانی سے بیٹھنے والا امیدوار نہیں تھا۔ بہر حال بہادر کی پوزیشن اب کسی قدر مضبوط ہو گئی ہے۔“ وہ سلمان کی اطلاع پر تبصرہ کرتا رہا۔ چند منٹ یہ سلسلہ جاری رہا۔

مفتگو ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی۔

سلمان نے اپنا تھیل اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ علی احمد پوسٹر تیار کرنے میں مشغول رہا۔ کمرے میں ایک بار پھر سکوت ہو گیا۔ باہر لو کے جھگڑوں کی سرسراہٹیں ابھرتی رہیں۔ کمرے کا لڑکی کا ایک پیٹ آہستہ آہستہ بچتا رہا۔

علی احمد کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ دوسرے ہی دن عبد الحمید کی جانب سے جاری کئے جانے والے بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ نظر آنے لگے۔ ان پوسٹروں میں عبد الحمید نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ خان بہادر کے حق میں انتخابات سے دستبردار ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے ووٹروں سے اپیل کی تھی کہ وہ خان بہادر کی پوری طرح حمایت کریں۔

اس اعلان کا فوری رد عمل یہ ہوا کہ خان بہادر کے حامیوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ بڑھ بڑھ کر کام کرنے لگے۔ چند ہی روز بعد انہوں نے جلسہ عام کا بندوبست کیا۔ یہ انتخابی مہم کے سلسلے میں خان بہادر کی جانب سے پہلا جلسہ تھا۔ اس سے قبل وہ عام جلسہ کراتے ہوئے ڈرتا تھا۔ غلامیہ تھا کہ کہیں جلسہ ناکام نہ ہو جائے اور یہی سبھی ساکھ بھی جانتی رہے۔ اس کے کارکنوں کے فطرتاً اور پست ہو جاتے۔

جلسہ کا میاب بنانے کے واسطے بہت زور و شور سے تیاریاں کی گئیں۔ ہر طرف قد آدم پوسٹر لٹائے گئے۔ خان بہادر کی دو جیپیں رات گئے تک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے جلسے کا اعلان کرتی رہیں۔

غلام علی احمد

ان تیار یوں کو دیکھ کر اسکاٹی لارکوں میں بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ فلک بیا کے ایک اہلکار میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ خان بہادر کے جلسے کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ چند جو شیے اسکاٹی لارک اس حد تک کمر بستہ تھے کہ جلسے گاہ کے اندر گھس کر بجلی کے تار کاٹ دے جائیں۔ ہڑ بونگ چار جلسہ درہم برہم کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔

اس نے کہا کہ اسکاٹی لارک اپنے مخالفین کو قوت کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں دیں گے تو اپنی صفوں کو حریف کے خلاف کبھی مستحکم نہ بنا سکیں گے۔ انہیں اپنی کمزوریوں کا اندازہ نہ ہو سکے گا اس کے نزدیک یہ بزدلی کی نشانی تھی۔ علی احمد اور بعض دوسرے اسکاٹی لارکوں کی مخالفت پر اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔

\*\*\*

خان بہادر نے جلسے پر خوب روپیہ صرف کیا تھا۔ پنڈال دہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ چپے چپے پر رنگ برنگے برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ شرابی کئی گز اونچی بنائی گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف در تار پردوں کی محرابیں تھیں۔ سچ میں فانوس لگے رہے تھے۔ دیز تالینوں کا فرش تھا جس پر صدر کے لیے ایک اونچی کرسی تھی۔ اس پر سرخ مٹل غلاف تھا۔ ہوا چلتی تو زور تار پردے لہراتے۔ ہر طرف ستاروں کی افشاں بکھر جاتی۔ شیشیوں سے آراستہ بارہ دری کی طرح شاندار نظر آتی۔

جلسے کا انتظام رفعت علی دل گیر کے سپرد تھا۔ وہ پستہ قد کا ادھیڑ آدمی تھا۔ چہرے پر بڑا ڈاڑھی لمبی، کاکلیں اور ہاتھ میں ساپ کی طرح بل کھایا ہوا عصا۔ اس جلسے میں وہ ان صوفیوں کی طرح نظر آتا تھا جن کو محفل سماع کی زینت کے لیے خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔ جو قوالوں کو کچھ کوڑی تو دیتے نہیں البتہ عالم وجد میں اس طرح بے خود ہو جاتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ دل گیر کا تصوف اور کشف و کرامات سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ یہ وضع قطع اس نے محفل ہائی شخصیت کو باوقار بنانے کے لیے اختیار کی تھی۔

کمر بستہ: آداب، تیار، مستحکم، مضبوط، پنڈال: مراد جلسے کی جگہ۔ پستہ: قد۔ چھوٹے قد کا۔ چکی ڈھلومی: کم ہالوں والی ڈھلومی کالی۔ لٹ: عصا۔ لاٹھی۔ عالم وجد: دیوانگی کی حالت، جیڑوی کی حالت، تصوف: جیڑی فقیری۔ کشف: غیب سے کسی چیز کا علم ہونا۔

دلگیر جلسوں کو کامیاب بنانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ویسے پیشے کے اعتبار سے وہ درزی تھا۔ شہر میاں کی دکان بھی تھی۔ مگر الیکشن کے دنوں میں وہ انتخابات لڑانے اور انتخابی جلسے کرانے کا کام بھی کرتا تھا اور ہمیشہ ٹھیکے پر کرتا تھا۔ ایک زمانے میں اس کی باقاعدہ ٹولی تھی جن میں نعرہ لگانے والے، نعرہ اٹھانے والے، تالیاں بجانے والے اور ایسے مضبوط غنڈے بھی تھے کہ اگر کسی نے ذرا بھی جلسے میں گڑبڑ کی تو فوراً اس کی گردن دیوچ لیتے۔ مگر اب اس کی ٹکڑی منتشر ہو گئی تھی۔ البتہ ہاں ساتھ باقی تھی۔

جلسہ شروع ہونے کا جو وقت مقرر تھا رفعت علی دل گیر اس سے گھنٹہ بھر پہلے ہی جلسہ گاہ پہنچ گیا تھا۔ اس نے پنڈال کا گھوم پھر کر باقاعدہ معائنہ کیا۔ اس کے ہمراہ ۱۲۵ افراد کی ٹیم تھی۔ دل گیر نے ہر ایک کو مختلف مقامات پر تعینات کیا۔ نعرہ لگانے والوں کو ہدایتیں دیں کہ پہلے کون ابتدا لے گا اور اس کے بعد کس طرح سب مل کر نعرہ لگائیں گے۔ تالیاں پیٹنے والے کس موقع پر ہاں بھائیں گے۔ جب تک وہ سگنل نہیں دے گا نہ کوئی نعرہ لگائے گا نہ تالیاں بجاتی جائیں گی۔

وہ ایک روز قبل باقاعدہ رہبر سیل بھی کراچکا تھا۔ مگر اس کے بیشتر کارکن اناڑی تھے۔ جلسہ لڑنا ہونے سے پہلے وہ انہیں بار بار ہدایتیں دے رہا تھا اور ڈانٹا بھی جا رہا تھا۔ ”دیکھو بے! کسی نے الیڈمی حرکت کی تو دھیلا نہیں دوں گا۔“ ان کے ریٹ کچھ اس طرح مقرر تھے۔

نعرہ لگانے والے فی کس پانچ روپے۔

نعرہ اٹھانے والے فی کس دو روپے۔

تالیاں بجانے والے فی کس ایک روپیہ۔

اس کے علاوہ دلگیر نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جو بہت زوردار اور جوشیلے نعرے لگائے گا اسے ٹیم بھی ملے گا۔

ان تیار یوں سے فارغ ہونے کے بعد دلگیر نے غنڈوں کی ڈیوٹیاں مقرر کیں۔ ان کو اچھی لگا کر بجا کر وہ خان بہادر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

ٹیم ہی سے لوگ جلسہ گاہ میں پہنچنا شروع ہو گئے۔ خان بہادر کی آمد سے پہلے ہی پنڈال کا گھوم گیا۔ ہزاروں کا اجتماع تھا۔ حاضرین میں بڑی تعداد خان بہادر اور اس کے حامی کارخانہ

ملفوظات علامہ اہل سنت تاجریہ کار۔ کچھ کچھ بہت زیادہ۔

مذکورہ بالا

مذکورہ بالا

داروں کی فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تھی، جنہیں بسوں میں بھر کر جلسہ نگاہ تک لایا گیا تھا۔ انہیں جلسے میں شرکت کرنے کے لیے باقاعدہ اور ٹائم دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے سے کچھ دیر قبل خان بہادر فرزند علی کی کار جلسہ گاہ پر آکر کی۔ اس کے کار کی چیلوں کی طرح کار پر جھپٹے۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ خان بہادر بڑے وقار کے ساتھ باہر آئے۔ کارکنوں اور عقیدت مندوں نے بڑھ بڑھ کر اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ دیگر نے فرائز نعرہ لگانے والوں کو اشارہ کیا۔ فضا "خان بہادر زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگی۔ خان بہادر، کارکنوں اور عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں مسکراتا ہاتھ ہلاتا آگے بڑھا۔ خلقت اس پر اس طرح ٹوٹ رہی تھی کہ شہ نشین تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔ شہ نشین پر پہنچ کر خان بہادر فرزند علی نے جلسے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی گئیں۔ اتنا بڑا اجتماع اس کے سامن گمان میں بھی نہ تھا۔ مسرت سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ روٹھیل سے جنگلاتے پنڈال میں، ہار پھولوں سے لدا، وہ دودھ لکھا کی طرح سجا سجاوا، مہمان خصوصی بنا ایک اونچی کرسی پر رونق افروز تھا۔ ہر نگاہ اس کی جانب اٹھی تھی اور ہر زبان پر اس کا تذکرہ تھا۔ اس حقیقت کا خان بہادر کو شدت کے ساتھ احساس بھی تھا۔

خان بہادر فرزند علی کے ساتھ نیاز بھی جلسے میں آیا تھا۔ اس نے یہ آن بان اور کروفر دیکھا۔ خان بہادر کی شخصیت سے بہت مرعوب ہوا۔ اس کے سامنے دور تک انسانی چہرے ہی چہرے نظر آ رہے تھے اور یہ سب خان بہادر کے حامی اور مددگار تھے۔ نیاز نے دل ہی دل میں کہا کہ واقعی خان بہادر فرزند علی بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ بار بار خان بہادر کی جانب دیکھتا جو اونچی کرسی پر کسی فرماں روا کی مانند فروکش تھا۔ اس کی گردن فخر سے اوپر اٹھی تھی۔ چہرے پر وقار اور گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ایک مقرر نے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اس نے خان بہادر کی شان میں خوب خوب قصیدہ خوانی کی۔ اس کے بعد کئی دوسرے مقرر بنائے تقریریں کیں۔ ہر تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ خان بہادر، عوام کا مخلص رہنما، سچا اور صالح مسلمان ہے۔ اس کے سینے میں ایمان کی حرارت اور غریبوں کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ ان کے

خان بہادر فرزند علی کے لیے لے لے کر پکڑے گئے۔ مگر وہ تقریر جو رٹ کر آیا تھا اس کے ذہن سے نکلتی جا رہی تھی۔ آخر خان بہادر بولنے کے لیے کھڑا ہوا۔ تقریر شروع کرنے سے پیشتر اس نے پورا گلاس پانی پی لیا۔

نعرہ بکیرا

اور اس کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے آوازیں آئیں۔

اللہ اکبر۔

"خان بہادر فرزند علی زندہ باد"

"خان بہادر فرزند علی زندہ باد"

ان نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ خان بہادر کی یادداشت بالکل جواب دے گئی۔ بدحواس ہو کر لے لے کر دو تین لمبے لمبے کش لگائے۔ اس کے پیر آہستہ آہستہ کپکپا رہے تھے۔ تنفس تیز

جھرمٹ: جھوم۔ خلقت: عوام۔ سان گمان: وہم و خیال۔ رونق افروز تھا: بیٹھا ہوا تھا۔ آن بان، کروفر: شان و شوکت، فضا: ہوا۔ لباب: خلاصہ۔

ہو گیا تھا اور سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اس نے اسی عالم میں تقریر شروع کر دی۔  
 ”برادران اسلام! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے آپ سے صرف چند ضروری باتیں کہنی ہیں۔“

یہ دونوں جیلے اس نے بڑی مشکل سے ادا کئے۔ اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔ مگر خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میں آپ لوگوں کا خادم ہوں۔ آپ لوگوں کی خدمت کر چاہتا ہوں۔“

اسے اپنی تقریر کا کچھ حصہ یاد آ گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”لیکن یہ بات تو ہر امیدوار آپ سے کہے۔ ہر ایک کے دل میں آپ کی خدمت کا جذبہ ہے۔ ہر ایک آپ کے غم میں گھلا جاتا ہے۔ تو آپ میری بات پر یقین کیوں کریں؟ آپ کہیں گے کہ خان بہادر ووٹ لینے کے لیے یہ سڑکوں پر چارہا ہے۔ وہ پرلے درجے کا عیار اور مطلبی ہے۔“

خان بہادر کی تقریر ایسے موڑ پر آ گئی تھی جہاں سے گریز اختیار کر کے وہ حرف مطلب پر آ جاتا تھا۔ اتفاق سے عین اس وقت رفعت علی دل گیر کے سر میں کھلبلی ہوئی۔ اس نے سر کھانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ ایک تالی بجانے والے کی نظر پڑ گئی۔ وہ سمجھا دل گیر سگٹل دے رہا ہے۔ اس قریب بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی کو کہتی سے ٹھوکا دیا اور زور زور سے تالی بجانے لگا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی تالی بجانے لگے۔

تالیوں کا شور سن کر مشرتقی کو نے پر کھڑے ہوئے نعرہ لگانے والے نے اپنی مستعدی ثبوت دیا۔ اس نے فوراً گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا۔  
 ”سچ کا بول بالا۔“  
 ”جلے سے ملی جلی آوازیں ابھریں۔“ ”جھوٹے کامنہ کالا۔“  
 ”وہاں دلی بازی!“  
 ”نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔“  
 ”ووٹوں کی دلالی۔“  
 ”نہیں چلے گی، نہیں چلے گی۔“

دل گیر کے گرجے چیلوں کی طرح اس شخص پر جھپٹے اور لاتیں اور گھونسنے مارتے ہوئے جلے

دل گیر کے گرجے چیلوں کی طرح اس شخص پر جھپٹے اور لاتیں اور گھونسنے مارتے ہوئے جلے

دل گیر کے گرجے چیلوں کی طرح اس شخص پر جھپٹے اور لاتیں اور گھونسنے مارتے ہوئے جلے

دل گیر کے گرجے چیلوں کی طرح اس شخص پر جھپٹے اور لاتیں اور گھونسنے مارتے ہوئے جلے

خدا کی ہمت  
نہ مدد تھی

سے باہر لے جانے لگے۔

یاد رکھو بڑے ذریعے درہم برہم کر لیا جائے۔

\*\*\*

اسکاٹی لارکوں نے بھی جلسہ عام کیا۔ حاضرین کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ ان میں جوش و  
ش بھی تھا۔ سلمان تقریر کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ صاف ستھرا تھا۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ انتخابی  
کے سلسلے میں تقریریں کرتے کرتے اب وہ خاصا منجھ گیا تھا۔ لوگوں کی نفیات سمجھنے لگا تھا۔  
رہنما اس کا اپنا سائل بننا جا رہا تھا۔ وہ ایک کامیاب مقرر سمجھا جانے لگا تھا۔

سلمان نے دوران تقریر ایک بار آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی پریشان حالی کی بنیادی  
بہ ہے کہ آپ کو اپنی قوت کا اندازہ نہیں۔ آپ اپنے حقوق اور ان کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔“  
ان بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اچانک جلسے کے اندر سے کئی آوازیں ابھریں۔  
”جھوٹ بولتا ہے۔“

”بہرہ بیا ہے۔“

”بے دھڑ مائگنے کا ڈھونگ ہے۔“

”ہم تقریر نہیں سنیں گے۔“

”واپس جاؤ، واپس جاؤ۔“

اس کے ساتھ ہی غل غپاڑہ ہونے لگا۔ چیخ کر بولنے والوں کی آوازوں کے ساتھ مرغوں  
نڈ کی بولیاں بھی سنائی پڑ رہی تھیں۔ سلمان کسی قدر گھبرا گیا۔ یہ اس کے ساتھ پہلا اتفاق تھا۔  
نے لوگوں سے خاموش رہنے کی درخواست کی تو شور مچانے والے اور بھی اونچی آواز سے چیخنے  
پہ آوازیں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

جلسے میں پہلے تو کچھ سراپسیگی پھیلی۔ کچھ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ بچوں کے بل اونچے  
اس طرف دیکھنے لگے جس طرف شور ہو رہا تھا یہ پندرہ بیس افراد کا غول تھا جس میں ہر شخص  
الٹا تھا کہ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر شور نہ مچا سکے۔ حاضرین میں سے کچھ نوجوان  
اور ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ لگا فساد کرنے لگے۔ یہی ان کے حق میں برا ہوا۔

ایک ایک پر چاروں طرف سے مار پڑنے لگی۔ کچھ تو یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی صاف نکل گئے۔  
نہ کو کھڑا لیا گیا ان پر دھڑا دھڑا جوتے پڑنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں ان کی اچھی خاصی مرمت ہو گئی۔

اس روتے پر حاضرین نے احتجاج کیا۔ جلسے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے غنڈوں کی  
گرفت سے اس شخص کو چھڑانے کی کوشش کی تو ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔ پھر تو اس قدر ہنگامہ ہوا کہ  
غل غپاڑہ ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جھڑپ منہ اٹھا اسی طرف بھاگا۔ خان بہادر نے یہ عالم دیکھا تو  
بھی بدحواس ہو گیا۔ چپکے سے شہ نشین سے اتر اور کارکنوں کے حلقے میں گھرا ہوا جلسے سے باہر اٹھا  
کارکنوں کی اور اس میں بیٹھ کر سیدھا گھر کی جانب چل دیا۔

بھگدڑ پڑنے کے بعد آٹا فانا پنڈال خالی ہو گیا۔ جلسہ گاہ میں آلو بولنے لگا۔ اب صرف ہار کر  
اور دل گیر شامیانے کے نیچے رہ گئے تھے۔ دل گیر سخت برہم نظر آ رہا تھا۔ اس کے گرد  
سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ ان کے سامنے بے چینی سے ٹھہل رہا تھا۔ زیادہ تاؤ  
توان پر برسنے لگتا۔

”ابے تم نے مجھے کہیں کانہ رکھا۔ اب میں خان بہادر کے پاس کس منہ سے جاؤں۔ یاد رکھو  
کسی سالے کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ میرا تو بیڑا غرق ہو ہی گیا مگر تم کو بھی نہیں بخشوں گا۔ ابے تم  
کس کس طرح سمجھایا۔ مگر سب نے اپنا حرا پیں دکھایا۔ یاد رکھو! تو عقل سے کام لیا ہوتا۔ تفہیم  
تم پر۔ اتنے ڈھونجوان ہو کر تمہاری یہ حرکتیں۔“

وہ دیر تک ان کو ڈانٹتا پھینکا رہا اور بے چینی سے ٹھہلتا رہا۔  
رفعت علی دل گیر شرم کے مارے خان بہادر کے پاس نہ گیا۔ پنڈال سے نکل کر سیدھا رزڈ  
خانے پہنچا۔

لیکن خان بہادر کو اس سے ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ اس نے جلسے کے درہم برہم ہو جانے کی  
ساری ذمہ داری اسکاٹی لارکوں پر عائد کی۔ وہ اپنے کارکنوں کے ساتھ بیٹھا سارا غصہ اسکاٹی لارکوں  
پر اتار رہا تھا۔

کارکن بھی اس کی تائید کر رہے تھے۔  
رات گئے تک خان بہادر کی کوٹھی پر یہی چر چار رہا۔ آئندہ کے لیے نئے انتخابی جھنڈے  
اسکیس میں سوچی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ جوابی کارروائی کے طور پر اسکاٹی لارکوں کے ہر جلسے کو

اسکائی لارکوں نے منت ساجت کی۔ بڑی مشکل سے ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد جلسہ پھر شروع ہو گیا اور رات گئے تک جاری رہا۔ مسلمانانہ انداز میں زیادہ جوش و خروش سے تقریر کی اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی یہ تقریر بڑی دلورہ انگیز تھی۔ لوگ بار بار نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں کی آوازیں رات کے سناٹے میں دور تک سنائی پڑ رہی تھیں۔

اسی رات فلک پیلا کا اجلاس ہوا جس میں جلسے کے اندر ہونے والی گڑبڑ پر غور کیا گیا۔ اس لیے کہ یہ ابتدا تھی۔ اور آئندہ کے واسطے اسکائی لارکوں کو تنبیہ بھی تھی۔ اجلاس میں بڑی بے چارہ جاتی تھی۔ اسکائی لارک اس واقعے پر بہت برہم تھے اور اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔



کمرے میں سگریٹوں کا دھواں منڈلارہا تھا۔ لیپ کے چاروں طرف سرمئی غبار کا جال بکھرا گیا تھا۔ اس کی روشنی دھندلی پڑ گئی تھی اور اس دھندلی روشنی میں اسکائی لارکوں کے چہرے ہاروں کی طرح بڑھ چکے تھے۔

چھائیوں کے مانند نظر آرہے تھے۔ فضا کچھ ایسی ہی دھواں دھواں تھی۔ ناگاہ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ صفر بشیر کھڑا تھا۔ اس کے بال پٹ سن کے ریشوں کی طرح خشک تھے۔ پیشانی پر گہری لکیر تھی۔ چہرے کا رنگ خاکستری پڑ گیا تھا۔ خساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے درمیان اس کی دماغی

ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ صفر بشیر لمحہ بھر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ آہستہ آہستہ

بڑھنے لگا اس کے قدموں کی آہٹ پختہ فرش پر کھٹ کھٹ ابھرتی رہی۔ وہ علی احمد کی پشت پر کھڑا

چٹان کی طرح استاد ہو گیا۔ ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں صفر بشیر کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا

”جناب صدر اور اسکائی لارک سا تھیو! اس بے جا مداخلت کے لیے میں آپ لوگوں کو معذرت خواہ ہوں۔ آپ کے اجلاس میں مجھے اس طرح آنے کا کوئی حق نہیں۔ فلک پیلا کے

جذباتی لگاؤ تھا جو مجھے یہاں بھیج لایا۔ شاید آخری بار اسکائی لارکوں کو، ان کے ہیڈ کوارٹر اور اس دور و دور کو دیکھ رہا ہوں۔“

صفر بشیر ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ اس طرح بول رہا تھا جیسے ہانپ رہا ہو۔ ”میں اس شام صفر بشیر کے چلنے سے اڑنے والی مٹی، مرا پیچہ رو جاتا ہوں۔“

نہایت  
معاذ

”لیکن میں تو لندن جا رہا ہوں۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

کئی اسکائی لارکوں کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

”صفدر بشیر لندن نہیں جاسکتے۔“

صفدر بشیر یہیں رہیں گے۔“

صفدر بشیر مسکرانے لگا۔ اس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔ اسکائی لارکوں

کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگایا۔

”صفدر بشیر زندہ باد!“

وہ اس وقت بے حد سرور نظر آ رہے تھے۔ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اونچی آوازوں

بول رہے تھے۔ صفدر بشیر کی کئی انہوں نے اس کی غیر حاضری میں شدت کے ساتھ محسوس کی

اور آج اسے پا کر اور اپنے درمیان دیکھ کر وہ خوشی سے کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح اچھل رہے تھے۔

سب نے صفدر بشیر کو گھیرے میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہنس ہنس کر بے تکلفی سے

کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد چائے آگئی۔ علی احمد اور صفدر بشیر چائے کی پیالیاں سنبھال کر لاہر پڑی

چلے گئے۔

وہ چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

\*\*\*

دروازہ کھلا اور ریاض اندر داخل ہوا۔ وہ فلک پینا کارکن نہ تھا کبھی کبھار آتا تھا اور کئی

ہیڈ کوارٹر میں ٹھہر رہا ہوتا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ علی احمد کا کلاس فیلورہ چکا تھا۔ اسی رشتے سے فلک

کے ساتھ اس کا رابطہ پیدا ہوا۔ وہ ہمیشہ قیام بھی علی احمد ہی کے ساتھ ہی کرتا تھا۔

صفدر بشیر بھی اسے جانتا تھا۔ مزدوروں کی یونین کے قیام میں ریاض نے بڑی مدد کی

ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں وہ صفدر بشیر کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ صفدر بشیر کی کنارہ کشی اور

کی اجتماعی مہم میں بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث ان دونوں یونین کی ذمہ داریاں ریاض

کھلنڈرے تاراج کنارہ کشی: علیہ کی۔

بالرکھی تھیں۔

صفدر بشیر نے چائے پیتے ہوئے ریاض سے دریافت کیا۔ ”یونین کی سرگرمیوں کا کیا حال ہے؟“

ریاض نے بتایا۔ ہڑتال کی ناکامی کے بعد خاصی گڑبڑ رہی۔ مگر اب صورت حال پہلے سے

بہتر ہے۔“

صفدر بشیر نے مسکرا کر کہا۔ ”ریاض! تمہیں یقین ہے کہ صورت حال بہتر ہو جائے گی۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں اس میں شبہ ہے؟“

صفدر بشیر بے تکلفی سے بولا۔ ”بات یہ ہے ریاض! یہ یونین و یونین کی بات سچ پوچھو تو میرے

بچے نہیں اترتی۔“

”صفدر! کبھی تم نے سنجیدگی سے سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟“ ریاض نے دریافت کیا۔

”نہیں! مگر میں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ فلک پینا کے ذریعے میں بہتر طور پر کام کر سکتا ہوں۔

وہی یہ بھی چاہتا ہوں کہ فلک پینا کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے علیحدہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہے۔

ت میں علی احمد سے بھی کہہ چکا ہوں۔“ صفدر بشیر نے علی احمد کو براہ راست مخاطب کرتے

کہا۔

”علی احمد! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

علی احمد جواب تک خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سن رہا تھا، مسکرا کر بولا۔ ”فلک پینا کے

لامیں اس مسئلے پر بحث بھی ہو چکی ہے۔ بلکہ کئی اسکائی لارک اس مسئلے پر تمہارے ہم خیال بھی

مگر مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں۔ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔“

اب فلک ریاض نے صفدر بشیر سے عجب ٹیڑھا سوال کیا۔ ”صفدر بشیر! تم ایک لاکھ روپے سے

تک جو اکھٹے رہو گے؟“

صفدر بشیر بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”میں تمہاری بات کا مطلب

انکھڑا۔ کیا تم اس کی وضاحت کرو گے؟“

ریاض بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ ”میرا مطلب ہے تم اپنے سرمائے سے کب تک فلک پینا

کا کچھ نہ رو گے؟ ایک دن تمہارا اثاثہ ختم ہو جائے گا۔ پھر تم اپنی جائیداد بیچ دو گے۔ وہ بھی ختم

نہ لگے۔ پھر کیا کرو گے؟ پھر گاڑی کس طرح چلے گی؟ کبھی تم نے اپنی جدوجہد کو اس رخ سے



بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک لاکھ یا چند لاکھ روپے سے اگر معاشرے میں تبدیلیاں آجائیں یہ بہت آسان نسخہ ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکاوٹ نہ بن کر بولا۔ ”سید ہاسد اسوال یہ ہے کہ آئندہ چاہتے کیا ہو؟“

صفدر بشیر نے مختصر سا جواب دیا۔ ”ہماری جدوجہد غربت اور پس ماندگی کے خلاف ہے۔“ مگر تم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ غربت اور پس ماندگی کیوں ہے معاشرے میں یہ اونچ نیچ کیوں ہے؟ یہ امیر اور غریب میں فرق کیوں ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے جب تک تم اس بنیادی سوال کی تہہ تک نہیں پہنچو گے بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہو گے۔“

علی احمد نے مسکراتے ہوئے ریاض کو مخاطب کیا۔ ”کامریڈرات اب خاصی ہو چکی ہے اور ایک ہی نشست میں اپنا انقلابی فلسفہ صفدر بشیر کو نہیں سمجھا سکتے۔“ علی احمد گفتگو ختم کرنا چاہتا مگر ریاض اس کے لیے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے فوراً وضاحت کی۔

”اس مسئلے پر صفدر بشیر سے میری پہلے بھی بات چیت ہو چکی ہے۔ یہ غربت اور پس ماند دور کرنا چاہتے ہیں اور اس جدوجہد میں محنت کشوں کی سیاسی قوت کو اہمیت بھی دینا نہیں چاہتے حالانکہ ہر جدوجہد اور ہر تحریک، خواہ سیاسی ہو، سماجی ہو یا اقتصادی، بنیادی طور پر طبقاتی ہوتی ہے یہ محنت کرنے والے اور محنت کا استحصال کرنے والے کے درمیان ایک مسلسل لڑائی ہے۔“

اس کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔ ”جب سے انسانی معاشرے میں نجی ملکیت کے تصور نے جنم لیا اور اس کے نتیجے میں طبقات وجود میں آئے، اس وقت سے یہ لڑائی جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک طبقات ختم نہیں ہو جاتے۔ جب تک انسان کے ہاتھوں انسان کی لوٹ کھسوٹ ختم نہیں ہو جاتی۔ اس لڑائی میں آپ کو کسی ایک فریق کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا۔ درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔ درمیان کا راستہ بند گلی کی مانند ہے۔“

علی احمد نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہے۔ کم از کم فلک پیا کے بارے میں تمہیں ایسی رائے نہیں چاہئے۔ اس کا کردار تعمیری ہے۔ اس کے ذریعے ہم عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان پڑھنا سکھاتے ہیں۔ طبی امداد فراہم کرتے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم اور امدادی بینک کے ذریعے روزانہ مہیا کرتے ہیں۔ ہم عوام کے قریب جا رہے ہیں۔ ان سے دور نہیں بھاگ رہے ہیں۔ ان کے سامنے

بلاشبہ روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تمہاری اس رائے سے قطعی اتفاق ہے کہ ہمیں اپنی جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ محنت کشوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی صورتیں بنائیں کہ ہمارا سابقہ خان بہادر فرزند علی ایسے لوگوں سے ہے جو خدمت خلق کو دولت کمانے اور بازاری حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔“

خان بہادر کے ذکر پر صفدر بشیر نے پوچھا۔ ”میونسپلٹی کا الیکشن کیسا جا رہا ہے؟ میں نے سنا ہے خان بہادر کا حال بہت پتلا ہے۔“

علی احمد نے کہا۔ ”تمہارا خیال درست ہے۔ ہمارے مقابلے میں اس کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ اس نے جلسہ عام کیا تھا وہ بد نظمی کی نذر ہو کر ناکام ہو گیا۔ ہمارے جلسے میں بھی اس نے اے کے غنڈوں سے گڑبڑ پیدا کرانے کی کوشش کی تھی۔ اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔ البتہ پیسہ بالائی طرح بہا رہا ہے۔“

کچھ دیر تک انتخابات ہی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی پھر تینوں پر نیند کا غلبہ ہوا۔ نواب معمول علی احمد کے ساتھ ٹھہر گیا۔ صفدر بشیر واپس نہیں گیا۔ وہ بھی ایک اسکائی لے کے ساتھ ٹھہر گیا۔

(۴)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر میں سب گہری نیند سوچکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر کے صدر دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آوازیں ابھریں فہیم اللہ نے نیند سے جاگنے لگے۔ دروازہ کھولا تو بھونچکا رہ گیا۔ سامنے پولیس کا مسلح دستہ موجود تھا۔ انسپکٹر نے فہیم اللہ کو روک لیا، ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لینے آئی ہے۔ پولیس والے علی احمد کے کمرے میں گھس گئے۔ اسے بائیں کانٹوں نے نیند سے بیدار کیا اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت دونوں کو گرفتار کر لیا۔

پبلک دشمن کارروائیاں کرنے اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینے کا الزام تھا۔ اس وقت تک دوسرے اسکائی لارک بھی بیدار ہو چکے تھے اور علی احمد کے کمرے میں پہنچ

نصف سول بنگلہ ہوتا۔ حالت خراب ہوتا۔ بھونچکا حیران۔

غلامی کی پٹری

چکے تھے۔ صفدر بشیر نے وارنٹ گرفتاری دیکھنا چاہا تو انسپکٹر نے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ تمہارے ملزموں کو دکھایا جائے گا۔ علی احمد نے بھی وارنٹ دکھانے پر اصرار کیا۔ مگر انسپکٹر نے اس کی ایک سنی اور اسے اور ریاض کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ صفدر بشیر اور ڈاکٹر زیدی نے ان کے ہمراہ چلنے کی بہت کوشش کی لیکن انسپکٹر کسی طرح رضامند نہ ہوا۔

پولیس کے جانے کے بعد اسکاٹی لارک دیر تک جاگتے رہے۔ علی احمد اور ریاض کی گرفتاری پر ان میں شدید غم و غصہ پھیل گیا تھا۔ صفدر بشیر تمام رات جاگتا رہا۔ صبح ہی صبح وہ ڈاکٹر زیدی کے ساتھ تھانے گیا۔ اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ علی احمد اور ریاض وہاں موجود نہ تھے۔ تھانے والوں نے بھی لا علمی کا اظہار کیا۔ تمام دن وہ بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ حکام بالا سے ملے مگر کہیں یہ سراغ نہ ملا کہ دونوں کو گرفتار کر کے کہاں رکھا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے شام کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ دونوں سنٹرل انٹیلی جنس کی تحویل میں ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ کسی کو اس سے ملنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔

خان بہادر فرزند علی کو یہ اطلاعات برابر ملتی رہتیں۔ وہ چڑچڑا اور بد مزاج ہو گیا تھا۔ بات اسکاٹی لارکوں کو یہ اطلاعات ملیں تو وہ بہت مشتعل ہو گئے۔ ڈاکٹر زیدی نے سمجھا بھکا کر کہ نہ کسی طور ان کے جذبات کو سرد کر دیا لیکن علی احمد کی گرفتاری کا فوری رد عمل یہ ہوا کہ اسکاٹی لارکوں نے اپنی انتخابی مہم اور تیز کردی۔ انہیں یقین تھا کہ دونوں کی گرفتاری کے پیچھے خان بہادر خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اس لیے کہ انتخابی مہم کا مگر ان اعلیٰ علی احمد تھا اور اس خوش اسلوبی سے نہ چلا رہا تھا کہ دولت اور ہر طرح کے وسائل کے باوجود انتخابات کا پانسہ اسکاٹی لارکوں کے میں پلٹتا جا رہا تھا۔ ریاض، یونین کے ذریعے مزدوروں کو اسکاٹی لارکوں کی حمایت میں منظم تھا۔ مزدور نہ صرف اسکاٹی لارکوں کے حامی تھے بلکہ ان کی انتخابی سرگرمیوں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لے رہے تھے۔ اس حلقے میں مزدور و وٹروں کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی کہ انتخابات کی ہارجیت کا انحصار بڑی حد تک مزدوروں کے ہی دوٹوں پر تھا۔

اسکاٹی لارکوں نے علی احمد اور ریاض کی گرفتاری کے بعد اپنے غم و غصے کو خان بہادر خان کے انتخابی مہم میں ڈھال دیا۔ وہ اب صفدر بشیر کی قیادت میں دیوانہ وار کام کر رہے تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے انتخابات کی فضا تیزی سے اسکاٹی لارکوں کے حق میں بدلنا شروع کر دی تھی۔

اسکاٹی لارکوں نے علی احمد اور ریاض کی گرفتاری کے بعد اپنے غم و غصے کو خان بہادر خان کے انتخابی مہم میں ڈھال دیا۔ وہ اب صفدر بشیر کی قیادت میں دیوانہ وار کام کر رہے تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے انتخابات کی فضا تیزی سے اسکاٹی لارکوں کے حق میں بدلنا شروع کر دی تھی۔

خوش اسلوبی سے: اچھے طریقے سے پانا پلٹنا، رخ بدلنا، ہکست ہوتے ہوئے فتح ہونا۔

خوش اسلوبی سے: اچھے طریقے سے پانا پلٹنا، رخ بدلنا، ہکست ہوتے ہوئے فتح ہونا۔

معاذ اللہ

کو چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔  
کمرے کے دوسرے سرے پر نبیم اللہ سو رہا تھا۔ صفدر بشیر نے اسے آواز دی۔ شور مچا۔

کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ دونوں نے کان لگا کر آواز کو سنا۔ مگر سوائے شور کے کچھ اور نہ سنا۔

شور اب بہت بڑھ گیا تھا۔ آوازیں عین ہیڈ کوارٹر کے سامنے بلند ہو رہی تھیں۔ اچانک سلمان دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ کئی اور اسکاٹی لارک بھی تھے۔ سلمان نے وقت سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہیڈ کوارٹر پر حملہ ہونے والا ہے۔“

حملے کی اطلاع سن کر سب گھبرا گئے۔ سلمان نے بتایا۔ ”میں باہر احاطے میں سو رہا تھا۔ سن کر آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر دیکھا تو ہیڈ کوارٹر سے کچھ فاصلے پر بہت سے لوگوں کا جھوم نظر آیا۔ اسکاٹی لارکوں کے خلاف اونچی آواز سے اشتعال انگیز باتیں کر رہے تھے میرا خیال ہے کہ ان کی تعداد پچاس سے اوپر ہی ہوگی۔“

اسی اثناء میں ڈاکٹر زیدی بھی کمرے میں آگیا۔ اس نے بھی سلمان کی تائید کی۔ وہ بگبگ سے اٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال خشک گھاس کی طرح کھڑے تھے۔ دروازے سے کمرہ اسکاٹی لارکوں سے بھر گیا۔ سب سہمے ہوئے تھے۔ ان کے بشرے سے پریشانی صاف عیاں تھی۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ توڑنے کی آواز سنائی دی۔ شور تیز ہو گیا۔ اب آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور چیخ چیخ کر اسکاٹی لارکوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ پھر اس شور و غل میں شینے کے ٹوٹنے کی جھنکاریں ابھرنے لگیں۔ ڈاکٹر زیدی نے بے قرار ہو کر کہا۔

”ڈسپنری تباہ ہو گئی۔“

اسکاٹی لارک اور بھی زیادہ پریشان ہو گئے۔ شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں دھڑا دھڑا کر رہیں۔ شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پھر ہیڈ کوارٹر کا صدر دروازہ توڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس دفعہ بالکل سامنے سے حملہ ہوا تھا۔ اسکاٹی لارکوں کے سامنے اب ہی راستے تھے۔ باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا پھر اندر رہ کر دروازے کی حفاظت کرنا۔

سلمان اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور صفدر بشیر کو سنبھال لیا۔ وہ اس کے ہاتھ پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھولنے لگا۔ سلمان نے چاہا کہ وہ صفدر بشیر کو اٹھا کر اندر لے جائے مگر حملہ آوروں نے اتنا موقع نہ دیا انہوں نے اندھا دھند لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ اسکاٹی لارکوں کے لیے ہیڈ کوارٹر کے اندر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ دونوں کو بچانے کے

معاذ اللہ! کھمبہ نہ آتا۔ دار: غریب، محتاج، بلم، بھالا، ایک جھنڈا کا نام۔

نیند اچاٹ ہونا: نیند اچاٹ۔ اشتعال انگیز: غصہ بڑھانے والی۔ پھرے: پھرے۔

لیے وہ باہر نکل آئے۔

محملہ آوروں نے ان کو زخموں میں لے لیا اور ہر طرف سے بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔ زخم پر زخم کھا رہے تھے اور تکلیف سے بلبل کر چیخ رہے تھے۔ ان کے جسموں سے خون پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے گہری دھند پھیلتی جا رہی تھی۔

محملہ آور وحشیوں کی طرح حملے کر رہے تھے۔ وہ ہاتھوں، نیزوں اور لاثیموں سے لاکھ لاکھوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں شکاری چیتوں کی طرح چمک رہی تھیں اور چہرے بھوتوں کی طرح خوف ناک نظر آ رہے تھے۔

بستی بھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ہر گھر میں جاگ ہو گئی۔ لوگ مکانوں کی چھتوں اور دروازوں پر سہمے ہوئے کھڑے تھے اور خوف زدہ نظروں سے بڑھ کر وارث کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں اسکائی لارکوں کے چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ مڑوا کر اس طرف نہ گیا۔

ہر شخص دم بخود تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ شور و غل سے دل دہلتا تھا۔ انجمن اشارت ہوئے اور ترک تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ ہیڈ کوارٹر کی جلتی ہوئی عمارت کے سامنے اسکائی لارک بے سدھ پڑے تھے۔

مفلد بشر نہ جانے کب دم توڑ چکا تھا سلمان اکھڑی اکھڑی سانسیں بھر رہا تھا فہیم اللہ لاپتہ تھا۔ ڈاکٹر زیدی اور کئی دوسرے اسکائی لارک خون میں ڈوبے بے حال پڑے تھے۔ پولیس اس وقت پہنچی جب حملہ آور جاچکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر جل کر تباہ ہو چکا تھا۔

دیکھتے ہوئے انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں خاک سے لتھڑی ہوئی صفدر بشر کی لاش پڑی بدل کا چہرہ اپنے ہی خون میں ڈوب کر شفق رنگ ہو گیا تھا۔ نیچلا ہونٹ لٹک رہا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ بے نور نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جھلسی ہوئی دھواں دھواں عمارت کو تیک رہا تھا۔

ہیڈ کوارٹر جل رہا تھا۔ الماریاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ شیشے، موم کی طرح پگھل رہے تھے۔ کتابیں چٹاکی مانند بھڑک رہی تھیں۔ یہ امن کے پیامبر نالائقی کی لاش تھی۔ یہ شیکسپیر کا جنازہ تھا۔ یہ ارسطو کا فلسفہ تھا۔ غالب اور اقبال کی شاعری تھی۔ مارکس اور لینن کا انقلابی ذہن تھا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ عظیم مصنف، عظیم مفکر۔ انسانی ارتقاء کے علمبرداروں کے

محملہ آور وحشیوں کی طرح حملے کر رہے تھے۔ وہ ہاتھوں، نیزوں اور لاثیموں سے لاکھ لاکھوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں شکاری چیتوں کی طرح چمک رہی تھیں اور چہرے بھوتوں کی طرح خوف ناک نظر آ رہے تھے۔

بستی بھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ہر گھر میں جاگ ہو گئی۔ لوگ مکانوں کی چھتوں اور دروازوں پر سہمے ہوئے کھڑے تھے اور خوف زدہ نظروں سے بڑھ کر وارث کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں اسکائی لارکوں کے چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ مڑوا کر اس طرف نہ گیا۔

ہر شخص دم بخود تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ شور و غل سے دل دہلتا تھا۔ انجمن اشارت ہوئے اور ترک تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ ہیڈ کوارٹر کی جلتی ہوئی عمارت کے سامنے اسکائی لارک بے سدھ پڑے تھے۔

مفلد بشر نہ جانے کب دم توڑ چکا تھا سلمان اکھڑی اکھڑی سانسیں بھر رہا تھا فہیم اللہ لاپتہ تھا۔ ڈاکٹر زیدی اور کئی دوسرے اسکائی لارک خون میں ڈوبے بے حال پڑے تھے۔ پولیس اس وقت پہنچی جب حملہ آور جاچکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر جل کر تباہ ہو چکا تھا۔

دیکھتے ہوئے انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں خاک سے لتھڑی ہوئی صفدر بشر کی لاش پڑی بدل کا چہرہ اپنے ہی خون میں ڈوب کر شفق رنگ ہو گیا تھا۔ نیچلا ہونٹ لٹک رہا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ بے نور نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جھلسی ہوئی دھواں دھواں عمارت کو تیک رہا تھا۔

ہیڈ کوارٹر جل رہا تھا۔ الماریاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ شیشے، موم کی طرح پگھل رہے تھے۔ کتابیں چٹاکی مانند بھڑک رہی تھیں۔ یہ امن کے پیامبر نالائقی کی لاش تھی۔ یہ شیکسپیر کا جنازہ تھا۔ یہ ارسطو کا فلسفہ تھا۔ غالب اور اقبال کی شاعری تھی۔ مارکس اور لینن کا انقلابی ذہن تھا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ عظیم مصنف، عظیم مفکر۔ انسانی ارتقاء کے علمبرداروں کے

”مردود، تجھے بکرا بننے کا بڑا شوق ہے۔ تجھے بکرا ہی بنا کے چھوڑ دوں گا۔“ وہ سڑاک سڑاک پیدل تارہ ہر بار تال سر کے ساتھ کہتا۔ ”بکرے کی بولی بول۔ بکرے کی بولی بول۔“

راجہ زراویر تک تو مار کھاتا رہا، پھر تکلیف سے بلبل کر چیخنے لگا۔ ”میں نے بکرے کی آواز نہیں سنی تھی۔“

## فصل نہم

(۱)

ماسٹر نے پیترا بادل کے زمانے کا ہاتھ گھمایا۔ ”خبیث جھوٹ بولتا ہے۔“

راجہ نے صفائی پیش کی۔ ”قسم اللہ کی ماسٹر صاحب میں نے بکرے کی آواز نہیں نکالی تھی۔“

”پھر کون تھا؟“

راجہ بات کہتے کہتے جھجک کر چپ ہو گیا۔ اسی وقت اس کے بازو پر سڑاک سے بید پڑا۔ وہ لڑا کر بولا۔ ”ماسٹر صاحب پوکر تھا۔“

پوکر کا نام محمد علی تھا مگر سب اسے پوکر کہتے تھے۔ وہ ہمیشہ کلاس میں ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ لڑکے اندر سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ بغل میں ہاتھ رکھ کر زور زور سے بجاتا کتابیں ہب کر دیتا۔ چکیاں بھرتا۔ نہ خود پڑھتا تھا اور نہ کسی کو پڑھنے دیتا تھا۔ چنانچہ روزانہ پڑھتا تھا۔ مگر سب اسے ڈرتے بہت تھے۔ بڑا شورہ پشت تھا۔

بڑے ماسٹر نے راجہ کو چھوڑ دیا اور دانت کچکا پاتا ہوا پوکر پر جھپٹا۔ پوکر مار کھانے کے معاملے میں تجربے کا تھا۔ اس نے ماسٹر کے پیچھے سے پہلی ہی گھٹنوں کے اندر سر چھپا لیا اور جھک کر بیٹھ لیا۔ ماسٹر نے قریب پہنچے ہی بید لگانا شروع کر دئے۔ پوکر چپ چاپ پٹپٹا رہا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔

جب کلاس ختم ہوئی اور ماسٹر باہر چلا گیا تو پوکر لپک کر راجہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ راجہ سبھی کو نظر دلا سے اسے دیکھنے لگا۔ پوکر نے گندی سی گالی دی اور آنکھیں نکال کر بولا۔

”گب تاؤ سالے خاں کیا کہتے ہو؟“

راجہ نے خوف زدہ ہو کر گردن جھکالی۔ پوکر نے ڈپٹ کر کہا۔ ”سیدھا کھڑا ہو تیری تو۔“

گالی دے کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور حلق سے آواز نکالی۔ ”ڈھیں۔“ ساتھ ہی اچھل کر راجہ کے کمر پر کھرماری۔ دوسری، پھر تیسری۔ پوکر حلق سے آوازیں نکالتا رہا۔ ”ڈھیں، ڈھیں، ڈھیں، ڈھیں۔“

خداوند شہرہ پشت بولا۔

پہرے دار نے آہنی پھانگ کھولا۔ دونوں بورسٹل جیل سے باہر آ گئے۔ یہ گرمیوں کی سارا سلونی شام تھی۔ بحیرہ عرب سے آنے والی تیز سمندری ہوائیں سرسراتی ہوئی چل رہی تھیں آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے بوند باندی ہو چکی تھی۔ بجکے ہوئے راستوں پر کہیں کہیں بارش اپنے نشان چھوڑ گئی تھی۔ دونوں جیل کی چار دیواری کے ساتھ ساڑ چلنے لگے۔

نوشا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مگر آج اس کے ہمراہ راجہ نہیں پوکر تھا۔ گزشتہ سال کا ذکر ہے ایک ایسی ہی شام تھی۔ جیل کا بوڑھا ماسٹر پیٹھ موڑے تختہ سیاہ پر چاک سے پاکستان کا نقشہ بنا رہا تھا۔ دفعۃً ایک طرف سے بکرے کی طرح زور زور سے میانے کی آواز ابھری۔ ماسٹر بدحواس ہو کر اس طرح اچھلا کہ اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ ہڑام سے کروٹ کے بل گرا۔ زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ماسٹر غضب ناک ہو کر اپنی انگلیاں رگڑ رہا تھا۔ اس بات کی علامت تھی کہ کسی کی شامت آنے والی ہے۔ وہ جب مارنے پر آتا تو ہانگوں کی حرکتیں کرتا تھا۔ اس نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے کلاس کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہ کچھ ایسا ہوش نظر آ رہا تھا کہ راجہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ ماسٹر نے اسے ہنسنے دیکھ لیا۔ اس نے بنید اٹھایا اور چیل کی طرح جھپٹا۔ راجہ نے سر اسیمہ ہو کر گردن جھکالی۔ ماسٹر اندھا دھند بیدار تا شروع کر دئے۔

ڈھیں۔“ راجہ چکر اگر گر پڑا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

خون نچک کر ہاتھ پر گرا تو راجہ کو تاؤ آگیا۔ وہ اٹھ کر اس پر کتے کی طرح چبھتا۔ مگر پوکر نے ہاتھ گھما کر کپٹی پر ایسا مگمارا کہ وہ رو جا کر گر گیا۔ سنبھل کر اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ پوکر نے زور سے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر راجہ کے گھٹنے پر لگی۔ بہت زور کی چوٹ آئی۔ راجہ تکلیف سے بلبلاتا کر چیخ پڑا۔ جیلر کے رو برو پوکر کی پیشی ہوئی۔ سزا بھی ملی۔ مگر راجہ کے گھٹنے پر ایسا زخم آیا کہ اچھانہ ہوا کئی بار زخم دھو کر پٹی باندھی گئی۔ لیکن گھاؤ اچھا ہونے کے بجائے اور پھیلتا گیا۔ راجہ لنگڑا کر پٹنار اکثر بیٹھا اپنا زخم کھداتا۔ کچھ ہی عرصے بعد زخم سے ذرا نیچے پنڈلی پر بھی ایک زخم اور ہو گیا۔ یہ زخم کسی چوٹ سے نہیں آیا تھا۔ خود بخود پیدا ہوا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے راجہ کے جسم پر جگہ جگہ سرخ اور سفید داغ پڑ گئے۔

جیل کا ڈاکٹر معمول کے مطابق قیدیوں کا معائنہ کرنے کے لیے آیا۔ اس نے راجہ کے زخموں اور سرخ اور سفید داغوں کو دیکھا تو دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر علیحدہ کمرے میں لے جا کر بہت سے سوالات کئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک اس کا خوب معائنہ کیا۔

دوبارہ ڈاکٹر جیل میں آیا تو راجہ کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹنے لگی تھی۔ زخموں سے رطوبت بہا کرتی۔ راجہ کا چہرہ بھدا ہو گیا تھا۔ کان پھول گئے تھے۔ انگلیوں کے ناخن جھڑ گئے تھے۔ اسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اب اس نے چلنا پھرنا بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت نڈھال پڑا رہتا۔ زخموں کو کھداتا۔

ڈاکٹر نے اس دفعہ دیکھا تو اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس روز اس نے راجہ سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے جیل کے چھانک پر ایک ایسبولنس آکر ٹھہری۔ راجہ کو اس میں بٹار اسپتال بھیج دیا گیا۔

راجہ اسپتال سے واپس نہیں آیا۔

\*\*\*

نوٹ: کواب یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ راجہ اسپتال میں ہے یا اسپتال سے کہیں اور چلا گیا۔ لیکن برابر راجہ کو یاد کرتا رہا اور آج جب وہ رہا ہو کر جیل سے نکلا تو اسے بار بار راجہ یاد آ رہا تھا۔ وہ فٹ پاتہ لکھتا تھا۔ معذرت منہ۔ ٹھنکنا قد: چھوٹا قد۔ دھاک بیٹھنا: رعب قائم ہونا۔ دھیک مشقی: لڑائی، جھگڑا۔ غضب کا: بہت زیادہ۔ بھو: بھارت۔ نور پور جس کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ نیلی مرغ: چھوٹے قد کا مرغ۔

ہلچل ہوئے سوچ رہا تھا۔ نہ معلوم اب راجہ کہاں ہوگا، کس طرح ہوگا؟ اسے کہاں تلاش کرے۔  
کی طرح ملے؟  
نشا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے آگے پوکر چل رہا تھا۔ پوکر سے اس کی دوستی راجہ کے جیل سے جانے کے بعد ہوئی اور اس کی ابتدا بھی ایک حادثے سے ہوئی۔  
پوکر گھٹے ہوئے مضبوط جسم کا لڑکا تھا۔ اس کی عمر سولہ سال سے کچھ اوپر تھی مگر دیکھنے میں بچہ کی طرح لگتا تھا۔ اس کا قد ٹھنکنا اور رنگ سانولا تھا۔ اس نے ایک رکشا ڈرائیور کو چاقو مار کر زخمی کیا۔ زور سے اقدام قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی اور وہ بورسل جیل بھیج دیا گیا۔ وہ بڑے فخر سے اپنا یہ درجہ نکالتا کرتا۔ ”سالے کی ایک ہی ہاتھ میں انتڑیاں نکال دی تھیں۔ نہ جانے کیسے بچ گیا۔ ورنہ لمبے دو کام ہی تمام کر دیتا تھا۔“

قدی لڑکوں پر اس کا بزار عجب پڑا۔ چند ہی روز میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ بات بات پر گالی بٹہ وقت لڑائی جھگڑا کرنے پر تیار رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بلا وجہ لڑکوں کو چھیڑ کر مار پیٹ کرتا۔  
”بے ہے کوئی ہے مائی کا لال۔ ذرا ہو جائیں دودو ہاتھ۔“ وہ بار بار انگڑائیاں لے کر ایک ایک کو دیکھتا۔ جب وہ نیا نیا جیل میں آیا تو بعض جرائم پیشہ لڑکوں نے اس کا چیلنج بھی قبول کیا۔

پوکر غصہ کا پھر تیرا تھا۔ لڑتے وقت اس کا جسم بجلی کی طرح تڑپتا معلوم ہوتا۔ کبھی داہنی طرف بھٹکائی دے کر نکلا تو گردن پر بھر پور ہاتھ دیا۔ بائیں طرف سے گھسا تو ایک ہی لات میں منہ لٹکائی گرا دیا۔ جب تک حریف کے سامنے رہتا اس کا جسم بید کی مانند چمکتا رہتا۔ ایک مقام پر نہ نکلتا۔  
”بھائی، کبھی وہاں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بچہ کی طرح چمکتی تھیں۔ وہ ٹپنی مرغ کی طرح چمکتا تھا۔  
”نکلا تو مینڈھے کی طرح ایک قدم پیچھے ہٹا۔ منہ سے ”ڈھیں“ کی آواز نکلتا اور زمین سے فٹ لگا کر چل کر نہانے سے مگمارتا۔ لڑنے والے کو لکارتا ”اے منہ کیا دیکھ رہا ہے، چل، چل۔“  
”بھائی، حریف کو تھپو کر اس کا ہاتھ صاف بچا جاتا۔ مسکراتا بار بار اکساتا۔ ”ایک اور۔ اے ایک اور!“

تھپو تھپو کر حملہ کرتا اور اپنے حریف کا لکارتا بھی جاتا۔

مشتعل کرتا تھا۔

راجہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوکر کو لکھارا۔ ”ابے ذرا منہ نہال کر بات کر۔ ساری ہیکڑی ابھی نکال کے رکھ دوں گا۔“

پوکر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”تو پھر آجا بے طرم خاں کے سالے۔“ اور اس کے روبرو جا کر ڈاؤن کیا۔ راجہ نے چھوٹے ہی زمانے کا ہاتھ پوکر کے منہ پر رسید کیا۔ راجہ اس وقت تھا بھی مگڑا اور بھی اس نے جھنجھلا کر کیا تھا۔

پوکر اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگاس کے جڑے پر بھر پور بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹ خون بہنے لگا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر ایک ہاتھ سے خون صاف کیا۔ ہنس کر بولا۔ ”اچھا ہاتھ تھا۔ ٹاکس بل کا معلوم ہوتا ہے۔“ پھر وہ دونوں ہاتھ تول کر راجہ کے سامنے لہرانے لگا۔ ”کم آن، کم آن“ وہی طرح شروع میں اپنے حریف کو اکساتا تھا۔ راجہ نے دانت بھیج کر ایک اور وار کیا۔ پوکر اٹھ گیا۔ اس نے ایکٹروں کی طرح مصنوعی قہقہہ لگایا۔ ”ہے“ اور راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں لکڑی بولا۔ ”ایک اور میری جان۔ کم آن، کم آن۔“ وہ اپنے کندھے بار بار اچکا رہا تھا۔ ہنس کر رہا تھا۔

”کم آن، کم آن۔“

راجہ نے پھر مگارا۔ وہ بھی خالی گیا۔ جھنجھلا کر اس نے پے در پے وار کرنا شروع کر دیئے۔ اس کے سارے حملے خالی دیتا گیا۔ ذرا دیر میں راجہ ہانپنے لگا۔ اسی وقت پوکر نے اچھل کر وار کیا۔ فوراً پوکر پڑا۔ راجہ نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ مگر وہ سنہلنے بھی نہ پایا تھا کہ پوکر نے تابڑ توڑ حملہ کر دیا۔

ہانچوں مکے پر راجہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔

اس کے بعد بھی کئی بار پوکر سے راجہ کا جھگڑا ہوا۔ شروع شروع میں وہ اس سے ذرا ذرا سی نہ ہارنے کے لیے مقابلے پر آ جاتا تھا۔ لیکن بعد میں پوکر سے ڈرنے لگا تھا۔ اس سے صرف اسی قدر لڑتا تھا جب بہت جھنجھلا جاتا تھا۔

پوکر اب قیدی لڑکوں کا سرغنہ بن چکا تھا۔ سب پر اس کی حکومت چلتی تھی۔ کوئی بھی اس

لڑکھانہ آدمی خود سری۔ مگڑا۔ صحت مند، زور آور۔ کس بل، زور و طاقت۔ پے در پے۔ مسلسل۔ سرغنہ۔ سردار۔

کوئی دن ایسا نہ جاتا جب اس کی پیشی نہ ہوتی۔ ہر روز اسے سزا ملتی۔ مگر جس طرح وہ اس کے معاملے میں نڈر تھا اسی طرح نارکھانے میں بھی ڈھیت تھا۔ سزا پا کر آتا تو بڑی بے حیائی سے ہن کر کہتا۔ ”خواہ مخواہ سالے اپنے ہاتھ تھکاتے ہیں۔“ پھر کسی لڑکے کو اشارہ کرتا۔ ”لے یا لڑا کر دو ایک مکیاں تو لگا دے۔ ادھر ایک آدھ ہاتھ گرم پڑ گیا تھا۔“ وہ اسی طنطنے سے قیدی لڑکوں پر چلاتا تھا۔ ذرا بھی کوئی حکم عدولی کرتا شامت آ جاتی۔

اس کا حکم نہ ماننے پر ایک بار نوشا کی بھی درگت بن چکی تھی۔ اس روز کسی بات پر ہاروا ہو کر پوکر نے ایک لڑکے کو مرغا بنادیا۔ نوشا کو حکم دیا کہ وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھ جائے۔ نوشا نے لیے آمادہ نہ ہوا۔ پوکر نے اٹھ کر نوشا کے منہ پر ایک مگڑا کر دیا۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس وقت پوکر دوسرا وار کیا۔ سنہلنے سنہلنے تیسرا وار ہوا تو نوشا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ہاتھ لپکپکانے لگے۔

پوکر کے پورے تین مکے جمیل جاننا مذاق نہیں تھا۔ اچھے اچھے جی دار لڑکوں کے جھکے چور جاتے تھے۔ نوشا ان دونوں نیا نیا جیل میں داخل ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ چکرا کر فز پر بیٹھ گیا۔ پوکر نے اس لڑکے کی خطا معاف کر دی اور نوشا کو مرغا بنا کر پیٹھ پر اس لڑکے کو بٹھا دیا۔ نوشا نے اسی دن توبہ کر لی تھی کہ اب وہ کبھی پوکر کے منہ نہیں لگے گا۔ وہ بلا چوں چا اس ہر بات مان لیتا۔ البتہ راجہ نے اس کی لیڈری کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ کئی بار اس کا اور پوکر کا چھیلا ہوا اور ہر بار راجہ کی دو گت بنی۔

پہلی بار دونوں کا جھگڑا کسی خاص بات پر نہیں ہوا تھا۔ پوکر نے حسب معمول لڑکوں کو چھیلا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اونچا کئے آواز لگا رہا تھا۔ ”ابے ہے کوئی مائی کا لال۔ ہاتھوں میں چل ہو رہی ہے ہو جائے کچھ رگڑم رگڑا۔“ اس وقت سارے لڑکے بیرک کے سامنے والے میدان میں اکٹھے ہو دوں کو پانی دے رہے تھے۔

جب کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ گالیاں دینے لگا۔ ”ابے تم سب سالے ہو۔ ایک بھی مرد کا بچہ نہیں۔“ اس نے سب کو خاموش پا کر اور بھی گندی گالیاں دینا شروع کر دیا۔

پیشی۔ بڑے اشر کے سامنے حاضری۔ ڈھیت۔ خدی۔ طنطنہ۔ شان۔ رعب۔ درگت۔ ہٹا۔ ہار پڑنا۔ جی دار۔ بہادر۔ چکے چھوٹا۔ مگڑا۔ چھیلا۔ مقابلہ۔ آغا سارا۔ جلی۔ خادش۔

خدا کی پوری مدد

پوکر کچھ دنوں تک خاموشی سے ٹارزن کی بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پورے مراسم بدھانا چاہے۔ مگر وہ اپنی ہوا میں تھا۔ اس نے پوکر کو زیادہ لفٹ نہیں دی بلکہ ایک طرف ہٹ گئے۔ پوکر کو بری طرح جھڑک دیا۔ اسی بات پر دونوں میں ٹھن گئی۔ پوکر اس وقت تو پوکر ہوا۔ اس لیے کہ خطا اس کی تھی۔ مگر دو ایک دن کا غوطہ دے کر اس نے ٹارزن کو چھیڑا۔ کچھ بھی نہ تھی۔ ٹارزن کی عادت تھی کہ وہ بات بات پر انگریزی میں گالیاں بکتا تھا جو امریکی لہجہ کے کچھ کر اس نے ازبر کر لی تھیں۔

ٹارزن اس روز تنگ میں تھا۔ اس نے ایک لڑکے کو یونہی تفریحاً ”بلڈی باسٹرڈ“ کہہ دیا۔ وہ لڑکے نے اس کا کھڑا ہو گیا۔ ”دیکھو جی ٹارزن! تم اس طرح گالی دے کر نہ کیا کرو۔ ورنہ اچھانہ ہو گا۔“

ٹارزن نے اس کا کوئی نوٹ نہ لیا اور نہایت حقارت سے دھتکار دیا۔  
”لٹ آؤٹ یو فلکن“

پوکر نے ترے اس کے جڑے پر فوراً ایک مٹکا جڑ دیا۔ چیخ کر بولا۔ ”سارے میں منع کر رہا ہوں لیکن تم اپنا حرامی پن دکھا رہا ہے۔“

ٹارزن نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور دونوں ہاتھ تول کر فلمی مٹکے بازوں کی طرح لے مارنے آکر جھومنے لگا۔ پھر اس نے دائیں طرف جھک کر پوکر کے منہ پر ایک مٹکا لگایا۔ ہاتھ ہٹا ہوا پوکر کوئی اور ہوتا تو پوکر صاف جھکائی دے کر نکل جاتا۔ لیکن اس پہلے ہی وار سے پوکر کو لڑا ہوا گیا کہ اس کا مقابلہ انٹری نہیں ہے۔ اچھی خاصی مٹکے بازی جانتا ہے۔ لہذا وہ بیچ بیچ کر حملہ لگاتا ہے۔

دونوں میڈھوں کی طرح جھوم جھوم کر لڑ رہے تھے۔ بڑے زوروں کا معرکہ پڑا۔ سارے گھونٹوں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ برابر کی جوڑ تھی۔ دونوں پیتھرے بدل بدل کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ پوکر کمزور پڑ رہا تھا۔ کئی بھر پوکر ہاتھ اس کی کنپٹی اور زخموں پر پڑ چکے تھے۔ ایک بار تو ٹارزن نے ایسا زانے کا مارا کہ پوکر لڑکھڑا کر گرتے گرتے چلا۔ لڑکوں نے زور سے تالیاں بجاتا شروع کر دیں۔ ان میں زیادہ تر ٹارزن کے حمایتی تھے۔

فیصلیہ ہو کر لڑا۔ زبانی یاد کرنا۔ خونخوار: جسے سے بھری ہوئی۔ چھپتا ہوا: سرسری۔ زانے کا: زوردار۔

کے حکم عدولی کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر مارتا بھی تو لڑے جسے چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی ناراضگی بے حد خطرناک ہوتی تھی۔ لڑکوں پر پوکر کی حکومت اسی طرح چلتی رہی۔

\*\*\*

ایک چینی ہوئی سہ پہر کو پولیس کی لاری جیل کے پھانک پر آکر رکی۔ پہرے دار نے تالاکو اور تین مسلح کانسٹیبلوں کی حراست میں گھسے ہوئے بدن کا ایک لڑکا جیل کے اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں ہتکڑیاں پڑی تھیں وہ ٹخنوں سے اونچی نیلی چٹلون پہنے تھا۔ جسم پر چھوٹی چھوٹی آستینوں ریشمی قمیص تھی۔ جس پر اڑد ہوں اور چھتوں کے علاوہ عورتوں اور مردوں کی ایسی تصویریں چھ تھیں جو بیجان انگیز انداز میں بوس و کنار کرتے نظر آتے۔ اس کی کمر کے گرد پیتل کے گوکھڑے سے جڑی ہوئی چڑے کی پٹی تھی۔ آنکھوں پر چوڑے چوڑے حلقوں کا سبز چشمہ تھا۔ وہ ہالی وڈ کی دھماکے بھر پور فلموں کا کردار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وضع قطع بالکل امریکی کاؤ بوائز کی سی تھی۔ اس کا نام تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس نے اپنا تعارف ٹارزن کہہ کر کر لیا اور وہاں سے قیدیوں میں مشہور ہو گیا۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ نابالغ لگتا تھا مگر اس پر زنا بالجبر کا مقدمہ چل رہا تھا۔ عدالت سے ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ اور اس کی ضمانت بھی نہ ہو سکی تھی۔ اس مشغلہ غنڈہ گردی اور سینما کے ٹکٹوں کی چور بازاری تھا۔ شہر میں اس کے ساتھیوں کا باقاعدہ گروہ جو اکثر جیل میں ملاقات کے دن اس سے ملنے آتے اور ہمیشہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے آتے۔ اس کے علاوہ وہ پہرے داروں کے ذریعے چوری چھپے سگریٹیں منگواتا تھا۔ چھپ چھپ خود بھی پیتا تھا دوسرے قیدیوں کو بھی پلاتا تھا۔

سگریٹوں کی بدولت ٹارزن جلد ہی جیل میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ اس نے اپنی پسند کے قیدیوں کی ایک ٹولی بنائی تھی جو ہر وقت اس کے دائیں بائیں پھرتے۔ ہر بات میں اس کی ہاں مٹا ملاتے۔ اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ ہونٹوں سے سیٹی پر کوئی انگریزی دھن بجاتا ہوا وہ ٹانگہ۔ جیل میں گھومتا پھرتا۔ ہاتھ پیروں میں کس بل تھا اور جھگڑا فساد کرنے کی مشق رہ چکی تھی۔ لہذا کی دھماک اور بھی زیادہ تھی۔

بیجان انگیز: جذبات بھڑکانے والے۔ گوکھڑے: بوسے ہوئے کانٹے۔ سن و سال: مرد عمر۔ زنا بالجبر: زبردستی کسی عورت کی زبردستی سوغات: تحفہ۔ ٹولی: گروہ۔ دھماک: دھب۔



ٹارزن نے اوپر سے اندھا دھند پوکر کے منہ پر مکتے مارنا شروع کر دئے۔ پوکر نیچے دبا ہوا بے بسی  
ہم ہاں بکرا رہا۔  
نوٹا اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ لپک کر وہاں پہنچ گیا۔ ذرا دیر تک وہ پوکر کو پٹختے دیکھتا رہا۔  
زندہ جانے اسے کیا سوچھی منہ بگاڑ کر ٹیکھے لہجے میں بولا۔

”مختے بہت سے مل کر اکیلے کو مار رہے ہو۔ ابے یہ بھی کوئی مردانگی ہے۔“

ٹارزن نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ چیخ کر گالی دی۔ ”شت آپ یو بلیدی۔“

نوٹا نے بے پروائی سے کہا۔۔۔ ”اکیلے اکیلے لڑو۔“

اس کی مراد یہ تھی کہ ٹارزن اکیلا پوکر سے لڑے۔ مگر ٹارزن یہ سمجھا کہ وہ اس کو لٹکا رہا ہے۔  
ہانے پوکر کو چھوڑ دیا۔ جھپٹ کر نوٹا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”چھا، تو تم مجھے چیخ دے رہے ہو۔ تو پھر آ جاؤ سامنے۔“

نوٹا لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ گھبراتا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ ”ابے میرے سر کیوں ہوئے  
ہاے؟“

وہ نوٹا ایسا کمزور بھی نہیں تھا۔ اب وہ خاصا لمبا چوڑا ہو گیا تھا۔ لمبے لمبے بے ڈول ہاتھ  
لہاؤں چاند اور موٹا ٹھٹھا جسم۔ دیکھنے میں وہ خاصا مسنڈا لگتا تھا۔ ٹارزن نے اس کی بات کا کوئی جواب  
نہ دیا۔ جھپٹ کر اس کے منہ پر ایک زوردار مچکا جڑ دیا۔ نوٹا بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ ٹارزن نے ایک اور  
لٹکا ہاتھ دیا۔ نوٹا سیکے بازی کا عادی نہیں تھا۔ جھنجھلا کر ٹارزن پر چھینٹا۔ ایک مچکا اس کی کینٹی پر اور  
لڑکھاس سے لپٹ ہی گیا۔

دونوں گتھم گتھا ہو کر کچھ دیر تک زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر نوٹا نے ٹنگوی لگا کر ٹارزن کو  
سارالوار اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر دو تین کس کس کے رگڑے جو دئے تو وہ لگا نہیں ٹھیں کرنے۔  
پوکر ابھی تک ٹارزن کے ساتھیوں کے زغے میں گھرا ہوا لڑ رہا تھا۔ اس پر چاروں طرف  
ٹپٹے ہو رہے تھے۔ وہ اکیلا سب کے وار روک رہا تھا۔ ٹارزن کا نوٹا نے حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اب وہ  
منہ کے قابل نہیں رہا تھا۔ نوٹا نے اس کو تو دوہیں چھوڑا اور لپک کر پوکر کے قریب پہنچا۔ اس  
نڈاؤ قہقہے بڑے جوش میں تھا۔ اس نے سب کو لٹکا رہا۔

نوٹا نے ٹنگوی لگا کر۔ مراد ہنگ مار کر، پہلوانوں کا ایک داؤ۔ ٹھیں ٹھیں کرنا۔ منت ساجت کرنا، عاجز ہونا۔

ٹارزن برابر دبا دبا جا رہا تھا۔ پوکر چوٹ پر چوٹ کھارہا تھا۔ اب اس کے ہاتھ بھی اٹنے لگے۔  
پڑ رہے تھے۔ پوکر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ پیچھے، اور پیچھے وہ جیل کی چار دیواری کے پاس پہنچ گیا۔ اس  
پشت بالکل دیوار سے لگ گئی۔ اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات  
اختیار کرنے کا موقع تلاش کر رہا ہے۔ اس کے رخسار جگہ جگہ سے سون کر نیلے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں  
سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ خچر کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ ٹارزن اب اس پر پور  
طرح حاوی ہو گیا تھا۔

پوکر نے ایک بار اپنی گردن جھکائی۔ حلق کے اندر سے ”ڈھیس“ کر کے بھیاک آواز نکالی۔  
مینڈھے کی طرح پنجوں کے بل اچھل کر ٹارزن کی ٹھوڑی پر زور کی ٹکرماری۔ وہ اس اچانک حملے  
لیے تیار نہ تھا۔ چند ہی کر رہ گیا۔ پوکر نے اسے سینھیلے کا موقع نہ دیا۔ دوسری ٹکرم، پھر تیسری۔  
نے تابڑ توڑ کئی ٹکریں ایسی ماریں کہ ٹارزن ہوتی کی طرح منہ پھاڑ کر جھومنے لگا۔

پوکر تیزی سے دائیں بغل سے نکلا اور گھوم کر ٹارزن کے رخسار کی بچھلی ہڈی پر زور دار مار  
دیا۔ وہ چکر کھا کر رہ گیا۔ اب ٹارزن کی پشت پر دیوار تھی اور پوکر اس کے سامنے تھا۔ اس کے بعد پوکر  
نے اچھل اچھل کر دو تین بھر پور مکتے مارے تو ٹارزن لڑکھڑا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں زرا  
پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پیٹھ دیوار سے ٹکی تھی۔ وہ منہ کھولے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں  
بند ہوتی جا رہی تھیں۔

اس معرکے بے بعد ٹارزن کی ہوا بگڑ گئی۔ اسے اپنی بے عزتی کا شدید احساس تھا۔ وہ کھرا  
تک اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ کس طرح پوکر کو نچا دیکھا جائے تاکہ انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو۔  
ایک روز موقع پا کر اس نے پوکر کو گھیر لیا۔ اس کے ہمراہ اس وقت کئی منتخب کتے ہوئے تھے  
لڑکے تھے۔ پروگرام کے مطابق پہلے ایک لڑکے کو بھیجا گیا۔ وہ پوکر کے برابر سے بٹلیں بجاتا  
گزرا۔ غنڈوں کی اصطلاح میں اس کا مقصد پوکر کی بے عزتی کرنا تھی۔

پوکر نے اس لڑکے کو غصے سے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ ”سالے چگاڈڑا تیری تو ایسی کی تھی۔“  
وہ گالیاں دیتا ہوا جھپٹا اور اس کی گردن دیوبلی۔ آناٹا ٹارزن اور اس کے ساتھی پوکر کو  
پڑے۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ سب نے مل کر اسے گرا دیا۔ ٹارزن سنے پڑا۔

چند ہی آنکھوں کے سامنے اندر اندر چھپا جاتا۔ ہوا بگڑنا۔ حالات کا پہلے سے الٹ ہو جانا۔

”آجاؤ سالو! ایک ایک کی ایسی کی تہی کر دوں گا۔“

نہا کی ہجرت

نہا کی ہجرت

نہا کی ہجرت اس فن کو سیکھ بھی گیا۔ تجربہ کرنے کا موقع نہیں ملا ورنہ جس طرح پوکر جیب تراشی

نہا کی ہجرت اس کا امتحان لے چکا تھا، تالا توڑنے کے ہنر کا مظاہرہ بھی ہو جاتا۔

پہلے وہ جیل میں بے حد اداس رہتا تھا۔ اکثر راتوں کو اٹھ اٹھ کر رویا کرتا۔ گڑگڑا کر گھنٹوں

ہائیں لگاتا کرتا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا۔ جیل کا ماسٹر جو سبق دیتا اسے جی لگا کے

ساتھ نظر آتے۔ جیل سے راجہ کے جانے کے بعد نوشا جو اکیلا پن محسوس کر رہا تھا، اس کی کوپا

نے پورا کر دیا۔ اس کے ساتھ رہنے میں ٹھانڈ بھی بہت تھے۔ سب پر حکم چلتا تھا۔

(۲)

نوشا اور پوکر فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے رہے۔

شام گھر کی جارہی تھی۔ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ شہر کی دیواروں پر سائے لہرا رہے تھے۔

کچھ دور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”بے ادب پوکر! کدھر منہ اٹھائے جا رہا ہے؟“

پوکر نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹین کی جھکی ہوئی چھت والے ایک چائے خانے کے سامنے استاد

بازو کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ باجو بھی تھا۔ پوکر رک گیا۔

استاد پیڑ رو اپنی اجلی شلوار کھڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ پیچھے پیچھے باجو آ رہا تھا۔ استاد نے

دوڑے اپنے بازو پھیلا دیے۔ پوکر کو بڑے جوش سے دونوں بازوؤں میں بھینچ کر اوپر اٹھالیا۔ ہنسنے

لگے بولے۔

”سوالوں نے اب چھوڑا ہے۔ میں تو چار بجے کا یاں آیا بیٹھا ہوں۔ حرام کے جنوں نے میسوں

کو گولا لے لیا۔ ابھی ابھی تو ہو کر آ رہا ہوں۔“

اس کے بعد دو اور قیدی لڑکے جیل سے نکل بھاگے۔ ایک رات پوکر اور نوشا نے بھی فرا

ہونے کی کوشش کی مگر پکڑے گئے۔ بڑی سخت سزا ملی۔ پیروں میں ڈنڈا بیڑیاں لگا کر قید تھائی

ڈال دئے گئے اور کڑی نگرانی کی جانے لگی۔

جیل میں نوشا نے اور تو کچھ نہیں سیکھا البتہ پوکر کی صحبت میں رہ کر اسے لڑنے بھڑنے اور

چا تو چلانے کی تکنیک معلوم ہو گئی۔ اب وہ ایسے موقعوں کے تمام ہتھکنڈے جان گیا تھا اور آئے

کسی نہ کسی بات پر لڑکوں سے جھگڑتا رہتا۔ اس میں پہلے جو جھجک اور خوف تھا، جاتا رہا۔

اب وہ بالکل نڈر ہو کر لڑتا تھا۔ اس کے علاوہ پوکر بڑا اچھا جیب کسرتا تھا۔ اس فن کے تمام

اس نے نوشا کو بتا دیئے تھے۔

بورشل جیل میں بڑی تعداد ایسے لڑکوں کی تھی جو جرائم پیشہ تھے۔ ان میں افلاطون بھی تھا۔

تالا توڑنے کا ماہر تھا اور اس فن کو بڑی فیاضی سے سکھاتا تھا۔ نوشا بھی کچھ عرصہ اس کا شاگرد رہا۔

شٹی گم ہوتا: یو کھانا: گاڑھی چھنا: آپس میں خوب میل جول ہوتا: فیاضی: سخاوت: کھلے دل سے۔

”استاد! یہ نوشا بھی اپنا یار ہے۔ میرے ساتھ ہی چھٹ کر آیا ہے۔“

نوشا نے گردن کو ذرا سا خم دے کر بڑی سعادت مندی سے استاد کو سلام کیا۔ اس کے انداز پر استاد پیڑ روکا دل خوش ہو گیا۔ بزرگوں کی طرح سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”جیتے رہو!“ کی جانب متوجہ ہوا۔

”کیوں بے باجو، وہ ٹیکسی والا کہاں مر گیا؟ ٹیکسی میں پٹرول ڈلوانے گیا تھا۔ اب تک ہر لوٹا۔ تو ٹیکسی لے کر آ۔ تب تک میں لمڈوں کو چائے پلا دوں۔“

باجو ٹیکسی لینے چل دیا۔ استاد پیڑ رو دوونوں کے ہمراہ چائے خانے میں پہنچا۔ بیچ پر بیٹھے ہوئے چائے خانے کے مالک سے بولا۔

”سیٹھ! دو فٹ کلاس ڈبل چائے تو مارو۔ ذرا بالائی اچھی ڈلوانا۔ لمڈا دبلا ہو کر آیا ہے۔“ نے محبت سے پوکر کے بازو کو دبایا۔ ”ابے کچھ کھانے کو بھی مل ریا تھا۔ تیری تو ہڈیاں نکل آئیں۔“ پوکر جیل کی تکلیفیں سنانے لگا۔ استاد کریڈ کرا کر ایک ایک بات پوچھ رہا تھا۔

نوشا خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔  
تھوڑی دیر بعد چائے آگئی۔ دونوں نے چائے پی اور وہاں سے اٹھ کر سڑک پر آگئے۔ ٹیکسی لے آیا تھا اور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ چاروں ٹیکسی کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی عثمان آباد طرف چل دی جہاں استاد پیڑ روکا ڈاڑھا تھا۔



بندر روڈ پر روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ رات ہولے ہولے کراچی کی فلک بوس عمارتوں نے نیچے اتر رہی تھی۔ استاد بڑے ٹھانڈے سے گردن اونچی کئے بیٹھا تھا۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ سر کے با کھڑی ہو گئے تھے۔ مونچھیں بہت گھنی تھیں۔ آنکھوں میں بڑی پراسرار چمک تھی۔ قدمیاں تھا جسم پر چربی کی جھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

جب وہ اڈے پر پہنچے تو پہر رات گزر چکی تھی۔  
”اڈا ایک تنگ دتار یک گلی کے اندر تھا۔ چاروں طرف کچی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ البتہ اڈا جس مکان میں تھا اس کی دیواریں پختہ تھیں۔ اس میں کئی کمرے اور ایک طوا

ان تھا۔ صحن بڑا کشادہ تھا مگر اس کا فرش کچا تھا۔ صحن کے ایک گوشے میں نیم کا گھنا درخت تھا جس پر کچرے پڑے تھے اور چاندنی راتوں میں اڑا کر شور مچاتے تھے۔  
پتلی گلی کے نکل پر رکی۔ استاد پیڑ رو کرایہ ادا کر چکا تو اس نے مشکوک نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ پوکر کو علیحدہ لے جا کر پوچھا۔

”ہیوں جی! یہ نوشے کا کیا معاملہ ہے؟“  
پوکر نے فوراً جواب دیا۔ ”استاد! وہ تو اب اپنے ہی ساتھ رہے گا۔“  
”ساتھ تو رکھ لوں گا پر کچھ اپنے کینڈے کا بھی ہے؟“

”ہاں پوچھتے ہو استاد! بڑا جی دار لوٹا ہے۔ ویسے میں نے اس کو کار گیری کے دو چار ہاتھ سمجھا ہیں۔“

استاد پیڑ رو نے اسے ڈانٹا۔ ”ابے تو کیا سمجھائے گا۔ ابھی تو تیرا ہاتھ خود نہیں صاف ہوا۔ لے پٹے ہیں استاد کی کرنے۔“  
پوکر کھیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

استاد نے باجو اور نوشا کو اشارے سے قریب بلایا اور ان کے ہمراہ گلی میں داخل ہوا۔ اڈے اندر جا کر اس نے دیکھا۔ بڑے کمرے میں لائین جل رہی تھی۔ چکر دیوار سے پیٹھ لگائے ٹیٹھا تھا۔ استاد پیڑ رو کو دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ استاد نے پوچھا۔  
”یہ لمڈے ابھی تک نہیں لوٹے؟“

”قادر اور پنچھی آئے تھے۔ چائے پینے گئے ہیں۔“  
استاد نے ایک لمبی، ہوں کی اور کمرے میں کھنچی ہوئی دری پر تھکا ہوا سا بیٹھ گیا۔ پوکر کو پوکر کے بولا۔ ”ابے تیرے چکر نے تو آج اپنا پلیٹین نکال دیا۔“  
چکر نے مسکرا کر پوکر کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ چکر نے کہا۔ ”یار

مافیا تاش کھیلنے کا لطف جاتا رہا۔ خدا قسم تجھے روزیاد کرتے تھے۔“  
پوکر ہنس کر بولا۔ ”تو پھر آج ہی جے گی۔ یار بہت دن ہو گئے تاش کھیلے ہوئے۔ بڑی مشکل

ڈال کی ایک گڈی ہاتھ لگی تھی۔ ایک دن سالوں نے دیکھ لیا۔ اسی وقت چھین کر لے گئے۔“

چکر م گھر کر اٹھا۔ اس نے کمرے کے کونے میں رکھا ہوا لکڑی کا صندوق کھولا۔ رجسٹر اور ذرا نکالا اور لائین کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ استاد نے دونوں نوجوان لڑکوں سے کہا۔

”کلیں تو تم دونوں بہت بھر رہے تھے۔ اب دیکھو تم کیا تیر مار کر آئے ہو؟“

لائین نے چٹلون کی جیب سے کئی نوٹ اور کچھ ریزگاری نکال کر چکر م کے سامنے ڈال دی۔

”بیڈرو نے پوچھا۔“ کیوں بے چکر م۔ کتنی رقم ہے؟ یہ تو سالے اپنی زبان سے بتائیں گے نہیں۔“

چکر م نے پوری رقم گن کر کہا۔ ۵۵ روپے نو آنے ہیں۔“ اور رجسٹر میں رقم درج کرنے لگا۔

استاد بیڈرو نے کہا۔ ”بس! کل تو تم بڑے فروٹ گئے تھے۔ آج کیا ہوا؟“

”آج تو صرف ایک ہی موقع لگا۔ کل چار دفعہ کار گیری کی تھی۔“

”نہیں ہے، اتنی تیزی ٹھیک نہیں۔ تم نے کل یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ بس ایک دفعہ کاری کر دیا کرو۔ ورنہ دھر لیے جاؤ گے۔ جتنا ملے گا نہیں اتنا رشوت میں لٹے کھا جائیں گے۔“

استاد بیڈرو کی ناراضگی رنج ہو چکی تھی۔ وہ انہیں بزرگوں کی طرح جیب تراشی کے فن پر سننے لگے سمجھانے لگا۔ دونوں سر جھکائے اس کی باتیں سنتے رہے۔ اسی اثنا میں تین نو عمر لڑکے کمرے

داخل ہوئے۔

”استاد سلام!“

”استاد سلام!“

”استاد سلام!“

وہ چکر م کو بورٹل جیل کی باتیں سنانے لگا۔ نو شا چپ بیٹھا رہا۔ پوکر نے اسے چکر م سے ملایا۔

استاد پیڈرو اب بازو پر سر ٹکا کر چٹ لینا تھا۔ باجو ا پھرتی سے اس کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ اسے ہاتھ بڑے سدھے ہوئے تھے اور تیزی سے چل رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کے دروازے پر بیس، بائیس سال کے دو نوجوان لڑکے نمودار ہوئے

ایک کارنگ سیاہ تھا۔ بالوں میں خوب تیل چڑھا ہوا تھا۔ وہ چٹلون اور بش شرٹ پہنے تھا۔ دوسرا

سے مختلف تھا۔ اس کا رنگ کھٹا ہوا تھا۔ گلے میں ریشمی رومال بندھا تھا۔ خوب گھیر دار لٹھے کی ٹٹا

پہنے تھا۔ دونوں بے تکلفی سے قہقہہ لگا رہے تھے۔

استاد نے دونوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ گرجدار آواز سے بولا۔ ”اے بڑی بیٹھی

ہو رہی ہیں۔ بہت دن سے تمہاری کندی نہیں ہوئی۔“

دونوں سہم کر رہ گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی استاد کو سلام کیا اور ایک کونے میں دبا

بیٹھ گئے۔ استاد نے پوچھا۔

”اے ابے ادھر منہ چھپا کر کیوں بیٹھ گئے۔ تم اب تک رہے کہاں؟“

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔

اس دفعہ استاد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”اے ابے منہ پھوٹ گئے تمہارے۔ بولتے کیوں نہیں؟“

نوجوان کو جس کا رنگ سیاہ تھا، مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو بتا بے کالین؟“

وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔ ”استاد ذرا دیر ہو گئی۔“

استاد کو جلال آگیا۔ ”اے ابے یہ ذرا دیر ہو گئی۔ دس بج رہا ہے اور تو ذرا ہی دیر کے رہا ہے۔ دونوں

ڈیوٹی تو پاسپورٹ کے دفتر پر تھی۔ وہ تو چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ اب تو وہاں کتے لوٹ رہے ہوں گے۔“

”کلکشن چلے گئے تھے۔“ اس دفعہ دوسرے نے جواب دیا۔

”تویوں کو سیریں ہو رہی تھیں۔ ابے تم کو کیوں ہوا لگی ہے۔ سالو! کھال میں رہو کھال

میں۔“ وہ چکر م کی طرف پلٹا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”چل بے چکر م! بہت ہو چکی یاری۔ کام بھی کرے گا

باتیں ہی ہوتی رہیں گی۔“

خدا کی بھی

کمرے میں ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور مکھیوں کی طرح بھنسنار ہاتھا۔ استاد پیڑرو کوٹ کے بل خاموش لیٹا تھا۔ آخر وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔

سارے جیب کترے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چکر م نے لالٹین اور رجسٹر اٹھایا اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

استاد نے جیب کتروں سے کہا۔ ”چلو بے حساب دو۔“

ایک ایک جیب کتر اباری باری آتا اور جیب سے نوٹ اور ریز گاری نکال کر اس کے سامنے ڈالتا جاتا۔ استاد پیڑرو اونچی آواز سے جیب کترے کا نام لیتا اور خود رقم گنتا۔ چکر م فوراً رجسٹر اندراج کر لیتا۔

استاد پیڑرو کسی کی پیٹھ ٹھوک کر شاباشی دیتا۔ کسی کو گالیاں دیتا۔ کسی کو جیب تراشنے کے لیے لپکھ دیتا۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

جب سب جیب کتر اپنی اپنی آمدنی جمع کر چکے تو استاد نے ساری رقم میں سے ایک تہائی نکال کر چکر م کو دے دیا۔ یہ اڑے کا حصہ تھا۔ بقیہ رقم میں سے استاد نے ہر ایک کی دہائی بانٹ دی۔ جیب کتروں کے مختلف مدارج تھے۔ جو سینئر تھے ان میں ۵۰ فی صدی حصہ تقسیم کر دیا جاتا۔ ان سے کم درجے کے تھے ان کو روپے میں ۵ آنے کا حصہ ملا اور جو بالکل جو نیر تھے ان کے حصے میں ۱۳ آنے کا حصہ آیا۔

استاد پیڑرو جیب کتروں میں اس روز کی دہائی تقسیم کر چکا تو اس نے باجو کی طرف اشارہ کر کے چکر م سے کہا۔ ”اسے بیس روپے دے دیجو۔“ پھر باجو کی طرف متوجہ ہوا۔ ”جانبے بنانے لیے سامان لے آ۔ مٹھائی تازہ لائیو۔ اس سالے افضل کے ہاں نہ جانیو۔ پتہ نہیں سالانہ میاں کا ملاوٹ کرتا ہے۔ اس دن جو امرتیاں تو لایا تھا ایسا کھلا پکڑا کہ اب تک طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔“

باجو نے چکر م سے بیس روپے لیے اور باہر چلا گیا۔

استاد بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جیب کتروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے دے کر باتیں کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ بے تکلفی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ سب کھسک کھسک کر پوکر کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھے ہو گئے تھے۔ اگلے سیدھے سوالات پوچھ رہے تھے۔

نوشا م صم بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہر جیب کتر اشتبہ نظروں سے ہٹا کر رہا تھا۔ ان کے اس انداز نے اسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔

\*\*\*

استاد پیڑرو کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت صرف سفید لنگی باندھے ہوئے تھا اور اپنے پلوئے بدن کو تولیہ سے پونچھ رہا تھا۔

ابیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غسل کر کے آیا ہے۔

جب بدن پونچھ چکا تو اس نے چکر م کے آگے کنبی پھیک کر کہا۔ ”الماری سے ایک دھلا ہوا لٹو نکال کر لا۔“ کنبی لے کر چکر م جانے لگا تو اس نے ٹوکا۔

”اور ہاں میری ٹوپی اور مصلّا بھی لائیو۔“

چکر م باہر چلا گیا۔ استاد پیڑرو نے اشارے سے نوشا کو قریب بلایا۔ ”میرے کئے آئیو۔“ وہ سہا اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ استاد نے کہا۔

”ڈر لا! دھنا ہاتھ تو دکھائیو۔“

نوشا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ استاد اس کا ہاتھ تھام کر انگلیوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ٹانگیں نرم اور لانی لانی تھیں۔

استاد مسکرا کر بولا۔ ”انگلیاں تو تیری ٹھیک دکھے ہیں۔ کچھ دن زور پنچہ کر انا پڑے گا۔ کھنچاؤ ہے۔“

وہ اس کی انگلیاں دیکھتا رہا اور اپنی مخصوص اصلاحات میں ان پر تمبرہ بھی کرتا رہا۔ جب وہ لبلاو کچھ چکا تو نوشا اٹھ کر جانے لگا۔ استاد نے ڈپٹ کر کہا۔

”سب ڈرائیو جا رہا ہے۔ یہ ڈھوکا ڈھو بدن دیکھو اور ابھی سے اس کی سٹی گم ہے۔“

نوشا چپ چاپ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

استاد کچھ کہنے ہی جا رہا تھا اتنے میں پنچھی بول پڑا۔

”کل سو لجر بازار والے استاد احمد جان مگر گئے تھے۔ آج کل ان کے بڑے نقشے ہیں۔ بڑے دلال جا رہے ہیں۔“

انہوں نے ڈھوکا ڈھو کر مراد مونا تازہ۔

پیڑ رونے اس کی بات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کے ریا تھا؟“

پنچھی نے بتایا۔ ”بڑی ہوا باندھ رہے تھے۔ کہنے لگے کراچی میں تو سب اٹھائی کیرے پر کار گیر ایک بھی نہیں۔ جسے دیکھو وہی استاد بنا پھر تا ہے۔“

استاد پیڑ رو کو تاؤ آگیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

”استاد تو وہی سالہا شہر بھر میں رہ گیا ہے۔ خواہ مخواہ فٹنی مارتا پھر تا ہے۔ بس کپڑا ماری دو چار لٹے سیدھے ہاتھ جانتا ہے۔ وہ تو ذرا ذرا سے لمڈے بھی جانتے ہیں۔ جسے گرہ کئی کہتے ہیں فن تو اس کے استاد کو بھی نہ آتا ہوگا۔ سالہا اب تک تیسری انگلی اناڑیوں کی طرح چلاتا ہے۔ اکر چلاتا تو اسے آج تک نہیں آیا۔ وہ کیا بمبئی کے ٹیکھے ہوئے جتنے کار گیر ہیں سب سالے اناڑی ہیں۔ استاد پیڑ رو بڑے جوش کے ساتھ بول رہا تھا۔

سارے جیب کترے دم بخود بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ استاد گردن کو بار بار خم دے کہتا رہا۔

”کام کرنے والے تو کلکتے سے بڑھ کر روئے زمین پر نہ ہوں گے۔ یہاں کا صاحب غور ہے کہ پھوٹ میں ہنر سیکھ لو۔ اپنے استاد تھے شیخ نبی بخش۔ ستر سے اوپر سن تھا۔ دکھائی بھی کم تھا۔ ان کا باقاعدہ اسکول تھا۔ پورے سو روپے نذرانہ لیتے تھے۔ پھر کام سیکھنے میں ان کے نو سونے الگ جھیلنا پڑتے تھے۔ ذرا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی چھٹے ہی منہ پر ہاتھ پڑتا تھا۔ کیا محال کو چوں کر جائے۔ کھڑے کھڑے نکال باہر کرتے۔ مگر اپنے کام کے ماہر تھے۔ دھاک اتنی تھی پیشاب سے چراغ جلتا تھا۔ بڑے بڑے مانے ہوئے استاد آکر کان پکڑ گئے۔“

استاد پیڑ رو کا غصہ ختم ہو گیا۔ اب وہ موج میں آکر بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اسی اثنا چکر م کپڑے لے کر آگیا۔

استاد پیڑ رو نے اٹھ کر وہیں کھڑے کھڑے کپڑے تبدیل کئے۔ درمی پر مصلحتاً بچایا اور اس ایک کو نے پر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد باجو اسامان سے لدا اچھنڈا کمرے میں داخل ہوا اور سارا سامان استاد پیڑ رو

اٹھائی کیرا: جیب کتر، اچکا، فٹنی، ہر او شی، اکڑ، پھوٹ میں: مفت میں: چھٹے ہی: فوراً ہی۔

عبدالکرم

ہلنے لاکر ڈھیر کر دیا۔

چکر م نے اگر بقیات سلگائیں۔ کمرے میں دھویں کے ہلکے ہلکے مرغولے لہرانے لگے۔ فضا میں ڈیڑھیل مٹی۔

استاد نے اپنی ترکی ٹوپی پہنی۔ شیرینی کو مصلے پر رکھا۔ آنکھیں بند کیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر ہار بنے لگا۔

نواز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نوشا کو قریب بلایا۔ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار لے اور اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی۔

شاگرد کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ نوشا اب استاد پیڑ رو کے حلقے میں باقاعدہ شامل ہو چکا تھا۔

استاد نے اپنے ہاتھ سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں رکھا اور مٹھائی تمام جیب کتروں کا تقسیم کر دی گئی۔

نوشا ٹھک کر ہر جیب کترے سے گلے مل رہا تھا۔

وہ آٹے کا ستر ہواں رکن تھا۔

پنچھی نے استاد پیڑ رو کی فرمائش پر ایک فلمی گیت سنایا۔ اس کی آواز اچھی تھی۔ خوب لہک لہک رہا تھا۔ قادر گیت کے ساتھ منہ سے طبلہ بجاتا رہا۔ اچھا خاصا سماں بندھ گیا۔

آدھی رات تک یہ جشن جاری رہا۔

جب کترے سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو آٹے ہارے تھے۔ ایک کمرے میں کئی کئی کی رہائش تھی۔ پوکر اور نوشا نے اپنے ٹھہرنے کا بندوبست بھی کرے میں کیا۔

لگ بھگ ہفتہ بھر تک استاد پیڑ رو، نوشا کو جیب تراشی کی تکنیک سکھاتا رہا۔ زور پنچے کی مشق ہاں کی انگلیاں مضبوط اور پھر تیلی بنائی گئیں۔ آخر ایک روز چکر م کی نگرانی میں اس کی ڈیوٹی مقرر ہو گئی۔

\*\*\*

چکر م چھری سے بدن کا طرح دار نوجوان تھا۔ وہ اپنے کام میں بڑا چوکس اور پھر تیز تھا۔ استاد

نوشا: محفل جلا: چھریرا بدن: چلا بدن: طرح دار: خوش انداز: چوکس: ہوشیار۔

خدا کی

پیڑرواس پر اس قدر مہربان تھا کہ بہت سے سینئر جیب کتروں کی موجودگی میں چکر م کو اٹھایا اور مقرر کر دیا تھا۔

استاد اس پر اعتماد بھی اتنا کرتا تھا کہ جیب کتروں کا سارا حساب کتاب وہی لیتا اور ساری بھی اس کی تحویل میں رہتی۔ چکر م دل کا بھی اچھا تھا۔ نوشا کی ہر طرح دلجوئی کرتا۔ خوب مذاکرات کرتا۔

دن میں کئی بار چائے اور لسی کا دور چلتا۔ ٹھاٹھ سے سگریٹیں پی جاتیں۔

نوشا چند ہی روز میں چکر م سے مانوس ہو گیا۔

دونوں کی آپس میں خوب ہنسنے لگی۔ ان دنوں چکر م کی ڈیوٹی شہر کے گنجان علاقے، ایپرا مارکیٹ کے بس اسٹینڈ پر تھی۔

مینیج کی شروع تاریخیں تھیں۔

پہلے ہی دن چکر م نے ایک سنگرام غاذج کیا۔ (جیب کتروں کی اصطلاح میں اسے جیب کاٹنا ہے)۔ دوسو سے اوپر کی رقم ہاتھ لگی۔

جس وقت چکر م نے جیب کاٹی نوشا قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ آغا پللی بھی ان ساتھ تھا۔

چکر م نے جس دیدہ دلیری سے کار گیری کا ہاتھ دکھایا نوشادنگ رہ گیا۔ پتہ بھی نہ چلا کہ اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔

نوشا کو تو اس وقت علم ہوا جب چکر م نے چڑے کا بڑا اس کے ہاتھ میں دے کر نکل جا۔ اشارہ کیا۔ ایسی تمام ہدایتیں استاد پیڑرواسے پہلے ہی دے چکا تھا اور باقاعدہ امتحان بھی لے چکا تھا۔

نوشا بڑا سنبھال کر سیدھا اسی چائے خانے میں پہنچا جہاں چکر م روزانہ بیٹھتا تھا۔ کوئی پندرہ من بعد چکر م اور آغا پللی بھی مسکراتے ہوئے چائے خانے میں پہنچ گئے۔ سب کچھ اتنی پھرتی اور آسانی۔

ہو کہ نوشا کے دل میں جیب تراشی کا جو خوف تھا، پہلے ہی تجربے میں بہت حد تک زائل ہو گیا۔

## فصل دہم

(۱)

باز کو بیوی کے انشورنس کارڈ پر ملا تو اس کے دن پھر گئے۔ پچاس ہزار وصول کرنے کے کچھ بعد اس نے مضافات میں ایک کوٹھی خرید لی اور پرانا مکان چھوڑ کر اس میں منتقل ہو گیا۔

یہ خاصا جائز علاقہ تھا۔ مشرق میں اونچے نیچے بکھرے تھے، قرب و جوار میں چند پرانی وضع کے فنانس میں کبھی فوجی افسروں کی رہائش تھی۔ مگر جب سے یہ بنگلے عام شہریوں کے تصرف میں آئے اس وقت سے روز بروز نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن شام ہوتے ہی ہر طرف ہوکا بندراستوں پر آمدورفت کم ہو جاتی۔ پہر رات گزرنے کے بعد سارا علاقہ قبرستان کی طرح معلوم ہوتا۔ اندھیرا ہوتے ہی گیدڑ بولنا شروع کر دیتے۔ رات کے سنانے میں ان کی آوازیں اونی لگتیں۔

لوٹنی میں چار کمرے تھے۔ نیاز نے نیلام میں خریدے ہوئے فرنیچر سے تمام کمروں کو خاصا کر دیا تھا۔ کوٹھی میں بڑا سا احاطہ تھا جس میں گھنے درخت تھے۔ عرصے سے باغیچے کی دیکھ لیا ہوئی تھی۔ لہذا ہر طرف جھاڑ جھکاڑ نظر آتے۔ رات کے وقت شاخوں سے خشک پتے نہکرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کوئی دبے قدموں درختوں تلے چل رہا ہے۔

لوٹنی میں اگر نیاز کو ہر طرح کی آسائش مل گئی تھی۔ مگر آمدورفت کی بڑی تکلیف تھی۔ لاکاشمیر میں تھا۔ سویرے ہی سویرے وہ گھر سے نکل جاتا۔ مگر بس کے انتظار میں کبھی کبھی

عشقم نہ ہوتا تھے دن آتا۔ مضافات: قرب و جوار۔ وضع: انداز۔ تعریف: استعمال۔ ہو کا عالم: خاموشی، سیرانی۔

جائین: قائم مقام۔ دل جوئی کرنا: تسلیدینا۔ دنگ: حیران۔ زائل ہونا: چلے رہنا، ختم ہونا۔

نہ راج اور رمی ہوتی۔ خان بہادر کو رمی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ میونسپلٹی کا چیئرمین منتخب ہونے کے بعد اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ مگر رمی کے پروگرام میں فرق نہ آیا۔ رات ہوتے ہی کچھ سرکاری افسر اور شہر کے بعض بڑے تاجر اس کی کوٹھی پر اکٹھا ہوتے اور وہاں مختلف شروع ہو جاتا۔ اس طرح خان بہادر کی کوٹھی پر ایویٹ قسم کا کلب بن گئی تھی جس کی نیاز بھی تھا۔ شروع شروع میں وہ پینے پلانے کے شغل سے کتراتا رہا۔ مگر کب تک بچتا۔ اس نے اصرار کر کے زبردستی تھوڑی سی اسکاچ و ہسکی پلا دی۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ اس کے بعد تو وہ لہک لہک کر پینے لگا۔

باز کی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے بسر ہو رہی تھی۔ سلطانہ اور انو اس کے ساتھ ہی کوٹھی میں رہنے دوں جاتے بھی کہاں۔ ان کا بیٹھا ہی کون تھا جو سر پرستی کرتا۔ مگر نیاز کا رویہ سلطانہ کے خلاف تھا۔ سلطانہ کی ماں کو مرے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مگر اس تمام عرصے میں نہ اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ کسی ایسی بات کا موقع دیا، جس سے اس کی دل نہ ہوتی۔

عام طور پر سویرے ہی سویرے کار لے کر کوٹھی سے نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ ایسا تھا کہ رات کو واپسی کے بعد اس نے سلطانہ سے کوئی بات چیت کی ہو۔ وہ چپ چاپ جا کر اسے میں سو جاتا۔ رات کا کھانا وہ خان بہادر ہی کے ساتھ کھاتا تھا۔ شروع شروع میں نیاز کا کھانا اس کے کمرے میں رکھوا دیتی۔ مگر جب نیاز نے خود ہی منع کر دیا تو اس نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ باز کی صحت بھی اب اچھی ہو گئی تھی۔ دکان پر دن بھر بیٹھے رہنے سے اس کے جسم میں جو نالیاں تھیں، وہ بڑھ چکا تھا۔ اس کی رنگت نکھر گئی تھی۔ شراب پینے سے رخساروں پر رخی جھلکتی رہتی۔ وہ جب نائیلون کی بش شرٹ اور پتلون پہن کر گھر سے بن سنور کر نکلتا تھا تو سلطانہ نے بھی اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ نیاز روز بروز خوش شکل اور وجیہ ہوتا



ان کے قلم کیل۔ دل آزاری۔ دل دکھنا۔ تکلیف۔ خوش شکل۔ وجیہ۔ خوبصورت۔

تو گھنٹوں انتظار کرنا پڑا۔ صرف چند لمبیں اس راستے پر چلتی تھیں۔ وہ بھی پرانی کھٹارا تھیں۔ اس دن کوئی نہ کوئی بس خراب ہو جاتی۔ اس پریشانی کا حل اس نے یہ نکالا کہ ساڑھے چھ ہزار میں ایک خرید لی۔ یہ سرخ رنگ کی ٹوسیٹر سگر تھی۔ پرانا ماڈل تھا مگر کنڈیشن اچھی تھی۔ کار خریدنے کے ساتھ ہی نیاز کے پرلگ گئے۔ اس نے شلوار اور قمیص چھوڑ کر پتلون اور بٹن شرت پہننا شروع کر دی۔ مونچھیں صفا چٹ کر ادیں اور ٹوسیٹر میں ٹھاٹھ سے بیٹھ کر اڑا اڑا کر دکان بھی اس نے ختم کر دی اور ایک روز اس کی کوٹھی پر پلاسٹک کی بنی ہوئی تختی بھی لگ گئی جس پر انگریزی حروف میں لکھا تھا:

شیخ محمد نیاز، گورنمنٹ کنٹریکٹر

ویسے وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ جانتا تھا۔ مگر گورنمنٹ کنٹریکٹر ضرور ہو گیا تھا۔ اس کو ڈبلیو ڈی کی نئی بیر کوں کی تعمیر کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ کام بڑا نہیں تھا لیکن بی کلاس گورنمنٹ کنٹریکٹر حیثیت سے اس کا نام ٹھیکے داروں کی فہرست میں رجسٹرڈ ہو گیا۔ اسی ٹھیکے کے بل بوتے پر میونسپلٹی کے نئے مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ اس کا ٹینڈر سات لاکھ کا تھا۔ دوسرے کنٹریکٹروں کے ٹینڈر کم تھے۔ مگر خان بہادر فرزند علی انہی دنوں نیا میونسپلٹی کا چیئرمین بناؤ انکیشن پر اس کا بہت رویہ صرف ہوا تھا لہذا وہ ان دنوں زیادہ سے زیادہ کمائی کی فکر میں تھا۔ نیاز اس کے مراسم بھی تھے۔ اس نے ۳۳ فیصد حصہ رکھ کر نیاز کا ٹینڈر منظور کرادیا۔

نیاز کو تعمیرات کے کام کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس اتنے بڑے کنٹریکٹ کے لیے سرمایہ تھا۔ لہذا اس نے ساڑھے چار لاکھ روپے میں سارا کام چھوٹے ٹھیکیدار کو دے دیا۔ اب اس کام میں اس کی دلچسپی صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ ٹھیکے کے نام پر اس نے سینٹ اور لون جو فاضل کوٹا منظور کر لیا تھا اسے بلیک مارکیٹ میں کس طرح فروخت کیا جائے۔

خان بہادر فرزند علی سے اس کے تعلقات پہلے ہی اچھے تھے۔ اس ٹھیکے کی وجہ سے دونوں تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ نیاز کا بیشتر وقت خان بہادر ہی کے ساتھ گزرتا۔ خان بہادر ہی توسط سے شہر کے اعلیٰ حکام تک اس کی رسائی ہو گئی۔ رفتہ رفتہ وہ ایک معزز شہری بننا جا رہا تھا۔ تقریباً ہر شب خان بہادر کے یہاں اس کی نشست ہوتی۔ اس محفل میں شراب کا

پر لگنا: شہری بننا۔ صفا چٹ: بالکل صاف۔ بل بوتہ: زور، طاقت۔ فاضل: فالتو۔ حصہ: رسائی ہونا۔ تعلق: پہنچ ہونا۔



گرمیوں کی خوشگوار شام تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں گہری تاریخی روشنی پھیلی تھی۔ درختوں کے طویل سائے خوابوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے سڑک پر اونٹوں کا ایک کارواں گزر رہا تھا۔ ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں شام کے سائے میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔ سلطانہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر کھڑی تھی۔ یہ کھڑکی باہر باغیچے میں کھلتی تھی۔ گھنٹیوں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ آفتاب کی نارنجی شعاعیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

\*\*\*

سلطانہ کے ساتھ نیاز کا روضہ جتنا نرم اور معقول تھا اسی قدر وہ ان کے ساتھ بے رخی سے پیش واپس بات پر اسے ڈانٹا ڈپٹا۔ زیادہ ناراض ہوتا تو گالیاں دینے سے بھی نہ چوکتا۔ دوبارہ ان کے منہ نے تھپڑ بھی مارے تھے اور ایک دفعہ تو ایسا غضب ناک ہو گیا کہ پانی کا گلاس کھینچ مارا۔ مگر انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس کے پاس نیاز کھڑا تھا۔ اس وقت وہ کہیں جانے کی غرض سے نکلا تھا۔ ڈرائیور اسٹین کی پچھلے حصے کے لیے کار لے گیا تھا۔ وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بے رخی کی لالہ گوں روشنی میں وہ خاصا دیدہ زیب نظر آ رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس وقت نیاز نے اس کی جانب نظریں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ سلطانہ فوراً ہٹ گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن اس واقعے کے بعد بھی نیاز کے روضے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اتوار کو نیاز عموماً گھر پر رہتا۔ مگر اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزر دیتا تھا۔ بلے والے آجاتے۔ وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ سلطانہ سے اس کی بات چیت بہت سرسری ہوتی۔ کئی بار وہ اسے اور انوکھا کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لیے شہر بھی لے گیا اور ہمیشہ ملان سے لے کر پھندالوٹا۔ اس کے سامان میں زیادہ تر سلطانہ کے بنڈل ہوتے۔

وہ اس کے ساتھ بڑی نرمی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتا۔ بات کرتا تو عام طور پر نظریں نیچے ہوتیں۔ یہ گفتگو عام طور پر رسمی سی ہوتی تھی۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا جب وہ اس سے کوئی ذاتی سوال کرتا وہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا۔

”تمہارا دل تو یہاں نہیں گھبرا رہا؟“

”رات تمہاری کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ جا کر ڈاکٹر کو دکھا دو!“

”کسی بات کی تکلیف تو نہیں؟“

گھر بیٹوں اور خداجات کے لیے وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو سویرے ہی سویرے انوکھو کو بلاتا اور اس کے ذریعے سلطانہ کو تین سو روپے بھیجو دیتا۔ بجلی کا بل، نوکروں کی تنخواہ اور کپڑوں کی دھلائی وہ خود

اسے اپنے بچپن ہی سے بڑی محبت تھی۔ اور اب تو بھری دنیا میں وہ اس کا واحد سہارا رہ گیا۔ سلطانہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک بھائی ایسا گیا کہ یہ بھی خبر نہ ملی کہ زندہ ہے یا مر گیا۔ ان کے ساتھ نیاز کا روضہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسے خواہ مخواہ ایذا پہنچانے کی

ن مدنی  
غدا کی

کوشش کرتا۔

گزر رہا تو یہی دیکھتا کہ وہ آٹو کا کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہے۔ وہ اس قدر منہمک ہوتی کہ نیاز کی جانب راغب کر بھی نہ دیکھتی۔

اٹو کی عزت پسندی نے سلطانہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اسے کبھی باغیچے کے گھنے دریا کے نیچے سے کبھی باورچی خانے کی کوٹھڑی سے، کبھی چھت پر جانے والے زینے سے بڑھ دھونڈھ کر لاتی۔ مگر آٹو اس کی نظر پیچھے ہی کہیں نہ کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ وہ گھبرائی والے تلاش کرتی پھرتی۔ اس کے پیار میں ماں کی مامتا کا جذبہ تھا۔ اس کی دیکھ بھال میں سلطانہ یہ طرح کا سکون ملتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ سلطانہ کی طبیعت خراب تھی۔ معمولی موسمی بخار تھا۔ نیاز نے اصرار کر کے بوڑھی خادمہ کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس بھیجا اور خود کار کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

\*\*\*

تمام کا وقت تھا۔

اٹو باہر باغیچے میں درختوں تلے حسب عادت تنہا بیٹھا تھا۔ جب اندھیرا خوب پھیل گیا تو وہ اٹھ کر اندر گیا۔ اسی وقت نیاز نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ آٹو کا خون خشک ہو گیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔

وہ سہا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ نیاز اسے دیکھتے ہی غریبا۔

”اے کہاں مر گیا تھا۔ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔“

اٹو نے حسب معمول اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ نیاز نے جل کر کہا۔ ”سور کے بچے! منہ کیوں نہیں بولتا۔ اب تک کہاں آوارہ گردی کر رہا تھا؟“

اٹو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”باہر درختوں کے نیچے بیٹھا تھا۔“

نیاز نے ایک سڑی ہوئی گالی دے کر کہا۔ ”اب تو جھوٹ بولنا بھی سیکھ گیا ہے۔ سمجھ لینا کھال لے کر دکھ دوں گا۔ اس گھر میں رہنا ہے تو ٹھیک سے رہو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں نے کوئی اندھ نہیں کھول رکھا۔“

”یونیک اس پر برستار ہا۔ پھر ڈپٹ کر بولا۔ ذرا الماری سے گلاس تو نکال اور وہ جو کونے میں لٹک رہی ہے وہ بھی لیتا آ۔ میری طبیعت خراب ہے۔ ذرا اسی دوا پیوں گا۔“

ن مدنی: عزت پسندی: تنہا رہنے کی عادت۔

اس کا کام کاج کرنے کے لیے گھر میں ملازم موجود تھا۔ مگر وہ اپنا سارا کام ادا کر اٹو سے کراتا۔ ذرا اسی غلطی پر گندی گندی گالیاں دیتا۔ اس کے چہرے پر تھوک دیتا۔ بازو پکڑ کر بہن چہرہ تکلیف سے بلبلاتا چہرے پر تھوہرے جی سے مارتا۔

اٹو نے بار بار سلطانہ سے فریاد کی۔ وہ اسے دلا سادے کر رہ جاتی۔ نیاز سے کچھ کہنے کی کبھی ہر ہوئی پھر ایک ایسا وقت آیا کہ اٹو نے نیاز کے خلاف کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ چپ چاپ اس کی مارہ اور گھر کے کسی گوشے میں جا کر چپکے چپکے روتا۔ نیاز سے تو اسے چڑھتی ہی اب وہ سلطانہ سے بھی بیزار رہنے لگا۔ اسے تنہائی سے رغبت ہوتی جا رہی تھی۔ جب دیکھو اکیلا بیٹھا ہے۔ اس وقت وہ بڑی پٹانگ باتیں سوچا کرتا۔ اس کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ جسم کے ہر ہر جوڑی ہڈیاں نکل آئیں تھیں۔ اس مرل سے لڑکے سے نیاز کو نہ معلوم کیوں اس قدر بیر تھا کہ دیکھتے ہی جھنجھلا جا آ نکھیں سرخ ہو جاتیں۔ ہونٹ کا پھٹنے لگتے۔ اسے اذیت پہنچا کر اسے عجیب سی تسکین ملتی۔

انوار کے سامنے جاتا تو اس طرح گھگھایا کر بولتا کہ خارش زدہ کتے کی طرح حقیر نظر آتا۔ نفرت کی بنیادی وجہ کسی حد تک خود سلطانہ تھی۔ اسے اٹو سے بے تحاشا پیار تھا۔ اس کا زیادہ تر اس کی دیکھ بھال میں گزر جاتا تھا۔ وہ اسے اپنے سامنے بٹھا کر ناشتا کرتی۔ اصرار کر کے کھانا کھاتی اپنے کمرے ہی میں اسے سلاتی تھی۔ کبھی بیٹھی اس کے کپڑوں میں بن ٹانگ رہی ہے۔ اس کی کتا قرینے سے لگا رہی ہے۔ اس کے جوتوں پر پالش کر رہی ہے۔ اس کا بستر درست کر رہی ہے۔

وہ سویرے بہت تر کے اٹھ جاتی اور دیر تک آٹو کو بیدار کرتی رہتی۔ وہ اس وقت گہری نیند ہوتا۔ بار بار کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر ناراض ہونے کے بجائے وہ اسے چمکاتی رہا۔ آخر جب اٹھ کر بیٹھ جاتا تو اسے غسل خانے میں لے جاتی۔ جب تک وہ نہاتا رہتا عام طور پر دروازے پر کھڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہتی۔ کنگھالے کر اس کے بال پٹائی۔ ذرا اس کے لیے گرم گرم دودھ کا گلاس لے کر آتی اور زبردستی پورا گلاس پلاتی۔ اس کو لے جاتا تو کونسی دروازے پر کھڑی دور تک اسے دیکھتی رہتی۔

سلطانہ نے اپنی ساری توجہ کا مرکز آٹو کو بنالیا تھا۔ نیاز کبھی کبھار اس کے کمرے کے

ادبدا کر: جان بوجہ کر: میر: دشمنی: تسکین: راحت: تلی: چمکاتی: پیار کرتی۔

مدھی  
غدا کی ہو

نیاز نے گہرا کر اسے چھوڑ دیا۔ اُو آنکھیں پھاڑے دیر تک نیاز کو تکتا رہا۔ اس کے منہ سے یہی رہی تھی۔ آنکھیں جنگلی کیوتر کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ اسی طرح سکتے کے عالم رہا۔ پھر وہ دروسے کر اپنے لگا۔ نیاز نے چیخ کر کہا۔  
”تو ہی میرے گھر سے نکل جا۔ ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔“  
اُو نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ڈگمگا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے تر تھا۔ سانس ہوئی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

نیاز نے گالی دے کر کہا۔ ”ابے اب جاتا ہے کہ سالے کچھ اور لے گا۔“ وہ اس کی جانب اور نظروں سے گھورتا ہوا لپکا۔ اُو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی بے بسی سے ہاتھ جوڑ لگایا کر فریاد کرنے لگا۔  
”اب نہیں، اب نہیں۔“  
نیاز بولا۔ ”تو پھر نکل جا یہاں سے۔“

اس نے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ زور سے دھاڑا۔ ”دیکھ اب لوٹ کے نہیں آتا۔ ورنہ میں لڑکھ نہیں چھوڑوں گا۔“

اُو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے کے باہر چلا گیا۔ لیکن وہ کونٹھی میں اٹھ کر لان عبور کر کے پھانک سے نکلا اور سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

(۲)

رات نے اپنے پر پھیلا دیئے تھے۔  
کوچہ بازار پر تاریکی پھیل گئی۔ اُو سنسان سڑک پر کئی گھنٹے تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ مسلسل لپکا کر۔ یہ کہاں جانا چاہیے۔

مگر وہ کہیں نہیں گیا اور ایک دیر ان فٹ پاتھ پر تھک کر سو گیا۔  
اُدھی رات سے کچھ دیر پہلے اُو کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ مینہ برس

لپکا کر۔ تھر تھر۔ حرکت۔

اُو چپ چاپ الماری کی طرف چلا گیا۔

جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہوا سکی ہوئی تھی۔ موسم سہانا تھا۔ نیاز کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ طبیعت کچھ بھاری بھاری تھی۔ اس نے سوچا اس وقت ایک آدھ پیگ و ہسکی کا لگا لیا جائے تو طبیعت بٹاش ہو جائے گی۔ اب وہ کبھی کبھار گھر پر بھی پتی لیتا تھا۔ وہ شراب پینے کا موڈ بنا کر کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔  
اُو نے الماری سے گلاس نکالا۔ بوتل اٹھائی۔ اسی وقت نیاز نے چیخ کر کہا۔

”ابے کہاں مر گیا؟“

اُو گہرا گیا۔ بدحواسی میں بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ فرش پر گرتے ہی اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ وہ ہسکی برسات کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ کمرے میں اس کی تیز بو پھیل گئی۔ نیاز لہجہ بریک توخوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے وحشیوں کی طرح جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اُو کے بال پکڑ لیے۔ کئی بار زور زور سے اسے جھنجھوڑا اور پھر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ وہ گیندی طرح دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ نیاز نے قریب پہنچ کر اندھا دھند اس کی کمر پر، پیٹ پر، سینے پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔

اُو کے سینے پر ایک بھرپور لات پڑی تو وہ دروسے بلبلاتا کر فرش پر دہرا ہو گیا۔ نیاز نے ایک اور کس کے لات ماری۔ وہ دروسے لڑکھٹا چلا گیا۔ نیاز بھینسنے کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے اپنے لگا۔ اُو دروسے تک تو لاش کی مانند بے سدھ پڑا رہا پھر اس نے اٹھ کر کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نیاز نے جانے نہ دیا۔ لپک کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا دیا۔ اُو خوف سے تھر تھر کاہنے لگا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور گریبان پکڑ کر ایک بار پھر اسے زور زور سے جھنجھوڑنے لگا۔ پہلی بار اُو نے جرأت پیدا کی اور جل کر اپنا پورا منہ نیاز کی کلائی پر رکھ کر گوشت چا ڈالا۔ نیاز نے تکلیف سے گہرا کر بڑا گھٹاؤنا سامنے بنایا۔ زور سے چلایا۔ ”مار دیا سالے نے۔“ اور پھر اُو کو فرش پر گر کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کے بھاری بھر کم جسم کے نیچے پھجلی کی طرح تپا۔ نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلاد بوج کر زور لگایا۔ اُو کے حلق سے بلیوں کے غرانے کی سی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں اٹل پڑیں۔

جھٹ پٹا۔ سورج غروب ہونے کا وقت۔ بٹاش۔ زور زور۔ خوں خوار۔ نہایت غصے سے بھری ہوئی۔ گھٹاؤنا۔ خونخوار۔

رہا ہے۔ اسے اپنا بدن بھیگتا ہوا معلوم ہوا۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اسی وقت اندھیرے میں کسی کی مگر ہوئی آواز ابھری۔

”اوائے تیرا خانہ خراب۔ ابے تجھے یہیں مرنے کو جگہ رہ گئی تھی۔“

اتو نے دیکھا۔ ایک شخص اس کے سر پر کھڑا پیشاب کر رہا ہے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا سبھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ شخص اسی طرح اطمینان سے کھڑا پیشاب کرتا رہا۔ ذرا بعد وہ فارغ ہوا تو ازار بند باند ہتا ہوا قریب آکر بولا۔

”ابے یہاں کیوں سو رہا ہے۔ گھر میں جگہ نہیں؟“

اتو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھا مگر ٹکرا سے دیکھتا رہا۔

اس نے دوبارہ پوچھا۔ ”یہیں رہتا ہے؟“

اس دفعہ اتو نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ”نہیں۔“

ذرا دیر تک وہ شخص خاموش کھڑا رہا۔ اندھیرے میں وہ سائے کی طرح دھندلا نظر آ رہا تو اس کے طے کا انداز نہ لگا سکا۔ اس کی آواز بھاری تھی۔ لب و لہجے سے گھٹیا قسم کا آدمی لگتا تھا۔ لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔

”ابے تو یہاں کیوں پڑا ہے؟“

اتو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ نہ کوئی آہ تھی نہ آواز۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اچانک رات کی خاموشی میں گھوڑے کی ہنہنات ابھری۔ اتو دیکھا، چند قدم کے فاصلے پر ایک تانگا کھڑا ہے۔ گھوڑا ہنہناتا نہ کر سڑک پر ٹاپیں مار رہا تھا۔ وہ آواز گھوڑے کو چکارنے لگا۔ ”او ذرا دم لے بادشاہ! میں ابھی آیا۔“ پھر اس نے پلٹ کر اتو سے کہا۔

”ابے یہاں کوڑے کے ڈھیر پر کیوں پڑا ہے؟ چل میرے ساتھ۔“

اتو خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس دفعہ وہ آدمی جو تانگا والا تھا، بے تکلفی سے بولا۔ ”ابے اب کھڑا بھی ہو۔“ اس نے اتو کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

اتو اس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ اس نے چابک ہوا میں لہرائی۔ باگیں کھینچیں۔ گھوڑا آگے بڑھے گیا۔ دور تک سرمئی سڑک پھیلی تھی جس پر گھوڑے کے پیروں میں لگے ہوئے فلر ٹپاٹپ بج رہے تھے۔ اتو کچھ دیر بیٹھا جھک لے کھاتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں دے سکتا تھا

بہا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا۔ تانگا ایک تنگ بازار سے آہستہ آہستہ گزر رہا ہے۔ بازار میں قافہ پنڈلیوں اور دودھ والوں کی اکادکا دکانیں ابھی تک کھلی تھیں جن پر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ تانگے والے نے ایک دودھ والے کی دکان کے سامنے تانگا ٹھہرایا۔ اتر کر دکان پر گیا۔ دودھ باری بھر کم جسم کا آدمی تھا بڑی بے تکلفی سے بولا۔

”ہاں نوروز خان کہاں سے آرہے ہو؟ آج تو تم نے بڑی دیر لگادی۔“

نوروز بولا۔ ”یار چھاؤنی کی ایک سواری لے کر گیا تھا، پلیٹ تھین نکل گیا انا۔“ اس نے لمحے بھر نی کر کے کہا۔ ”لایا سیر بھر دودھ تو دے۔ بڑے آب خورے میں دینا۔“

”یہاں نہیں پیو گے؟“

”نہیں یار ساتھ لے جاؤں گا۔“

نوروز کا جواب سن کر دودھ والا چونکا۔ اس نے جھک کر تانگے کی جانب دیکھا جس میں اتو بیٹھا تھا۔ اس نے آنکھ مار کر پوچھا۔ ”تو یوں کہوتا! ابے کہاں سے پٹالایا۔“

نوروز مسکرایا۔ ”بس پوچھ نہ، چڑھ گیا جتنے اللہ سب کو رزق دیتا ہے پہلوان۔“

دودھ والے نے ایک بار پھر اتو کو دیکھا۔ ران کھجاتے ہوئے بولا۔ ”لوٹا تو صورت شکل کا اچھا ہے۔ پر یار یہ تو بہت چھوٹا ہے۔ ابے یہ مر جائے گا۔ سالے کھنچے کھنچے پھر وگے۔ میرا کہنا ابر کرباب چھوڑ دے۔ گھر ورسالے۔“

نوروز بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ”ابے کیار کھا ہے گھر سامنے میں۔ خواہ مخواہ کا مٹنا ہے۔“

”تم کو تو سالے چاٹ ہی چاٹ لگ گئی ہے۔“

”یار پہلوان! تو زیادہ باتیں نہ بنایا کر۔ لا دودھ دے۔“ یہ کہہ کر نوروز نے پانچ روپے کا نوٹ نکال دھالے کو دیا۔ ”بڑی ہو تو پیاؤ بھر دے بھی دے دے۔ بڑی نہ ہو تو کچھ اور بیٹھا دے دے۔“

دودھ والا بولا۔ ”آج تو بڑے زوروں پر جا رہا ہے۔“

نوروز صرف مسکرا کر رہ گیا۔ پہلوان نے دودھ سے بھرا ہوا آب خورہ اسے دیا۔ کہنے لگا۔ ”اے نہیں۔ جلیبیاں دے دوں؟“

نوروز نے اسے اشارہ کیا۔ ”آب خورہ۔ مٹی کا پیالہ جس میں پانی وغیرہ پیتے ہیں۔ پٹانا: چائنا۔ گھر سامنا: شادی کرنا۔ مٹا: ذمہ داری، بوجھ۔ چاٹ:

”لایا رو ہی دے۔ دیر نہ کر۔“

پہلوان نے جلیبیاں اور پانچ روپے کے نوٹ سے بچی ہوئی رقم اس کے حوالے کر دی۔  
نے تانگے کے قریب آکر دودھ کا آب خورہ اور جلیبیوں کا پڑاؤ کو تھما دیا۔ خود اچک کر تانگے پر  
ہو گیا۔ گھوڑے نے حرکت کی اور تانگا بازار سے گزرنے لگا۔

مختلف راستوں کے چکر کاٹنے کے بعد تانگا ایک احاطے کے اندر داخل ہوا۔ احاطے کی  
دیواری بوسیدہ تھی۔ اندر کچھ ریل کی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ ان ہی میں نوروز  
کو ٹھری بھی تھی۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ نوروز نے تالا کھولا۔ ماس جس جلا کر چند میسی لائیں رو  
کی جس کی چنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کو ٹھری میں ایک طرف پلنگ پڑا تھا جس پر میلے کچیلے بستر کے،  
نوروز کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک ٹرک تھا جس پر کنگھا، تیل کی شیشی اور ایک  
چھوٹی موٹی چیزیں رکھی تھیں۔

نوروز نے لائیں روشن کی۔ بستر پر سے کپڑے ہٹائے۔ انو سے بولا۔ ”تم یہاں بیٹھو۔  
گھوڑا کھول کر تھان پر باندھ دوں۔ بس ابھی آیا۔ گھبرانا نہیں۔“

وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔ کو ٹھری کی فضا مرطوب تھی اور عجیب سی بساند پھیلی ہوئی تھی  
اتو خاموشی سے پلنگ پر دونوں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور کو ٹھری کی ایک ایک چیز کھوئی کھوئی نظروں  
دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک گرم صم تھا۔ ہر چیز اس کے لیے اجنبی تھی۔ ہر بات انوکھی تھی۔ گزشتہ  
ساتھ گھنٹوں میں اس کی زندگی میں کچھ اس طرح پے بہ پے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں کہ سو  
سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف خوابوں کا دھندلا چھایا تھا جس میں  
کی اپنی ذات گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر احساس دم بخود تھا۔

نوروز واپس آیا۔ اس نے کو ٹھری کے دروازے کی کنڈی لگائی۔ المونیم کے بڑے  
کنوڑے میں دودھ اور جلیبیاں لے کر آؤ کے پاس گیا۔ آؤ نے صرف سہ چہر کی چائے پی تھی۔  
سخت بھوک لگ رہی تھی۔ نوروز نے اصرار کیا تو اس نے دودھ میں بھیگی ہوئی جلیبیاں کھا لیں  
نوروز نے ہاتھ بڑھا کر طاق سے لائیں اٹھائی اور پھونک مار کر بچا دی۔

\*\*\*

اچک کر چلائی گا کر کچھ ریل کھاس بھوس۔ تھان کھوڑا کھڑا کرنے کی جگہ۔ مرطوب۔ مکی۔ بساند۔ بدبو۔

نوروز سویرے بہت تڑکے اٹھ کر کو ٹھری سے باہر چلا گیا۔

آؤ کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے جاگ رہا تھا اور بستر پر لاش کی  
اچے سدھ پڑا تھا۔ اس نے نوروز کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ روشن دان سے ابھرتی ہوئی ہلکی  
ہاؤری روشنی بھی دیکھی۔ سویرا ہو رہا تھا۔ کہیں قریب ہی مسجد سے اذان بلند ہو رہی تھی۔

احاطے میں ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ بچوں کے رونے کی آوازیں، بوڑھوں کی کھانسی،  
ان کی چیخ پکار۔ یہ سب آوازیں کھل مل کر ہلکے ہلکے شور میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ آؤ چپ  
شور کو سنتا رہا۔ روشن دان سے ابھرنے والی روشنی کو دیکھتا رہا۔

نوروز جب واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں گرم گرم پوریوں کا پڑاؤ باندھا ہوا تھا۔ اس نے آؤ پر ایک  
لا۔ مسکرا کر بولا۔

”ابے تو ابھی تک لیٹا ہے؟ منہ ہاتھ تو دھو لیا ہوتا۔“

آؤ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پلنگ سے نیچے اترا تو اس کے قدم ڈگدگانے لگے۔ اس نے کونے  
کے ہوئے لوٹے میں گھڑے سے پانی بھر اور کو ٹھری کے دروازے پر جا کر منہ دھونے لگا۔

اس کا جی ستلارہا تھا۔ مگر نوروز نے اصرار کر کے اسے دوپوریاں زبردستی کھلا ہی دیں۔ چار  
اس نے آؤ کے دوپہر کے کھانے کے لیے رکھ دیں۔ نرم لہجے میں بولا۔

”موقع لگا تو میں دوپہر کو آجاؤں گا۔ نہیں تورات کو واپسی ہوگی۔ گھبرانا نہیں۔ کسی چیز کی  
تو توتنا ہے۔“

آؤ نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ نوروز نے اس کی پیٹھ تھپتھا  
”اب تو اطمینان سے پڑ کر سو۔ طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بھوک لگے تو پوریاں کھا لینا۔“

اٹھائیں لے کر آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

اس نے آؤ کے رخسار میں ہولے سے چٹکی بھری۔ مسکرا کر بولا۔ ”وکیل صاحب کو دیر  
ہوگی۔ مجھے ان کے لیے تانگا لے کر جانا ہے۔ گھبرانا مت۔“ وہ کو ٹھری سے باہر نکلا۔ دروازہ  
اس میں تالا لگا دیا۔

آؤ دن بھر کو ٹھری میں بندھا پڑا رہا۔ سہ پہر کو ذرا بھوک لگی مگر ایک پوری بھی نہیں کھائی  
بلنے کیسی طبیعت ہو رہی تھی۔ اس نے گلاس بھر کر پانی پیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

اتوار پھر انکار میں بلا دیتا۔  
 "اصرار کر کے پوچھتا۔" دیکھ بے کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً کہہ دیا کر۔"  
 "جھل۔" اتو کا جواب بہت مختصر ہوتا۔

نوروز کو اس کی یہ خاموشی کبھی کبھی بڑی گراں گزرتی۔ وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہتا۔ "اے تو  
 بڑی چپ کار روزہ رکھا ہے۔ ذرا بات چیت کیا کر۔ یہ کیا ہونٹ سینے بیٹھا ہے۔ اور دیکھ جو تیرا جی  
 بے خوف مجھ سے کہہ دیا کر۔ دیکھ تو میں تیری بات پوری کرتا ہوں کہ نہیں۔"  
 اس کے اسی اصرار پر آخر ایک روز اتو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔  
 "مجھے اسکول میں داخل کرادو۔"

نوروز حیرت سے چونک پڑا۔ "اسکول میں داخل کرادوں؟" وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ "اے کیا  
 ہے اسکول جا کر۔ وہاں تو لڑکے جا کر ایک نمبر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ جا بے تو بھی یوں ہی رہا۔"  
 اس کے اس جواب سے اتو کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ سوچا کہ تاکہ اسکول میں داخل ہو جائے گا،  
 اب پڑھے گا۔ پھر اچھی سی کوئی نوکری کر لے گا اور سلطانہ کو اپنے پاس بلالائے گا۔ اسے سلطانہ  
 بندہ آتی تھی۔ اسے یاد کر کے وہ اکثر رو پڑتا۔ اب وہ اس کے پاس جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ نیاز دیکھ  
 بالائے زعمہ نہیں چھوڑتا۔

نوروز کے پاس رہتے ہوئے اتو کو دو مہینے سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ نوروز اسے روزانہ کوٹھری  
 لٹا کر کے چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ اتو دن بھر کوٹھری میں قید رہتا۔ کبھی کبھی دل گھبراتا  
 لڑکے چینی سے چکر کاٹنے لگتا۔ پھر اپنی بے کسی پر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔  
 سکیاں بھر کر دیر تک روتا رہتا۔ نوروز سے اس کو کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے  
 غلط تھے۔ منہ سے بڑی خراب بو آتی تھی۔ ابائیل کے پروں کی طرح گھنی مونچھیں تھیں۔  
 ہونٹوں پر اتو کو کاجی مٹلانے لگتا۔ بس چلتا تو وہ نوروز کے منہ پر تھوک دیتا۔

ایک رات نوروز واپس آیا تو نشتے میں دھت تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ قدم ہلکے ہلکے پڑ  
 تھے اس نے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی اتو کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ جھوم کر بولا۔  
 "گڈی گا دے۔"

نوروز کی: مجبوری۔ کراہیت۔ نفرت۔ غلیظ۔ بندے۔ خمار آلود۔ لعلی۔

رات کو دس بجے کے قریب نوروز آیا۔ وہ اپنے ساتھ روٹیاں اور سالن لایا تھا۔ اس کے علاوہ  
 اتو کے لیے ایک پھولدار ریشمی بٹن شرٹ بھی لایا تھا۔ اس نے بڑے شوق سے بٹن شرٹ اسی وقت  
 اتو کو پہنائی اور ہنس کر بولا۔  
 "جج گئے استاد۔ اے میرے ساتھ رہا تو عیش کرادوں گا۔"

اتو کو بٹن شرٹ پہن کر کوئی خاص مسرت نہ ہوئی۔ مگر نوروز بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ بار بار بٹن  
 شرٹ کی تعریف کرتا۔ اس کی اپنی قمیص خاصی میلی تھی۔ شلوار اس سے بھی زیادہ میلی تھی۔  
 دہرے بدن کا لمبا رنگا آدمی تھا۔ تیس بتیس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ رنگ سانولا تھا۔ سر پر لمبے لمبے  
 بال تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی تھیں۔ ہنستا تو آنکھیں بند ہو جاتیں۔ چہرہ کچھ ایسا بے ڈھ  
 ہو جاتا کہ اچھا خاصا لوکا پٹھا معلوم ہوتا۔

لیکن وہ لوکا پٹھا ہر گز نہ تھا۔ روزانہ دس بارہ روپے اور کبھی کبھی تو اٹھارہ بیس روپے کمالا۔  
 طبیعت میں چنور پن تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا تھا۔ شہر کے تانگے والوں میں وہ بڑا سرکش  
 مشہور تھا۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں اچھے تھے اس لیے لوگ اس سے  
 ڈرتے بھی تھے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب اڈے پر کسی تانگے والے سے اس کی توٹکار نہ ہوتی۔ اگر  
 اس گالی گلوچ میں ہاتھ پائی کی نوبت آجائی۔

لیکن انوکے ساتھ نوروز کا رویہ بڑا اچھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتا۔ اتو نے  
 بھی کبھی اسے ناراض ہونے کا موقع نہ دیا۔ وہ فطرتاً کم گو تھا۔ اب اس نے بولنا اور بھی بند کر دیا تھا۔  
 ہر وقت چپ چاپ رہتا۔

نوروز روزانہ صبح کوٹھری میں تالا لگا کر چلا جاتا اور رات گئے آکر کھولتا۔ واپسی پر انوکے لیے  
 کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ اکثر اور بھی کچھ نہ کچھ لے آتا۔ کھانا کھانے کے بعد نوروز زور زور سے  
 ڈکاریں لیتا اور دم سے بستر پر گر جاتا۔ اتو کو آواز دے کر قریب بلا تا۔

"لے بے ذرا ٹانگیں تو دبا دے۔"  
 اتو پائنتی بیٹھ کر چپ چاپ اس کی موٹی موٹی پنڈلیاں دبائے لگتا۔ نوروز اس وقت بائیں کرنے  
 کے موڈ میں ہوتا۔ وہ اتو سے پوچھتا۔ "کیوں بے کوئی تکلیف تو نہیں؟"

اتو کا پٹھا: سرور بدخل، زور پن، چنور پن، کھانے کا شوق، سرکش، لڑاکا، پائنتی، چارپائی کا پاؤں کی طرف کا حصہ۔

خدا کی ہمت

توں شخص لمحہ بھر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے نوروز کو تکتے رہے۔ پھر ایک نے آگے  
رکھا۔ ”بات کیا ہے بیٹی؟“

نوروز بولا۔ ”اسی لئے پوچھ لو۔“

اس سے تو بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے تم بتاؤ۔“

نوروز بکر بولا۔ ”دیکھو جی بہت دن تم نے میرا لونڈا رکھ لیا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ

پاپ الگ کھڑے رہو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

”فصل طریقہ سلجھ میں بولا۔ ”اچھا“ اور اپنے ساتھ والے سے مخاطب ہوا۔ ”لوجی یہ لونڈا  
ہو گیا۔“

نوروز نے کہا۔ ”اس سے پوچھ کر تو دیکھو۔“

”فصل بولا۔ ”اس سے کیا پوچھنا ہے۔ آٹھ سو روپیہ نقد خرچ کیا ہے۔ تانگا گھوڑا بک جائے

لہذا فقیر سے پوچھ لو کیا رقم دی ہے اس لونڈے کی۔“

”ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ آؤ نوروز کی کوٹھری سے نکل کر بھاگا تو راستے میں تو بیچوے سے  
رہو گی۔ ثواب سن سے اتر چکا تھا۔ اس نے تانکہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ گھیر گھار کر نو خیز  
اکلاتا۔ کچھ دن ان کی کمائی کھا تا اور جب کوئی مالدار اسامی مل جاتی تو اس کے ہاتھ فروخت کر  
لے کی خوف زدہ نگاہیں دیکھ کر بیوی کی تجربہ کار نظریں تازہ گئیں کہ گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ اس نے  
لامار یا اور بھلا پھسلا کر اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ کچھ عرصہ اپنے پاس رکھا۔ پھر علی جان کے  
ٹائیڈ۔“

اس وقت نوروز سے علی جان ہی بات کر رہا تھا۔ وہ چڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ آمدنی اچھی تھی۔

مائی میاشی کرتا تھا۔ خود بھی مزاج میں غنڈا پن تھا اور دو چار بد معاشوں کو بھی ساتھ رکھتا تھا۔

نوروز نے گالی دے کر کہا۔ ”میں کسی سالے تو دو کو نہیں جانتا۔ میں تو ابھی اسے لے کر

ا۔“

”لی جان نے کہا۔“ لے جایا جائے تو لے جاؤ۔“

نوروز نے گردن اونچی کر کے کہا۔ ”دیکھو تو کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔“ اس نے آؤ کا

نوروز کا قصہ سن سے اتر چکا تھا۔ مرنے والے نوروز نے کہا تھا۔ تانکہ جس کے ماتحت کئی عداوتیں ہوں مائی کا لال۔ بہادر بدلیہ۔

اس کی آواز اس وقت پھٹے بانس کی طرح بے ڈھنگی تھی۔ آؤ نے تانے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔  
نوروز کو ٹھری کے بیچوں بھیج کھڑا جھومتا رہا۔ اس نے گہری نظروں سے آؤ کو دیکھا۔ ”کوم  
آے۔“ آؤ چپ چاپ اس کے پاس چلا گیا۔

نوروز نے لالٹین پر ایک لات ماری جو دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ لالٹین بیکہ لو چند بار بھڑکی اور  
بجھ گئی۔ کوٹھری میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔

صبح اٹھ کر نوروز نے دیکھا آؤ غائب تھا۔ اس کی نظر فوراً دروازے پر گئی نہ کنڈی کھلی ہوئی تھک  
وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر جا کر دیکھا۔ آؤ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ رات کو نہ جانے کب اٹھ کر فرار ہو گیا۔

نوروز دن بھر پاگلوں کی طرح تانگے پر بیٹھا آؤ کو تلاش کرتا رہا مگر کبھی نہ سراغ نہ ملا۔ کی روز  
تک وہ جگہ جگہ اسے ڈھونڈتا رہا لیکن آؤ ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہ آیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔

\*\*\*

نوروز قریب قریب آؤ کو بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ اچانک نظر آ گیا۔ رات کے گیارہ بجے  
تھے۔ بازاروں کی رونق اجڑ چکی تھی۔ نوروز تھکا ہارا لوٹ رہا تھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر ملنے  
دیکھا۔ بجلی کے سبب کے پاس آؤ کھڑا ہے۔ وہ اس وقت بوسکی کی قمیص اور شلوار پہنے تھے۔ گٹھا  
پھولوں کا گجر اٹھا۔ کتے میں پان تھا۔ آؤی مانگ نکلی تھی۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس  
کے ہمراہ تین آدمی تھے۔ وہ اجلے لباس پہنے ہوئے تھے اور وضع قطع سے اوباش نظر آتے تھے۔ آؤ  
مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کر رہا تھا۔

نوروز نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے تانگا آگے بڑھایا اور عین ان لوگوں کے سامنے

جا کر روک لیا۔ نیچے اتر آؤ نے دیکھا تو چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ نوروز نے ہنسنے بھلا کر

خونخوار نظروں سے دیکھا۔

”کیوں بے حرام کے ختم۔“ نوروز کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا۔ اس کی مونچھیں خطرناک

طریقے پر پھڑپھڑانے لگیں۔ اس نے لپک کر آؤ کا بازو دبوچ لیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”منہ کیا بک رہا ہے

سیدھی طرح چلتا ہے کہ دوں ایک ہاتھ۔“

وضع قطع: ظاہری حالت۔ بوباش: بد معاش۔ ہنسنے بھلا کر: ہنسنے سے۔

(۳)

ہاتھ پکڑ کر جھٹکادیا۔ ”چل ہے۔“

اسی وقت علی جان کا ایک ساتھی بڑھ کر آگے آیا۔ نوروز کو آہستہ سے دھکادے کر بولا۔  
”الگ ہٹ کر بات کر۔“

نوروز نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ اکیلا ہوں۔  
تینوں پر بھاری ہوں۔“

مگر وہ شخص مشتعل نہ ہوا۔ نرمی بولا۔ ”جا بھی اپنا کام کر۔ کیوں خواہ مخواہ سر ہونے  
جار ہے۔“

نوروز نے پھر اُو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ علی جان کے ساتھی نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا  
اور بڑا سا کمانی دار چاقو باہر نکال لیا۔ کڑکڑ کر مے چاقو کے کھلنے کی آواز ابھری۔ چاقو کی جھلکتی ہوئی  
نوک نوروز کے پیٹ پر تھی۔

وہ آدمی ڈپٹ کر بولا۔ ”اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ورنہ لاش بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے گی۔“  
نوروز چپ چاپ کھڑا جھمکتے ہوئے چاقو کو دیکھتا رہا۔

علی جان نے نوروز کو گالی دے کر کہا۔ ”ابے اب یہاں سے نلے گا بھی بابتیا کرانے کا ارادہ ہے؟“  
نوروز پسپا ہونے کے سے انداز میں پیچھے ہٹا اور گردن جھکا کر تانگے کی طرف چل دیا۔ جب  
تانگے پر سوار ہونے لگا تو علی جان نے کہا۔

”آئندہ ادھر کارخانہ نہ کرنا، ورنہ ٹھنڈے ٹھنڈے پڑے ہو گے۔“  
نوروز کو ان پر تاؤ تو بہت آیا مگر وہ ایک نہیں تین تھے اور مسلح بھی تھے وہ بالکل نہتہ تھا۔ ان  
نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ گھوڑے کی لگام کھینچی اور تانگے کو آگے بڑھادیا۔ کوئلہ کی پٹہ  
سڑک پر اس کے تانگے کی آہٹ دور تک ابھرتی رہی اُو بجلی کے کھمبے کے ساتھ علی جان اور ان  
کے ساتھیوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔

اُو گھر سے نکلنے کے بعد واپس نہ آیا۔  
سلطانہ روزانہ اس کا انتظار کرتی۔ اسے امید تھی کہ اُو ایک نہ ایک روز ضرور واپس آئے گا۔  
نے اُو کی ایک ایک چیز سنبھال کر الماری میں رکھ دی تھی۔ اس کے لیے کپڑوں کے نئے نئے  
بے سلوائے تھے۔ وہ بھی الماری میں رکھے تھے۔ جب اُو بہت یاد آتا تو وہ الماری کھول کر کھڑی  
بائی اور ساری چیزوں کو حسرت سے دیکھتی۔ پھر اس کا دل بھر آتا۔ بے اختیار رو پڑتی۔ اُو سے  
بڑی ڈھارس تھی۔ اس کے جانے کے بعد تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ وہ پانگلوں کی طرح گھر  
پر کاٹا کرتی۔

گھنٹوں در پیچے پر کھڑی سڑک کی جانب خواب ناک نظروں سے ٹکا کرتی کہ شاید اُو آتا ہوا  
رہا ہے۔

اسے اس قدر پریشان دیکھ کر گھر کی خادمہ نے ایک روز بتایا کہ گئی میں ایک شاہ صاحب ہیں۔  
بچے ہوئے بزرگ ہیں۔ فال نکال کر ایسی پتے کی باتیں بتاتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جائے۔ ان کا  
ذائقہ پر ایک ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کئی حیرت انگیز واقعات بھی سنائے جن کو سن کر  
ان کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ ایک روز جب نیاز باہر گیا ہوا تھا اس نے خادمہ کو اپنے ہمراہ لیا اور شاہ  
صاحب کے ہاں جا پہنچی۔ اس نے دیکھا۔ حاجت مندوں کا ہنکھالاکا ہوا تھا۔ دور دور سے لوگ ان کے  
اُٹے تھے۔ ان کا قیام ایک ٹیلے کے دامن میں تھا۔ یہ مختصر سا نیم پختہ مکان تھا۔ اس میں کل دو  
ساتھ۔ کمرے کے آگے سانبان تھا جس میں مردوں کے لیے انتظام تھا۔ ایک کمرے میں پردہ  
فانٹین بیٹھی تھیں۔ سلطانہ بھی وہیں جا کر بیٹھ گئی۔ وہ نوبے دن کو وہاں پہنچی تھی۔ دوپہر کو اس  
کی ہوئی۔

کہہ خاصا کشادہ تھا۔ شاہ صاحب مسند پر گاؤٹیکے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ قریب ہی ایک  
اُباگر سوز رکھا تھا جس میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف تیز خوشبو پھیلی

لڑکھٹ، در پیچے، کڑکی، ایک پر ایک ہے، بہت اچھا ہے، اشتیاق، شوق، ہنکھلا، جھوم، اگر سوز، وہ برتن جس میں اگر بنی  
فہم



خادمہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سلطانہ کا سر عقیدت سے اور جھک گیا۔  
شاہ صاحب نے زعفران کی روشنائی سے دو تعویذ لکھے اور سلطانہ کو دیتے ہوئے بولے۔ ”یہ لو  
بمہر کے شمالی کونے میں کھود کر دفن کرو دینا۔ دوسرا کسی اونچے درخت پر لٹکا دینا۔ جیسے جیسے ہوا  
نوعید ملے گا ویسے ہی لڑکے کے دل میں ہول اٹھے گا۔ گھر کی یاد ستائے گی۔ انشاء اللہ شام تک  
بہا آجائے گا۔“

سلطانہ نے تعویذ لے کر پرس سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ اسے نذرانے کے طور پر  
دیکر شاہ صاحب ہنس پڑے۔

”تمہارا بھائی آجائے تو ایک سیاہ بکرا صدقہ کر دینا۔ اس کا گوشت غریبوں محتاجوں میں تقسیم  
رہا۔“

سلطانہ نے نوٹ پرس میں واپس رکھ لیا۔ شاہ صاحب سے اجازت لی اور خوشی خوشی گھر آ گئی۔  
شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق اس نے ایک تعویذ زمین میں دفن کر دیا۔ دوسرا باغیچے میں  
ہوئے پتیل کے بیڑ کی اونچی شاخ پر لٹکوا دیا۔ اسے یقین تھا کہ اٹو ضرور آجائے گا۔ شاہ صاحب  
تعب کا طلسم اس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔

اس روز اس نے خانساں کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے سامنے کھیر تیار کرائی۔ اٹو کھیر بڑے  
ماتے کھاتا تھا۔ سہ پہر تک وہ بڑی خوش خوش رہی۔ جب دن ڈھلنے لگا اور دھوپ کا رنگ گہرا  
ہو گیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ بار بار در پہنچے پر جا کر باہر دیکھتی۔ سورج غروب ہو گیا۔ دن کالا  
پڑ گیا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ شام ہو گئی مگر اٹو نہ آیا۔

رات ہو گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ راستے سنسان پڑ گئے۔ مگر اٹو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ساری رات  
اسی اور اٹو کا انتظار کرتی رہی۔

بہر بہت سی شامیں آئیں اور گزر گئیں اور شاہ صاحب کا تعویذ پتیل کی اونچی شاخ پر لہرا تا رہا۔  
منہ دوبارہ شاہ صاحب کے پاس جانے کے لیے اصرار بھی کیا۔ لیکن سلطانہ پھر ان کے پاس نہ  
اس کی عقیدت کا طلسم درہم برہم ہو چکا تھا۔

تھی۔ وہ ادھیڑ آدمی تھے۔ خوب گھنی ڈاڑھی تھی۔ سر پر کاکلیں تھیں۔ اس وقت وہ زعفرانی رنگ  
کرتا اور ویسا ہی تہ بند باندھے ہوئے تھے۔ چہرے سے جلال نکلتا تھا۔ سلطانہ اندر پہنچی تو وہ آنکھیں  
بند کئے مراقبہ کے عالم میں تھے۔ سلطانہ کے ساتھ خادمہ بھی تھی۔

دونوں غالیچے کے ایک سرے پر مودب ہو کر بیٹھ گئیں۔ شاہ صاحب آنکھیں بند کئے پڑ  
رہے۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ اچانک شاہ صاحب کی آواز ابھری۔

”لڑکی تیرا بھائی شمال مشرق کی جانب گیا ہے۔ وہ ایک شخص کے چنگل میں بری طرح پڑ  
ہے۔“

سلطانہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کو سخت حیرت ہو  
کہ انہیں کس طرح یہ علم ہوا کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کرنے آئی ہے۔ ان سے اس  
بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ فرط عقیدت سے اس کی گردن جھک گئی۔ کمرے میں اگر سوزے ابر  
ہوا ہلکا نیلگوں دھواں لہرا رہا تھا۔ گہری خاموشی اور اگر بتیوں کی تیز خوشبو نے ماحول کو آسبز  
بنادیا تھا۔

ذرا دیر بعد شاہ صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ سلطانہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ حیرت زدہ ہو  
بولے۔ ”تم دونوں کب آئیں؟“ سلطانہ تو خاموش رہی البتہ خادمہ نے کہا۔

”ہم کو تو آئے ہوئے دیر ہو گئی۔ بلکہ آپ نے بی بی جی سے کچھ کہا بھی تھا۔“

”کاہے کے بارے میں؟“

”ان کا چھوٹا بھائی بہت دنوں سے لاپتہ ہے۔ اسی کے بارے میں آپ نے کہا تھا۔“  
شاہ صاحب زیر لب مسکرائے۔ ”اچھا اچھا۔ میں تو نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔“ ”تم بھر رک  
انہوں نے کہا۔ ”حاجیوں کا ایک جہاز عدن کے قریب سمندری طوفان میں گھر گیا تھا مجھے علم ملا  
فورا جاکر حاجیوں کو بچاؤ۔ اللہ غنی کیا عالم تھا۔ جہاز میں کھرام برپا تھا۔ ہر شخص موت کی گھڑیاں  
رہا تھا۔ موجیں دھاڑتی ہوئی اٹھ رہی تھیں۔ جہاز درخت کے پتے کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔“  
اس طرح آہستہ آہستہ بول رہے تھے جیسے خواب میں بڑا رہے ہوں۔

نہایت خچکے نقوش، بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ خاصا خوبصورت نوجوان تھا۔ بی ایس سی کر چکا تھا۔ اس کا رشتہ پر ایم بی اے کرنے کے لیے امریکہ جانے والا تھا۔ چائے پر بھی امریکہ کے متعلق بہت بات ہوتی رہی۔

دوران گفتگو شاہد نے اچانک سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مسز نیاز آپ کو دیکھ کر تو بلا جہت ہوئی۔“

سلطانہ کو مسز نیاز کہنے پر سخت تعجب ہوا۔

اس کا بی چاہا کہ اس غلط فہمی کو دور کر دے۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ نیاز نے نہ جانے اس کا حلق ان لوگوں سے کیا کہا ہے۔ سلطانہ کو براغصہ آیا۔ کم بخت نے کم سے کم اشارہ ہی کر دیا۔ وہ ڈرا کر خاموشی رہ کر اس نے شاہد سے کہا۔ ”آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھتا تھا نہ جانے آپ کیسی ہوں گی۔“ اس کے انداز میں بچوں کی سادگی تھی۔

سلطانہ کو اس کی یہ ادائیگی پیاری معلوم ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔ ”کیا مطلب؟“

وہ گہرا گیا۔ ”میں سمجھتا تھا کہ آپ کچھ عجیب سی ہوں گی۔“

اسی وقت شاہد کی بہن نے کہا۔ ”آپ کو دیکھ کر تعجب تو مجھے بھی ہوا۔“

سلطانہ کی سمجھ میں ان کی باتوں کا مطلب نہیں آیا۔ پوچھنے لگی۔ ”کیوں؟“

وہ بولی۔ ”ہم تو سمجھتے تھے کہ نیاز صاحب کی مسز تو بڑی بوری ہوں گی۔ موٹی موٹی، کالی سی۔ آپ اتنی زیادہ خوبصورت اور اتنی سوٹ ہوں گی، یہ تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ پھر وہ ہلکائی کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

”کیوں بھائی جان! یہی بات ہے نا؟“

”کچھ آپ بڑی گریڈ معلوم ہوتی ہیں۔“

سلطانہ کا ایک بار پھر جی چاہا کہ وہ ان کی غلط فہمی رفع کر دے۔ مگر اس میں نیاز کی ناراضی کا ڈر تھا۔ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اپنے گھر میں واپس پہنچی اور دیر تک خان بہادر کے اہل خانہ کے بارے میں سوچتی رہی۔

ملنسار بیوی، ملنسار بیٹیاں اور ہنس مکھ شاہد جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

نیاز کو سلطانہ کے دکھ کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ ہر طرح اس کی ناز برداری کی کوشش کرتا تھا۔ دنوں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ اس کے لیے خرید کر لاتا۔ اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا۔ اٹو کے چل جانے پر اظہار افسوس کرتا۔ لیکن سلطانہ اس سے کھنچی کھنچی اور بے زار بے زار سی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ اٹو نے صرف اس کی وجہ سے گھر چھوڑا ہے۔ حالانکہ بوڑھے خاندانوں نے صرف اس قدر بتایا تھا کہ اس نے نیاز کو اتو پر ناراض ہوتے سنا تھا۔ اس کے بعد اٹو کو ٹھکی کا پھانکھول کر چپ چاپ باہر چلا گیا۔ جب وہ اس بات پر غور کرتی تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ نیاز کے خلاف شدید نفرت کا طوفان اٹھتا۔ اس کا بی چاہتا کہ اس کو ٹھکی سے کہیں چلی جائے۔ ہر طرف نظریں دوڑاتی مگر اس کوئی بھی سہارا کوئی بھی اپنا غم گسار نظر نہ آتا۔ ایسے عالم میں کبھی کبھار مسلمان کا بھی خیال آتا۔ مگر اس کی یاد کے ساتھ ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اس کا بی چاہتا کہ اگر مسلمان مل جائے تو وہ اس کا منہ نوچ لے۔ اس کے چہرے پر تھوک دے اور ہزاروں کوٹنے دے۔ پھر وہ سوچتی، کاڑ ایک بار مسلمان اسے مل جائے اور وہ اسے یہاں لاکر دکھائے کہ اب سلطانہ وہ لڑکی نہیں رہی ہے غریب اور لاوارث جان کر اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ شاندار کو ٹھکی میں رہتی ہے۔ اس کے پاس کا ہے، قیمتی فرنیچر ہے، نوکر ہیں، خدمت گار ہیں جن پر اس کا حکم چلتا ہے۔ اس کے پاس ڈیڑھ سارہ ریشمی کپڑے ہیں۔ زیورات ہیں۔ جو توں کی درجنوں جوڑیاں ہیں۔ وہ جس قدر ٹھٹھاٹ باٹ سے رہا ہے، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

انہی دنوں ایک بار اصرار کر کے نیاز اسے اپنے ہمراہ خان بہادر فرزند علی کے گھر لے گیا۔ خان بہادر بڑی شاندار کو ٹھکی میں رہتا تھا۔ اس کا رہن سہن شاہانہ تھا۔ ہر کمرے میں عمدہ اور فرنیچر تھا۔ کام کاج کے لیے نوکروں کی پلٹن تھی۔ مگر اس کی بیوی بڑی چھچھوری اور خردماغ تھی۔ اترا اترا کر بات کرتی تھی۔ اس کے ہر انداز سے نودو لٹا پن ٹپکتا تھا۔ البتہ دونوں لڑکیاں بہت شاندار اور ملنسار تھیں۔ بڑا لڑکا بھی خوش اخلاق اور بہت ہنس مکھ تھا۔

شاہم کی چائے اس نے تینوں کے ساتھ پی۔ لڑکے کا نام شاہد علی تھا۔ لمبا نکلتا ہوا دانت،

نہ جانے کیوں اس کی باتیں سلطانہ کو بار بار یاد آتی رہیں۔

\*\*\*

رات کے کوئی آٹھ بجے اچانک شاہد آگیا۔

نیاز اس وقت موجود نہیں تھا۔ عام طور پر وہ اس وقت غیر حاضر رہتا تھا۔ سلطانہ چاہتی تو نیاز کے دوسرے ملنے جلنے والوں کی طرح اسے بھی ٹر خادیتی۔ مگر شاہد سے ملنے وہ خود ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہ کسی کام سے نیاز کے پاس آیا تھا۔

باتوں باتوں میں اس نے سلطانہ کو پھر مسز نیاز کہہ کر مخاطب کیا۔ سلطانہ نے سوچا کہ وہ اس غلط فہمی کو مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے مسکرا کر ٹوکا۔

”آپ مجھے مسز نیاز نہ کہا کریں۔“

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”کیوں؟“

”میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“ سلطانہ نے شرما کر دبی زبان سے کہا۔ ”شاہد آپ کو پتہ نہیں۔ نیاز صاحب رشتے میں میرے سوتیلے والد لگتے ہیں۔“

شاہد تعجب سے منہ پھاڑ کر بولا۔ ”ارے!“ لمحہ بھر تک وہ ہکا بکا اسے سمجھتا رہا۔ ”تو پھر اس روز آپ نے یہ بات کیوں نہ بتائی؟“

”آپ لوگوں نے بتانے کا موقع ہی کہاں دیا۔“

شاہد معذرت کرنے لگا۔ ”ہم تو یہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ تو بہت بری بات ہو گئی۔ آپ نے برا تو نہیں مانا۔ پھر اس نے گھبرا کر خود ہی کہا۔ ”آپ نے ضرور برامانا ہو گا۔“

اسے پریشان دیکھ کر سلطانہ بولی۔ ”وہ تو غلط فہمی تھی۔ اس کا کیا برامانا۔“

شاہد نے اس کے بعد کچھ نہ کہا۔ چپ چاپ بیٹھا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگا تا رہا۔ چٹکی ہو اسے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ چہرہ سوچتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس عالم میں وہ بالآخر بصورت لگ رہا تھا۔

سلطانہ نے کئی بار اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ لہر بارہ اسے زیادہ کشش اچھیز نظر آتا۔ معصوم چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بھرے بھرے گلہابی ہونٹ۔

ٹر خانا: ہال دیا۔ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا: بھٹیوں سے دیکھتا۔

خدا کی قسم  
ہی مدنی

کمرے میں خاموشی تھی۔ باہر باغیچے میں درختوں کے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑا رہے۔

نیر دبی دبی آٹھیں پیدا کر رہے تھے۔

رات کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔

سلطانہ نے اسے خاموش پا کر پوچھا۔ ”آپ کیا سوچنے لگے؟“

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی ذرا سوچ رہا تھا۔“

”ہیا؟“ سلطانہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ شاہد علی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور بے چین ہو کر علی سے سر کے بال کریدنے لگا۔ پھر اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”میرے بارے میں؟“

شاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ گلہابی ہو گیا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ دروازہ پر پہنچا اور لگانہ کی جانب دیکھے بغیر باہر چلا گیا۔ سلطانہ کچھ نہ بولی۔ گم صم بیٹھی رہی۔

دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ نیاز اس وقت بھی موجود نہ تھا۔ سلطانہ جیسے اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بلا جھجک پہنچ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ کمرے میں خاموشی تھی اور باہر شام در دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔

کچھ دیر بعد شاہد کی آواز خاموشی میں ابھری۔ ”میں آپ ہی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔“

”مجھ سے؟“ سلطانہ کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”یہاں تو بہت دیرانی ہے۔“ شاہد نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ ”آپ کا دل نہیں گھبراتا؟“

”گھبراتا تو ہے۔“ اس دفعہ سلطانہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر شاہد کو دیکھا۔ ”آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے تھے؟“

شاہد چپ رہا۔ اس نے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے سے بے چینی جھٹک رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کی طرف مڑا۔ آگے بڑھا۔ مگر بلینز تک پہنچتے پہنچتے ٹھکا۔ پلٹ کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ شاہد مبہوت کھڑا رہا۔ پھر کسی سحر زدہ انسان کی

نیر دبی دبی آٹھیں پیدا کر رہے تھے۔ جس پر جلد کیا گیا ہو۔

طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلطانہ کے قریب آیا۔ اس کی سانس اتنی تیز چل رہی تھی گویا بائپ رہا ہو۔ سلطانہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ سلطانہ نے شاہد کی گرم گرم سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی۔

شاہد کی آنکھوں میں چراغ جھللا رہے تھے۔ ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بے اختیار سلطانہ کو اپنے بازوؤں میں بھیج لیا۔

سلطانہ نے کسمسا کر کئی بار اس کے بازوؤں کے حلقے سے ٹکٹنے کی کوشش کی مگر صرف کلبلا کر رہ گئی۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اس نے نڈھال ہو کر اپنا سر شاہد کے کندھے سے ٹکا دیا وہ موم کی طرح پکھل چکی تھی۔

(۵)

کمرے کی خاموشی میں شاہد کی تیز سانسوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سلطانہ اس کے پہلو میں بت بنی کھڑی تھی۔

چند لمحے بعد شاہد کی آواز ابھری۔ ”میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ میں اب ایم بی اے نہیں کروں گا۔“ وہ اپنی بے ترتیب سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیوں؟“ سلطانہ نے مجسم سوال بن کر پوچھا۔

”میں تم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں آج ہی کہنے آیا تھا۔“ وہ ہولے ہولے سلطانہ کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ ”میں پہلے تم سے شادی کروں گا۔ خدا کی قسم! میں آج ہی اتنی سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ ”تم میری ہو تم میری ہو۔“ اس نے پاگلوں کی طرح سلطانہ کی گردن چومنا شروع کر دی۔

\*\*\*

شاہد چلا گیا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں گئی۔ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھا اور تنگی باندھے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی کیا وہ واقعی خوب صورت ہے؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ شاہد اس سے بیاہ کر لے؟

یہ سوالات اس کے ذہن میں کلبلا رہے اور اس کی دلکش آنکھیں بار بار آئینے میں جھپٹا رہیں۔ ہونٹ لرز کر رہ جاتے۔ ان پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔

وہ شام اور ایسی کئی شامیں اس نے انگڑائیاں لے لے کر اور مسکرا مسکرا کر گزار دیں۔

شاہد کی گرم گرم سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی۔

شاہد کی گرم گرم سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسوس کی۔

نیاز نے پوچھا۔ ”تم کو ڈر تو نہیں لگے گا؟“ اور جواب کا انتظار کئے بغیر سلطانہ کا بازو تھام لیا۔  
 ”چلو آج میرے کمرے میں سو جاؤ۔“  
 سلطانہ نے کسماکس آہستہ سے کہا۔ ”نہیں۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔  
 نیاز نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”پاگل مت بنو، آؤ!“ اور جھپاک سے اسے دونوں بازوؤں پر

ڈال دیا۔

نیاز اسے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے کمرے کے باہر آگیا۔  
 بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر، درختوں پر، چھتوں پر بج رہے تھے۔ ہوا فراتے بھرتی  
 بادلوں سے گزرتی تو ایسا محسوس ہوتا کوئی زور زور سے قہقہہ لگا رہا ہے۔  
 اندھیرا بہت گہرا تھا اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نیاز کے بوجھل قدموں کی آواز برآمد  
 پہنچے فرش پر آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔  
 کھٹ کھٹ کھٹ۔ آواز دور ہوتی چلی گئی۔  
 باہر درختوں میں کوئی پرندہ اچانک نود سے چینا۔ پھر اس کی چیخ بارش کے شور میں ڈوب گئی۔  
 لڑ لڑا لڑا جھپک جھپک ہوئی سیاہ بخت رات اور سیاہ ہو گئی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش برابر ہو رہی تھی۔ ہوا درختوں میں چیخ رہی تھی۔  
 سلطانہ ابھی تک سونہ سکی تھی۔ بجلی واپس نہیں آئی تھی۔ اندھیرے سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔  
 تیز ہوا کی سرسراہٹوں میں اس نے سنا، باہر برآمدے میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ چپ رک  
 رک کر ابھر رہی تھی۔  
 سلطانہ لرز کر رہ گئی۔

\*\*\*

قدموں کی آہٹ رک رک کر ابھرتی رہی۔ بارش کا زور ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ ہوا کے شور  
 سے دل دھلتا تھا۔ اسی اثنا میں کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔  
 ڈر کے مارے سلطانہ مسہری کی پٹی سے چمٹ گئی۔ پھر ایک بھاری آواز ابھری۔ ”سلطانہ۔“  
 سلطانہ! ”نیاز آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔  
 سلطانہ نے پوچھا۔ ”کون؟“  
 نیاز نے کہا۔ ”دروازہ کھولو۔“

سلطانہ دم بخود پڑی سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ دروازے پر آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ  
 ہوتی رہی۔ نیاز رک رک کر اسے آواز دیتا رہا۔ آخر سلطانہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔  
 نیاز اندر آگیا۔ ذرا دیر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے سلطانہ سے کہا۔ ”دیکھو ذرا ہوشیار  
 سونا۔“

اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیوں؟“  
 ”مجھے ابھی ابھی ایسا محسوس ہوا کہ کوئی برآمدے میں چل رہا ہے۔“  
 آواز سلطانہ نے بھی سنی تھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گئی۔ نیاز کہتا رہا۔  
 ”پہلے تو میں پڑا پڑا اس آہٹ کو سنتا رہا، پھر باہر نکل کے دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ اندھیرا اس  
 قدر ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا۔ تم نے موم بتیاں بھی منگوا کر نہیں رکھیں۔“  
 اس کی آواز اندھیرے میں آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔  
 خوف کے مارے سلطانہ کی آواز تک نہ نکلی۔ وہ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔

سلمان جس وقت وہاں پہنچا تو ان ڈھل چکا تھا۔ شام کے امنڈتے اور پھیلنے ہوئے دھندلے میں بارش کی عمارت کسی کھنڈر کی طرح ویران نظر آرہی تھی۔

سلمان نے اندر داخل ہو کر دیکھا، کمروں میں گہرا سناٹا تھا۔ نہ پہلی سی چہل پہل تھی نہ اسکاٹی لائن کی مصروف اور سرگرم زندگی کی گہما گہمی تھی۔ ہر طرف بوجھل خاموشی چھائی تھی۔ وہ دروازے سے گزرتا ہوا دفتر کی جانب بڑھا۔

دفتر کا دروازہ کھلا تھا کمرے میں دن کی ڈوبتی ہوئی روشنی مدہم پڑ چکی تھی۔ اس نیم تاریکی میں ٹیف ولاغر شخص میز پر جھکا سامنے رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے قریب دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ یہ ڈاکٹر زیدی تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں بال کنپٹیوں پر ہنید ہو گئے تھے۔ وہ خاصا بوڑھا نظر آ رہا تھا۔

سلمان کے دل کو سخت دھچکا لگا وہ دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ غور سے دیکھنے لگا کہ آیا وہ ڈاکٹر لائیو یا کوئی اور۔ واقعی وہ اب بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ اچانک ڈاکٹر نے گردن اٹھا کر سلمان کی نگاہوں اور حیرت سے چہنچہا ہوا اکھڑا ہو گیا۔

”ہیلو سلمان!“

سلمان گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر تم نے اپنا یہ کیا حلیہ بنا لیا؟“ ڈاکٹر زیدی صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پشمرہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مان کے اس سوال سے اسے ذہنی اذیت پہنچی ہے۔ سلمان نے خاموشی اختیار کر لی۔ مزید بات نہیں کی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر ہارٹن کیا۔

سلمان نے پوچھا۔ ”دوسرے اسکاٹی لارک کہاں ہیں؟“

”اپنے اپنے حلقوں میں کام کرنے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔“

ڈاکٹر زیدی کے جواب سے سلمان کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ اس کے بعد باتوں کا طویل سلسلہ لگا۔

ڈاکٹر زیدی نے بتایا کہ صفر بشیر حملے کی رات ہی کو جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کے جسم پر زخموں

## فصل یازدہم

(۱)

سلمان لگ بھگ ڈیڑھ مہینے تک اسپتال میں رہا۔ اس کے جسم پر تیرہ زخم آئے تھے۔ تین روز تک وہ ایمر جنسی وارڈ میں بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو اس کی پیناکی بہت دھندلی تھی۔ فہمت اس قدر زیادہ تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ پہلو میں تیسری پہلی کے نیچے ایسا گہرا زخم تھا جس نے کئی روز تک ڈاکٹروں کو پریشان رکھا۔

شروع شروع میں اسکاٹی لارک اسپتال میں اس کی عیادت کے لیے آتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ انہوں نے آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ان کا یہ رویہ سلمان کو بہت شاق گزرا۔ اسے اسکاٹی لارکوں کی اس بے اعتنائی پر غصہ آیا اور اپنی ٹیکسی پر دکھ بھی ہوا۔

اسپتال سے صحت یاب ہو کر جب وہ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت جھنجھلایا ہوا تھا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ فلک پیا کے آئندہ اجلاس میں وہ اسکاٹی لارکوں کی اس بے رخی کے خلاف شدید احتجاج کرے گا اور یہ دریافت کرے گا کہ اس کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیوں اختیار کیا گیا؟

لیکن گنتی پہنچ کر اس نے ہیڈ کوارٹر دیکھا تو سب کچھ بھول گیا۔ ہیڈ کوارٹر کی دیواریں ابھی تک جھلکی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ہر چند کہ جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ نئی کھڑکیاں اور دروازے لگائے گئے تھے مگر آتشزدگی کے نشانات جگہ جگہ دھوئیں کے سیاہ دھبے بن کر بکھرے ہوئے تھے۔ لائبریری کی ایک دیوار چھج چھجی تھی۔ اس میں انچ بھر چوڑا نشان تھا۔

سلمان بہت زیادہ کمزور۔ ششدر۔ حیران۔ پشمرہ۔ افسردہ۔ مہمائی ہوئی۔

فہمت: کمزوری۔ عیادت: تدارک دہی۔ شاق: ناگوار۔ بے اعتنائی: لاپرواہی۔

لارک رہائی کے بعد اسی قدر دہشت خیزہ اور ہراساں ہو گئے کہ انہوں نے فلک پیا سے کنارہ پار کر لی۔ اب صرف سات اسکائی لارک رہ گئے تھے۔ اس افراطی میں تمام محاذوں پر کام بند ہو گیا۔ پولیس نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ تعلیم بالغاں کے تمام مراکز بند ہو گئے۔ علاقے میں ایک تانگے والے نے اپنا گھوڑا باندھنا شروع کر دیا اور اسے باقاعدہ اصطبل بنا دیا۔

ہائیڈکوارٹر سے نکلے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ پولیس کو حملے کی اطلاع کر دی تھی۔ پولیس کی تفتیش شروع ہونے کے چند ہی روز بعد قریب قریب سارے اسکائی لارک گرفتار کر لیے گئے۔ ہائیڈکوارٹر تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اسکائی لارکوں پر صفدر بشیر کے قتل کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق الزام کی نوعیت یہ تھی کہ صفدر بشیر فلک پیا سے مستغنی ہو چکا تھا۔ وہ لندن جانے والا تھا وادرات کی شب وہ ہائیڈکوارٹر آیا تھا اور فلک پیا کے فذ میں اس کی جو رقم موجود تھی، اس کی واپس مطالبہ کر رہا تھا۔ مگر رقم دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ اسکائی لارکوں نے یہ جہاد کرنے کے لیے کہ صفدر بشیر اپنے حامیوں کے ساتھ حملہ کرنے کی نیت سے آیا تھا، ہائیڈکوارٹر عمارت کو آگ لگا دی۔

پولیس کے موقف کی تائید علیم احمد نے کی۔ بعد میں جنیم اللہ بھی سرکاری گواہ بن گیا۔ اس

دونوں کے علاوہ پولیس بستی سے بھی چند گواہ مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مقدمے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ پولنگ سے قبل کسی اسکائی لارک کی ضمانت ہو سکی۔ دو تنک کے وقت پولنگ اسٹیشن پر اسکائی لارکوں کا نہ کوئی ایجنٹ موجود تھا اور نہ ہی دونوں کتنی کے وقت کوئی نمائندہ تھا۔

ڈاکٹر زیدی امیدوار تھا۔ مگر دوسرے اسکائی لارکوں کے ساتھ وہ بھی جیل میں بند تھا۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس کے ووٹ تعداد میں اس قدر کم نکلے کہ ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔

خان بہادر فرزند علی بھاری اکثریت سے میونسپل بورڈ کا ممبر منتخب ہو گیا۔ اس شاعر کا کامیابی پر اس دھوم دھام سے جلوس نکلا۔ بستی میں جگہ جگہ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ اس کے کارکنوں نے اپنے گھر پر چرغاں کیا۔

خان بہادر فرزند علی کی کامیابی کے چند ہی روز بعد اسکائی لارکوں کی ضمانتیں منظور ہونا شروع ہو گئیں۔ علی احمد بھی ضمانت پر رہا ہو چکا تھا۔ البتہ ریاض سیفی ایکٹ کے تحت ہنزہ نظر بند تھا۔ بعض

عمر سے۔ بالائی آمدنی: مراد روث، ہاجا نکائی۔

کے ۴۲ نشانات تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے اسکائی لارک بھی زخمی ہوئے تھے۔ صرف جنیم اللہ اسکائی لارکوں کے ساتھ کچھلی دیوار پھاند کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

پولیس موقع وادرات پر اس وقت پہنچی جب حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ حالانکہ جنیم اللہ ہائیڈکوارٹر سے نکلے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ پولیس کو حملے کی اطلاع کر دی تھی۔ پولیس کی تفتیش شروع ہونے کے چند ہی روز بعد قریب قریب سارے اسکائی لارک گرفتار کر لیے گئے۔ ہائیڈکوارٹر تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اسکائی لارکوں پر صفدر بشیر کے قتل کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق الزام کی نوعیت یہ تھی کہ صفدر بشیر فلک پیا سے مستغنی ہو چکا تھا۔ وہ لندن جانے والا تھا وادرات کی شب وہ ہائیڈکوارٹر آیا تھا اور فلک پیا کے فذ میں اس کی جو رقم موجود تھی، اس کی واپس مطالبہ کر رہا تھا۔ مگر رقم دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ اسکائی لارکوں نے یہ جہاد کرنے کے لیے کہ صفدر بشیر اپنے حامیوں کے ساتھ حملہ کرنے کی نیت سے آیا تھا، ہائیڈکوارٹر عمارت کو آگ لگا دی۔

پولیس کے موقف کی تائید علیم احمد نے کی۔ بعد میں جنیم اللہ بھی سرکاری گواہ بن گیا۔ اس

دونوں کے علاوہ پولیس بستی سے بھی چند گواہ مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مقدمے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ پولنگ سے قبل کسی اسکائی لارک کی ضمانت ہو سکی۔ دو تنک کے وقت پولنگ اسٹیشن پر اسکائی لارکوں کا نہ کوئی ایجنٹ موجود تھا اور نہ ہی دونوں کتنی کے وقت کوئی نمائندہ تھا۔

ڈاکٹر زیدی امیدوار تھا۔ مگر دوسرے اسکائی لارکوں کے ساتھ وہ بھی جیل میں بند تھا۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس کے ووٹ تعداد میں اس قدر کم نکلے کہ ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔

ہے۔ مجھے اس کا جیسا افسوس ہے۔“

مسلمان نے مزید کچھ نہ کہا۔ علی احمد اسے اسکائی لار کون کی سرگرمیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آٹھ بجے تک سارے اسکائی لارک دفتر میں اکٹھا ہو گئے۔ ہر ایک نے بڑے جوش و خروش سے مسلمان خیر مقدم کیا۔ سب اس کی آمد سے بہت خوش تھے۔ ان میں نئی توانائی اور مستعدی نظر آ رہی تھی۔ اس روز سب نے مل کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ دس بجے کے قریب فلک پیکا کا اجلاس ہوا۔ جس میں صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا اور اس کی روشنی میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل کیا گیا۔ نئے عزائم اور تازہ دلولے کے ساتھ جدوجہد کرنے کا عہد کیا گیا۔ اجلاس آدمی رات با جاری رہا۔ ہر مسئلے پر بحث ہوئی اور ہر اسکائی لارک نے بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

نئی تجاویز پیش کی گئیں۔ سب سے زیادہ اس تجویز پر زور دیا گیا کہ فلک پیکا کے نئے کار بنائے جائیں۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس لیے کہ فلک پیکا کے پاس اب بہت قہر تھا۔ وہ بھی علی احمد نے بارہ ہزار روپے میں اپنا مکان فروخت کر کے مہیا کیا تھا۔ اور جس کا بڑا حصہ مقدمے بازی میں اور ضروری اشیاء کی خریداری پر خرچ ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں بعض اسکائی لارکوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ فلک پیکا کے ہمدردوں سے چندہ لیا جائے۔ مسلمان کی رائے؟ کہ تعلیم بالغاں کے مرکزوں میں پڑھنے والے طلباء سے فیس لی جائے جو بہت معمولی ہو۔ ڈاکٹر زید نے اس کی تائید کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ڈپنٹری سے جو دوائیں دی جاتی ہیں، مریمضوں سے ان کی کچھ نہ کچھ قیمت لی جائے۔ کم سے کم ان لوگوں سے جو قیمت دے سکتے ہیں۔ اس روز کوئی تجویز منظور نہیں کی گئی اور فنڈ کا مسئلہ آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زیدی نے مسلمان کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ دن آرام کرے۔ اس کی صحت اس قابل تھی کہ کوئی کام کر سکے۔ مگر اس نے ڈاکٹر کی ایک نہ سنی۔ دوسرے ہی روز اپنے پرانے شاگرد سے ملا۔ جس جگہ تعلیم بالغاں کا مرکز تھا، وہ جگہ دیکھی۔ وہاں ایک قصائی نے گوشت کی دکان کھول رکھی تھی۔ اس کا گھر بھی قریب ہی تھا۔ مسلمان اس سے ملا اور یہ تجویز پیش کی کہ دکان کھول جائے۔ مگر وہ سرکش آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف مسلمان کی تجویز مسترد کر دی بلکہ اس قدر فحاشی کی کہ اس نے اس کا گھر پر اثر آیا۔ مسلمان کے ساتھ جو لوگ تھے ان کو بھی غصہ آ گیا۔ اچھی خاصی لڑائی جھگڑے فضا پیدا ہو گئی۔

مسلمان نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ یہ طے کیا کہ مرکز کسی اور جگہ قائم کر لیا جائے۔ کہیں جگہ ملے تو ذریعہ طور پر کسی کھلی جگہ چٹائیاں بچھا کر اور گیس بتی روشن کر کے کلاسیں شروع کر دی جائیں۔ شام کو مسلمان وہاں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک مکان کی دیوار کے سہارے پرانے ٹین کے ذریعہ کاسٹائبن ڈال دیا گیا تھا۔ گیس بتی روشن تھی اور فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں۔ اسے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دن یاد آگیا جب فلک پیکا نے تعلیم بالغاں کا پہلا مرکز قائم کیا تھا۔

چند ہی روز میں طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مجبوراً داخلہ بند کرنا پڑا۔ جب مرکز اچھی طرح چلنے لگا تو مسلمان نے اس کی ذمہ داری ایک تربیت یافتہ اسکائی لارک کے سپرد کی اور خود دوسرا مرکز قائم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

لگ بھگ مہینہ بھر میں مسلمان نے دو ڈھوپ کر کے تعلیم بالغاں کے تین مرکز قائم کر لیے۔ ان میں باقاعدہ تعلیم بھی شروع ہو گئی۔

علی احمد کو مسلمان کے واپس آنے سے بڑی مدد ملی۔ اب ہر کام معمول پر آتا جا رہا تھا۔ بڑیل ہوم کو اسکائی لارکوں نے اپنی نگرانی میں لے کر از سر نو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ رالٹالے پھر سے قائم کر دیئے گئے۔ ڈپنٹری کو بھی درست کیا گیا۔ مگر سب سے بڑی وقت فنڈ قحی جس کے بغیر کام چلانا بہت مشکل تھا۔

اسکائی لارک ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ فنڈ کس طرح مہیا کیا جائے۔ فنڈ کی قلت نے باعث اسکائی لارکوں نے ایک وقت کا کھانا بند کر دیا تھا۔ اپنی تمام ضروریات کم سے کم کر دی تھیں۔ مگر ٹوں کے بجائے انہوں نے بیڑیاں پینا شروع کر دی تھیں۔ جن کے کپڑے پھٹ گئے تھے اس لیے اسکائی لارکوں کے کپڑوں سے کسی نہ کسی طور پر اپنا کام چلا رہے تھے۔

مسلمان کی صحت اسپتال سے نکلنے کے بعد پہلے ہی خراب تھی۔ سخت مشقت اور مناسب غذا نہ ملنے کے باعث اس کا جسم اور لاغر ہو گیا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ شکم بال شکم کی طرح کھڑے رہتے۔ اس کے چہرے پر دیرانی برسنے لگی تھی۔ مگر وہ اپنی سسے بے نیاز کام کرنے کی دھن میں مگن تھا۔



”میں پہلے تو تمہیں پہچان ہی نہ سکا۔“

سلمان اس کی باتوں سے پریشان ہو گیا، کہنے لگا۔ ”بہار تھا۔“

نیاز بڑے سر پر ستانہ انداز میں بولا۔ ”بھی لیڈری ویڈری تم کو زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بڑے ہوں کے جو نچلے ہیں۔ میرا کہا مانو تو اس جھنجھٹ پر لعنت بھیجو۔ کل کسی وقت آکر مجھ سے ملو۔ نہارے لیے نوکری کا بندوبست کرادو گا۔ میرا دفتر پاور ہاؤس کے برابر والی سڑک پر ہے۔ وہاں راجس کسی سے پوچھو گے دفتر کا پتہ بتا دے گا۔ میں عام طور پر ٹوبہ کے دفتر پہنچ جاتا ہوں اور دو بجے ضرور رہتا ہوں۔ لویہ میرا کارڈ رکھ لو۔“ اس نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر سلمان کو دیا۔

سلمان اس کی باتوں پر سخت جھنجھلیا۔ دل ہی دل میں کہا یہ سالا کب لایا خود کو کیا سمجھنے لگا ہے۔ نہ لکھا چار سو بیس کر کے کچھ رقم پیدا کر لی۔ اب اس طرح بات کر رہا ہے جیسے دولت کے ساتھ لاش بھی بڑی ہو گئی۔ اس نے کسی قدر بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

”آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔ فی الحال مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں۔ اگر کبھی ایسا ام ہو تو آپ سے ضرور ملوں گا۔“

سلمان نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی ہونٹوں سے لگا کر نے ہی والا تھا کہ نیاز نے اپنا سنہری سگریٹ کیس کھولا اور سلمان کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

”لو یہ ۵۵۵ پیڑ۔“

”شکریہ۔ میں بیڑی پیوں گا۔“

نیاز بے تکلفی سے بولا۔ ”اماں اس خواہ خواہ کے تکلف میں کیا رکھا ہے۔ اچھی چیزیں استعمال انہیں بھی اچھی ہی اچھی سو جھتی ہیں۔“

ان وقت سلطانہ نے بیڑی سے کہا۔ ”چلے دیر ہو رہی ہے۔“

نیاز نے پلٹ کر سلطانہ کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”یہ مسٹر سلمان ہیں۔ میرے پرانے سہیل ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لیڈری کے چکر میں پڑ کر اپنی یہ حالت بنالی۔“ وہ سلمان کی سے صفائی پیش کرنے لگا۔ مگر سلطانہ نے سلمان کا ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔ بے نیازی سے اپنے لبرن ناخون دیکھتی رہی۔

اسے نوٹس لینا تو چہ کر۔

ایک شام کو سلمان شہر کے بڑے بازار سے گزر رہا تھا۔ اچانک نیاز سے اس کی ٹڈ بھڑ ہو گئی نیاز کے ساتھ سلطانہ بھی تھی۔ وہ اس وقت خاصی ماڈرن اور طرح دار لگ رہی تھی۔ جدید طرز کا ریشمی لباس اور ہلکا ہلکا میک اپ۔ وہ کسی شہزادی کی طرح نظر آرہی تھی۔ دونوں ایک دکان سے نکل کر باہر آرہے تھے۔ سلمان نے چاہا کہ ان کی نظریں بچا کر نکل جائے مگر نیاز نے اسے دیکھ لیا۔ بے تکلفی سے بولا۔

”ہیلو سلمان!“

مجبوراً اسے رکتا پڑا۔ نیاز اس کے قریب آکر بولا۔ ”ارے بھئی! کہاں ہو۔ کہیں نظر نہیں آتے؟“

سلمان نے جواب دیا۔ ”میں تو یہیں تھا۔“

”مگر تم نے یہ اپنا کیا حلیہ بنالیا ہے؟“

سلمان اس کی بات سن کر قدرے گھبرا گیا۔ واقعی اس کا عجیب حلیہ تھا۔ خشک بال، بڑھا ہوا شیو، چہرے پر گرد۔ لباس گندہ جس کی ایک آستین اس طرح پھٹ گئی تھی کہ اندر کی جلد صاف نظر آتی تھی۔ اور نیاز ایسا لگتا تھا جیسے کسی لائڈری سے ابھی دھل دھلا کر نکلا ہے۔ شارک اسکن کی جھلکی ہوئی سفید بٹشرٹ اور کارڈرائی کی پتلون میں وہ خاصہ اسارٹ لگ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت کھمبائی تھی۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرنخی تھی۔ آنکھیں شفاف تھیں۔ سلطانہ کے ہمراہ کسی طرح بھی ناموزوں نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ سلمان نے اس کے روبرو خود کو کوڑے کے ڈھیر سے لگے ہوئے مرل چوہے کی طرح حقیر محسوس کیا۔

نیاز بولا۔ ”کہیں نوکری دو کر لی بھی ملی یا ابھی تک بے روزگاری کا چکر چل رہا ہے۔“

”نوکری کا کارواہ تو مدت ہوئی میں نے ترک کر دیا۔“

”تو پھر کیسے کام چل رہا ہے؟“ نیاز نے سلمان سے پوچھا۔

”کچھ سوشل کام کر رہا ہوں آج کل۔“

نیاز ہنسنے لگا۔ ”ارے بھئی، اس سوشل کام وہم کے چکر میں کہاں پڑے ہو۔ ذرا اپنی حالت تو

علی احمد نے اس سے صرف اتنا کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے واپس آنے کی کوشش کرے۔ اس  
سلمان کو ۲۰ روپے زاد راہ کے طور پر دئے اور ایک بار پھر جلد آنے کی تاکید کی۔  
دوسرے روز سلمان رات کی ٹرین سے سفر پر روانہ ہو گیا۔

(۳)

شہر کی ایک دھندلی صبح کو سلمان چپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بوسیدہ لٹچی  
لٹک رہا تھا۔ لباس ملگجھا تھا اور سر کے خشک بال نکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع سے کسی  
ادانے کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔

اس کی آمد پر نہ کوئی پلچل پیدا ہوئی نہ ہی کسی نے توجہ دی۔

گھر کا ہر فرد سرد مہری سے پیش آیا۔ باپ نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔ البتہ ماں کی مامتا بلک  
وہ اسے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ چند لمحے اس کے چاروں طرف ہجوم رہا۔ پھر ہر  
خاموشی سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ نہ کسی نے زیادہ بات چیت کی اور نہ اس پر  
تکی بوجھاڑی گئی۔

اس کے جملے ہوئے چہرے پر چھائی ہوئی ویرانی، دھنسی ہوئی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھالے ملگجے  
نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

سلمان نے غور کیا کہ اس کی غیر حاضری میں گھر میں بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ باپ  
شہر سے ریٹائر ہو کر پنشن پر آگیا تھا۔ اس نے لمبی ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ وہ بڑی پابندی سے پانچوں  
نماز پڑھتا۔ سویرے تاروں کی چھاؤں میں اٹھ بیٹھتا اور دیر تک کلام پاک کی تلاوت کرتا۔  
لہجہ بھی پڑھتا۔ اس کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا جہاں وہ خاموش بیٹھا حقہ گڑ گڑایا  
اور نئی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

نماز مغرب کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا اور صحن سے چپ چاپ گزرتا ہوا بیٹھک میں  
ٹپکتا۔ پاس پڑوس سے اس کے کچھ ہم سن بوڑھے آجاتے۔ وہ حقہ پیٹے، پان چباتے اور

لڑکھڑکھ مروتی۔ ہم سن، ہم سن۔

سلمان کے لیے ایک ایک لمحہ دو بھر ہو رہا تھا۔ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ گھر اکر  
سے بولا۔ ”اب میں چلوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

”اچھا، اچھا! جی چاہے تو کبھی دفتر کی طرف چلے آنا۔“ یہ کہتا ہوا نیاز آگے بڑھ گیا۔

سلطانہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کی خوبصورت صراحی دار گردن  
اٹھی ہوئی تھی۔ چال میں تمکنت تھی۔ دونوں قریب کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گئے۔ کار نیاز ڈرا  
رہا تھا۔ سلطانہ اس کے برابر ہی بیٹھی تھی۔ سلمان چپ چاپ کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ اسے گمان  
سلطانہ ایک بار اس کی جانب ضرور دیکھے گی۔ مگر سلطانہ نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بڑے لاڈلے  
کے شانے پر جھک کر اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ دونوں مسکرا دئے۔

کار اشارت ہوئی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔ سلمان دور تک اسے خوابناک نظروں سے  
رہا اس نے آگے بڑھتے ہوئے سوچا۔ سلمان! سلطانہ اب بہت دور جا چکی ہے اور تم دلدل  
پڑے ہو اور اس دلدل میں گرنا تم نے خوشی سے منظور کیا ہے۔ اس لیے کہ تم معاشرے سے غلام  
صاف کر دینا چاہتے ہو۔ تمہیں حسین چیزوں کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ خواہ وہ سلاطہ  
چودھویں کا چاند۔ تم تو خوبصورتی کے حصول کے بجائے بد صورتی کو حسن میں ڈھالنے کے  
جدوجہد کر رہے ہو۔

سلمان نے کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا تو لیا مگر وہ یہ نہ بھول سکا کہ اس کی زندگی  
ایک لڑکی سلطانہ بھی آئی تھی جس نے ایک رات اس سے محبت کی بھیک مانگی تھی اور جس نے  
اسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ایک نگاہ غلط انداز ہی ڈال لیتی۔ کیا وہ اس سے انتقام لے رہی  
واقعی سلطانہ نے اسے حقیر سمجھا تھا؟ یہ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے سوالات اس کے ذہن میں اب  
رہے ڈوبتے رہے۔ ڈوبتے رہے ابھرتے رہے۔ اسی الجھن میں وہ اس روز پوری یکسوئی کے  
پڑھا بھی نہ سکا۔

رات اس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ پھر اس کی کتنی ہی راتیں بے چینی میں گئیں۔  
ایک روز وہ اسی بے چینی کے عالم میں علی احمد کے پاس پہنچا۔ یہ غدر پیش کیا کہ اس کی ماں کی لٹ  
بہت خراب ہے۔ وہ چند روز کے لیے گھر جانا چاہتا ہے۔

دو بھر: مشکل۔ کرب: دکھ۔ صراحی دار: مروتی۔ تمکنت: عروج، شان۔

ہم کے اندر کھرام چلتا۔ ہر طرف سے اس پر لٹاڑ پڑتی۔ وہ چیخ چیخ کر روتی۔ کوئے دیتی اور اپنی بہن کی بے ثباتی کا رونا۔ کبھی غنی پود کی بے راہ روی پر کڑھنا اور کبھی کھار گرد و پیش کی زندگی پر سرسری سا تبصرہ۔

باپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اطمینان قلب حاصل ہے۔ اسے فخر تھا کہ اس نے ۳۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے سرکاری ملازمت کی اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دئے۔ ہمیشہ افسران بالا کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ صاف ستھرا رہا۔ اسے سواتین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ اسے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کا بیٹا سلمان تالا لنگر گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلمان نائب تحصیل دار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ آگیا تھا۔ وہ بات بات پر رونا پینا شروع کر دیتی۔ کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی۔ مگر اب اسے کاتھ کھاڑی طرح ناکارہ قرار دے کر گھر کے ایک کونے میں بٹھادیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھری نما مختصر کمرے میں پڑی کھانا کرتی، پان چلیا کرتی اور چھالیہ کترا کرتی۔ بلغم اور پان کی پکیوں سے اس نے دیواروں پر خوب لگاڑیاں کی تھیں۔ وہ اپنی اولاد کو سرکش اور بد تمیز سمجھتی تھی اور اولاد اسے جاہل اور کوڑھ مغز قرار دیتی تھی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو اس کے کمرے میں باہر سے تالا لگادیا جاتا اس لیے کہ وہ بڑی بے پردہ باتیں کرتی تھی۔ اس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے پھوہڑ پن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی جو بہت معیوب ہوتی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

لیکن یہی ایک ایسا وقت ہو تا جب وہ اپنی اولاد سے انتقام لے سکتی تھی۔ وہ اپنا ملگجالباس پہنے جوتیاں گھسیٹتی سوسو کر کرتی ابداء کے مہمانوں کے سامنے آجاتی۔ دونوں لڑکیوں اور بہو کے چہرے سفید پڑ جاتے۔ وہ دانت کٹکٹا کر اسے گھورتیں تاکہ وہ جلد سے جلد نظروں سے دور ہو جائے۔ لیکن سب کچھ نظر انداز کر کے عین مہمان کے سامنے آکر بیٹھ جاتی اور دنیا جہان کے قضیئے چھیڑ دیتی۔ بعد

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی اور ان دنوں چھٹیوں پر گھر آئی ہوئی تھی۔ اس نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا۔ لیکن وہ خود ایک ہی فلسفے میں یقین رکھتی تھی۔ اور وہ فلسفہ یہ کہ گزشتہ افسر سے شادی ہو جائے۔ اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ بیکاپ کے باوجود آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں صاف نظر آتی تھیں۔ وہ گھر میں کسی سے بات چیت کرتی اور سب پر اس طرح حکم چلاتی گویا وہ اس کے تابع دار ہوں۔

عذرا کی ہنسی

باپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اطمینان قلب حاصل ہے۔ اسے فخر تھا کہ اس نے ۳۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے سرکاری ملازمت کی اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دئے۔ ہمیشہ افسران بالا کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ صاف ستھرا رہا۔ اسے سواتین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ اسے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کا بیٹا سلمان تالا لنگر گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلمان نائب تحصیل دار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ آگیا تھا۔ وہ بات بات پر رونا پینا شروع کر دیتی۔ کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی۔ مگر اب اسے کاتھ کھاڑی طرح ناکارہ قرار دے کر گھر کے ایک کونے میں بٹھادیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھری نما مختصر کمرے میں پڑی کھانا کرتی، پان چلیا کرتی اور چھالیہ کترا کرتی۔ بلغم اور پان کی پکیوں سے اس نے دیواروں پر خوب لگاڑیاں کی تھیں۔ وہ اپنی اولاد کو سرکش اور بد تمیز سمجھتی تھی اور اولاد اسے جاہل اور کوڑھ مغز قرار دیتی تھی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو اس کے کمرے میں باہر سے تالا لگادیا جاتا اس لیے کہ وہ بڑی بے پردہ باتیں کرتی تھی۔ اس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے پھوہڑ پن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی جو بہت معیوب ہوتی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

لیکن یہی ایک ایسا وقت ہو تا جب وہ اپنی اولاد سے انتقام لے سکتی تھی۔ وہ اپنا ملگجالباس پہنے جوتیاں گھسیٹتی سوسو کر کرتی ابداء کے مہمانوں کے سامنے آجاتی۔ دونوں لڑکیوں اور بہو کے چہرے سفید پڑ جاتے۔ وہ دانت کٹکٹا کر اسے گھورتیں تاکہ وہ جلد سے جلد نظروں سے دور ہو جائے۔ لیکن سب کچھ نظر انداز کر کے عین مہمان کے سامنے آکر بیٹھ جاتی اور دنیا جہان کے قضیئے چھیڑ دیتی۔ بعد

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی اور ان دنوں چھٹیوں پر گھر آئی ہوئی تھی۔ اس نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا۔ لیکن وہ خود ایک ہی فلسفے میں یقین رکھتی تھی۔ اور وہ فلسفہ یہ کہ گزشتہ افسر سے شادی ہو جائے۔ اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ بیکاپ کے باوجود آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں صاف نظر آتی تھیں۔ وہ گھر میں کسی سے بات چیت کرتی اور سب پر اس طرح حکم چلاتی گویا وہ اس کے تابع دار ہوں۔

عذرا کی ہنسی

بے ثباتی: تپا ندری۔ پود: نس۔ اطمینان قلب: دلی سکون۔ گل کاریاں: پھول بوئے، نقش و نگار۔ کوڑھ مغز: بے عقل۔ بے راہی: فصول۔ پھوہڑ پن: ادا پن، جہالت۔ معیوب: ناپسندیدہ۔ افشا: ظاہر۔ قبیح: مجرور۔

چھوٹا بھائی بی اے کر چکا تھا۔ وہ تمام وقت پڑھنے میں گزارتا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا  
یہ طرح سی ایس پی بن جائے۔ شاندار بنگلہ، جھلکتی کار، اردلی اور سر کہنے والے ماتحتوں کی پلٹن۔  
اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی بیانی خراب کر چکا تھا۔ وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک

اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے میں کتابوں پر جھکا  
نظر آتا۔



سلمان کئی برس بعد آیا تھا اور ان کئی برسوں میں اتنی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں کہ وہ اپنے  
رہیں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔

بظاہر اس کے بھائی بہنوں کے پروگرام مختلف تھے مگر سب کی منزل ایک ہی تھی۔ وہ اس  
ناک پہنچ جانا چاہتے تھے جس پر چڑھ کر وہ اوپر کے طبقے میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر وہ خلا میں  
بہرہ برہے گئے تھے۔ ان کے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر تھیں تاکہ نیچے نہ دیکھ سکیں، صرف بلندی کو  
بلند وہ نیچے اترنا نہیں چاہتے تھے اور اوپر پہنچنا ان کے بس میں نہ تھا۔ انہیں ایک ایسے سہارے  
دراستی جو ان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لے۔

سلمان اس لیے گھر آیا تھا کہ اس کی صحت کچھ سنبھل جائے گی اور جس ذہنی انتشار میں مبتلا تھا  
ناک آجائے گی۔ مگر ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹائی فائیڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا بیمار پڑا کہ ہفتوں بستر  
پر ہی اس کی زندگی کا بڑا اذیت ناک دور تھا اس کے بھائی بہنوں کا رویہ بڑا افسوس ناک تھا۔  
لڑکے قریب آکر نہ پھٹکتا۔ وہ اس سے اس طرح کتراتے جیسے وہ مجسم ٹائی فائیڈ کی بلان گیا تھا  
بہ آتے ہی ان سے چمٹ جاتی۔

سب مل کر تہقہ لگاتے۔ فلموں پر تبصرے کرتے۔ لباسوں کے نئے ڈیزائنوں پر بحث  
مگر کوئی اس کی علالت کے متعلق بات بھی نہ کرتا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ بے  
کوشش بدلا کرتا۔ ایک ایک چیز کو ترسا کرتا۔ مغلے بھائی کو تو اپنی انتہائی مصروفیات کے

گزیٹڈ افسر شوہر سے مایوس ہو کر اب وہ غیر ملکی اسکالر شپ کے لیے کوشاں تھی۔ ان دنوں  
اس پر یہی دھن سوار تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے وزارت تعلیم کے ایک بڑے افسر  
کے بنگلے کے اتنے طواف کئے تھے کہ اس کے متعلق طرح طرح کے اسکینڈل مشہور ہو گئے۔

منجھلا بھائی نہر کے محکمے میں ملازم تھا۔ وہ سر تاپا تصنع تھا۔ اس پر مغربیت دیوانگی کی حد تک  
سوار تھی۔ اس کی بیوی گرجیوت تھی۔ لہذا وہ اور بھی زیادہ انگریز بننا جارا تھا۔ وہ سویرے اٹھ کر  
بیڈٹی پیتا۔ ناشتے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتا اور اخبار میں ہمیشہ ایسی خبریں تلاش کرنے کی کوشش  
کرتا جن میں ان افسروں کا ذکر ہوتا جن سے اس کی شناسائی تھی۔ دفتر جاتے وقت بیوی اسے  
دروازے تک چھوڑنے جاتی تھی جہاں وہ اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا اور بائی بائی کہتا ہوا چلا جاتا۔ بیوی  
کو ہمیشہ ڈارلنگ کہتا۔ ہالی وڈ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر نئے نئے انداز کے لباس پہنتا اور بڑا عجیب و غریب  
نظر آتا۔

وہ گھر میں روزانہ نئی تبدیلیاں کرتا رہتا۔ ایک روز چیتل کی ایک گھنٹی لے آیا جو کھانے کی  
میز پر رکھ دی گئی۔ ناشتے اور کھانے کے وقت اسے بجا کر باقاعدہ اعلان کیا جاتا کہ بیوی کے لیے  
جننازیم کا سامان لے آتا۔ سویرے بہت تڑکے اٹھتا اور اپنی نگرانی میں بیوی سے ورزش کرواتا۔ اسے  
طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ عام طور پر وہ اپنا ہر تجربہ بیوی پر آزما تا تھا۔ جب وہ موٹی ہو جاتی تو  
ڈائٹنگ کرواتا۔ دہلی ہو جاتی تو کھن اور دودھ کی مقدار میں ناپ ناپ کر اضافہ کرتا۔ وہ اپنے بچوں  
سے ہمیشہ انگریزی میں بات چیت کرتا۔ اگر کبھی ان کی زبان سے اردو کا لفظ سن لیتا تو آگ بگول  
ہو جاتا۔ اس کے دو بچے تھے جو بہت کم سن تھے مگر انہیں کانٹونٹ میں داخل کرانے کے لیے اس نے  
ابھی سے کوشش شروع کر دی تھی۔

وہ کوئی بڑا عہدے دار نہیں تھا۔ آمدنی کم تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے جنہیں پورا  
کرنے کے لیے وہ رشوت خوری کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش  
تھی اور وہ یہ تھی کہ اسے بڑا آدمی سمجھا جائے۔ لیکن مال اسے بڑا آدمی سمجھنے کے بجائے ناکاکٹھ کالو  
سمجھتی تھی جس کا انتقام وہ اس طرح لیتا کہ اکثر رات کو بیڑ کا ایک گلاس چڑھاتا اور نشے کی رنگ میں  
مال کو ڈانٹتا پھینکا کرتا۔

نورانی: اردلی: سرکار کی طرف سے ملے والا نوکر۔ معلق: لکے ہوئے۔ انتشار: پریشانی، غم۔ اذیت ناک: تکلیف دہ۔ دور:

دھن: جنون۔ طواف کرنا: پھر لگانا۔ تصنع: مبالغہ، ہوکھار۔ آگ بگول ہونا: نہایت فساد میں آنا۔ کاکٹھ کالو: بیوقوف، احمق۔

خدا کی ہمت

باعث اس کے متعلق سوچنے تک کی فرصت نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی سی ایس پی بننے کی تیاری میں غرق تھا۔ وہ سلمان کے لیے صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور واپس آکر اس قدر احسان قبول کیا کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی بہن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اس کی طرف آ جاتی۔ مگر وہ ہم اس طرح کہ ناک پر رومال رکھ کر دروازے کی دہلیز ہی پر ٹھنک جاتی۔ کھڑے کھڑے اشاروں سے اس کی طبیعت کا حال پوچھتی اور اپنے قدموں واپس چلی جاتی۔

ایک ماں کی مانتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔ وہ اس کے سر ہانے بیٹھی رہتی اور اکثر سارا رات آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوا دیتی۔ اس کا سرد ہاتی۔ بخار کی شدت ہوتی تو اس کے تلوے سہلاتی۔ پیشانی پر کپڑا بھگو کر رکھتی۔ ہر طرح اسے تسلی دیتی۔ کبھی وہ اپنی بے کسی پر بے قرار ہو کر آب دیدہ ہو جاتا تو وہ اسے سمجھاتی اور سمجھاتے سمجھاتے خود ہم رونے لگتی۔

\*\*\*

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ گھر کے سارے اخراجات قرض پر چل رہے تھے۔ سارا کے لیے دوا بھی قرض پر آرہی تھی۔

وہ موسمی کارس پینا چاہتا تھا۔ طویل علالت نے اسے بچوں کی طرح ضدی بنا دیا تھا۔ وہ بار بار موسمیایاں منگوانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ ماں پہلے تو تاملتی رہی پھر اپنی مجبوری پر پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

سلمان کو اپنی غلطی کا اچانک شدت کے ساتھ احساس ہوا۔

اس کے کمرے کے سامنے صحن تھا اور صحن کے مشرقی کونے پر اس کے مٹھلے بھائی کا کمرہ تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے صاف نظر آتا تھا۔

لینے لینے سلمان کی نظر مٹھلے بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دیکھا، کمرے میں میز پر بہت سے تازہ پھل رکھے تھے اور اس کا بھائی اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ اپنے ایک بیمار افسر کی عیادت کے لیے اسپتال جا رہا تھا اور یہ پھل، جن میں سرخ سرخ موسمیایاں شامل تھیں، اسے پیش کرنے کے لیے بطور خاص منگوائے گئے تھے۔ سلمان نے سب کچھ خاموش

نہاں سے دیکھا اور کسی اندرونی چوٹ سے بلبل کر رہ گیا۔

ایک رات بخار کی شدت سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کا بدن انگلیٹھی کی طرح سلگ رہا تھا۔ بخار کی شدت سے حلق خشک پڑ گیا تھا۔ اس نے کئی بار ماں کو اپنی خفیف آواز سے پکارا مگر ماں کو بھی بخار تھا کوئی تشویش ناک مرض نہ تھا۔ مسلسل شب بیداری سے پیار پڑ گئی تھی اور رات اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ اسے کانوں کا ن خبر نہ ہوئی۔ سلمان کچھ دیر تک آوازیں نہ سنا سکا۔ صبح کے پلنگ سے نیچے اتر اگھر پر سناٹا چھایا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ڈوبتے چاند کی زرد چاندنی چھت کی منڈیر پر جھلک رہی تھی۔ ہوا سرد تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سلمان باہر نکلا۔ وہ دیوار کے سہارے چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہونے سے محن عبور کیا۔ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے ہانپنے لگا جہاں کھانے کی رقمی کمرے میں دھندلی روشنی تھی اور اس روشنی میں اس نے میز پر رکھا ہوا تھرماس دیکھ لیا۔

چند لمحوں تک وہ دروازے کا سہارا لیے ہانپتا رہا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ریگ رہے اور حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے چلتا ہوا میز پر پہنچا۔ تھرماس کھولا۔ اس میں سے برف کا ایک ٹکڑا نکلا۔ اچانک اس کے پیر زور زور سے ہانپنے لگا۔ تھرماس کے سامنے کالے کالے پردے لہرائے گئے۔ وہ چکر اکر وہیں گر پڑا۔ اسے نہیں معلوم وہ کب تک کمرے کے سرد فرش پر پڑا رہا۔ کب وہ اپنے بستر پر آیا؟ کون اٹھ آیا؟ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

ہوش آیا تو سب سے پہلی آواز جو اس نے سنی وہ اس کی بھالہ کی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ نا تھی۔

”تھرماس گر کر بالکل تباہ ہو گیا۔ پچھلے ہی مہینے تو خرید تھا۔“

اس کے شوہر نے صرف اس قدر کہا۔ ”ڈارلنگ! تم اس طرح پریشان ہو کر اپنی صحت خراب کر لی۔ میں دوسرا تھرماس لے آؤں گا۔“

مگر وہ دیر تک غصے سے بڑبڑاتی رہی اور سلمان بستر پر پڑا اس کی آواز سنتا رہا۔ یہ اور ایسے ہی غم غم اس نے پیاری کے دنوں میں اپنے دل پر کھائے اور ہر بار دکھ سے ٹپ کر رہ گیا۔

دیکھو، جلد، خفیف، کمزور۔

مسلمان کو نیاز سے نفرت تھی اور اپنے بہن بھائیوں سے بھی۔ نیاز نے اسے اس لیے نظر سے دیکھا تھا کہ وہ قیمتی سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔ شان دار سوٹ نہیں پہنے تھا۔ اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ مظلوم الحال انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی سنوارنا چاہتا تھا۔ اور اسے بہن بھائی اس لیے اسے حقیر اور کم تر سمجھتے تھے کہ اس نے کوئی عہدہ کوئی منصب ہتھیلانے ایش نہیں کی۔ بینک بیلنس کیوں نہ بڑھایا؟ ان کے نزدیک عوام کی خدمت محض مسخر اپن تھا، راترات تھی۔ اس لیے کہ وہ بلندی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں مطلق احساس نہ تھا کہ کروڑوں بچے بھوکے، کپڑے مکڑوں کی مانند ریگ رہے ہیں جو ان ہی کی طرح انسان ہیں۔

کی خوشیاں اور غم ان سے مختلف نہیں ہیں۔ پیاری کے دنوں میں مسلمان مسلسل ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور ان کا نفسیاتی رد عمل یہ ہوا کہ وہ ماندہ اور پریشان حال انسانوں کا دکھ درد بھول کر اپنے بہن بھائیوں سے انتقام لینے کی سوچنے لگا۔ لپٹا دھکے مارنے کا پروگرام بنانے لگا۔ وہ اپنی حقیر اور ذلت کا ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔



محنت یاب ہونے کے بعد مسلمان نے فلک پیا کے ہیڈ کو اڑ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور یہ بے لگا کہ وہ کیا کرے؟

انہیں دنوں ماں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ شادی کر لے۔ ماں کی خواہش تھی کہ اس کی لڑکی میں وہ اپنا گھر بسالے۔

یہ پروگرام دراصل اس کے باپ کا تھا اور بیوی کے ذریعے اس نے مسلمان تک پہنچایا تھا۔ مطلقے کے ایک عام باپ کی طرح اسے بھی مسلمان کو راہ راست پر لانے کا ایک ہی مجرب نسخہ مل گیا اور وہ شادی کا پروگرام تھا۔ مسلمان نے صاف انکار کر دیا۔

مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ چچانے کی طرح اسے پالا پوسا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپیہ نقد دے گا اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دلوادے

لعل: جہاں، خستہ حال۔ مسخر اپن: دل بگ۔ پس ماندہ: غریب۔ حقیر: بے عزتی۔



باپ فجر کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ واپسی پر مسلمان کے کمرے میں بھی آتا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ جھک کر مسلمان کی پیشانی چھوتا۔ کلائی تھام کر نبض دیکھتا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ اس کے سر ہانے کھڑا زیر لب کوئی دعا پڑھتا رہتا۔

جب بھی وہ آتا، مسلمان کی آنکھ کھل جاتی۔ اس وقت اسے اپنے باپ کے چہرے پر ایک مقدس نور نظر آتا۔ اس کی سفید ڈاڑھی آہستہ آہستہ حرکت کرتی اور آنکھوں میں بے بسی اور مظلومیت جھلکتی۔

مسلمان خاموش لیٹا سوچتا رہتا کہ یہ بوڑھا کس قدر بد قسمت ہے۔ اس نے اپنی ساری جوانی موٹی موٹی فائلوں میں سرکھپاتے گزار دی۔ افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دس در بارہ بارہ گھنٹے دفتر میں کائے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا پہنا اور روکھا سوکھا کھایا۔ نہ کبھی بالا خانے پر جانے کے اسے توفیق ہوئی نہ اسے خانے سے نکلنے دیکھا گیا۔ نہ کسی کی باگی چتون نے اسے گھاس کیا اور نہ سہانی راتوں میں اس کی جوانی نے انگڑائیاں لیں۔ اس نے زائد سے زائد مشقت کی۔ کم سے کم خرچ کیا اور زائد سے زائد پس انداز کیا۔ اور یہ سب کچھ اس نے صرف اس لیے کیا کہ اس کی اولاد مستقبل روشن ہو جائے۔

وہ ہزاروں روپے جو اس نے اپنی خوشیاں نیلام کر کے کمائے تھے، اولاد کی تعلیم پر لگا دیے۔ اور اس کی تعلیم یافتہ اولاد اور ان پڑھ نیاز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مسلمان سوچا کرتا کہ یہ بد قسمت بوڑھا کس قدر احمق ہے۔ اس سے زیادہ سمجھ دار تو نیاز کا باپ تھا جس نے اسے کوئی تعلیم نہیں دلائی۔ اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اس پر صرف نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اس سم سم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اس کے بہن بھائی سرگرداں تھے۔ لیکن نیاز نے اس سم سم کا سراغ لگا لیا تھا۔ ان پڑھ کبابیا تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا۔ کوٹھی، کار اور بینک بیلنس۔ جیت کے تینوں کارڈ اس کے پاس تھے۔ وہ بڑا آدمی بن چکا تھا۔ اور وہ تینوں ابھی تک جیت کے ان تینوں کارڈوں کے خواب ہی دیکھ رہے تھے۔

زیر لب: منہ ہی منہ میں۔ بالا خانہ: درختی کا کھڑا۔ خانہ: شراب خانہ۔ باگی چتون: ترجمہ نظر۔ پس انداز: بچت۔ گاڑھی کمائی: منہ سے حاصل کی گئی دولت۔ سرگرداں: مصروف۔

گاہ۔ یہ سن کر سلمان کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

اس نے سوچا زندگی میں آگے بڑھنے اور شادمانی و کامرانی حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ صرف چور دروازے سے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے اور صوبائی اسمبلی کے ممبر کے پاس اس چور دروازے کی کنجی ضرور ہوگی۔ چنانچہ چند روز تک سوچ بچار کرنے کے بعد وہ شادی پر رضامند ہو گیا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

اس کے باپ نے روپیہ قرض لے کر خرچ کیا۔ اس لیے کہ وہ صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر سیدھی بنے جا رہا تھا۔

(1)

گلابی جاڑوں کی غبار آلود دوپہر تھی۔ نوشا ٹرام کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اس وقت بلائی تھا۔ چکر م کی ڈیوٹی استاد پیڈرو نے نمائش پر لگادی تھی اور نوشا کو پوکر کی ٹیم میں شامل کر لیا۔ چار بجے اسے پوکر سے صدر کے ایک ایرانی چائے خانے میں ملنا تھا۔ ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ گزارنے کے لیے اس نے سوچا ٹرام پر سیٹاڑی تک ایک چکر ہی لگالیا جائے۔ ممکن ہے کوئی شکار لے جائے۔

اب وہ کبھی کبھار اکیلے بھی کام کر جاتا تھا۔ حالانکہ استاد پیڈرو کی سخت ہدایت تھی کہ بغیر ٹیم لڑائی نہ دکھائی جائے۔ اس میں خطرہ بہت تھا۔ مگر اب نوشا جیب تراشنے کے فن میں اچھا تھا اور اس قدر نڈر ہو گیا تھا کہ سیکڑوں کے ہجوم میں جیب صاف کر دیتا۔

نوشا خاصی دیر سے ٹرام کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر کوئی ٹرام آتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اکتا کر وہ ہائی وے پر راہ گیر تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ دکانوں پر سناٹا تھا۔ دور کشاوالے فٹ پاتھ کے ہائی وے پر راہ گیر تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ فضا بڑی بوجھل تھی۔ نوشا نے پتلون کی جیبوں میں ڈال لیے اور ہولے ہولے سیٹی بجاتا ہوا بلا مقصد بند روڈ پر چلنے لگا۔ کچھ دور تک وہ اپنی دھن لگا کر اسی طرح فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ ایک موڑ پر کسی گداگر نے صدا لگائی۔

”کیا بابا، اللہ کے نام پر اس محتاج کو کچھ دیتا جا۔“

جس نے یہی ساری کاموس کارگیری مہارت، یہاں مرد جیب تراشنے کی مہارت ہے۔ مجھنا: تجربہ کار ہوتا۔

شادی میں شہر کے اعلیٰ حکام اور معززین کے علاوہ تین وزیر بھی شریک ہوئے۔ لہذا تمام مقامی اخبارات میں شادی کی تقریب کی تصاویر بھی شائع ہوئیں جن میں سلمان کے بجائے وزر دو لکھا معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ ایک اخبار نے، جسے سرکاری اشتہارات کی اشد ضرورت تھی، دو لکھا بھی نکال دیا اور تصویر میں صرف وزیروں ہی کو رہنے دیا جس میں وزیر اطلاعات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا تھا۔

سلمان کو شب عروسی ہی پر اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیوی سیدھی سادھی گھریلو لڑکی ہے۔ اگر نے میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔ اس کا ذہن گویا گیلی مٹی تھا جسے وہ کبھار کی طرح جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتا تھا۔

وہ اس کی توقع سے زیادہ دل کش اور معصوم نکلی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے گھائے کا سودا نہیں کیا۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار روپے نقد ملے تھے اور ملازمت کے لیے چچا سر نے حسب وعدہ کوشش شروع کر دی تھی۔

شادی کے تیسرے ہی ہفتے سر کا خط آیا کہ فوراً کراچی پہنچو۔ ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سلمان نے بیوی کو گھر پر چھوڑا اور اسی روز پہلی ٹرین سے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

شادمانی و کامرانی: خوشی و کامیابی۔ سیدھی: دلچسپ اور دلہا کے باپ آپس میں سہمی ہوتے ہیں۔ شہ عروسی: شادی کی پہلی رات۔

”آٹک ہے۔“

”یہ آٹک کیا بیماری ہوتی ہے؟“

”یہ رنڈی بازوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے۔“

نوشا نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یار تو نے تو کبھی ایسی حرکت کی نہیں۔“

”میں نے حکیم جی سے یہی بات کہی تو وہ بولے تمہارے باپ کو یہ مرض ہو گا۔ یہ خاندانی

لاہوتی ہے۔ اکثر مریضوں کو ورثے میں ملتی ہے۔“

”تو پھر تم نے کچھ علاج و لاج کروایا؟“

مری ہوئی لاش میں سے پرانا راجہ جاگ اٹھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”یار تو بھی

رات ہے۔ ابے علاج کوئی پھوٹ میں ہوتا ہے۔ اس میں رقم لگتی ہے۔“

نوشا سے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔ ”یہ تو بتاؤ آج کل رہتے

ہو؟“

”ابنا بھی کوئی گھریا ہے۔ جہاں جی چاہا پڑ رہا۔ کوئی ہفتہ بھر سے تو یہیں پڑا ہوں۔“ لمحہ بھر کے

اجہ خاموش رہا۔ ”مگر یہ تو بتاؤ آج کل کیا کر رہا ہے؟ ویسے تو تیرے بڑے ٹھاٹھ دکھائی دیتے

بڑی لائٹ مار رہا ہے۔ کہیں نوکری دوکری کر لی؟“

نوشا صاف بات نہ بتا سکا۔ ”ہاں یار ایک جگہ نوکری ہی کر لی ہے۔“

”مرے میں گزر بسر ہوتی ہے؟“

”بالکل۔“ نوشا نے مختصر جواب دیا۔

راجہ نے اکتے ہوئے کہا۔ ”یار نوشا! تو مجھے ایک میسا کھی دلوادے۔“ اس نے پاس پڑے

ڈپٹے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس سالے سے دو قدم چلنا مصیبت ہو جاتا ہے۔ میں نے

ناکے لیے دس روپے جمع کئے تھے۔ کوئی سالا چوٹھا سوتے میں نکال لے گیا۔“ راجہ نے اسے

گلا دی۔ دل گرفتہ ہو کر بولا۔ ”نوشا! تو مجھے میسا کھی ضرور دلوادے۔ تیرا بہت بڑا احسان

مجھے بہت تکلیف ہے۔“

”یار اس میں احسان کی کوئی بات ہے۔“ نوشا نے اس کی دل جوئی کی۔ ”میں جلد ہی تجھے

ایک نئی بیماری۔ پھوٹ۔ مفت۔ دل گرفتہ۔ برنجیدہ۔

نوشا اس صدا پر توجہ دینے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ آواز کچھ نارس اور جانی پہچانی سی ہے۔ وہ چلتے چلتے ٹھنکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ایک دیوار کے سائے میں فٹ پاتھ پر ایک گداگر سکر اسکر لیا پڑا ہے۔ اس کے جسم پر بہت بوسیدہ لباس تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ داہنا ہاتھ خیرات کے لیے آگے بڑھا تھا۔

نوشا نے غور سے گداگر کے چہرے کو دیکھا۔ ذہن کو ایسا شدید جھٹکا لگا کہ وہ تکلیف سے کانپ اٹھا۔ یہ راجہ تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ سکر اسکر لیا جسم کسی سڑتی ہوئی لاش کی طرح گھناؤنا نظر آرہا تھا۔ نوشا نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا کر کڑا ہو گیا۔ قدموں کی آہٹ پا کر راجہ نے ایک دردناک صدا بلند کی۔ اس کے بدن پر کھیاں بجنھنا رہی تھیں۔ جگہ جگہ پھنسیاں تھیں جن سے رطوبت بہہ رہی تھی۔

نوشا نے آہستہ سے آواز دی۔ ”راجہ!“

راجہ نے آنکھیں کھول دیں اور نوشا کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ خوشی سے جچ پڑا۔ ”نوشا!“ وہ ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا۔

نوشا نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”یار! یہ تیری کیا حالت ہو گئی؟“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس کی بات سے راجہ کو دکھ پہنچا۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے مسرت کی جو رمتی ابھری

تھی اس نے فوراً دم توڑ دیا۔ وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔

”میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔“ اس کا لہجہ بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ تھا۔ آواز میں لہ

رقت تھی جیسے شدید کرب میں مبتلا ہو۔

نوشا نے کہا۔ ”یار! تو تو اسپتال بھیج دیا گیا تھا وہاں علاج نہیں ہوا؟“

راجہ کے ہونٹوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ ابھری۔ ”اسپتال والوں نے میری ایک ٹانگ کاٹ ڈالا

اور کوڑھیوں کے اسپتال بھیج دیا۔ کئی روز تک وہاں پڑا رہا۔ مگر اسپتال میں جگہ نہیں تھی۔ ایک رو

چوکیداروں نے زبردستی اٹھا کر مجھے ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ جب سے یونہی در بدر کی خاک

چھانتا پھر رہا ہوں۔“

نوشا خاموش بیٹھا رہا۔ راجہ آہستہ آہستہ کہتا رہا۔ ”ایک حکیم جی کو دکھایا تھا۔ وہ کہنے لگے تم



میساکھی دلوادوں گا۔“

نوشا اس وقت توراہ کو خاموشی سے واپس لے آیا۔ مگر اب اس پہ یہ دھن سوار تھی کہ کسی ڈھائی سو روپے میا کئے جائیں تاکہ راجہ کا باقاعدہ علاج ہو سکے۔ چنانچہ پوکر کے ساتھ جب لکڑی کے علاوہ وہ اکیلا بھی کاریگری کے ہاتھ دکھانے لگا اور اس رقم کو استاد پیڑرو سے بدھ رکھا۔

اسے ڈھائی سو روپے کی ضرورت تھی تاکہ راجہ کا علاج کرا سکے۔



نوشا نے میریٹ روڈ سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر کو بھانپا۔ وضع قطع سے وہ دکان دار لگتا تھا۔ اندازہ تھا کہ اس کے پاس لمبی رقم ہے۔ اس نے سوچا اگر داؤں لگ جائے تو آج ہی راجہ کا علاج کی پوری رقم نکل آئے گی۔ رات کے نو بجے تھے۔ سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ راستوں پر بڑھ گیا تھا۔ دوبار نوشا نے اسے گھیرا مگر وہ ہتھے نہیں چڑھا۔ نوشا نے ہمت نہ ہاری۔ برابر اس کا لہڑاہوہ شخص سڑک سے مڑ کر ایک گلی میں گھس گیا۔

گلی سنان تھی اور روشنی کم تھی۔ گلی کشادہ بھی نہ تھی۔ دونوں جانب کئی کئی منزلہ اونچی اونچی نماں تھیں۔ نوشا سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس نے پتلون کی جیب میں پڑا ہوا کال کر آہستہ سے کھول لیا اور جب وہ ایسی جگہ پہنچا جہاں اندھیرا زیادہ تھا نوشا جھپاک سے اس ماننے آکر کھڑا ہو گیا اور کھلا ہوا چاقو سینے پر رکھ کر بولا۔

”جو کچھ جیب میں ہے نکال کر چپ چاپ دے دو۔“

اس نے گھبرا کر نوشا کو دیکھا جو اندھیرے میں بھوتوں کی مانند خوف ناک نظر آرہا تھا۔ اس اٹھ میں کھلا ہوا چاقو تھا جس کی جھلکتی ہوئی نوک عین سینے پر تھی۔ اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس زلف سے منہ پھڑپھڑا کر آواز نہ نکلی۔ نوشا نے حواس باختہ اور خاموش پا کر خود ہی اس کی جیب اس نکال لیا۔

نوشا نے پرس نکال کر اپنی جیب میں رکھا ہی تھا کہ گلی میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ دوسائے ٹیک کی کڑکی سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں نظر آئے۔ دونوں راہ گیر اسی طرف ہتھے۔ نوشا نے اس شخص کا بازو پکڑ کر اندھیرے میں گھسیٹا۔ ڈپٹ کر بولا۔

نوشا: ”کونسا ہے؟“

وہ گھٹنہ بھر تک راجہ کے پاس رہا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا۔ چلتے وقت اس نے راجہ کو ایک روپیہ دیا اور کھانے کے لیے جو کچھ مانگا خرید کر دے دیا۔ راجہ صبح سے بھوکا تھا۔ راجہ سے مل کر نوشا کی طبیعت مکرر ہو گئی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بار بار اسے راجہ کی کسی کا خیال آتا۔ اس نے سوچا راجہ کے لیے اسے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ دوسرے روز وہ پا کے پاس گیا۔ اس دفعہ وہ اس کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے گیا۔

اب وہ اکثر راجہ کے پاس جاتا اور کچھ نہ کچھ اسے دے کر آتا۔ راجہ کے لیے اس نے ایک میساکھی بھی خریدی جس کے سہارے وہ چلنے پھرنے لگا تھا۔ چوہے کی کھال کا سا گھٹاؤ لباس اتروا نیا جوڑا پہنا دیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کہیں رہنے کی جگہ مل جائے تو اس کے ایک حصے میں راجہ رہائش کا بندوبست کر دے۔

سردی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ راجہ رات بھر شبنم میں پڑا بھیگا کرتا اور سردی سے کاہ رہتا۔ رہنے کو مکان تو نہ مل سکا البتہ ایک اونچی عمارت کی دیوار کے ساتھ تریپل ڈال کر نوشا۔ سانبان بنادیا جس کے نیچے راجہ رہنے لگا۔

راجہ کے لیے وہ جو کچھ کر رہا تھا، اس سے نوشا کو بڑی خوشی ہوتی۔ یہ عجیب سی خوشی تھی۔ محسوس ہوتا جیسے اس کی زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔ وہ محض جیب کترا نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ راجہ کی بیماری دور ہو جائے۔

ایک روز وہ راجہ کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ مگر وہ علاج کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور یہ مشورہ دیا کہ اسے کوڑھ ہے۔ کوڑھیوں کے اسپتال لے جاؤ۔ مگر نوشا اسے کسی اسپتال نہ لے گیا۔ اسے خوف تھا کہ جس طرح اسپتال والوں نے ٹانگ کاٹ کر لنگڑا بنادیا اسی طرح اس کے جسم کا کوئی اور حصہ نہ کاٹ دیں۔

ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر وہ راجہ کو ایک حکیم کے پاس لے گیا۔ اس نے دونوں کی ہتھ دھارس بندھائی۔ اس کا خیال تھا کہ راجہ کا مرض لاعلاج نہیں ہے۔ اگر پابندی سے علاج کرایا جائے تو وہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اس علاج کے لیے اس نے ڈھائی سو روپے طلب کئے۔

مکدر: ”تھیں۔ تریپل: ایک مونے کپڑے کی چادر۔ ڈھارس بندھانا: حوصلہ دینا، ہمت بڑھانا۔

زنی تھیں۔ آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے اپنی رفتار سست کر دی اور ایک مکان کی دیوار تک پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ دیوار میں کھڑکی تھی۔ نوشا نے کھڑکی پر ہاتھ رکھا اور امید موموم کے ساتھ ہلکا ہلکا کھڑکی کھل جائے۔

کھڑکی کا ایک پٹ ہاتھ رکھتے ہی کھل گیا۔ وہ اچک کر اس پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ اس نے فوراً لڑکی بند کر دی اور چوٹ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نوشا جس جگہ کھڑا تھا، وہ ایک تنگ غلام گردش تھی۔ غلام گردش جہاں ختم ہوتی تھی وہاں چوٹی سمت لکڑی کا زینہ تھا جس کی سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی تھیں اوپر سے ہلکی ہلکی روشنی ابر ہی تھی جو زرد دھبے کی طرح دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ نوشا دھندلی دھندلی روشنی میں دم بخود رہا۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ وہ منہ کھولے بری طرح ہانپ رہا تھا۔

(۲)

گلی میں ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ پتھریلے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ٹاری تھی اور تیز تیز بجتی ہوئی سیٹیاں چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسی اثناء میں زینے کی لڑکی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی۔ کوئی آہستہ آہستہ چوٹی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ ابھرتی رہی۔ روشنی زینے سے نکل کر غلام گردش کی دیواروں پر پھیلنے لگی۔

بچے دیکھتے زینے پر سایہ ابھرا۔ ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ اس کی مختصر سی ڈاڑھی تھی۔ سر گنجا تھا۔ لموں پر چشمہ تھا۔ وہ گاؤں پہنچے ہوئے تھا۔ اس کے دامن ہاتھ میں شمع دان تھا جس میں موم بتی ٹٹکتی تھی۔ وہ کمر کو ذرا سا خم دے کر چل رہا تھا۔ نوشا بدحواس ہو کر دیوار سے چٹ گیا۔ اس نے کھلا اپنا منہ مٹی سے تھام لیا اور بوڑھے کو سبھی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا۔

بوڑھا زینے سے اتر کر غلام گردش میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جب فاصلہ آدھم گیا تو اس کی نگاہ نوشا پر پڑی۔ وہ رک گیا۔ اس کا ہاتھ آہستہ سے کپکپایا۔ موم بتی کی لوزور موموم، ہلکی سی امید۔ غلام گردش، سرور آمد، گیلری، اسی اثناء میں، اسی دوران، چوٹی، لکڑی کی بتی ہوئی، کو، شعلہ۔

”آواز نکلی تو پورا چاقو اتار دوں گا سینے میں۔“

وہ خوف سے کانپ رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوشا کو گھور رہا تھا۔ دونوں اندھیرے میں ایک دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ چاب گلی کے پتھریلے فرش پر ابھر رہی تھی۔ ان کے جوتے بھاری بھاری لگتے تھے۔ نوشا کو شبہ ہوا کہیں وہ پولیس والے نہ ہوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ کسی قدر گھبرا گیا۔

قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ، قریب اور قریب۔ اچانک نوشا کے کھلے ہوئے چاقو کی زد میں کھڑے ہوئے خوف زدہ آدمی نے حلق سے آواز نکالی۔ یہ آواز اتنی بیٹ ناک تھی کہ تنگ و تاریک گلی کے در و دیوار لرز کر رہ گئے۔ ساتھ ہی وہ چلانے لگا۔

”بچاؤ! بچاؤ۔“

نوشا نے اس کے کھلے ہوئے منہ پر پوری قوت سے مگا مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ مگر سینے کے ساتھ ہی اس نے پھر دہانہ شروع کر دیا۔ اب نوشا کے لیے وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ اس نے اندھیری گلی میں بھاگنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک فلیٹوں کی کھڑکیاں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ گھبرائے ہوئے لوگ بالکونیوں سے نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ بعض نے اونچی آوازوں سے بولنا بھی شروع کر دیا۔

گلی میں داخل ہونے والے دونوں راہ گیر واقعی پولیس والے تھے۔ شور سن کر پہلے تو وہ ٹھکے اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اسی وقت ان کے سامنے ایک سایہ تیزی سے لہرایا۔ کوئی تیز رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ یہ نوشا تھا۔ دونوں نے فوراً اس کا تعاقب شروع کر دیا۔

نوشا کچھ دور تک بھاگتا رہا پھر وہ دامن ہاتھ مڑنے والی گلی میں گھس گیا۔ یہ گلی بھی تاریک تھی۔ اس کے قدموں کی آوازیں گلی کے پتھریلے فرش پر ابھر رہی تھیں۔ وہ گلی میں پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ سے ٹھوکریں کھاتا، لڑکھاتا، سر پٹ بھاگتا رہا۔ اس کی پشت پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کے قدموں کی آہٹ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ دونوں کا ٹیبل زد زور سے سیٹیاں بجا کر خطرے کا اعلان کر رہے تھے۔

دوڑتے دوڑتے نوشا کی سانس پھول گئی۔ قدم ڈمگانے لگے۔ اچانک ایک نئی مصیبت سامنے آگئی۔ اب گلی کے دوسرے کنارے پر بھی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دھندلی روشنی میں انسانی شکلیں نظر

بوڑھے نے شمع دان میز پر رکھ دیا تھا جس میں جلتی ہوئی موم بتی کی لوہولے ہوئے تھر تھرا جی تھی۔ بوڑھا ایک کرسی پر تھکا ہوا سا بیٹھ گیا۔ اس نے نوشا کو برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہانپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ بوڑھے نے میز پر رکھا ہوا ہانپ اٹھایا۔ تمباکو بھری اور اسے سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ اچانک رات کے سنائے میں ایسی آواز ابھری جیسے کوئی رک رک کر راہ لے رہا ہو۔ نوشا نے چونکا ہوا کرکان کھڑے کئے۔ وہ کسی نامعلوم خوف سے لرز اٹھا۔ بوڑھا خاموشی سے اپ پر کش لگاتا رہا اور تمباکو کا تیز بودار دھواں کمرے میں بکھیرتا رہا۔

\*\*\*

کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ سولہ سترہ برس کی ایک سرو قد لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ راکھ جام ادنی شال میں لپیٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بوڑھے کے پاس جا کر گویا ہوئی۔

”اباجا! ابھی تک بجلی نہیں آئی۔ سارے گھر میں اندھیرا ہو رہا ہے۔“

وہ جیسے چونک پڑا۔ ”اوہ بجلی۔ میرا خیال ہے مجھے ڈاکٹر رفیق کے گھر سے ٹیلی فون کر دینا ہے۔“ لمحہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔ ”مگر اب تو ڈاکٹر سو گیا ہو گا۔“

وہ بولی۔ ”آپ تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون ہی کرنے تو گئے تھے۔“

”ہاں گیا تو میں ضرور تھا۔“ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے نوشا کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر ”اللہ“ ”تم، یعنی تم؟ میرا مطلب ہے۔“ وہ ہکھلانے لگا۔ ”اوہو ہو بھی معاف کرنا۔ میں بالکل بھول باقا کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو۔ دیکھو ناظر! یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ان کو گرم گرم دودھ لاکر پلا دو۔ اور ابھی مجھے بھی ایک گرم پیالہ کافی کامل جائے تو کیا بات ہے؟“ وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

نادرہ نے مزید بات چیت نہیں کی۔ کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑی۔ بوڑھے نے جاتے اٹھنے لگا۔ ”کیا تمہاری ماں پر پھر دورہ پڑا ہے؟“

”جی ہاں، مگر اب ان کو نیند آگئی ہے۔“

بوڑھا خاموش ہو گیا اور وہ باہر چلی گئی۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ بوڑھا کسی

سے تھر تھرائی۔ غلام گردش میں بہت سی دھندلی دھندلی پر چھائیاں جھومنے لگیں۔ نوشا نے ایک لمحے کا بھی انتظار نہ کیا۔ جھپٹ کر اس کے سامنے کھلا ہوا چاقو بڑھا کر بولا۔

”آواز نکلی تو پورا چاقو سینے کے اندر ہو گا۔“

بوڑھے نے حیرت زدہ نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ کھلے ہوئے چاقو کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ نہ اس نے جسم کو کوئی حرکت دی اور نہ زبان سے ایک لفظ نکالا۔ نوشا ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ اس کے جس ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اس میں ہلکی سی تھر تھراہٹ تھی۔

بوڑھے نے اس کی گھبراہٹ اور ہاتھ کی تھر تھراہٹ کو محسوس کیا۔ سنبھل کر نرمی سے بولا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ تم یہاں قطعی محفوظ ہو۔“

نوشا کھلا ہوا چاقو تانے اسی طرح کھڑا رہا۔ بوڑھا اسے بڑا عجیب و غریب معلوم ہوا۔ ”ڈرومت۔“ اس دفعہ بوڑھے کا لہجہ صاف اور پراعتماد تھا۔ ”میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھ سے تم اس قدر کیوں ڈر رہے ہو؟ آؤ میرے ساتھ۔“

وہ مڑا۔ لیکن نوشا اس کے ہم راہ جاتے ہوئے جھجکنے لگا۔ البتہ اس نے چاقو نیچے کر لیا تھا۔ بوڑھے نے بڑے مشفقانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ”بھئی تم مجھ سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ آؤ، گھبراؤ مت۔“

اس کے لہجے میں اس قدر نرمی اور اپنائیت تھی کہ نوشا کے قدم خود بخود اٹھ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ زینے کے عین مقابل دروازہ تھا بوڑھا اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نوشا ابھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ یہ مختصر کمرہ تھا۔ اس کے آگے تنگ راستہ تھا۔ دونوں کمرے سے گزر کر باہر آگئے۔ سامنے دروازہ تھا جس کی جھری سے روشنی پھوٹ کر باہر آرہی تھی۔ مگر وہ اس طرف نہیں گیا۔ دوسری طرف مڑ گیا۔ کچھ دور آگے چل کر اس نے ایک دروازہ کھولا۔ نوشا نے دیکھا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ اس میں کتابوں سے بھری ہوئی تین الماریاں تھیں۔ لمبی میز تھی جس پر بہت سی کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔

گہری سوچ میں ڈوب گیا اور آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگانے لگا۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا منہ چمک چمک رہا تھا۔ چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں خوابیدہ خوابیدہ سی معلوم ہو رہی تھیں۔

”نوشا۔“

نادرہ دونوں ہاتھوں میں طشت سنبھالے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ طشت پر دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور کافی کی پیالی تھی۔ اس نے میز پر جھک کر طشت رکھا۔ اس کا چہرہ موم بتی کی زور روشنی کے سامنے آگیا۔ نوشا نے غور سے دیکھا اور سوچنے لگا، لونڈیا زور دار ہے۔ اس کا رنگ سناٹا تھا۔ البتہ خدو خال سبک تھے۔ آنکھیں کنول کی طرح شفاف تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ اس پر ہلکی ہلکی سنجیدگی چھائی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور بڑی بے باکی سے نوشا کو دے دیا۔ وہ جھجکی نہ شرمائی۔

وہ کمرے میں زیادہ دیر نہ رکی۔ نوشا نے دودھ کا گلاس ختم کیا تو اسے اپنے جسم میں کسی قدر تازگی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ رات بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ اسے چنا چاہیے۔ اسی وقت بوڑھے نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے کسی کو قتل کیا ہے؟“

”نہیں۔“ نوشا نے انکار میں گردن ہلائی۔

”چوری؟“ بوڑھے نے دوسرا سوال کیا۔

نوشا نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں“ اور ندامت سے گردن جھکائی۔

بوڑھے نے گہری سانس بھری۔ ذرا دیر کچھ سوچتا رہا پھر گویا ہوا۔ ”تمہاری عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ مگر تم جرائم پیشہ کیسے بن گئے؟“ پھر خود ہی چونک کر اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہیے۔ یہ بات تمہیں خود بھی نہیں معلوم ہوگی۔ تمہیں ابھی بہت سی باتیں نہیں معلوم۔ مثلاً یہ کہ اگر میں تم سے کہوں کہ تم انجینئر، ڈاکٹر، قانون داں، سائنس داں، ماہر تعلیم، مصنف اور مصوّر بن سکتے ہو تو یہ تمہارے لیے بڑی حیرت انگیز بات ہوگی۔“

نوشا کو واقعی اس کی بات پر تعجب ہوا۔ وہ ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ کہتا رہا۔ ”کیا تم اپنی زندگی کی کچھ باتیں بدل سکتے؟“ اس نے رک کر ایک بار پھر اپنا جملہ دہرایا۔ ”کچھ“

خوابیدہ: سوئی ہوئی۔ طشت: بڑی پلیٹ، ٹرے۔ خدو خال: چہرے کے نقوش۔ سبک: باریک۔ بے باکی: جرأت، بہادری۔ ہونق: بے وقوف۔

نادرہ: شعور، عقل، سمجھ۔ بے مکان: سلسل، گاتار۔ اناڑی: تجربہ کار۔

پروفیسر نے مسکرا کر نوشا کو دیکھا۔ ”نوشا یعنی دولہا۔ بھی تمہارا نام تو خوب ہے۔ گو میں اس کا قائل نہیں کہ نام کا اثر کردار پر پڑتا ہے۔ مگر تمہارے نام میں بڑی راجائیت ہے۔ غالب کی ریت بھی مرزا نوشہ تھی۔ تمہیں تو شاعر ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جس نے یہ نام رکھا ہوگا بالآخر ضرور شاعرانہ ہوگا۔“ کہتے کہتے وہ رک گیا۔ حسب معمول چونک کر بولا۔

”بھی معاف کرنا۔ میں ذرا بہک گیا تھا۔ ہمارے ملک میں لوگوں کو ناموں کی معنویت کا اتنا ادراک کہاں ہے۔ سچ پوچھو تو اتنا شعور کہیں نہیں ہوتا۔ ورنہ ایک اچھے بھلے انگریز ادیب کا نام مسٹر لک ڈائر نہ ہوتا۔ ڈیرک وائر تم جانتے ہو۔ اس کا مطلب ہے پانی پیو۔ لا حول ولا قوۃ، کیا مسخراپن یہ بھی بھلا کوئی نام ہوا۔“

وہ بے مکان بولتا جا رہا تھا۔ نوشا خاموش بیٹھا اس کا منہ تنک رہا تھا۔ پروفیسر کی باتیں اس کی سمجھ مشکل سے دس فی صد آرہی تھیں۔ وہ بہت جلد آگیا گیا۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں جمائی ہار اٹھائی۔ پروفیسر نے نوشا کی عدم دلچسپی اور آگاہی کو محسوس کیا۔

”اُوہو ہو تم کو نیند آرہی ہے۔ تم کو اب سو جانا چاہیے۔“

نوشا نے فوراً کہا۔ ”میں اب جاؤں گا۔“

”رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ کیا اس وقت تمہارا جانا مناسب ہوگا؟“

”میں چلا جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”تم مجھ سے آئندہ ضرور ملنا۔ تم ابھی عادی مجرم نہیں بنے ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب تم باپا تو تانے کھڑے تھے تو تمہارا ہاتھ کاپ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت اندازہ لگالیا تھا کہ تم ابھی لاکو۔“ لکھ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔

”کیا تم کبھی جیل بھی گئے ہو؟“

نوشاد روزانہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی استاد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”کیوں بے تواب تک کہاں تھا؟“

نوشاد نے آہستہ سے کہا۔ ”سینما چلا گیا تھا۔“

”تو استاد اللہ رکھا کے علاقے میں کیوں گیا تھا؟ میں نے ہزار دفعہ کہا کہ بولٹن مارکیٹ کے رانگلانہ اپنا نہیں ہے۔ پر تم تو سالوں اپنی ماں کے یار ہو۔ ابے تو اپنی باندگی دکھانے کھار اور کہا تھا؟ استاد اللہ رکھا کے کارنگر تم سے پتلا مومتے ہیں۔ سالو! تم خواہ مخواہ دلوں میں پھیر ڈالو!۔“ استاد پیڑرو نے اسے تنکیھی نظروں سے دیکھا۔ ”لانکال جھمکوں کی رانی۔“ گرہ کٹی کی رقم لے یہ استاد پیڑرو کی اپنی مخصوص اصطلاح تھی۔

نوشاد پہلے ٹوسٹ پٹایا کہ ضرور کچھ گول مال ہے۔ استاد کو کہیں سے کچھ سراغ مل گیا ہے۔ مگر وہ استاد کو دینا نہ چاہتا تھا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں تو اس طرف گیا بھی نہیں۔ آغا پٹلی ہو گا۔“

آغا پٹلی کو نے میں سسڑا سسڑا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے کچھوے کی طرح اپنی سوکھی بے ڈول لانکال کر نوشاد کو دیکھا اور ناک میں منمننا کر بولا۔

”اناں دیکھ رہے ہو استاد! سالو! خواہ مخواہ کے لیے مجھ سے فلاٹھین کر رہا ہے۔ وہ رانچاں دوں گا کہ نکل پڑے گی۔ میں تو باہر نکلا ہی نہیں۔ دوپہر سے بخار میں پڑا بھن رہا ہوں اور یہ سالو اپنی اڑا۔“

استاد پیڑرو نے اسے فوراً اڑا۔ ”بند کر اپنا لیکچر۔ بہت کہہ چکا۔“

پھر وہ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے اجنبی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیوں جی! تم نے خود دیکھا تھا۔“ اس نے نوشاد کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بولا۔ ”ہاں جی، یہی لوٹا تھا۔ شام سے شکار کے پیچھے منڈلا رہا تھا۔“

نوشاد نے اس عرصے میں پہلی بار اسے دیکھا۔ وہ دہرے بدن کا مضبوط نوجوان تھا اور گردن کے بڑی بے باکی سے بول رہا تھا۔ ”استاد! میں نے کئی بار اسے اشارہ بھی کیا کہ یہ اپنا گاہک ہے۔“

بارٹوپ ٹاپ مارا تو یہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔

نوشاد نے پتلا مومتے ہیں: مراد کم ہنر مند نہیں ہیں۔ پھیر: مجھڑا فرق: فلاٹھین کر رہا ہے: مراد پکڑے رہا ہے۔

نوشاد نے بڑے سادگی سے جواب دیا۔ ”ہاں۔“

پروفیسر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ ”تم جیل بھی جا چکے ہو۔ پھر بھی اناڑی ہو۔ سلسلے کی کوئی درمیانی کڑی ضرور غائب ہے۔ میرا سارا تجزیہ غلط ہو گیا۔“ اس نے حیرت زدہ نظروں سے نوشاد کو دیکھا۔ ”بہر حال تم مجھ سے ضرور ملنا۔ آؤ میں تم کو دروازے تک پہنچا دوں۔“

اس نے شمع دان اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ دونوں زینے سے اتر کر نیچے آئے اور غلام گردش عبور کر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ نوشاد نے دروازے سے نکلے ہوئے مڑ کر پروفیسر کو دیکھا۔ موم بنی کی روشنی میں وہ سرکس کے مسخرے کی طرح اول جلول نظر آ رہا تھا۔

نوشاد باہر گلی میں پہنچ کر سوچنے لگا۔ یار کس او اندھی کھوپڑی سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ سالانہ جانے کوئی ایران توران کی ہانک رہا تھا۔ کہنے لگا یہ کام چھوڑ دو۔ پھر کیا کرو؟ جھک مارو۔ کیا کیا اڑا رہا تھا۔ انجینئر، ڈاکٹر، قانون داں اور نہ جانے کیا ناپ شاپ بنا رہا تھا۔ بھی حد ہو گئی۔ بھلا میں کیسے انجینئر یا ڈاکٹر بن سکتا ہوں۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے اور اپنی قسمت میں تو ہاتھ کی صفائی دکھانا لکھی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے اس نے جیب سے پرس نکال کر دیکھا۔ اس میں پونے دو سو سے اوپر روپے تھے۔ خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ دل ہی دل میں کہا۔ یار اپنے کام کی بھی کیا بات ہے۔ منٹوں میں چاندی نکلتی ہے۔ استاد پیڑرو سچ کہتا ہے یہ کچی کیسیا ہے۔ بس ذرا اسی ہاتھ کی صفائی اور تھوڑی سی کاری گری چاہئے۔

وہ اسی طرح سوچتا ہوا آہستہ آہستہ اڈے کی طرف چل دیا۔

(۳)

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ استاد پیڑرو کی محفل جی ہوئی تھی۔ وہ کسی مہنت کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ چاروں طرف جیب کترے حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ کمرے میں تباہ کا دھواں بھرا تھا۔ ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔

اول جلول: بے ڈھکا، بے وقوف۔ ایران توران کرنا: مانوس کرنا، فلسفہ بھارنا۔ انپ شاپ: اونٹ ہانگ۔ باچھیں کھلنا: بہت خوش ہونا۔ چاندی نکلتا: مراد لوٹا کرے حاصل ہونا، عیش ہونا۔ عمل: مہنت، جوجی، سادھوؤں کا سر دار۔

مدنی

میرے سے ٹرکیں کرنے چلا تھا۔ تیرے جیسے نہ جانے کتنے لمڑے ٹانگ کے نیچے سے بچے ہیں۔ ۳۰ سال سے اوپر ہو گئے یہ کام کرتے ہوئے۔ جھک نہیں ماری۔ ”استاد پیڑرو نے کان پکڑ کر گردن ہلائی۔ ”ایسے استاد کا شاگرد ہوں کہ ولایت تک اس کی تصویریں کھینچ کر استاد پیڑرو کچھ دیریوں ہی لیکچر دیتا رہا۔ پھر اس نے چکر م سے کہا۔ ”ڈراما تو کتنی رقم ہے؟“

چکر م نے مڑے مڑے نوٹوں کو اٹھا کر گنا۔ استاد کو بتایا۔ ”ایک سو تراسی ہیں۔“ استاد پیڑرو نے اللہ رکھا کے آدمی سے پوچھا۔ ”کیوں جی! تمہارا حساب کیا کہتا ہے۔ ٹھیک؟“

”ہاں جی بس اتنا ہی ہمارا اندازہ تھا۔“

”لو یہ سنبھالو اپنی امانت۔“

استاد نے نوٹ چکر م سے لے کر اسے دے دیے۔ اس نے نوٹ لے کر گئے اور اس میں سے ایک کھال کر استاد کے آگے ڈال کر بولا۔ ”یہ ۳۶ روپے ہیں۔ ۲۵ فی صدی کے حساب سے اتنا ہی مختانا بنتا ہے۔ اگر تمہارا ریٹ کچھ اور ہے تو بتادو۔“

”نہیں جی، یہی ٹھیک ہے۔“

واٹھ کر جانے لگا تو پیڑرو نے کہا۔ ”استاد اللہ رکھا سے میرا سلام کہنا۔ ان سے کہہ دیجو لمڑا لڑائی ہے۔ قاعدہ قانون نہیں جانتا۔ ویسے میں اس کی اچھی طرح کندی کر دوں گا۔“

اللہ رکھا کا آدمی چلا گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ نوشا کی سٹی گم تھی۔ اب اس کی شامت آنے لگی وہی ہوا۔ استاد پیڑرو نے اس کو ذبح کرنے والی تیز نظروں سے دیکھا۔ گالیاں دے کر بولا۔ ”سارے توجھے چک پھریاں دیتا ہے۔ حرام کے ختم نے ناک کٹوا دی۔ اللہ رکھا کہے گا۔ پیڑرو ہائے کیا الم غلم شاگرد رکھ چھوڑے ہیں۔ اس جھپ سٹ سے اپنی یوں ہی لگتی ہے۔ شہر کے بکواسے پر یہ بات پہنچ جائے گی۔ تف ہے سالی ایسی استاد پر۔ ساری عزت کر کری ہو گئی۔“

نوشا مڑموں کی طرح سر جھکائے سہا ہوا بیٹھا رہا۔ استاد غصے سے چیختا رہا۔ پھر اس نے قادر سے

استاد پیڑرو مسکرانے لگا۔ ”یار تو بھی کیا بات کر رہا ہے۔ اسے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ یہ سالہا سمجھے گا استاد کی یہ گر۔ ابھی تو۔۔۔“ استاد نے ایک گندی گالی دی۔

”وہ تو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ ابھی اتناڑی ہے۔“

نوشا ہٹ دھری پر اتر آیا۔ ”اماں بے فضول میں میرے اوپر الزام لگا رہے ہو۔ میں نے تو تم کو دیکھا بھی نہیں۔“ وہ خوشخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ اسی وقت استاد نے زمانے کی گالی دے کر کہا۔

”اب چپکا بھی رہے گا یا جیجی جی کئے جائے گا۔ تیری ساری کھکشاں کا ابھی پتہ چل جاتا ہے۔“

نوشا نے چوری کا ہٹا پھینک دیا تھا اور نوٹ چتلون کی موری میں سرخ کر کے چھپالے تھے۔ اسے اطمینان تھا کہ وہاں تک کسی کی نظر نہ جائے گی۔ لہذا اس نے چپک کر کہا۔ ”جھوٹ بول رہا ہوں تو میری تلاشی لے لو۔“

استاد نے گردن ہلا کر کہا۔ ”کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں تجھے بالکل ملوہ چھوڑ دوں گا۔“ اس نے چکر م کو اشارہ کیا۔ ”دیکھ بے ناداں اسی کے پاس ہے یہ کہیں رکھ آیا۔ ذرا انٹی پر چڑھا کے۔ یہ بڑا حرامی دکھے ہے۔“

چکر م نے دونوں ہاتھ پکڑ کے نوشا کو کھڑا کر دیا۔ استاد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ہاتھ اوپر کر۔“ نوشا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ چکر م تلاشی لینے لگا۔

استاد بلی کی طرح تیز نظروں سے نوشا کو گھورتا رہا۔ چکر م نے ہر جگہ ٹٹولا۔ جسم کا ایک ایک گوشہ کریدا۔ مگر تم برآمد نہ ہوئی۔ ایک بار وہ اپنے ہاتھوں کو جھپکی دیتا ہوا اوپر سے نیچے تک آیا تو استاد کی تجربہ کار نظر نے تازہ لیا کہ جب چکر م کا ہاتھ پیروں پر آیا تو نوشا زار اسباب کا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

”ڈراما میرے کئے تو آئیو۔“

نوشا اس کے پاس چلا گیا۔ استاد کا ہاتھ سیدھا چتلون کی موری پر پہنچا۔ اس نے انگلی ڈال کر نوٹوں کا قلیتہ نکالا اور بے نیازی سے اٹھا کر سامنے ڈال دیا۔ سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ نوشا کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ استاد پیڑرو نے تہر آلود نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔

نوشا مختانا: معاوضہ۔ کندی کرنا: مارنا پٹنا۔ سٹی گم ہونا: پریشان ہونا۔ چک پھیریاں: دھوکا، فریب۔ الم غلم: فضول، بے کار۔ نصرت کر کری ہونا: بے عزتی ہونا۔

ہٹ دھری: ضد۔ ملوہ: مرد آلود۔ بدکنا: ڈور کھانا۔

نہا کی ہنسی

کہا۔ ”ابے او قادر! لگا اس حرام کے جنے کو دو ٹھونکے۔“

قادر نے اٹھ کر نوشا کے ایک ہی ٹھونکا لگایا تھا کہ وہ تکلیف سے بلبل کر چیخنے لگا استاد نے قادر کو لٹکارا۔ ”ابے ذرا دبا کے۔ کیا زخوں کے سے ہاتھ چلایا ہے؟ یہ سالہا تو یوں ہی قتل چلایا ہے۔“

قادر نے کودنے کے سے انداز میں دونوں بازوؤں کو تولا۔ پہلے دانے ہاتھ کو ذرا سا تر چھلکا اور کہنی کی ہڈی کی بھرپور ضرب لگائی۔ نوشا کراہتا ہوا دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ قادر آگے بڑھا اور جھپٹ کر زور کا ٹھونکا لگایا۔ ایک، دو، تین۔ وہ تابڑ توڑ ٹھونکنے لگا تا چلا گیا۔ قادر بڑا کڑیل جوان تھا۔

بھاری بھر کم کسرتی جسم تھا۔ ایک ایک بازو کا وزن پانچ سیر یوں میں تھا۔ پنڈلیاں اور پیر لوہا لٹکتے۔ نوشا لڑکھڑا کر دھڑام سے فرش پر گر اور زور زور سے چیخنے چلانے لگا۔ پھر اس کی آواز مٹ

سے غیس غیس کر کے نکلنے لگی۔ اس کا منہ پھٹا ہوا تھا۔ چہرہ وحشت ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح فرش پر لوٹنے لگا۔

نہ جانے وہ دیو کا دیو قادر کب تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا کہ اسی اثناء میں استاد کی آواز ابھری۔ ”بس بے۔ سالے کو ذرا سانس تو لینے دے۔“

قادر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ گینڈے کی طرح ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے سارے جیب کترے دم بخود تھے۔ نوشا ابھی تک فرش پر پڑ

رہا تھا۔ استاد پیڑرو نے ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری پر رکھ لی اور جسم کو ہولے ہولے حرکت دینے لگا۔ سامنے دیوار پر اس کا مہیب سایہ جھوم رہا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ ہر شخص خاموش قلبہ

کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ نوشا تڑپتے تڑپتے تھک کر شل ہو گیا اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ کمرے کے سکوت میں اس کی بو جھل سانسوں کی آواز صاف سنائی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد استاد کی بھاری بھر کم آواز ابھری۔ وہ نوشا سے کہہ رہا تھا۔ ”اٹھ کے بیٹھ۔ بہت ہو چکا خرو۔ نہیں تو سالے دو چار اور لگواؤں گا۔ جو کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔“

نوشا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھر کر منہ پر آئے تھے۔ وہ منہ بسور بسور کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ مگر استاد پیڑرو اس کی حالت زار سے ذرا

زحما: بھول لیل: غور: کڑیل جوان: بھرپور جوان: کسرتی جسم: مضبوط گھما ہوا جسم: پانچ سیر: مرلو بہت وزنی: لوہا لٹکتا: مروہ: مضبوط: دم بخود: خاموش: مہیب: بے لک: خوفناک: شل ہو جانا: بے حس ہو جانا: کسرتی: حالت زار: بری حالت: ذرا

ہانڈ نہ ہوا۔ مگر چکر کم کو اشارہ کیا۔

سالے کو تھوڑا سا زندہ طلسمات پلا۔ پھر اس کو چٹا کر۔“

چکر کم کمرے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ قادر کے کی شیشی لیے ہوئے کمرے میں ہوا۔ اس میں زور زور د پیشاب بھرا تھا۔ شیشی دیکھتے ہی نوشا دہائی دینے لگا۔

”استاد! اللہ کے لیے چھوڑ دو۔ مری جاؤں گا۔“

”اب غلطی کروں تو جان سے مار دیتا۔“

وہ گڑگڑاتا رہا۔ فریاد کرتا رہا۔ مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ استاد پیڑرو کی ہدایت پر ایک جیب دکان کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو دبوچ لیا۔ دوسرے نے اس کا منہ چیر دیا۔

نے قادر کے کے کئی قطرے اس کے حلق میں ڈال دیئے۔

نوشا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ وہ زور زور سے ابکائیاں لے رہا تھا۔ ہٹ کر بولا۔ ”باہر جا کر الٹی کچھ۔ سالے یہاں گندگی پھیلائی تو ابھی اور زندہ طلسمات پلوؤں

باہر چلایا ہے کہ نہیں۔“

نوشا لڑکھڑا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سننا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دروازے پر نمودار ہوا۔

”اب یہاں ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔“ استاد جھٹکے لہجے میں بولا۔ ”تم ابھی اپنا ٹین پاٹ سے گول کرو۔“

نوشا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”استاد! خدا کی قسم۔ تم سے سب کچھ سچ بتائے دیتا ہوں۔ یہ۔“

استاد زور سے دھاڑا۔ ”اب تو اپنی بات اپنے ہی پاس رکھ۔“

”میری بات تو سن لو استاد!“

”میں تجھے اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تو ایک نمبر کا حرام کا ختم ہے۔“ استاد پیڑرو نے دس ٹانگ لٹکائی اس کی طرف پھینکا۔ حقارت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”لو سالے خاں یہ اپنے کفن کے لیے جاؤ۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ تو تو مجھے بھڑوا دیکھے ہے۔ ان ہی کی طرح پٹیاں نکالتا ہے۔“

نوشا لٹکائی پٹیاں نکالتا ہے۔ مراد یہاں تراشا ہے۔

اب جا کے اپنی ماں کے لیے کوئی یار ڈھونڈ۔“  
نوشا اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ استاد نے ڈانٹا۔ ”سالے! آنکھیں کیا دکھایا ہے  
جا کر تھانے میں رہت لکھا دیجو کہ استاد پیڑ رو جیب کتروں کا اڈہ چلاتا ہے۔ تجھے بھی قسم ہے جو جا کر  
نہ کہیں۔ پر یہ بھی سن لے کہ دو ہزار روپے نقد بھتا دیتا ہوں۔ سالے کسی اور ہوا میں نہ رہتا تو یہ ہم  
ریا ہو کہ میں استاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔“

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ کھڑا رہا۔  
استاد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ابے جاریا ہے یا کچھ اور تیری کنڈی کراؤں۔ تجھے دیکھ کر میرے  
آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔ بس اب تو یہاں سے دفان ہو جا۔“  
نوشا نے دس روپے کا نوٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈکے سے باہر آگیا۔  
(۴)

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ نوشا کے سامنے اب  
سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رات کہاں گزارے۔ اچانک اسے راجہ کا خیال آگیا۔ مگر اس کی یاد آتی  
جھنجھلا گیا۔ اس سالے کی تو نقد ہی بری کھوٹی ہے۔ سوچا تھا کہ اس رقم سے اس کا علاج کرا دوں گا۔ الا  
ڈبا گول ہو گیا۔ نہ رہنے کو ٹھکانہ ہے نہ کوئی کام دھندا۔  
وہ اسی طرح سوچتا ہوا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ عثمان آباد کی گلیوں سے گزر کر وہ لارنس روڈ  
آگیا۔ سڑک سنسان تھی۔ سناٹے میں کہیں کہیں کتے بھونک رہے تھے۔ گشت کرنے والا باک  
کا ٹیبل اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔ نوشا گھبرا گیا۔ اس طرح  
رات گئے آوارہ گردی کرنا مناسب نہیں تھا۔ سردی تھی اور وہ بہت تھکا ہوا بھی تھا۔ آخر وہ آبا  
درخت کے نیچے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

رات دیو کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ شبنم کے قطرے درند  
کے چوں سے ٹپ ٹپ فٹ پاتھ پر گر رہے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک شخص گھڑی کی طرح  
نوشا کو محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ نہ  
نواک کامر ہوا پڑا تھا۔ اس کے آتے ہی وہ خوف سے کانپ اٹھا۔ ایسا لگا کہ لاش اس سے چٹ

نوشا کے ہاتھ پاؤں مارے۔ بھائی بند: ہم پیشہ، سامی۔ متوالہ: مست، شوقین۔

اب جا کے اپنی ماں کے لیے کوئی یار ڈھونڈ۔“  
نوشا اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ استاد نے ڈانٹا۔ ”سالے! آنکھیں کیا دکھایا ہے  
جا کر تھانے میں رہت لکھا دیجو کہ استاد پیڑ رو جیب کتروں کا اڈہ چلاتا ہے۔ تجھے بھی قسم ہے جو جا کر  
نہ کہیں۔ پر یہ بھی سن لے کہ دو ہزار روپے نقد بھتا دیتا ہوں۔ سالے کسی اور ہوا میں نہ رہتا تو یہ ہم  
ریا ہو کہ میں استاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔“

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ کھڑا رہا۔  
استاد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ابے جاریا ہے یا کچھ اور تیری کنڈی کراؤں۔ تجھے دیکھ کر میرے  
آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔ بس اب تو یہاں سے دفان ہو جا۔“  
نوشا نے دس روپے کا نوٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈکے سے باہر آگیا۔  
(۴)

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ نوشا کے سامنے اب  
سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ رات کہاں گزارے۔ اچانک اسے راجہ کا خیال آگیا۔ مگر اس کی یاد آتی  
جھنجھلا گیا۔ اس سالے کی تو نقد ہی بری کھوٹی ہے۔ سوچا تھا کہ اس رقم سے اس کا علاج کرا دوں گا۔ الا  
ڈبا گول ہو گیا۔ نہ رہنے کو ٹھکانہ ہے نہ کوئی کام دھندا۔  
وہ اسی طرح سوچتا ہوا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ عثمان آباد کی گلیوں سے گزر کر وہ لارنس روڈ  
آگیا۔ سڑک سنسان تھی۔ سناٹے میں کہیں کہیں کتے بھونک رہے تھے۔ گشت کرنے والا باک  
کا ٹیبل اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا۔ نوشا گھبرا گیا۔ اس طرح  
رات گئے آوارہ گردی کرنا مناسب نہیں تھا۔ سردی تھی اور وہ بہت تھکا ہوا بھی تھا۔ آخر وہ آبا  
درخت کے نیچے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

رات دیو کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ شبنم کے قطرے درند  
کے چوں سے ٹپ ٹپ فٹ پاتھ پر گر رہے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک شخص گھڑی کی طرح

کھوٹی: بری، ڈبا گول ہو گیا: ہات بڑھ گئی، معاملہ خراب ہو گیا۔



گئی ہے۔ وہ فوراً آگے بڑھ گیا اور پیچھے مڑ مڑ کر لاش کو دیکھتا رہا۔ اسے بار بار معلوم ہوتا جیسے کوئی ہر کا تعاقب کر رہا ہے۔

اسی گھبراہٹ کے عالم میں وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بندر روڈ پر پہنچا۔ بندر روڈ پر پناؤ یوں کی اکاد گاد کانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ ایرانی چائے خانے بھی کھلے تھے۔ وہ غاموڑ سے ایک ایرانی چائے خانے میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس وقت بھی خوب چہل پہل تھی۔ شب زندہ داروں کا ہجوم تھا۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں سنے باز تھے، دلال تھے، رکوالے تھے، وکٹوریہ والے تھے، پولیس کے کانسٹیبل تھے اور ایسے کوچہ گرد تھے جن کا نوشا کی طرح کوئی ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔

نوشانے گرم گرم چائے کے دو گھونٹ پئے تو ذرا سکون ملا۔ ایک پیالی چائے ختم کرنے کے بعد اس نے بی بی پی کے دو مسک بن کھائے۔ ایک اور گرم گرم ڈبل چائے چڑھائی۔ مگر ابھی تک سنبھل نہیں سکا تھا۔ اسے رہ رہ کر مرے ہوئے آدمی کا خیال آ رہا تھا جس کی جیبوں سے اس نے ایک روپیہ اور پانچ آنے نکالے تھے۔ یہ احساس بڑا ذہیت ناک تھا۔ وہ بار بار سوچتا۔ یہ گرہ کئی کا پیشہ سالا، واہیات ہے۔ یا اس پیشے کو تو چھوڑ ہی دینا چاہیے۔

مگر سوال یہ تھا کہ وہ پھر کرے گا کیا؟ اسی عالم میں کوئی اس کے وجود کے اندر سے بولا۔ میں سب جیب کترے ہی تو نہیں ہیں۔ اس خیال سے اسے کسی قدر تقویت پہنچی۔

وہ دیر تک چائے خانے میں بیٹھا رہا۔ جب صبح کے آثار ہو پیدا ہوئے اور ہلکی سفیدی آسمان۔ کناروں پر ابھرنے لگی تو وہ چائے خانے سے نکل کر باہر آ گیا اور سڑکوں کی آوارہ گردی شروع کر دی۔ دن بھر وہ کام دھندے کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر اس کا وہ دن بیکار گیا۔ رات اس۔ ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں گزاری۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ دن سڑکوں پر چائے خانوں کے اندر گزرتا اور رات مسافر خانے میں۔ اس کے دس روپے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اس احساس سے وہ پریشان ہو جاتا۔

آخر ایک آنٹو گیراج میں اسے میکینک کا کام مل گیا۔ ۵۰ روپے مہینہ تنخواہ اور صبح ۸ بجے سے

اکاد کا۔ کوئی کوئی۔ چہل پہل۔ روتھ۔ بے باز۔ جواری۔ دلال۔ سودا کرانے والا۔ کوچہ گرد۔ گلیوں میں آوارہ پھرنے والے۔ مسکین۔ گھر بن۔ گرہ کئی۔ جیب تراشی۔ تقویت۔ حوصلہ بہت۔

پنام تک کی ڈیوٹی سب شرائط اس نے قبول کر لیں اور کام شروع کر دیا۔ کام تو مل گیا مگر رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ معاشے پر و فیر کلیم اللہ کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اس سے ملا جائے۔ باتیں تو بہت کرتا ہے۔ شاید کچھ کام بن جائے۔ چنانچہ ایک شام کو آٹو راج سے نکل کر وہ سیدھا پر و فیر کے پاس گیا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

”آخر تم آہی گئے۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“

”میں نے پرانا دھند اچھوڑ دیا ہے اور ایک گیراج میں نوکری کر لی ہے۔“ نوشانے اسے مطلع کیا۔

پر و فیر ہو، ہو کر کے بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ اس خبر سے اسے بڑی خوشی ہوئی۔ ”بہت بڑا بہت اچھا۔ تم تو انجینئر بن سکتے ہو۔“ اس نے نوشا کا موٹیل آئل سے داغ دار لباس غور سے دیکھا۔

”تم تو ابھی سے انجینئر لگنے لگے۔“ وہ اس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دینے لگا۔

نوشانے موقع غنیمت جان کر مطلب کی بات کہہ دی۔ ”کام تو مل گیا مگر رہنے کا کوئی ٹھکانا

نہیں۔ اسٹیشن جا کر مسافر خانے میں پڑ رہتا ہوں۔“

پر و فیر ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”نہیں، میں تم کو رہنے کے بجگہ دوں گا۔“ اس نے فوراً اپنی بیٹی کو بلایا۔ نادراہ لگتی تو وہ گویا ہوا۔ ”نادراہ ان سے ملو۔ یہ نوشا

ہمارے دوست۔ اگر تم کو دوست کے لفظ پر اعتراض ہے تو میں اس لفظ کو واپس لیتا ہوں۔ بہر

ماہ ہمارے مہمان ضرور ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ ہی ٹھہریں گے۔“

”مگر ابا جان گھر میں جگہ کہاں ہے؟“

”وہ ایک احمقانہ سی مثال ہے۔ جگہ دل میں ہونی چاہیے۔ تو اس وقت جگہ دل ہی میں نکالنا

ساک۔ دل نہیں دماغ سے سوچو کہ کہاں جگہ نکل سکتی ہے؟“

نادراہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پر و فیر ذرا دیر تک بے چینی سے کمرے میں ٹھہلتا رہا۔ پھر اس نے چٹکی بجا کر کہا۔ ”یہ ٹھیک

ہے۔ کھانے کے کمرے سے میز اٹھا کر تم راہداری میں لگا دو۔ کیا مضائقہ ہے۔ کھانا ہی تو کھانا

راہداری بھی بری جگہ نہیں۔ خاصی کشادہ بھی ہے۔ کھانے کی میز اس میں آسانی سے لگائی جا

سکتی ہے۔ جس شہر میں انسان کو سر چھپانے کے لیے چھت تک میسر نہ ہو وہاں کسی کو ڈانٹنگ روم

لے گا کوئی حق نہیں۔ یہ خود غرضی ہے۔ میں اسے ہر گز برداشت نہیں کر سکتا۔“

نادرہ پروفیسر کی عادت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ ایک بار ملے کر لیتا ہے اسے پورا کئے بغیر نہیں رہتا۔ لہذا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے باہر چلی گئی اور گھر کے ملازم کی مدد سے کھانے کی میز نکال کر غلام گردش میں ڈال دی۔ کمرہ نوشا کے لیے خالی کر دیا گیا۔ پروفیسر نے اس کے لیے چار پائی اور بستر کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس رات نوشا کئی راتوں کے بعد گہری نیند سویا۔ سویرے ہی سویرے پروفیسر کی آواز سن کر نوشا جاگ اٹھا۔ وہ اسے ناشتے کے لیے بلارہا تھا۔ اس نے غسل خانے میں جا کر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور اس کے پاس چلا گیا۔ پروفیسر اور نادرہ کھانے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ میز پر چائے اور ناشتے کا سامان رکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے جھجکنے لگا۔ پروفیسر نے کہا۔

”تم شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ آؤ، ادھر آکر بیٹھو۔“

نوشا سکڑا سکڑا کر سی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر نے پھر کوئی بات نہیں کی اور اخبار کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ نادرہ نے نوشا کو چائے بنا کے دی۔ ٹوسٹ اور ایک انڈا دیا۔ نوشا آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا۔ وہ گھبراہٹ سے نظر آ رہا تھا۔ اسے ہر چیز اجنبی اور نامانوس معلوم ہو رہی تھی۔ اس روز وہ آٹو گیراج پہنچا تو اس کی طبیعت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ کام بھی محنت سے کیا۔ پہلی بار اسے گیراج سے چھٹی ہوتے وقت خوشی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھا گھر آیا اور غسل خانے میں دیر تک نہا تا رہا۔ رات کا کھانا بھی اس نے پروفیسر ہی کے ساتھ کھایا۔

چند ہی روز کی رہائش کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی زندگی میں بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اب وہ سڑکوں پر آوارہ گردی اور گھٹیا چائے خانوں میں وقت گزارنے کے بجائے زیادہ تر گھر ہی پر رہتا۔ اس کی زندگی میں کسی قدر اعتدال اور سلیقہ پیدا ہو رہا تھا۔

## فصل سیزدہم

(1)

کراچی آئے ہوئے سلمان کو کئی مہینے ہو گئے تھے۔ چچا سر کے سیاسی اثر و رسوخ سے اسے بے غیر ملکی فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی، کام بھی زیادہ نہ تھا۔ پانچ روپے جو سسرال سے شادی پر سلامی میں ملے تھے اس کے پاس موجود تھے۔ اس میں سے چار روپے بچکڑی دے کر اس نے شہر کے ایک بارہانہ علاقے میں رہائش کے لیے فلیٹ لے لیا تھا۔ اس میں تین کمرے تھے۔ فلیٹ روشن اور ہوادار تھا۔ پاس پڑوس بھی برا نہیں تھا۔ اس چار زلہ عمارت میں زیادہ تر پارسی اور عیسائی خاندان آباد تھے۔ ان کے رہن سہن میں نفاست اور فرہیت تھی۔ اکثر رات گئے تک خوب چہل چہل اور ہنگامہ رہتا۔

آمدنی معقول تھی۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ سلمان عام طور پر گھر ہی میں رہتا تھا اور بائیس وقت مطالعے میں گزارتا۔ ان دنوں اس کا صرف یہی مشغلہ تھا۔ مہینے کی شروع تاریخوں میں بازار سے نئی کتابیں خرید کر لاتا۔

ایک کا ایک کمرہ اس نے مطالعے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس میں مختصر سی لائبریری بن گئی تھی۔ ماہوں کی دو الماریاں، مطالعے کی میز اور صوفہ سیٹ لگا کر اس نے کمرے کو قرینے سے آراستہ کیا۔ کچھ فرنیچر اس نے خرید لیا تھا، کچھ کرائے پر لے آیا تھا۔

کراچی میں اس کا کوئی شناسا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے ساتھ اس نے مراسم بڑھانے کی

کوشش کی۔ دفتر میں کام کرنے والے ساتھیوں سے اسے کبھی انسیت پیدا نہ ہوئی۔ مگر وہ حتی الوسع کوشش کرتا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اس نے آشفٹہ مزاجی اور بے راہ روی ترک کر کے زندگی میں اب میانہ روی اور سلیقہ پیدا کر لیا تھا۔ چند موٹے موٹے اصول وضع کر رکھے تھے۔ ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ دفتر کے کسی شخص سے بد مزگی پیدا نہیں کرے گا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اسے روزانہ وہاں سات گھنٹے گزارنا پڑتے تھے۔ البتہ دفتر سے باہر آنے کے بعد وہ اس ماحول کو اس فضا کو یکساں فراموش کر دیتا۔ یہاں وہ تھی کہ کسی رفیق کار کے ساتھ اس کے تعلقات دفتر کی چار دیواری سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اتوار کو عام طور پر وہ میٹنی شو دیکھتا یا سمندر کے کنارے کسی پر فضا مقام پر چلا جاتا اور گھنٹوں ریت پر بیٹھا شور مچاتی لہروں کو دیکھتا رہتا۔ اس کی زندگی میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور توازن آ گیا تھا۔ اور وہ اس سے مطمئن بھی تھا۔ کبھی کبھی اسے کھانے کی دقت کا احساس ہوتا۔ ہوٹل کے کھانے سے وہ اکتا گیا تھا۔ اس نے ایک ملازم رکھ لیا اور گھر پر کھانا پکوانے کا بندوبست کیا۔ مگر وہ ہفتہ بھر بھی نہ ٹکا۔ ایک روز دفتر سے لوٹا تو ملازم غائب تھا۔ سوٹ کیس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ خیریت ہوئی کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور سوٹ کیس میں صرف ۴۲ روپے پڑے تھے۔ ان ۴۲ روپوں کے علاوہ وہ کچھ کپڑے چرا کر بھی لے گیا۔ نقصان زیادہ نہ ہوا۔ لیکن اسی روز اس نے طے کر لیا کہ آئندہ ملازم نہیں رکھے گا۔ دوسرے روز اس نے بیوی کو بلانے کے لیے خط لکھا اور پھر ہر خط میں اصرار کرنے لگا۔



جاڑوں کی ایک کبر آلود صبح کو سلمان کی بیوی رخشندہ کراچی پہنچ گئی۔ اس کے ہمراہ ایک ادیب خادمہ بھی تھی۔ بیوی کو لینے صبح تڑکے وہ کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین کچھ لیٹ تھی۔ اس انتظار میں اس نے ایک خاص کیف محسوس کیا۔ یہ ایسی مسرت تھی جو وہ بہت عرصے بعد محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ انٹر کلاس کے ایک زنانہ ڈبے سے اس کی بیوی خادمہ کے ساتھ اتری۔

وہ برقع پہنے ہوئے تھی اور بہت شرمائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ گھر آکر بھی اس کا یہی انداز رہا۔ بات کرتا تو نگاہ نیچے جھکی رہتی۔ چہرے پر کچھ عجیب سی گھبراہٹ نظر آتی۔

انسیت: محبت۔ حتی الوسع: جہاں تک ہو سکے۔ آشفٹہ مزاجی: پریشان حالی۔ جاڑے: سردی کا موسم۔ کیف: سرور، محفل۔

اس روز اس نے دفتر سے چھٹی نہیں لی تھی۔ لہذا وہ فلیٹ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ دفتر روانہ ہوا۔ سہ پہر ہونے تک اس کا دل کام سے اچاٹ ہو گیا۔ اس روز وہ جلد ہی گھر پہنچ جاتا چاہتا تھا۔ بڑے نکلا تو بہت خوش تھا۔

وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا بازار گیا۔ اس نے حلوہ سوہن خریدا، تازہ پھل لیے اور گل زرش کی دکان سے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی خرید لیا۔ گھر پہنچا تو رخشندہ چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے شاید کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اس کا چھپتی چہرہ پھولوں کی طرح شگفتہ تھا۔ ہلکے آہنی لباس میں وہ دل کش اور دل آرا نظر آرہی تھی۔ سلمان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی بیوی صبر اور خوب رو ہے۔

چائے پیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے چھیڑتا رہا تاکہ اس کا حجاب کسی قدر کم ہو جائے۔ اس وقت وہ ایک کھلڈرے نوجوان کی طرح غیر سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا اور ٹپٹپٹ باتیں کرتا۔ اس کی یہ شام بڑی خوشگوار گزری۔

سلمان کو جلد ہی اندازہ ہو گیا۔ کہ رخشندہ بڑی محنتی اور سکھڑ ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ بیدار ہو جاتی۔ اس کے کپڑوں پر استری کرتی۔ شیو کرنے کا سامان آئینے کے سامنے رکھ دیتی۔ جتنی اربہ غسل کرتا اس عرصے میں وہ ناشتہ تیار کر کے میز پر لگا دیتی۔ ہر چند کہ گھر میں خادمہ موجود تھی مگر اس کا سارا کام وہ خود کرتی اور اس میں اسے ہسرت بھی محسوس ہوتی۔ سلمان نے اکثر غور کیا کہ اگر اس نے کسی کام کے لیے خادمہ سے کہا تو رخشندہ خود ہی وہ کام کر دیتی۔

شام کو واپس آتا تو چائے تیار ملتی۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ جاتا۔ بیوی اس کے قدموں پر جھک کر جوتے کا فیتیہ کھولنے لگتی۔ سلمان نے منع بھی کیا مگر وہ باز نہ آتی۔ اس کے کپڑے وہ خود ہی دھو کر پٹا لگتی۔ اس کی ایک ایک چیز قرینے سے لگی ہوتی حالانکہ وہ رخشندہ کے آنے کے بعد خاصا اہلکار ہو گیا تھا۔ دفتر جاتا تو سارا کمرہ کباڑ خانہ بنا کر ڈال دیتا۔ مگر شام کو ہر چیز اپنی جگہ آراستہ ملتی۔

یہ بڑے پر کیف دن تھے۔ اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ چہرے پر تازگی آگئی تھی۔ وہ اہلکار خاصا بھلا جوان نظر آتا۔ لیکن ان دنوں وہ جس قدر باتونی ہو گیا تھا رخشندہ اسی قدر خاموش

لہلہات ہونا: دل نہ لگنا۔ چھپی: چھپنا ہو اور درگ۔ شگفتہ: نکلا ہوا، خوش۔ دل آرا: مرد خوبصورت۔ حجاب: شرم۔ سکھڑ: ہنرمند، غیر لہلہات۔ کیف: خوشی سے بھرپور۔

ایک اتوار کو پکنک کا پروگرام بنا جسے پڑوسیوں نے بنایا تھا۔ آمدورفت کے لیے انہوں نے ایک اسٹین وگن کا بندوبست کیا۔ سب اس میں لدلدا کرہا س بے پہنچے۔ اس روز رزخندہ کا برقع بھی اتر گیا۔ پارٹی میں خاصی تفریح رہی۔ سمندر میں غسل کیا گیا۔ ریت پر لیٹ کر سورج کی شعاعوں سے جسم یکا گیا۔ بہت سی الم غلم چیزیں کھائیں۔ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اور جب سورج بحیرہ رب میں غروب ہونے لگا اور لہروں کا رنگ ارغوانی ہو گیا تو وہ تھکے ہارے واپس ہوئے۔

اس کے بعد اکثر اتوار کو پکنک پارٹیاں ہوتی رہیں۔  
 سلمان ہفتے کی شام کو بیوی کے ساتھ پکچر ضرور دیکھتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کے ہمراہ ہام کو ٹہلنے نکل جاتا۔ دونوں کچھ شاپنگ کرتے اور کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ مہینے کی شروع تاریخیں ہوتیں تو وہ شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں رات کا کھانا بھی کھا لیتے۔

زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ البتہ اس میں سکون کم اور ہنگامے زیادہ ہو گئے تھے۔ مگر یہ ہنگامے اس طرح بے قدموں زندگی میں داخل ہوئے کہ سلمان کو مطلق احساس نہ ہوا۔ وہ ان سے روز رفتہ مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن جس قدر یہ ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے مطالعے کا شوق کم ہوتا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں وہ معمول کے مطابق روزانہ چالیس پچاس اور کبھی کبھی تو سوسو سو صفحات پڑھ ڈالتا تھا۔ ان دنوں وہ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیپ کے شیڈ کا ہلکس لہراتا۔ بیوی بار بار کروٹ بدلتی۔ خواہ مخواہ بات کر کے اسے چھیڑتی۔ وہ مطالعے میں محو رہتا۔ اب یہ محویت کم ہونے لگی تھی۔

بیوی میں شاپنگ کی عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ جو توں اور سینڈلوں کی اس نے درجنوں ڈولیاں خرید ڈالی تھیں۔ ہر فلم دیکھنے کے بعد وہ نیا لباس تیار کرانے کا پروگرام بناتی۔ میک اپ کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ نئے نئے لوشن خرید کر لاتی۔ کوئی غسل کرنے کے لیے ہوتا، کوئی صرف ہتھیلیوں کی جلد نرم کرنے کے لیے اور کسی سے چہرے کا رنگ نکھاراجاتا۔ دونوں بازار جاتے اور کوئی شاپنگ نہ بھی ہوتی تب بھی فیشن میگزین ضرور خریدے جاتے، جن کو پڑھ کر وہ روزانہ نئے نئے انداز سے بال سنوارتی۔ درزی سے ایسے لباس سلواتی جن سے سینے کی جلد زیادہ سے زیادہ عریاں نظر آتی۔ ان کا ٹھنگ اس طرح ہوتی کہ جسم کا ایک ایک ختم نظر آتا۔

ظلم ندر احمی، ہائل۔ غم: مراد اجمار۔

رہتی۔ بہت کم بات چیت کرتی۔ کوئی بات اچھی لگتی تو صرف مسکرا دیتی۔ اس کے سفید دانت چمکے اور سرخ لب کپکپا کے رہ جاتے۔  
 سلمان کو اس کی مسکراہٹ بہت پسند تھی۔

\*\*\*

کراچی آنے کے بعد سلمان کی بیوی ابتدائی دنوں میں شدید تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اجنبی شہر، اجنبی ماحول، اجنبی پاس پڑوس۔ نہ کسی سے میل ملاپ، نہ کہیں آنا جانا۔ سلمان دفتر چلا جاتا تو اس کے لیے وقت کا ناندو بھر ہو جاتا۔ لیکن سلمان نے زور دیا تو اس نے پڑوسیوں سے راہ و رسم سیکھنے کی کوشش کی اور رفتہ رفتہ خاصا میل جول پیدا کر لیا۔

بلڈنگ کے عیسائی اور پارسی خاندانوں کی بیشتر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں بیٹیکوں اور تجارتی اداروں میں سیکرٹری، ٹائپسٹ یا اسٹینوگرافر تھیں۔ وہ تنگ اسکرٹ پہنتیں، مردوں کی طرح سر پہ چھوٹے چھوٹے توشے ہوئے بال رکھتیں اور اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ قیمتی لباس اور میک اپ پر خرچ کرتیں۔ وہ اکثر سلمان کے فلیٹ میں بھی آتیں۔ ان کی مسکراہٹ مصنوعی تھی، ان کی نظروں کا انداز مصنوعی تھا، جسم کی حرکت مصنوعی تھی، وہ بنی سنوری کٹھ پتلیوں کی طرح نظر آتیں۔ ان کی باتیں عام طور پر لباسوں کے جدید ترین ڈیزائنوں، نئی فلموں، ڈانس پارٹیوں، پکنک اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے متعلق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شہزادی مارگریٹ کے کسی نئے اسکیڈل یا شاہ فاروق اور پرنس علی خان کے تازہ ترین معاہدے کے بارے میں بھی بات کر لیتیں اور ان کے تذکرے میں خاص لذت محسوس کرتیں۔

سلمان نے غور کیا کہ ان لڑکیوں کے ساتھ بڑھتے ہوئے میل جول نے اس کی بیوی میں بھی بعض تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ باتوں کے دوران خواہ مخواہ انگریزی کے بھونڈے الفاظ استعمال کرتی۔

اس نے اپنے بالوں کا سیدھا سادا انداز بدل دیا تھا۔ میک اپ کرنے لگی تھی۔ اب اس کی بھی خواہش ہوتی کہ سلمان اس کے حسن کی تعریف کرے۔ پہلے وہ فلم دیکھنے سے پرہیز کرتی تھی مگر اب دبے دبے الفاظ میں فلم دیکھنے کا اشتیاق بھی ظاہر کرتی۔

دو بھر: مشکل: بھونڈے: بے شک: اشتیاق: شوق: خواہش۔

اب وہ کام کرنے سے بھی جی چرانے لگی تھی۔ ہر وقت خادمہ کو احکامات دیتی رہتی۔ کام کرنے سے ہاتھوں کی جلد کھردری پڑ جانے کا اندیشہ تھا اور زیادہ محنت کرنے سے رنگت سانولانا جانے کا خطرہ تھا۔ البتہ اب وہ یہ فن ضرور جان گئی تھی کہ اپنی دلکشی کی زیادہ سے زیادہ کس طرح نمائش کی جائے۔ وہ خوبصورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ سچ سچا کرشمہ کو چائے کی میز پر بیٹھتی تو کمرے میں تازہ پھولوں کی شگفتگی اور مہک رچی ہوتی۔ سلمان دفتر سے تھکا ہارا آتا۔ اس کے دل آویز چہرے اور پھڑکنے ہوئے جسم کو دیکھتا تو ساری تھکن بھول جاتا۔ اس کی قربت میں مسرت اور کشش محسوس کرتا۔

آمدنی پنی تلی تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ کتابوں کی خریداری کم ہوتے ہوئے مفر رہ گئی۔ مطالعہ بھی بند ہو گیا۔ تنخواہ ملنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ بلکہ اکثر بلوں کی ادائیگی بھی رہ جاتی جن کو آئندہ ماہ پر ٹالنا پڑتا۔

سلمان اب سگرٹ گن گن کر پینے لگا تھا اور اپنی ضروریات کا سامان خریدنے سے حتی الوسع پرہیز کرتا۔ اب وہ اکثر بغیر استری کیا ہوا سوٹ پہن کر آفس چلا جاتا۔ دفتر میں ہر شخص سے اس کا لین دین شروع ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ادائیگی میں تاخیر ہوتی تو بد مزگی بھی پیدا ہوتی۔ پہلے وہ دفتر کے ساتھیوں سے مراسم بڑھانے سے کتراتا تھا مگر اب کم از کم قرض خواہوں سے اسے زیادہ گل مل کر رہنا پڑتا۔

سلمان کے مزاج میں رفتہ رفتہ چڑچڑاہٹ آتا جا رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر خشمندہ لہجہ پڑتا اور پھر کئی کئی روز تک اس کا سلسلہ چلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دفتر سے گھر آنے کے بجائے کسی چائے خانے میں بیٹھ جاتا۔ پکچر دیکھنے چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ اس میں عجیب سا لاپالی پن آ گیا تھا۔

\*\*\*

جاڑے جا چکے تھے اور گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ ایک روز دفتر کے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ”شب ماہ تاب“ منانے کا پروگرام بنا۔ وہ ایک ہوٹل کے کھلے لان میں رات بھر بیئر پیتا رہا اور پورے چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پارٹی میں دفتر کی کچھ عیسائی اور پارسی لڑکیاں بھی تھیں جن کو نشے میں دھت ہو کر اس نے بہت ستلایا۔ ایک لڑکی کا اسکرٹ پھاڑ ڈالا۔ وہ نیم برہنہ ہو گئی۔ کئی کے گال نوج لیے اور وہ بلیوں کی طرح غرا کر

ایک روز دفتر کے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ”شب ماہ تاب“ منانے کا پروگرام بنا۔ وہ ایک ہوٹل کے کھلے لان میں رات بھر بیئر پیتا رہا اور پورے چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پارٹی میں دفتر کی کچھ عیسائی اور پارسی لڑکیاں بھی تھیں جن کو نشے میں دھت ہو کر اس نے بہت ستلایا۔ ایک لڑکی کا اسکرٹ پھاڑ ڈالا۔ وہ نیم برہنہ ہو گئی۔ کئی کے گال نوج لیے اور وہ بلیوں کی طرح غرا کر

نیشے کی شام تھی۔ سلمان دوپہری کو دفتر سے گھر واپس آ گیا تھا۔ مینے کی شروع ہار بیٹھیں تھیں۔

لہجہ انتہائی۔

ہے ہوں گے۔

اس روز وہ گھر سے ہشاش بشاش نکلا تھا۔ ایک روز پہلے اسے تنخواہ ملی تھی۔ اور ابھی تک اس باب میں کچھ کم ۲۰ روپے پڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے اس نے اپنے لیے دو سو فی بیس شرٹوں کے علاوہ بیانی خریدی تھی۔ ٹائیوں کا ایک چھوٹا ڈبائے یونہی مون میں آکر خرید لیا تھا۔ نادرہ کے لیے ایک کے خوبصورت آویزے بھی خریدے تھے۔ آویزے خریدتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ یار ہاؤس کی بدولت کھانے کے علاوہ گرما گرم چائے بھی مل جاتی ہے۔ اسے راضی خوشی رکھنا بہت روٹی ہے۔ تمام خریداری پر اس کے ۲۵ سے زیادہ روپے خرچ ہوئے تھے۔ مگر وہ خوش تھا اور ہوم جموم کر چل رہا تھا۔ لیکن مسلمان کو دیکھ کر اس کا دل افسردہ ہو گیا۔ اسے گھر کی یاد ستانے لگی۔ بارڈیال آتا کہ وہ کراچی میں عیش کر رہا ہے اور ادھر گھر پر نہ جانے سب کس حال میں ہوں گے؟

ہوں گے؟

اسی افسردگی کے عالم میں وہ واپس پہنچا۔ ملازم اپنے گھر جانے کے لیے اس کا بے چینی سے غار کر رہا تھا۔ نوشانے اسے رخصت کیا۔ دروازے کا بولٹ چڑھایا اور زینے کی میٹر حیاں طے کرتا باہر چلا گیا۔ گھر میں سناٹا تھا پردیسر کے کمرے میں روشنی تھی لیکن نوشا اس طرف نہیں گیا۔ غلام اٹسے گزر کر اس نے نادرہ کے کمرے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ سامنے میز پر نادرہ سر ہائے پڑھنے میں محو تھی۔ ٹیبل لیپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے چہرے کے خدو خال پتھر کے نول کی طرح ترشے ترشائے نظر آرہے تھے۔ ایک ایک زاویہ ایک ایک خم ابھر کر نمایاں ہو گیا تھا۔ لالہ کلی تھی اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

نوشانے نظر بھر کر اسے دیکھا اور چپکے سے کمرے میں جا کر اس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ کو بال آمد کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میز کے سٹاپلائسک کے آویزے رکھ دیئے۔ تیز روشنی میں وہ خوبصورت نظر آنے لگے۔ نادرہ نے سٹاپلائسک کے آویزے دیکھے۔ پھر گردن موڑ کر نوشا پر اچھتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا؟“

”تم اتنی دیر تک کہاں غائب رہے؟“

”ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد سیدھے گھر کیوں نہیں آئے؟“

سہ پہر کو چائے پیتے ہوئے دونوں میاں بیوی نے طے کیا کہ شام گھر سے باہر گزاری جائے۔ ہر گھر میں کسی پر سکون ریسٹوران میں بیٹھ کر آکس کریم کھائی جائے۔ اس کے بعد فلم دیکھی جائے۔ فلم انتخاب پر دونوں کی پسند مختلف تھی۔ لہذا فیصلہ یہ ہوا کہ فلم کا انتخاب آکس کریم کھاتے وقت کیا جائے۔ فلم دیکھنے کے بعد رات کا کھانا بھی باہر ہی کھانا تھا اور یہ طے ہوا کہ کھانا چاہے کسی بھی ہوٹل میں کہ جائے مگر اس میں بیج کے کباب ضرور شامل ہوں۔ گرم ہوں اور چٹ پٹے ہوں۔

دونوں گھر سے باہر آئے۔

گرمی کا موسم تھا۔ دن ڈھلتے ہی شہر کی ساری آبادی سڑکوں اور بازاروں میں آگئی تھی۔ طرف چہل پہل تھی۔ شور و غل تھا۔ دکانوں پر بھیڑ تھی۔ دونوں تفریح کے مود میں تھے اور فکری سے بازار سے گزر رہے تھے۔

ایک موٹر پر مسلمان نے محسوس کیا کہ ایک نوجوان پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ معمولی لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر الجھے ہوئے گھونگھریالے بال، کھلتا ہوا رنگ اور چہرے پر ہلکی بھوری موٹھیں۔

مسلمان کو پہلے تو اس کے انداز پر غصہ آیا۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ مسلمان کو شبہ ہوا کہ وہ نوشا ہے۔

وہ واقعی نوشا تھا اور اس نے مسلمان کو پہچان لیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ مگر یہ سوچا شرمندگی کا احساس ہوا کہ وہ گھر سے بھاگ کر کراچی آیا ہے۔ مسلمان کو بھی اس کا علم ہو گا۔ لے گا اس کا ذکر ضرور کرے گا اور اس کے متعلق وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور لاؤ کیڑے کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

مسلمان کو دیکھنے کے بعد نوشا کو اپنا گھرایا آگیا۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے اماں کس طرح ہو گی؟ سلطانہ کیسی ہو گی؟ تو تو اب بڑا ہو گیا ہو گا۔ ٹھانڈے سے اسکول جاتا ہو گا۔ شاید اماں نے آؤ کو اسکول سے اٹھا کر کہیں کام دھندے پر لگا دیا ہو گا۔ اس کے اس طرح چلے آنے پر اماں ضرور ہوں گی۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار وہ گھر کی چھت پر چڑھتے ہوئے گر پڑا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ سارا چہرہ لہو لہان ہو گیا تھا۔ اماں پہلے تو اسے دیکھ کر تھر تھرا کانپتی رہیں اور پھر جی بار کر زور زور سے رونے لگی تھیں۔ اماں اس کے لیے ضرور روئی ہوں گی۔ سلطانہ بھی روئی ہو گی۔ سب اسے

اس نے نوشا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی چلی گئی۔ اس کے لہجے میں ٹیکھاپن تھا۔ چہرے پر قدرے جھنجھلاہٹ تھی۔ نوشا گھبرا گیا۔ کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ خاموش کھڑا کر نکلا۔ اس کا چہرہ تنکنا رہا۔

”اباجان کی بار پوچھ چکے ہیں۔ تمہیں اس قدر غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہیے۔“

نوشا نے سوچا۔ یار یہ تو بلا کی طرح چٹ گئی۔ سالی بڑی تیز لوٹیا ہے۔ ایسے طعنان سے باز کرتی ہے جیسے ماں بچے کو ڈانٹ رہی ہو۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ احمقوں کی طرز آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ نادرہ نے آویڑے الٹ پلٹ کر دیکھے اور تیزی سے بولی۔

”یہ کیوں لے آئے؟“

نوشا پھر بھی نہ بولا۔

”میں پوچھتی ہوں کہ تم نے یہ ٹاپس کیوں خریدے؟“

نوشا نے گھبرا کر کہا۔ ”تمہارے لیے لایا تھا۔“

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”میرے لیے؟“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”جناب مال میرے پاس ایک درجن سے زیادہ کانوں کے ٹاپس ہیں اور ذرا آپ اپنی یہ قیص ملاحظہ فرمائیے۔ موہل آئل کے داغوں نے جیسے ہر جگہ جنگل اگادینے ہیں۔ اور آپ کی یہ اکلوتی قیص ہے۔“

نوشا نے فوراً وضاحت کی۔ ”دوبلش شرمیں بھی تولایا ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا ایک کھولا اور اس کے سامنے ڈال دیا۔

نادرہ نے بلش شرموں کو ایک نظر دیکھا اور آویڑوں کی ڈبیا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ”آئندہ کوئی ایسی چیز خرید کر نہ لانا۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

نوشا کو اس کا یہ انداز بہت ناگوار گزرا۔ اس نے بھیجی بھیجی نظروں سے اسے دیکھا اور آویڑوں کی ڈبیا اٹھالی۔ جب وہ جانے لگا تو نادرہ نے پوچھا۔

”تم نے کھانا کہاں کھایا؟“

نوشا بے رخی سے بولا۔ ”کہیں نہیں۔“

”تو پھر چلو کھانا کھاؤ۔“

”میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“

وہ اس وقت کسی ضدی بچے کی طرح روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نادرہ نے خاموشی سے اسے دیکھا اور بات نہیں کی۔ نوشا جھجھلایا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ تھکے تھکے قدموں سے زینہ طے کیا اور کمرے میں چلا گیا۔

بہر پر لٹ کر وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نادرہ کے رویے سے اس کے دل کو لپکتی تھی۔ وہ اس کے لیے خوشی خوشی آویڑے خرید کر لایا تھا۔ اور اس نے اس حقارت سے اور اس کی دیا کہ وہ تمل کر رہ گیا نوشا کو محسوس ہوا کہ وہ اسے گھٹیا اور حقیر سمجھتی ہے۔ وہ بڑا ناراز و درخ تھا۔ یہ بات کانٹنے کی طرح اس کے ذہن میں کلکتے لگی۔ بہت دیر تک وہ اس واقعے پر گہرا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نوشا کی آنکھوں پر ہلکی ہلکی گیہاری تھی۔ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ پھر اندھیرے میں ایک سایہ سالہرا ہوا۔ اسے اپنے سر ہانے کسی کیا ہستہ آہستہ سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ نوشا نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں گھورنے لگا۔ ایک نرم نرم ہاتھ اس کے کندھے پر آکر ٹپک گیا۔ ساتھ ہی آواز۔

”نوشا!“

یہ نادرہ تھی وہ آہستہ آہستہ اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی تھی۔ نوشا دم بخود پڑا رہا۔ اس نے نادرہ اس وقت اس کے پاس کیوں آئی ہے؟ جب نادرہ نے کئی بار جھنجھوڑا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ہاں!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کیا بات ہے؟“ نوشا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”نرم لہجے میں بولی۔“ کھانا کھاؤ۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

نوشا نے اٹھ کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ اس نے دیکھا۔ نادرہ کھانا لے کر آئی۔ اس نے کھانے کی پلیٹیں پلنگ پر رکھ دیں اور خود بھی بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔

شروع شروع میں تو نوشا نے اس رویے کے خلاف احتجاج کرنے کی بھی کوشش کی لیکن رفتہ رفتہ ہانس ہوتا گیا۔

اس ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں خاصی شائستگی پیدا ہو گئی۔ اب وہ بے بن سے قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ بات کرتا تو سنجل سنجل کر بولتا۔ پہلے اس کی وضع قطع فلم ریل کی سی تھی۔ اب اس نے بال چھوئے کرا دیئے تھے۔ چٹلون کی موریوں الٹ کر چڑھانا چھوڑ نہیں۔ رات کو مزے میں آکر کبھی کبھی وہ کوئی فلمی دھن گنگنانے لگتا تھا۔ اب ایسی کوئی آواز اس کے سے نہیں ابھرتی تھی۔

\*\*\*

پروفیسر سے نوشا کی ملاقات صرف ناشتے کی میز پر ہوتی۔ مگر اس وقت بھی وہ اخبار پڑھنے میں مبتلا رہتا۔ بات چیت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھار اتفاق سے اس کا نوشا سے آمناسما ہوتا جاتا۔ طرح کھویا کھویا گزرتا جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔

ایک روز پروفیسر کو نہ جانے کیا سوچھی۔ اچانک نوشا کے کمرے میں آگیا اور آتے ہی بولا۔

”ابھی ابھی سوچا کہ تم کو کسی اسکول میں داخلہ لے لینا چاہیے۔“

نوشا نے دبی زبان سے کہا۔ ”میں کام کرنے گیراج جو جاتا ہوں۔“

”بہت ٹھیک بات کہی تم نے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ نائٹ اسکول کیسار ہے گا؟ مگر نائٹ اسکول سب دواہیات ہیں۔ ایک صاحب کو میں جانتا ہوں جو رات کو اسکول چلاتے ہیں اور دن لٹائی کرتے ہیں۔ نائٹ اسکول اور قرق امینی میں قدر مشترک کیا ہے؟ یہ مسئلہ آج تک میں نہیں کر سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تعلیم دینے کے بجائے طلباء کے ذہن قرق کرتے ہوں گے۔“

تو وہ خود ہی ہنس پڑا۔

نوشا خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

”کوئی وجہ نہیں کہ تم انجینئر نہ بنو۔ مگر تعلیم کا مسئلہ، مگر تعلیم کا مسئلہ۔“ وہ بے خیالی میں اُستہ بڑبڑانے لگا۔ پھر چونک کر گویا ہوا۔

”مگر میرا ج کی ملازمت کیوں نہ چھوڑ دو؟“

نوشا بھڑپانے لگا۔ بد نظری۔ قدر مشترک۔ مشترک بات۔

نوشا کی ہنس

”جاؤ ہاتھ دھو کر آؤ اور کھانا کھاؤ۔“

نوشا سدھے ہوئے جانور کی طرح چپ چاپ غسل خانے میں گیا۔ ہاتھ دھوئے اور کمرے میں آکر کھانا کھانے لگا۔ اسے خاموش دیکھ کر نادرہ بولی۔ ”لاؤ وہ ٹاپس کی ڈیبا کہاں ہے؟“ نوشا نے نیکی کے نیچے سے ڈیبا نکال کر اسے دے دی۔

ڈیبا لے کر وہ بولی۔ ”دیکھو اب کوئی ایسی چیز نہ خریدنا تمہیں خود ابھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔“

نوشا سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔

وہ کہتی رہی۔ ”معلوم ہوتا ہے تم نے میری بات کا بہت برا مانا۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”تم کو سزا دینا چاہتی تھی۔ دیکھو نائیہ کتنی بے سکی سی بات ہے۔“

نوشا کو اس میں کوئی بے تکاپن نہ معلوم ہوا اس نے کسی قدر تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح گردن اٹھائے بیٹھی تم جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کے رو برو بیٹھا ہو۔ جب نوشا کھانا کھا چکا تو وہ پلیٹیں اٹھا کر اوپر جانے لگی نوشا نے چاہا کہ پلیٹیں وہ خود اٹھا کر لے جائے تو وہ ڈانٹنے کے سے انداز میں بولی۔

”خواہ مخواہ تکلف مت کرو۔ تم کو صبح تڑکے جانا ہے۔ جلدی سو جاؤ۔“

وہ کھٹ پٹ کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نوشا خاموش بیٹھا لکڑی کے زینے پر اس قدر موم کی آہٹ سنتا رہا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ نادرہ ہمیشہ نوشا سے اسی طرح پیش آتی تھی۔ عمر میں لگ بھگ وہاں کے برابر ہی تھی مگر اس کا رویہ بزرگوں کا سا تھا۔ وہ بات بات پر اس سے باز پرس کرتی۔

”نوشا! تم صبح دیر سے کیوں اٹھتے ہو؟“

”نوشا! تمہارے دانت اتنے گندے کیوں ہیں؟ دونوں وقت دانت صاف کیا کرو۔“

”نوشا! تم ایکٹروں کے سے بال مت بنایا کرو۔ بالکل لو فر لگتے ہو۔“

”نوشا! تم نے پھر غلط زبان بولی۔ فلاطین قطعی مہمل لفظ ہے۔“

وہ ہر وقت اسے ٹوکتی رہتی۔ نوشا تم نے یہ نہیں کیا۔ نوشا تم نے وہ نہیں کیا۔

سدھے ہوئے تربیت یافتہ۔ لوفر۔ آوارہ۔ مہمل۔ بے معنی۔



نوشا نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ”نہیں۔ تمہیں ضرور کچھ نہ کچھ کہنا پڑے گا۔“ یہ کہنا ہوا کرے سے باہر چلا گیا۔

ایک عرصے تک نوشا سے پروفیسر کی ملاقات نہیں ہوئی۔

نادرہ بھی اپنے باپ کی طرح عجیب و غریب لڑکی تھی۔ ذرا سی بات پر اس کی ہموں ہ جاتیں۔ آنکھوں میں تیز چمک آجاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نوشا جھنجھلا کر کوئی الٹی سیدھی بات کہ دیتا تو مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ ایک دن تو اس نے کمال کر دیا۔ نوشا نے شوخ رنگ کی بٹن شر خریدی تھی۔ اس پر فلمی اداکاراؤں کی رنگ برنگی اور پیمان انگیز تصاویر چھپی تھیں۔ وہ اسے پہن نادرہ کے سامنے سے گزرا تو اس نے ٹوکا۔

”نوشا تمہارا مذاق بڑا گھٹیا ہے۔“

نوشا اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کہنے لگا۔ ”کیوں، کیا ہوا؟“

وہ بولی۔ ”یہ بٹن شرٹ پہن کر تم پہلے بوائے سے زیادہ لائف بوائے صابن کا ٹیڈی مارا معلوم ہوتے ہو۔“

نوشا کو تاؤ تو بیٹا یا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ اس کا مذاق اڑاتی رہی۔ ”اس لباس میں تم بالکل معلوم ہوتے ہو اور وہ بھی تیسرے درجے کے۔“

نوشا کو اس روز وہ کئی بار ڈانٹ پھینکا کر چکی تھی۔ وہ پہلے ہی جھنجھلایا ہوا تھا۔ جل کر بولا۔ ”تم یہ روزانہ اٹے سیدھے بال بناتی ہو اور نہ جانے کیسی آڑی تر چھی قیصیں اور فراکیں پہنتی ہو تو؟“

نوشا نے کبھی یہ نہیں کہا تم بالکل چڑی کی بیگم لگتی ہو۔ ایک دم چڑی کی بیگم۔

کہنے کو تو غصے میں نوشا نے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ مگر فوراً سہم گیا۔ اس نے سوچا اب شاہ آگئی۔ مگر نادرہ کھسپائی ہنسی ہنسنے لگی اور جب نوشا جانے لگا تو اسے روک کر نرم لہجے میں بولی۔

”معاف کرنا نوشا! مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ میں اپنی غلطی کی معافی چاہوں۔“

نوشا ہلکا ہلکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا اور وہ بار بار معذرت کرتی رہی۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں جن سے وہ بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے۔

یہ اس کی ماں سیدھی سادی گھریلو سی عورت تھی۔ اس کا نام عارفہ بیگم تھا۔ اسے گھٹیا کا عارفہ تھا۔ اسے بھی دو گروہ کا بھی دورہ پڑتا۔ وہ بیشتر وقت بستر پر پڑی رہتی۔ جب نوشا پہلے پہل اس گھر میں آیا اس نے بڑی ناک بھوں چڑھائی۔ اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ ممکن ہے اس کے ہاں شوہر سے شکایت بھی کی ہو۔ مگر وہ جلد ہی نوشا سے مانوس ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نوشا کی مستعدی سے اس کی خدمت کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا اس کے پیروں پر مالش کیا کرتا۔ اس کا سر ہڈیوں پر ڈھونڈ کر اس کے لیے دوائیں اور انجکشن لاتا۔

نوشا اکثر رات کو کھانا کھانے کے بعد عارفہ بیگم کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ سر ہانے بیٹھا اس کا دیکھا کرتا اور گھنٹوں باتیں کیا کرتا۔ اس کی باتیں سیدھی سادی عام گھریلو قسم کی ہوتی تھیں۔ ان میں کچھ ماضی کی یادیں ہوتیں۔ عزیزوں اور رشتے داروں کا تذکرہ ہوتا۔ کسی کی غیبت اور کسی کی رفا ہوتی اور شوہر کے خلاف گلے شکوے ہوتے۔ پروفیسر نے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔ یہ ن معمولی اور عام سی باتیں تھیں جن کو نہ کبھی پروفیسر کلیم اللہ سننے کی زحمت گوارہ کرتا تھا اور نہ رات کو بیتی تھی۔ نوشا ہی گھر بھر میں ایک ایسا فرد تھا جو عارفہ بیگم کی ہر بات چپ چاپ بیٹھنا سنا لے لیکھا دیکھتا تھا کہ اب وہ اسے بڑا اچھا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ بہت سعادت مند اور فرمانبردار۔ ٹوبہ وہ کمرے سے اٹھ کر جاتا تو وہ دیر تک بڑی بوڑھیوں کی طرح اسے دعائیں دیتی رہتی۔



نوشا اب پروفیسر کلیم اللہ کے کہنے کا ایک فرد بن چکا تھا۔ شروع شروع میں جو جھجک اور عار دل کرتا تھا، اب ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کھانے میں دیر ہو جاتی تو وہ بڑی بے تکلفی سے آواز لگاتا۔ ”بھئی! آؤ شہر بھر کے سارے چوہے میرے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور خوب اوم دھما دھما چارے ہیں“

اسی طرح جب اس کی قیصوں کے بٹن ٹوٹ جاتے یا کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو وہ نادرہ کے سر پر زور کر کے درست کرواتا۔ کبھی خوشامد کرتا کبھی ناگواری سے منہ بگاڑتا اور اپنا کام کروائے بغیر لے لے لے پروفیسر کلیم اللہ کو وہ اب تک نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ پہلے بھی اس کے لیے معہ تھا اور اب مامعہ تھا۔

وہ بھٹکتا اور غائب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ خبطی اور سکی بھی تھا۔ ہر وقت کھویا کھویا رہتا تھا۔

نوشا کا دورہ عارفہ بیگم سے ہوا۔ مستعدی: خیر، ہوشیاری: غیبت: کسی کے چہرے پر برا کہنا: عارفہ بیگم: شرم: اوم دھما دھما: شور شرابہ: اچھا لڑکا: ہانڈا: غلطی: دیکھو، سودا: سکی: جنونی۔

(۳)

موسم گرمی کی سنان دوپہر تھی۔ ہر طرف مگوے منڈلا رہے تھے۔ غبار میں ڈھکی ہوئی لڑکیاں اور بچیاں تھکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ سلطانہ کمرے میں تھکی ہوئی لیٹی تھی۔ دروازے اور کڑیاں بند تھیں۔ وہ بہت ہلکا لباس پہنے تھی۔ اس کے برہنہ بازو ہتھکے پر جھول رہے تھے چہرے پر ہلکی زردی تھی اور آنکھیں دھلی دھلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

مہینہ بھر تک اسپتال میں رہنے کے بعد وہ پچھلے ہفتے واپس آئی تھی۔ اس کے برابر ہی پالنے والی ایک ننھا سا بچہ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ یہ اس کا بچہ تھا اس کا چہرہ نیاز کی طرح چوڑا تھا۔ ناک کے نیچے ابھرے ہوئے تھے اور دہانہ بڑا تھا۔ اس بچے کی پیدائش میں وہ اٹھارہ گھنٹے تک لیبر روم میں لگی کی طرح تڑپتی رہی اور موت اور زندگی کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی۔

دورات کے ۴ بجے پیدا ہوا تھا اس روز شام ہی سے سلطانہ کی حالت غیر تھی۔ اس پر بار بار غشی اور ہڈ پڑا ہوا تھا۔ ۱۲ بجے تک اس کی غصیں ڈوبنے لگی تھیں۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور چہرے پر ہلکی منڈلائی لگی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے گہرا کر نیاز کو ٹیلی فون کیا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے اس نے شراب زیادہ پی لی تھی۔ مدہوش پڑا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور یہ کہہ کر لیڈر کو دیا کہ وہ صبح سے پہلے اسپتال نہیں آ سکتا۔ نرس نے کئی بار نمبر ملایا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی مگر نیاز ایسا کروٹ بدل کر سویا کہ پھر آنکھ ہی نہ کھلی۔

چار بجے تک سلطانہ پر نزع کی حالت طاری رہی۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی اسے ہوش نہ آیا تھا۔ اس کے جسم میں دو بوتل خون داخل کیا گیا۔ نیاز آٹھ بجے صبح اسپتال پہنچا۔ بچے کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ مریضہ کے پاس جا کر بچے کو ایک نظر دیکھ لے۔ مگر نرس نے گھنٹہ بھر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ تمام وقت وارڈ کے باہر بے چینی سے ٹھٹھا رہا۔ جب نرس نے بچہ کو دکھایا تو اس نے جھک کر بچے کو بے ساختہ چوم لیا۔

جب تک سلطانہ اسپتال میں رہی وہ پابندی سے اسے دیکھنے جاتا۔ دن میں کئی کئی بار ٹیلی فون

نالی حالت: دم نکلنے کی حالت: پالنا: بچوں کا جھولا۔

اور اکثر اوٹ پانگ باتیں کرتا۔ بیوی کا کہنا تھا کہ وہ پہلے ایسا نہ تھا۔ اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ لڑا بھی تکلیف ہوتی تو بے چین ہو جاتا۔ طرح طرح سے اس کی دل جوئی کرتا۔ بچوں سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتا تھا اور پہلوئی کے بیٹے سلیم اللہ کی چاہت کا تو یہ عالم تھا کہ اسے دیکھ کر نہال ہو جاتا۔ ہر طرح اس کی ناز برداری کرتا۔ اس کا مستقبل سنوارنے کے لیے نت نئے منصوبے بناتا رہتا۔ اس کی تعلیم اور تربیت پر پوری توجہ صرف کرتا۔ سلیم اللہ ذہین اور ہونہار طالب علم تھا۔ صحت مند اور خوش شکل تھا۔ ڈاؤمیڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ ایم بی بی ایس کا تیسرا ہی سال تھا کہ پروفیسر کلیم اللہ نے اسے لاڈ میں ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں وہ اپنے چند ہم جماعت طلباء کے ساتھ ایک روز سینڈس پٹ پر پکنک منانے گیا۔ سمندر میں نہاتے ہوئے پھری ہوئی سرکش لہروں میں ایلام ہوا کہ دوسرے روز غوطہ خوروں کی سخت جدوجہد کے بعد اس کی لاش ملی۔ اس دل خراش سانے سے ایسا شدید صدمہ پہنچا کہ پروفیسر کلیم اللہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ گھنٹوں بت بٹا خاموش بیٹھا رہا۔ بہکی بہکی باتیں کرتا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھر سے نکل جاتا۔ بیٹے کے انتقال کو کئی سال ہو گئے تھے مگر اس کے دماغ کی چولیس ایسی ڈھیلی ہوئیں کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ ہولوار و خبطی ہو گیا۔

مگر نوشا کے لیے وہ فرشتہ رحمت سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ محلے کے ایک شخص نے، جو محکمہ زراعت میں چر اسی تھا، کسی بات پر پروفیسر کو آٹو کا پٹھا کہہ دیا۔ نوشا ایسا تاؤ آیا کہ ایک لمحے بھی انتظار نہ کیا۔ تابو توڑ اس کے جڑے پر کئی کے جڑ دیے۔ اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا اور وہ چکر اکر گر پڑا۔ پاس پڑوس میں کھلبلی مچ گئی۔ خاصا ہنگامہ ہوا۔ بات پروفیسر تک پہنچی۔ اس نے فوراً اس شخص کے پاس جا کر باقاعدہ معافی مانگی اور دس روپے اصرار کر کے تادان ہو دیا۔ نوشا ڈر کہ اب وہ اس پر ناراض ہوگا۔ مگر اس نے نوشا سے صرف اس قدر کہا۔

”تمہارے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ تمہیں انجینئر کی بجائے فوجی بننا چاہیے مجھے تمہاری اسپرٹ پسند آئی۔“

وہ دیر تک اس کی پیٹھ تھپک کر شاباشی دیتا رہا۔

پہلوئی کا بچہ: پہلا بچہ۔ دل خراش: تکلیف۔ دو: تادان: جرمانہ۔ اسپرٹ: طاقت، حیرت۔

بجلی کے تار جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا کسی کھنڈر کی  
روح بیت ناک نظر آتا تھا۔

ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اوپر فلیٹوں میں رہنے والوں میں سے کئی خاندان پورے کے پورے نڈر گور ہو گئے۔ بڑا برا وقت تھا۔ گہرا اندھیرا پھیلا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ فائر بریگیڈ لے رات بھر بلے سے زخمیوں کو نکالتے رہے۔ بارہ افراد اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے جن میں ۳ بچے اور ۳ عورتوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ ۵۵ زخمیوں کو نکال کر اسپتال پہنچایا گیا۔ بعض کی لاشیں بہت تازہ تھیں۔

میونسپلٹی میں ایک گروپ خان بہادر کے مخالفین کا بھی تھا۔ انہوں نے اس حادثے کی آڑ لے لے ایسے بیانات جاری کئے جن میں خان بہادر پر بحیثیت چیئرمین بہت سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ شہریوں کی جانب سے احتجاجی جلسہ بھی ہوا جس میں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ قلمی مقررین نے کھلم کھلا نیاز کا نام لیا۔ اس لیے کہ مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکیدار وہی تھا۔ صوبائی حکومت نے احتجاج سے مرعوب ہو کر اسپیشل پولیس کے ایک سینئر افسر کی نگرانی میں فوراً تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ خان بہادر پہلے ہی کیا کم پریشان تھا، اس اطلاع نے اسے اور سرا سمہ کر دیا۔ معاملہ بہت سنگین

سلطانہ خوش تھی کہ نیاز بچے سے اس قدر ریا کر رہا ہے۔ وہ خود بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ انہی نے اپنی جان کی بازی لگا کر اسے جنم دیا تھا۔ حالانکہ بچے کی پیدائش سے پہلے اکثر سوچا کرتی تھی کہ اسے ماں کی مانند دے سکے گی۔ سلطانہ کو اس کے خیال ہی سے نفرت ہوتی تھی۔ ایک روز جب راز افشا ہوا کہ وہ حاملہ ہے تو تمام دن روتی رہی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی نفرت بڑھتی گئی۔ وہ جل کر کبھی کبھی اسے کوٹنے لگتی۔ ”یا اللہ! یہ حرامی پیدا ہوتے ہی مر جائے۔“ اسی کوٹ میں وہ ہو گئی۔ جسم لاغر پڑ گیا۔ ان دنوں وہ ذرا سی بات پر نیاز کو جھڑک دیتی۔ بلیوں کی طرح غرا کر اسے آنکھیں ٹکالتی اور گھٹنوں بند کرے میں بیٹھی رویا کرتی۔ یوں بھی اس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر گزرتا تھا۔ وہ بہت ہی کم باہر نکلتی۔ گھر کے نوکروں تک کے سامنے آتے ہوئے خوف معلوم ہوتا۔ اس نے سوچا تھا کہ پیدائش کے فوراً ہی بعد گلا گھونٹ کر چپکے سے اسے ختم کر دے گی۔ اب یہ حالت تھی کہ اسے دیکھ کر جی رہی تھی۔ وہ ہر وقت بچے ہی کے کسی نہ کسی کام میں مہنہ رہتی۔ اسی کی بدولت وہ اب نیاز میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔ ورنہ اس نے ہمیشہ نیاز کی قربت۔ بیزاری محسوس کی تھی۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ کبھی بولتی بھی تو اس میں تنگی اور حقارت ہوتی اور دہلی دہلی سی نفرت۔ مگر اب یہ ہو تا کہ نیاز جب صبح ہی صبح بچے کو دیکھنے کمرے میں تو وہ دیر تک نیاز کے پہلو میں بیٹھی باتیں کیا کرتی۔ وہ نیاز سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ بچہ ان تعلقات کے درمیان مضبوط کڑی بن گیا تھا۔

گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ درودیوار انگاروں کی طرح تپتے۔ باہر احاطے میں خشک ہے دن کھڑکھڑاتے۔

روز افزای هوا: بهیچ کل جانا روز فایر هوا:

”اپنی پریشانی میں آپ نے ننھے کو بھی بھلا دیا۔ دیکھئے تو آپ کو کس طرح دیکھ رہا ہے“  
 نیاز نے بچے کو گود میں اٹھالیا اور اس کا رخسار چوم کر بولا۔ ”بیٹا تمہارے باپ کو سزا ہو گئی تو  
 ارمس کے ساتھ کھیلو گے؟“  
 سلطانہ نے فوراً کہا۔ ”آپ پر تو آج کل یہی بھوت سوار ہے۔“

نیاز مسکرا کر چپ ہو گیا۔ سلطانہ کچھ کہنے ہی جا رہی تھی کہ دروازے کی کھنٹی زور زور سے  
 بج گئی۔ نیاز نے بچے کو سلطانہ کی گود میں دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ برساتی میں پولیس کی گاڑی کھڑی  
 تھی۔ ایک انسپکٹر اور کئی مسلح کانسٹیبل دروازے پر موجود تھے۔ وہ گرفتاری کے وارنٹ لے کر آئے  
 تھے۔ انہوں نے اسی وقت اسے حراست میں لے لیا اور گاڑی میں بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے۔

نیاز کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو خان بہادر گھبرا گیا۔ اس نے جو اسکیم تیار کی تھی اس میں نیاز کی  
 زاری کے پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ خطرہ یہ درپیش تھا کہ مارکیٹ کے ٹھیکے سے جو منافع ہوا  
 ہاں میں سے ۸۰ ہزار روپے خان بہادر کے حصے میں بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو  
 اس ٹیکسٹری لگائی تھی اس کی تعمیر میں سینٹ اور لوہا بھی مارکیٹ ہی کے کوٹے سے گیا تھا۔ یہ سارا  
 نیاز ہی کے ذریعے ہوا تھا۔ اس نے سوچا نیاز کہیں گھبرا کر سب کچھ صاف صاف نہ اگل دے۔  
 نامور میں اس کے پھنس جانے کا قطعی امکان تھا۔

پہلی بار خان بہادر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل کترانے کے بجائے اسے نیاز کو اپنے  
 ٹھمنہ رکھنا چاہیے تھا۔ بہر حال اب جو کچھ ہو چکا تھا اس کا تدارک ضروری تھا۔ چنانچہ چند ہی روز  
 وال نے دوڑ دھوپ کر کے نیاز کو ضمانت پر رہا کر لیا۔

دوسرے مہینے تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کو دے دی۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ  
 کنک کی تعمیر میں جو میٹریل استعمال کیا گیا تھا وہ بہت ناقص اور غیر معیاری تھا مزید براں سینٹ کا  
 اسب بہت کم تھا۔ اس کی کوریٹ اور بھری سے پورا کیا گیا تھا۔ چھتوں پر کنکریت برائے نام ڈالی گئی  
 لہذا لوہا ضرورت سے بہت کم استعمال کیا گیا تھا۔ یہ سارے الزامات نیاز کے خلاف تھے۔

تحقیقاتی کمیٹی نے حکومت سے پرزور سفارش کی تھی کہ ٹھیکیدار کے خلاف سخت کارروائی کی  
 جائے۔ اس کی بدعنوانیوں کے باعث ۱۲ شہریوں کی قیمتی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ سات افراد اپنے

اپنے تدارک: روک تھام۔

ہو گیا تھا اور مخالفین تلے ہوئے تھے کہ اسے جیڑمین کے عہدے سے ہٹائے بغیر نہ رہیں گے۔  
 خان بہادر نے اس صورتحال سے گھبرا کر میونسپلٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور ساری ذمہ  
 داری نیاز پر ڈال دی۔ اس طرح عدم اعتماد کی تحریک اس کے خلاف کارگر نہ ہو سکی۔ مخالفین کو مزہ  
 کی کھانا پڑی۔

میونسپلٹی کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد وہ تحقیقاتی کمیٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ جو پولیس  
 افسر اس کا گراں مقرر ہوا تھا اس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ معلوم ہوا کہ وہ عنقریب ریٹائر  
 ہونے والا ہے۔ خان بہادر کو یہ اطلاع ملی تو ہاتھ اونچا کر کے بولا۔  
 ”بس اب کام بن گیا۔“

خان بہادر اس افسر سے ملا۔ آدمی تجربہ کار تھا۔ اس کی باتوں سے تھوڑی ہی دیر میں خان  
 بہادر کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ بن سکتا ہے۔ اس نے ۲۰ ہزار روپے منحل کے ڈبے میں رکھ کر اسے  
 ”نذرانہ“ دیا اور بقول ٹھٹھے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

تحقیقات ہوتی رہی۔ خان بہادر حسب معمول روزانہ شام کو اس کالج کے تین چار بیگ چڑھاتا  
 اور رات گئے تک رمی کھیلتا۔ البتہ نیاز کی آمدورفت اس نے اپنے یہاں بالکل بند کرادی اور یہ مشورہ  
 دیا کہ کچھ عرصے کے لیے وہ شہر سے باہر چلا جائے۔ نیاز پہلے تو تیار ہو گیا۔ پھر اس کی سمجھ میں خود ہی  
 یہ بات آگئی کہ غیر حاضری سے خواہ مخواہ شبہ پیدا ہوگا۔ لہذا اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

نیاز کے لیے یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ وہ گھر میں بہت کم رہتا۔ دوڑوڑ کے ان ٹھیکے داروں  
 کے پاس جاتا جن کے ذریعہ اس نے مارکیٹ بنوائی تھی۔ گھر میں جتنی دیر رہتا کھویا کھویا سا بے چینی  
 کے عالم میں ٹھہرتا۔ اکثر رات گئے بستر سے اٹھ کر سلطانہ کے پاس آتا اور اس سے اوٹ ہانگ  
 باتیں شروع کر دیتا۔

\*\*\*

نیاز ایک رات سلطانہ کے پاس کمرے میں بیٹھا تھا۔  
 باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ باڈل زور زور سے گرج رہے تھے۔ بچہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔  
 وہ ہمک ہمک کر نیاز کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لیکن نیاز بڑا افسردہ تھا۔ سلطانہ نے دل جوئی کی کوشش کی۔  
 بچے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

لہجے تھے اور نگاہیں کتاب پر جمی تھیں۔ ذرا دیر بعد نادرہ کی آواز ابھری۔ ”نوشا یہاں آؤ۔“ وہ چپ چاپ جا کر اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش کھڑی رہی۔ سامنے حد نظر تک روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں کے جھلکتے ہوئے درجوں نے چٹانوں کو دیا تھا۔ رم جھم رم جھم بینہ برس رہا تھا۔ دور افق پر بار بار بجلی کڑک رہی تھی۔ ہوا کے لپکے جھونکوں سے نادرہ کے بالوں کی ایک لٹ بکھر کر رخسار پر لہرا رہی تھی۔ چند منٹ بعد نادرہ نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے آج رات بھر بارش ہوگی۔“

نوشا نے مختصر جواب دیا۔ ”ہاں“

اچانک نادرہ نے بڑا بے تکاس سوال کیا۔ ”نوشا تم نے کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔

”تم سخت بور معلوم ہوتے ہو۔“

نوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ننھی ننھی بوندوں کی جھار روشنی کے پس منظر میں لہراتی رہی۔ ہوا میں لپک لپکی خشکی تھی۔ نادرہ کا جسم بار بار تھر تھرا کے رہ جاتا۔ وہ بے چین نظر آ رہی تھی۔ اس نے نوشا کو جانب دیکھے بغیر پوچھا۔

”تم نے کسی لڑکی کو پیار بھی نہیں کیا؟“

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ نوشا کو اس کی بات بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ شرما کر بولا۔

”نہیں“

اس دفعہ نادرہ نے گھوم کر اس کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”سچ؟“

نادرہ کی نظریں نوشا کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیوں کا جھلسلا رہا تھا۔ اس نے ابھی ہوئی آواز سے کہا۔ ”نوشا!“

اور نوشا نے بے اختیار اپنا منہ اس کے ہونٹوں کی جانب بڑھا دیا۔

عین اسی وقت کمرے میں کوئی آہستہ سے کھکھار۔ نوشا نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پروفیسر کھڑا ٹیبلنگ کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی گول گول آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ کر

جسوں کے اکثر اعضاء ضائع کر کے لپاچ ہو گئے اور لاکھوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔

رپورٹ میں جبکہ جبکہ نیاز کے خلاف ٹھیکیدار کی حیثیت سے سنگین الزامات لگائے گئے تھے اسے ہر طرح جانی اور مالی نقصانات کا ذمہ دار قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ گو کہ یہ رپورٹ ہنوز کانفیڈنشل تھی مگر خان بہادر کو اس کی ایک نقل مل گئی۔ نقل کے ملتے ہی وہ بدحواس ہو گیا۔ اب نیاز اسے اپنی سلامتی کے لیے بے حد خطرناک نظر آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ معاملہ عدالت کے دروازے بھی جائے گا اور وہاں نیاز کا بیان بھی لیا جائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد خان بہادر کو اپنی گلو خلاصی کے لیے ایک ہی راستہ نظر آیا۔ اور وہ تھا نیاز کا مصیاب۔ نیاز کو قتل کئے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس کی موجودگی سے خان بہادر کو ہر وقت خطرہ درپیش تھا نیاز اس کے خلاف سارے ثبوت مہیا کر سکتا تھا۔

نیاز کے قتل کا پورا منصوبہ خان بہادر تیار کر چکا تھا۔ اسے صرف ایک شخص کا انتظار تھا جو ان دنوں راولپنڈی میں تھا۔ اور جلد ہی آنے والا تھا۔

(۴)

ہلکی ہلکی بوند ا باندی ہو رہی تھی۔

آسمان پر گھٹا چھائی تھی۔ کمرے میں نرم نرم بھیکے ہوئے جھونکے آرہے تھے جن میں برسات کے پہلے چھینٹنے کی مہک تھی۔ نادرہ گردن جھکانے کا غذیر آہستہ آہستہ لکھ رہی تھی۔ اس کے برابر ہی نوشا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ابتدائی کلاسوں کی کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی۔ گزشتہ کئی مہینوں سے وہ پابندی کے ساتھ نادرہ کی نگرانی میں پڑھ رہا تھا۔

نادرہ نے لکھتے لکھتے فاؤنٹین پن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور تھکی ہوئی سی انگڑائی لی۔ ٹیبل ٹیپ کی ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کے جسم پر لہروں کا مد و جزر پھیلتا چلا گیا۔ نادرہ ذرا دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی پر چلی گئی۔

نوشا کتب کے کسی طالب علم کی طرح جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ

”بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

نوشا کمرے سے باہر نکلا۔ پروفیسر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے گھر کا دروازہ کھولا۔ نوشا سہا ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے دروازے کا بولٹ چڑھانے کی آواز سنی۔ اندر ہم گردش میں قدموں کی آواز آہستہ آہستہ ابھری۔ چوبی زینے پر ٹھپ ٹھپ کا دبا دبا شور ہوا۔ زینر اوپر جا رہا تھا۔

\*\*\*

نوشا دروازے کے باہر کھڑا ایک ایک آواز ایک ایک آہٹ سنتا رہا۔ ابھی تک بوند باندی ارسی تھی۔

آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ اسے رہ رہ کر پروفیسر پر غصہ آرہا تھا۔ سالانہ کا ٹھکانہ ہے۔ بد دم چریا۔ نہ جانے کیسی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔

لیکن اس گھر سے نکلنے کا اسے بہت افسوس تھا۔ کئی سال بعد اسے گھریلو ماحول ملا تھا۔ جہاں وہ ٹٹ تھا، مطمئن تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسکول میں پڑھنا شروع کر دے گا۔ بغل میں موٹی موٹی اٹل دبا کر ٹھاٹھ سے پڑھنے جائے گا۔ پھر وہ میٹرک کا امتحان پاس کر لے گا۔ نادرہ نے یہی کہا تھا مگر سالانی نے تو انگریزی کا سبق پڑھاتے پڑھاتے پیار و محبت کا سبق پڑھنا شروع کر دیا اور اس طرح رانگیا کہ اپنا ذہنی گول ہو گیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

نادرہ پر اسے طیش آرہا تھا اور وہ اسے یاد بھی آئی۔ وہ چھریے جسم کی نازک اور دلکش لڑکی جو نہایت پر اسے ڈانٹتی چھٹکارتی تھی اور جس کے ناراض ہونے میں اسے حرا آتا تھا۔ اب وہ اسے دیکھ کر گایہ سوچتے سوچتے دل بوجھل ہو گیا۔ اس نے بڑی بے چارگی کے عالم میں سوچا کہ وہ کراچی لڑے گا۔ سیدھا مالک کے پاس جائے گا۔ سب سالانہٹ راگ ہے۔ بس اب گھر چلنا چاہیے۔

اسی وقت اس نے طے کیا کہ سویرے کی ٹرین سے چلا جائے گا۔ کراچی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لڑے گا۔

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور رات سر پر کھڑی تھی۔ نوشا نے اسٹیشن کے مسافر نے رات بسر کرنے کا پروگرام بنایا۔ معارجہ یاد آگیا۔ سوچا چلتے چلتے اس سے بھی مل لینا

لڑکی کا نام ہوا: آشیانہ: ٹین: مگنولہ: چھریا: دہلا پتا: کھٹ راگ: بکواس: مصیبت۔

کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ گردن اونچی کئے باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ نوشا اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ پروفیسر نے انگلی کے اشارے سے نوشا کو اپنے قریب بلایا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“

نوشا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینے کی سیزھیاں طے کیں اور نیچے آگئے۔ پروفیسر کمرے کا دروازہ قہقہہ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔ ”قطعی ناقابل برداشت۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ یہ انسانی ہمدردی کا بے جا استعمال ہے۔“ اچانک وہ غضب ناک ہو کر دھاڑا۔

”کیا سمجھتے تم؟“

نوشا سر جھکائے لمزموں کی طرح کھڑا رہا۔ پروفیسر کہنے لگا۔ ”مسٹر! تم اس کمرے کو فوراً خالی کر دو۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ تم کو وقت نہیں دے سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ دہلیز کے پتوں کی پھیل کر کھڑا ہو گیا۔ نوشا ہکا بکا کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔

”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے، ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو، جب کترے ہو، اٹھائی گیرے ہو۔ میں تم کو اس بات کا ہرگز حق نہیں دے سکتا کہ تم میری بیٹی کے ساتھ فلٹ کرو۔ تم اور نادرہ مل کر مکمل اکائی نہیں بن سکتے۔ وہ خط مستقیم ہے اور تم خط منحنی۔ دو غیر مساوی مقداریں۔ تم مسئلہ فی التناسب سمجھتے ہو؟“

نوشا ہوتق کی طرح خاموش کھڑا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر زور سے چیخا۔ ”میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ تین منٹ ہو چکے ہیں۔ پانچویں منٹ ہ تمہارا ایک قدم گھر کے باہر ہونا چاہیے۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔“

نوشا نے گھبرا کر جلدی جلدی اپنا سامان ایک چادر میں باندھا اور گھٹری اٹھا کر بغل میں دبالی۔ پروفیسر نے معائنہ کرنے والے انپیکٹر کی طرح نوشا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔

اٹھائی گیرا: اچانک: جب کتر: فلٹ: مجموعی مبت: خط مستقیم: سیدھی کیر: خط منحنی: بیرونی کیر۔

رانی کی سوچھی ہے۔ سارے تجھے کبھی عقل نہ آئی۔“

راجہ کھیٹا ہو کر بولا۔ ”یار یوں ہی دل پشوری کر لیتے ہیں۔ تو آگیا تو ذرا بات چیت بھی لے۔ ورنہ شام سے اکیلا پڑا ہوں۔ بخار بھی ہے۔“

راجہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا نے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھا۔ وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ اچانک سارے کپڑے بارش کی بوچھاڑ سے بھیگ گئے تھے۔ وہ اس وقت دھوبی کی تاند میں پڑے اپنے تیلے کپڑوں کی پوٹ معلوم ہو رہا تھا۔

”اے تو نے کچھ کھایا یا بھی؟“ نوشا نے پوچھا۔

راجہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، بھوک ہی نہیں لگی۔“

”اچھا لے ایک سکرٹ تو پی۔“

”یار نوشے! کیا بات کہی تو نے۔ قسم اللہ کی دل خوش کر دیا۔“

دونوں نے سکرٹ میں سلاخیں اور لمبے لمبے کش لگانے لگے۔ بارش کے قطرے تہپال پر ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔ ہوا سرد تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نوشا نے دیوار سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ راجہ پر بھی نیند کی غنودگی طاری ہو گئی۔ دونوں ٹک کر سو گئے۔



رات کے پچھلے پہر نوشا کی آنکھ کھل گئی۔

کتا بارش سے بھیگ کر کوں کوں کرتا ہوا اس کی ٹانگوں کے اندر گھس گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بھاڑ کٹے کو گالیاں دینے لگا۔

”دھت تیرے کی۔ مار دیا سارے نے۔“

راجہ بھی اس کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ ”اے نوشے! کیا ہو گیا؟“

نوشا چل کر بولا۔ ”ہو کیا گیا۔ یہ سالہا تیرا کتا ہے۔ حرامی پن کر رہا ہے۔ تو نے بھی کیا جھیلنا مارا کتا ہے۔“

راجہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”یار انسانوں کا ساتھ تو چھوٹ گیا۔ اب جانوروں سے بھی

لڑائی ہو رہی ہے۔ دل نہ لگے۔ تاند بڑا کڑوا پوٹ۔ گھری۔ جھیلنا۔ سمجھت۔

چاہیے۔ جانے اب اس سے کبھی ملاقات ہو بھی کہ نہیں۔

پروفیسر کے دروازے پر کھڑے ہونے سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ نوشا نے گھڑی سر پر رکھی۔ آگے بڑھا اور سڑک پر چلنے لگا۔

وہ راجہ کے پاس پہنچا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ راجہ ایک کونے میں سکرٹ اسکرٹ لپٹا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک کتا لیٹا تھا۔ تہپال سے بارش کا پانی ٹپ ٹپ کر رہا تھا۔ اندر کچھڑ تھی، سڑاند تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ نوشا ٹھٹھک کر باہر ہی رہ گیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی بھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتا غرا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ ساتھ ہی راجہ کی آواز ابھری۔

”کون ہے؟“

نوشا نے بے تکلفی سے کہا۔ ”اے یار میں ہوں نوشا۔ پر یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔“

”اے اپنی قسمت میں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“ راجہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”باہر کیوں

کھڑا ہے۔ اندر آ جا۔“

نوشا گردن جھکا کر اندر داخل ہوا تو منتھوں پر تیز بونے اچانک حملہ کر دیا۔ وہ چپ چاپ جا کر راجہ کے قریب بیٹھ گیا۔

راجہ نے پوچھا۔ ”اس وقت بارش میں کیسے آگیا؟“

نوشا نے جواب دیا۔ ”میں صبح کی گاڑی سے گھر جا رہا ہوں۔“

”ج؟“ راجہ کو یقین نہ آیا۔ ”یار ٹھیک ٹھیک بتا۔“

”اے میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”مگر تو تو کہتا تھا کہ میں نے پڑھائی شروع کر دی ہے۔ اسکول میں نام لکھوانے والا ہوں۔“

میٹرک کا امتحان دوں گا یہ کروں گا، وہ سارا پروگرام کیا ہو گیا؟“

”بات تو کچھ ایسی ہی تھی پر یاد اپنی سالی تقدیر ہی کھوٹی ہے۔“

راجہ گردن ہلا ہلا کر اپنی بھونڈی اور بے سری آواز سے گنگٹانے لگا۔

تقدیر بنی بنی بن کر بگڑی دنیا نے ہمیں برباد کیا

نوشا نے بیزار سے کہا۔ ”اے بند کر اپنی یہ بھیر دیں۔ میں بات کر رہا ہوں اور تجھے گلے

سڑاند۔ کسی شے کے سڑنے کی بدبو۔ بھائی دیا۔ نظر آتا۔ دل گرفتہ۔ رنجیدہ۔ ہمکن۔ بھیر دیں۔ ایک آدمی جو صبح کے وقت مٹی پالتا۔

دوستی نہ کروں۔“

کہا۔

”تھوڑی دیر اور ٹھہر جا۔ ایک تیرا ہی تو سہارا رہ گیا تھا۔ اس دنیا میں اب اپنا کوئی نہیں رہا۔“ اس کی آواز بھرائی گئی۔ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اس نے تڑپ کر نوشا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس پر اپنا منہ رکھ کر بولا۔ ”نوشے! خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ میرا کوئی نہیں۔ ہائے میرا کوئی نہیں رہا۔“ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگا نوشا کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر راجہ کے چہرے پر ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

دونوں کچھ دیر اسی طرح روتے رہے۔ ان کی سسکیاں گہری خاموشی میں ابھرتی رہیں۔ پھر راجہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے نوشا سے کہا۔

”جاو! تجھے دیر ہو رہی ہے۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہوگی۔“

نوشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور راجہ کو دے دیا۔ اس نے اپنی گھڑی اٹھائی اور آگے بڑھا۔

باہر آکر اس نے مڑ کر راجہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ نوشا کو کتے دیکھ کر وہ تنہی سے بولا۔ ”یار اب تو جا۔ کیوں خواہ مخواہ دیر کر رہا ہے۔“ یہ کہتے کہتے کھانسی کا ادھڑا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا بڑھ کر مڑک پر آگیا۔ دور تک راجہ کی کھانسی اسے سنائی دیتی رہی۔

وہ اسٹیشن پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اس نے ٹکٹ خریدا اور تیسرے درجے کے لمبے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی گاڑی چھوٹنے میں دیر تھی مگر مسافروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔

گھنٹہ بھر بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ ڈبا مسافروں سے کچھ کچھ بھرا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ باتیں کہہ رہے تھے۔

نوشا ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اسے اپنا شہر یاد آ رہا تھا۔ اپنا محلہ اور محلے کی وہ گلی جس کے کونے پر میونسپلٹی کی لائین تھی۔ جہاں راتوں کو سب لڑکے مل کر کھیلتے تھے۔ اودھم مچاتے تھے۔ لڑکی نیچی نیچی دیواروں والے وہ مکان جن میں اس کا بھی گھر تھا اماں، سلطانہ اور آٹو۔ نہ جانے سب کب کیسے ہوں گے؟ اسے دیکھ کر کیا کہیں گے؟ ایک کے بعد دوسرا خیال۔ ایک یاد کے بعد

ایک یاد۔

اس کے لہجے میں بلا کا کرب تھا۔ نوشا کانپ اٹھا۔ مینہ برسا بند ہو گیا تھا۔ آسمان شفاف نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی کانوری روشنی پھیلنے لگی تھی۔ نوشا نے جھک کر باہر دیکھا۔

”سویرا ہونے والا ہے۔ اب میں اسٹیشن چلوں گا۔“

”اے چلا جانا۔ تھوڑی دیر تو اور بیٹھ۔“

نوشا کے پاس اس وقت ۴۰ روپے تھے اور کچھ ریزگاری۔ اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور راجہ کو دیتے ہوئے بولا۔

”لے یہ روپے رکھ لے۔“

”نہیں یار، میں تیرے روپے نہیں لوں گا۔ میرا تو کسی نہ کسی طرح کام چل ہی جاتا ہے۔ تو اتنے دنوں بعد گھر جا رہا ہے۔ خالی ہاتھ جائے گا تو سب کیا کہیں گے؟“

نوشا اصرار کرنے لگا۔ مگر راجہ نے نوٹ نہیں لیا۔ ”تو مجھے ایک سگرٹ اور پلاوے۔ گلاسک رہا ہے۔“

دونوں نے ایک ایک سگرٹ سلگائی۔ تمباکو کا دھواں ہر طرف بکھر گیا۔ راجہ نے نیچے کے نیچے سے ٹٹول کر بڑا سا چاقو نکالا۔ نوشا کی طرف بڑھا کر بولا۔

”لے اسے رکھ لے۔ کچھ کام ہی دے جائے گا۔ میرے لیے تو اب یہ بیکار ہو گیا ہے۔“

”میں نے چاقو تو اور کھنا چھوڑ دیا ہے۔“ نوشا نے چاقو لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ”اے تو اپنے ہی پاس رکھ۔“

”تو اسے میری نشانی ہی سمجھ کر رکھ لے۔“ اس کی آواز دردناک ہو گئی۔ ”میرے پاس رہے گا تو کسی دن اپنے ہی ہاتھوں اپنا سینہ نہ چیر ڈالوں۔ یا رسائی اس زندگی میں رکھائی گیا ہے۔ تھکے

ایسے جینے پر۔“

نوشا نے چاقو لے کر چپ چاپ اپنے پاس رکھ لیا۔ راجہ کے چہرے کو دیکھا جو صبح کا ذب کی دھندلی دھندلی روشنی میں براخونفاک نظر آ رہا تھا۔ راجہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ وہ بار بار بے چینی سے کروٹ بدلتے لگتا۔ آخر جب نوشا اٹھ کر جانے لگا تو راجہ نے عاجزی

بلا کا کرب: بہت زیادہ دکھ۔ دردناک۔ دکھ بھری۔ صبح کا ذب: صبح کی روشنی جس کے بعد مہماندہ میرا چھا جاتا ہے۔



نوشا کادل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے صرف ایک لفظ کہا۔ ”کیا؟“  
”اس گھر میں تو حاجی رحیم بخش رہتے ہیں۔“

نوشا نے گھبرا کر کہا۔ ”اور میری اماں؟“

شامی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”ان کا تو دو سال ہوئے انتقال ہو گیا۔“

نوشا کے سینے پر زبردست گھونسا لگا۔ وہ شامی کے گلے سے پٹ کر بے اختیار رونے لگا۔ دیر  
اس کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ ”میری بڑی بہن اور اٹو  
ا ہیں؟“

شامی نے ٹالنا چاہا۔ ”تمہارے جانے کے بعد گھر میں بڑی عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔ تم  
رے ساتھ گھر چل کر بیٹھو تو اطمینان سے سب کچھ بتاؤں گا۔ بڑی لمبی داستان ہے۔“

نوشا نے اصرار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”یاد رکھو تو بتا دے۔ تو نے مجھے یہ خبر بتا کر بے  
ت مار دیا۔ ہائے اماں تم کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔“ نوشا پھر منہ بسور کر رونے لگا۔

”اچھا اب تم رکشے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو راستے میں بتا دوں گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ  
نے لگا تو گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔“

نوشا رکشا پر سوار ہو گیا۔ شامی نے پیڈل پر پیر مارا۔ رکشا آگے روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر جانے  
بعد نوشا نے اپنا سوال دہرایا۔ ”یاد رہے تو بتا دے کہ سلطانہ اور اٹو کہاں ہیں؟“

”اٹو کی نہ پوچھ۔ اس سالے نے تو ناک کٹوا دی۔“

”کیوں؟“ نوشا نے چونک کر پوچھا۔

”سالا بیجروں کے ساتھ رہتا ہے۔ روزانہ شام کو خوب پوڑو دوڑ لگا کر ان کے ساتھ بازار  
لھومتا ہے۔ پھنچا پھٹ تالیاں بچارتا ہے۔ عورتوں کی طرح اٹھلا کر کمر لچکا تا ہے۔ اسے ذرا  
ٹرم نہیں آتی۔ یار برا نہ ماننا۔ میرا بھائی ہوتا تو سالے کے چار کٹوے کر کے ڈال دیتا۔ اس نے  
باغیچہ کی حد کر دی۔“

نوشا کا خون کھول اٹھا۔ تڑپ کر پوچھا۔ ”وہ سالار ہتا کہاں ہے؟“

”نہ جانے کہاں رہتا ہے۔ پر شام کو بازار میں ضرور نظر آتا ہے۔“

نوشا نے ایک لمبی ”ہوں“ کی۔ پوچھا۔ ”سلطانہ کا بھی کچھ اتا پتا ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے؟“

خیالات کا سلسلہ تھا کہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ ٹرین آہنی پٹریوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اور وہ  
یادوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا تھا۔

\*\*\*

نوشا ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے خاموشی سے پلٹ  
فارم طے کیا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گیا۔ ایک رکشا والے کی جانب بڑھتے ہوئے شہر ہوا کہ  
کہیں اسے دیکھا ہے۔ وہ دہلا پتا نوجوان تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں اور اندر  
دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔

رکشا والے نے بھی غور سے دیکھا اور جیج کر بے اختیار اس کے گلے سے چٹ گیا۔

”ابے نوشے تو آ گیا؟“

وہ شامی تھا۔ اس سے مل کر نوشا کو بڑی خوشی ہوئی۔ ”ابے یہ دھند اتو نے کب سے شروع  
کر دیا؟“

شامی مری ہوئی آواز سے بولا۔ ”یار بکے مرنے کے بعد تو سالی معیتوں نے اپنا گھر دیکھ لیا۔“  
”ابے تیرے لبا کا انتقال ہو گیا۔ کب؟“

”یار ان کو مرے ہوئے یہ تیسرا سال ہے۔“

نوشا نے پوچھا۔ ”دکان بھی تو تھی تیری؟“

”وہ تو بکائی بیماری کے زمانے ہی میں بیچ دی تھی۔“ شامی اپنی پریشانیاں سناتے لگا۔ وہ صبح کے  
وقت ابھی تک اخبار بیچتا تھا اور رات کو سائیکل رکشا چلاتا تھا۔ گھر میں سات کھانے والے تھے اور ان  
سب کا بوجھ تھا اس کے کندھوں پر تھا۔ اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ وہ رک رک کر کھانسی  
رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے نوشا سے پوچھا۔

”مگر اس وقت تم جاؤ گے کہاں؟“

نوشا کو اس کے سوال پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ ”گھر جاؤں گا اور کہاں؟“

”کونسا گھر؟“ شامی نے دریافت کیا۔

نوشا گھبرا گیا۔ ”ابے کیا اڑا رہا ہے؟ اپنے گھر جاؤں گا۔ وہی گلی والا گھر اور میرا کونسا گھر ہے۔“

شامی نے گردن نیچی کر لی اور رساں سے بولا۔ ”تو یار تجھے کچھ بھی پتہ نہیں؟“

برہمی سے چند کئے کما لیا تو مجھ پر رعب جھاڑ رہا ہے۔ یہ روپیہ اپنے پاس رکھ۔ صبح گھر آتا۔ دونوں اچھ کھانا کھائیں گے۔ اور دیکھ نیاز کے ہاں تیرا زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ ”وہ اچک کر رکشا پر سوار ہو پڑا۔ پیر مارا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

نوشا کو ٹھکی کے پھانک پر خاموش کھڑا رہا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ البتہ ایک کھڑکی سے ہلکی لاروشنی پھوٹ رہی تھی۔ مگر یہ روشنی اس قدر دھیمی تھی کہ تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ نوشا نے آہستہ سے پھانک کھولا اور احاطے کے اندر چلا گیا۔ مگر برساتی کی طرف جانے کے بجائے وہ جنوں کی جانب مڑ گیا۔ وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلے لگا۔ خشک پتے اس کے پاؤں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بار بار چونک پڑتا۔

اس نے آہستہ سے جوتے اتارے اور درختوں کے نیچے ایک طرف رکھ دیئے۔ قریب ہی لائٹری بھی رکھ دی۔ اس نے دے دے قدموں چل کر کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ ہر طرف سے مانہ کیا۔ پھر اپنی گھڑی کے پاس آیا۔ چاقو نکال کر کھولا اور اسے دانتوں میں دبا کر دیوار پر چڑھ گیا۔ ٹی کے اندر گہری خاموشی تھی۔ وہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر چلا گیا۔ اور ہولے ہولے قدم مارا۔ اس کے کمرے کے قریب پہنچا جہاں روشنی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

اس نے برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لے کر کمرے کے اندر نظر ڈالی۔ نیاز سامنے صوفے ایک طرف جھکا ہوا نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک رک کر گہری سانس بھر رہا تھا۔ ناآہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ نیاز کو ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا خاموشی سے اس کے اندر چلا گیا۔

اچانک اس کا حیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ آہٹ ہوئی۔ نیاز نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے ناگودیکھا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا نوشا آن کی آن میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو فٹس تھا۔ اس نے پہلا ہی وار بھر پور کیا۔ تین پسلیاں چیر ڈالیں۔ نیاز زور سے چیخا۔

”ہائے مار ڈالا۔“

وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر پڑا۔ نوشا ایک ٹانگ کے بل جھک کر بیٹھ گیا اور پے پے کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے نیاز کے سینے کو، پیٹ کو، گردن کو، بازوؤں کو، ہر حصے کو چیر ڈالا۔

اللہ برائی، عمل خاموشی۔ پے پے۔ مسلسل۔

شامی اس وقت سڑک کی چڑھائی پر رکشالے جا رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوشا نے دروازہ پر بعد اپنی بات دہرائی تو اس نے بتایا۔

”وہ تو نیاز کے ساتھ رہتی ہے۔“

نوشا بھونچکا ہو کر بولا۔ ”نیاز کے ساتھ؟“

”ہاں بے وہی نیاز کبڑیا جس کی بازار میں دکان تھی۔ اب تو وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایک دم صاحب بہادر لگتا ہے۔ کوٹ پتلون پہنتا ہے اور موٹر کار سے نیچے بات نہیں کرتا۔ یار اس کے تو بڑے ٹھٹھے ہیں۔ دیکھے گا تو پہچان بھی نہ سکے گا۔“

”مگر سلطانہ اس کے یہاں کیوں چلی گئی؟“

”یار! بات یہ ہے تاکہ تیری اماں نے نیاز سے نکاح پڑھو لیا تھا۔ تو ناراض نہ ہو تو ایک بات بتاؤں۔“ شامی نے بات کہتے کہتے قدرے تامل کیا، پھر دبی زبان سے بتایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ سلطانہ کی اور نیاز کی کچھ لگ سٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے نیاز نے تیری اماں کو مروادیا۔ سارے ٹکے والے یہی کہتے ہیں۔“ وہ رکشالا تاجار ہاتھ اور رک رک کر بول رہا تھا۔ ”سارے نے بہت حرای پن کیا۔ ایک نمبر بد معاش ہے۔“

نوشا خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے شامی سے دریافت کیا۔ ”تجھے نیاز کا گھر معلوم ہے؟“

”ہاں معلوم ہے۔“

”تو مجھے وہیں لے چل۔“

”یار اس وقت وہاں جا کر کیا کرے گا وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔“

وہ نیاز کی کوٹھی پر جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ شامی نے مجبوراً رکشا اس طرف موڑ دی۔ اب نوشا بہت کم بول رہا تھا۔ کبھی کبھار ہوں ہاں کر دیتا۔ شامی رک رک کر ٹکے کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا۔

نیاز کی کوٹھی کے پھانک پر پہنچ کر شامی نے رکشا ٹھہرایا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ نوشا نے رکشا سے اتر کر شامی کو کرائے کا ایک روپیہ دینا چاہا تو اس نے خفا ہو کر گالی دی۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ ”یار!

بھونچکا: حیران۔ غصا: شان و شوکت، غماض: ہٹ۔ تامل: وقفہ۔ لگ سٹ: مروادتی، محبت۔

نوشا کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے پیر کو زور سے جھٹکادیا۔ سلطانہ لڑھک کر دوڑ جا گری۔ وہ  
نوشا کو اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سلطانہ فرش پر پڑی ہوئی رک رک کر کہہ رہی تھی۔

”نوشا، خدا کے لیے رک جا!“

”نوشا! نوشا!“

اس کی آواز دیر تک ابھرتی رہی۔

نوشا کو ٹھنی سے نکل کر بائیسچے میں آگیا۔ درختوں کے خشک پتوں پر اس کے قدموں کی آہٹ  
باف سناٹی دے رہی تھی۔ کوٹھلی میں خادمہ بدحواس ہو کر زور زور سے چیخ رہی تھی۔ نوشا نے احاطہ  
لے لیا۔ پھانک کھولا اور باہر سڑک پر آکر بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں خون سے  
نمزا ہوا چاقو تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن جا رہا تھا۔

ٹھپ، ٹھپ، ٹھپ۔

سنان سڑک پر نوشا کے قدموں کی آواز رک رک کر ابھرتی رہی۔

نیا زکاجیتا جیتا خون کمرے میں ہر طرف پھیل گیا۔ وہ ذرا دیر تک تڑپتا رہا، کراہتا رہا۔ پھر اس نے دم  
توڑ دیا۔



نوشا لاش کے سر ہانے بیٹھا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ خون سے بھرا ہوا چاقو ابھی تک ہاتھ میں  
تھا۔ اسی اثنا میں کمرے کے باہر آہٹ ابھری۔ نوشا نے پلٹ کر دیکھا۔ سلطانہ کمرے میں داخل ہو  
رہی تھی۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نوشا کو دیکھا۔ پھر نیا زکاجیتا خون میں ڈوبی ہوئی لاش دیکھی۔  
اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔

”ہائے نوشا تو نے یہ کیا کر دیا۔“

نوشا خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھنے  
لگا۔ سلطانہ اس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر سر اسیمہ ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”اب تو  
کہاں جا رہا ہے؟“

نوشا نے خونخوار نظروں سے اسے مڑ کر دیکھا۔ گردن ہلا کر بولا۔ ”تھانے!“ اس کی آواز  
ڈھول کی طرح گر جدار تھی۔

سلطانہ جھپاک سے آگے بڑھی۔ دروازے پر پہنچی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔  
”میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔“

نوشا غرا کر چیخا۔ ”ہٹ جا حرازدی چھال میرے سامنے سے۔ نکلے کر کے یہیں تیرے  
یار کے پاس ڈال دوں گا۔“

وہ پاگلوں کی طرح بولتی چلی گئی۔ ”تو مجھے بھی مار دے۔ تو مجھے بھی مار دے۔“  
نوشا نے قریب پہنچ کر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی۔ نوشا کمرے  
سے باہر نکل گیا۔

سلطانہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ”نوشا میرے بھائی۔ اللہ کے لیے رک جا۔  
میری بات تو سن لے۔“ وہ گڑگڑا کر رونے لگی۔

بعد میں دفتری امور کے سلسلے میں سلمان کو بارہا اس سے ملنا پڑا۔ اور ہر بار اس نے محسوس کیا کہ جعفری میں افسروں والی روایتی رعوت نام کو نہ تھی۔ مسکرا مسکرا کر نرمی سے بات کرتا۔ اپنے انہوں کے ساتھ اس کا انداز شفقانہ ہوتا۔ اپنے اسی رویے کی بدولت وہ انہیں ناراض کئے بغیر زیادہ سے زیادہ کام کراتا تھا۔ یہ تکنیک اس نے سال بھر کی ٹریننگ میں بڑی مہارت کے ساتھ سیکھی تھی۔ دفتر کے مقررہ اوقات کے علاوہ اگر وہ سلمان کو روکنا چاہتا تو پوچھتا۔

## فصل چہارم

(۱)

”مسٹر سالو من! کیا میں دریافت کر سکتا ہوں آج شام کے لیے آپ کا کیا پروگرام ہے؟“  
سلمان فوراً سمجھ جاتا کہ اس استفسار کا کیا مطلب ہے۔ اگر اس کا کوئی پروگرام بھی ہو تا تب ہی اس کا اظہار نہ کرتا۔ اس لیے کہ وہ اسے ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بلا جھجک کہہ دیتا۔ ”جی نہیں، آج شام میرا کوئی خاص پروگرام نہیں۔“

جعفری بڑے رسمی انداز سے کہتا۔ ”کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کی اس شام کا بوقت لے لوں؟“ اس کے بعد وہ کوئی کام سلمان کے سپرد کر دیتا۔

اکثر وہ سیکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح سلمان کو بھی اتوار اور دوسری چھٹیوں پر بلا لیتا۔ تب بھی ایسی ضرورت پیش آتی تو وہ کھنٹی بجاکر پہلے چپرا سی کو بلاتا۔ کینٹین سے چائے یا کافی منگواتا اور اپنا امریکی برانڈ کا سگریٹ پیش کر کے کہتا۔

”مسٹر سالو من! کیا آپ اپنی ڈائری دیکھنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ میں دریافت کرتا ہوں گا کہ اتوار کے لیے آپ کے کیا کیا انگیجمنٹس ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ آپ آؤٹنگ کے موڈ لا تو ہرگز نہیں ہیں اور پکنک کے لیے موسم بڑا ف ہے۔“

سلمان بغیر ڈائری دیکھے کہہ دیتا۔ ”میری ڈائری میں اس اتوار کا صفحہ بالکل خالی ہے۔“  
جعفری سر پر ستانہ انداز میں مسکرا کر کہتا۔ ”اس عمر میں لڑکوں کو اتنا صوفی نہیں بننا چاہیے۔“  
دفتر توقف کرنے کے بعد وہ حرف مطلب پر آ جاتا۔ حسب معمول بڑے تکلف کے ساتھ کہتا۔ ”اگر آپ ہالی ڈے کے موڈ میں نہیں ہیں تو میں آپ سے یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ آپ اپنا بوقت بستر پر صرف کرنے کے بجائے دفتر کو دے دیں۔ اگر یہ ممکن ہو سکتا ہے تو آپ مجھے ذاتی اہم کمون ہونے کا موقع دیں گے۔“

قدموں کی آہٹ پر سلمان نے مڑ کر دیکھا۔ اسکی پشت پر لمبے قد کا ایک گورا چٹا نوجوان کھڑا ہے۔ تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ سلمان لمحہ بھر تک خاموش بیٹھا اسے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اجنبی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔  
”میرا نام انیس اے، جیفرے ہے۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس گرم جوشی سے مصافحہ کیا کہ سلمان کی انگلیوں کا چومر نکل گیا۔ اس نے فوراً پہچان لیا کہ وہ کون ہے۔ وہ اس کے سیکشن کا انچارج انیس احمد جعفری تھا۔ وہ کمپنی کا سینئر آفیسر تھا اور سال بھر تک امریکہ میں ٹریننگ لینے کے بعد اسی ہفتے لوٹا تھا۔ لیکن دفتر میں اس روز پہلی بار آیا تھا اور اپنے سیکشن کے ہر رکن سے ذاتی طور پر ملاقات کر رہا تھا۔

اس کی پیشانی تنگ تھی۔ ناک ستواں تھی۔ سر پر بھورے بھورے خشخشی بال تھے۔ وہ ٹخنوں سے اونچی ڈھیلی ڈھالی پتلون اور ٹائیڈ کی جھلکتی ہوئی سفید قمیص پہنے تھا۔ کار میں شوخ رنگ کی ٹائی بھی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار اپنے کندھے اچکا تا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ ”خالص امریکی لہجے کے ساتھ روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔ دوران گفتگو جتنی بار اس نے سلمان کو مخاطب کیا ہر بار مسٹر سالو من کہتا رہا۔ سلمان کو اس کا انداز مخاطب بڑا عجیب سا لگا۔ مگر پہلی ملاقات میں اندازہ ہو گیا کہ انیس احمد جعفری دلچسپ نوجوان ہے۔“

میری تصویر کو سینے سے لگایا نہ کرو

میری محبوب مجھے بھول بھی جا، بھول بھی جا

حالانکہ نوجوان لڑکیاں اسے نرا الٹو کاٹھنا سمجھتی تھیں۔ چہرے مہرے سے وہ یتیم اور وضع قطع کا کٹی ہوئی ہڈی کا محرر لگتا تھا۔ مگر اب اسے لڑکیاں ڈان ڈوان کہتی تھیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب اسے سنور کر شام کو اپنی نئی شیو پر نکلتا تو بڑا بانکا بھیلّا جوان نظر آتا۔

جعفری کی شخصیت میں سلمان کے لیے روز بروز کشش پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس کشش میں ایک عقیدت مندانہ جذبہ کار فرما تھا۔ وہ اس کے روبرو جاتا تو اس انداز سے بات کرتا جیسے منوں بچہ تلے دبا ہو۔



ایک روز سلمان دفتر سے نکلا تو بس اسٹاپ پر بہت بھیڑ تھی۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد ٹی کی بس میں جگہ نہ ملی تو پیدل ہی چل دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک ایک جھلکتی ہوئی کار اس کے قریب آ کر رکی۔

سلمان نے دیکھا جعفری اسٹیرنگ و ہیل سنبھالے بیٹھا ہے۔ اس نے اشارے سے سلمان کو زب بولایا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔

”اگر آپ چہل قدمی کے موڈ میں نہ ہوں تو میں آپ کو گھر تک لفٹ دینے میں خوشی محسوس کروں گا۔“

اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سلمان چپ چاپ اگلی نشست پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ راستے میں دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ جعفری نے اس سے صرف مکان کا پتہ دریافت کیا اور اُسے آہستہ آہستہ کسی نئی انگریزی فلم کی دھن گنگنا نے لگا۔

کار جب سلمان کے فلیٹ کے سامنے رکی تو اترتے ہوئے سلمان نے سوچا کیوں نہ جعفری کو ہائے پر مدعو کر لیا جائے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔ جعفری ذرا اڑوچتا رہا پھر کار سے نکل کر باہر آ گیا۔

دونوں زینے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے۔ دروازہ گھر کی خادمہ جنت نے کھولا۔ وہ اس

لکھنا: یہ قوف۔ کاغذی ہاؤس۔ دوسری کاری مکان / جگہ جہاں لاوارث موتی بیچے جاتے ہیں۔ بانکا، بھیلّا: خوش، خوش مزاج۔

جب کوئی سینئر افسر اپنے ماتحت سے اس قدر انکسار کے ساتھ مطالبہ کرے تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلمان بھی سیکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح اس کی بات مان لیتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ سلمان نے پہلے ہی ارادہ کر لیا کہ وہ ایسے بے جا مطالبات ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ مگر جب وہ جعفری کے روبرو گیا تو اس کے نرم اور شگفتہ رویے سے ایسا پیچا کہ انکار نہ کر سکا۔

ان ہی خدمات کے صلے میں کمپنی نے جعفری کو ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ اور بھی بہت سی مراعات دے رکھی تھیں۔ جعفری جس کو ٹھگے میں رہتا تھا وہ اسے کمپنی کی جانب سے ملی تھی۔ ہر ماہ ایک ہزار روپیہ مختلف الاؤنسوں کی صورت میں مل جاتا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے رہتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا رہن سہن تھا اور اعلیٰ طبقوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔

سلمان پر یا تو وہ زیادہ مہربان تھا یا سلمان کو یہ گمان تھا کہ وہ اسے زیادہ مانتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آتا تھا۔ اگر دفتری امور میں سلمان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو وہ خفگی کا اظہار نہ کرتا۔ بلکہ نرمی سے سمجھا دیتا۔ کبھی تنبیہ بھی کرتا تو ہمیشہ براہ راست نہ کہتا۔

”میں سوچتا ہوں کہ آج کل آپ ذہنی طور پر پریشان ہیں۔ کیا آپ مجھے یہ حق دیں گے کہ میں اس سلسلے میں کچھ پوچھ سکوں؟ مجھے خوشی ہوگی کہ میں آپ کی کچھ مدد کروں۔“ سلمان انکار کرتا کہ وہ کسی ذہنی الجھن میں مبتلا نہیں ہے تو وہ پوچھتا۔ ”کیا آپ نے فائل پر میرا نوٹ دیکھا ہے؟ میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ اس سے کس حد تک اتفاق رائے رکھتے ہیں؟“ اور پھر اپنے سوالوں کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہتا۔ ”کیا میں آئندہ یہ امید رکھوں کہ آپ مجھے فائلوں پر سرخ پنسل چلانے کا موقعہ نہیں دیں گے؟“

جعفری عام طور پر انگریزی میں بات کرتا تھا۔ کبھی بکھار اور دو میں بات کرتا تو پہلے وہ انگریزی میں سوچتا۔ پھر اس کا ترجمہ کرتا۔ یہ انداز گفتگو اس نے اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ویسے وہ علی گڑھ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور اس کے بی اے کے نصاب میں اردو لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل تھی۔ بلکہ طالب علمی کے زمانے میں وہ شاعری بھی کرتا تھا اور کچھ اس قسم کی رومانی نظمیں کہتا تھا:

تم میرے واسطے یوں اشک بہایا نہ کرو

مخمل حسن میں یوں دیپ جلایا نہ کرو

چین سلمان تھا۔ اسے روہ کر بیوی پر غصہ آ رہا تھا۔ کوئی ۲۰ منٹ بعد جنت چائے کا سامان لے کر آئی۔ اب اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور لی حد تک صاف ستھری نظر آرہی تھی۔ سلمان کو قدرے اطمینان ہوا چائے کا سامان رکھا ہی بارہا تھا کہ رخشندہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے میک اپ میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ سلمان نے بیوی کو دیکھا وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی حسین اور دلکش نظر آرہی تھی۔ جعفری احتراماً کھڑا ہو گیا۔ سلمان نے جعفری سے بیوی کا تعارف کراتے ہوئے خوشی محسوس کی۔ یہ خوشی ایسی ہی تھی جیسے جدید ترین ماڈل کی کار، شاندار کوٹھی یا اعلیٰ نسل کا لڑکھ کر محسوس کی جاتی ہے۔

جعفری نے رخشندہ سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس قدر حجاب محسوس کر رہی تھی کہ جعفری زیادہ بات نہ کر سکا۔ وہ تمام عرصہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ البتہ سلمان ہت چمک رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بیوی سے چھیڑ چھیڑ کر باتیں کر رہا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا۔ اس لاسرت میں بچوں کی سی سادگی تھی۔

چائے پینے کے بعد جعفری زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اسے کسی سے ملنے کے لیے جانا تھا۔ وہ سلمان اور رخشندہ کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ سلمان اسے کار تک رخصت کرنے گیا۔ چند ہی روز بعد دفتر میں چھٹی ہونے سے کچھ دیر قبل جعفری اس کے پاس آیا۔ مسکرا کر گویا دل ”سالو من! اس روز چائے پر تمہارے ہاں کیا چیز تھی؟“ لمحہ بھر کے لیے وہ رکا۔ ”میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو شاید وہ پکڑے تھے۔ کیا تم میرے خیال کی تائید کرو گے؟“

”جی ہاں وہ پکڑے ہی تھے۔ کیا آپ کو پسند آئے تھے؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کا ذائقہ پسند آیا تھا۔ کیا تم آج شام مجھے چائے کی دعوت دے رہے؟ لیکن پکڑے کا آئیٹم ضرور ہو۔ ان کے لیے میں شام کا بہترین پروگرام بھی قربان کر سکتا ہوں۔“

سلمان اسے چائے پلانے پر خوشی سے تیار ہو گیا۔

شام کو وہ جعفری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ چائے کے ساتھ خاص طور پر پکڑے لائے گئے۔ جعفری نے بڑے شوق سے کھائے۔ اس روز وہ قطعی بے تکلفی کے موڈ میں تھا۔

وقت گندالباں پہنے ہوئے تھی۔ سلمان کو اس پر سخت غصہ آیا اور کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ کمرے میں اس کی بیوی موجود نہیں تھی۔ اس نے جعفری سے اجازت لی اور پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ بیوی بستر پر لیٹی تھی۔ سلمان نے جاتے ہی کہا۔

”رخش! میرے آفس کے جعفری صاحب آئے ہیں۔ چائے ہم ڈرائنگ روم میں پئیں گے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”اچھا وہیں بھجوائے دیتی ہوں۔“

”خدا کے لیے جنت کے ہاتھ چائے نہ بھجوانا۔ اس سے کبھی کبھار تو نہالیا کرے۔ پکڑوں سے ایسی بو آرہی ہے کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔ جعفری بڑا نفاست پسند ہے۔ وہ چائے لے کر گئی تو پینے سے انکار کر دے گا۔“

”اچھا تو پھر خود ہی لے آؤں گی۔“

سلمان نے بیوی کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت عام گھریلو لباس میں تھی۔ سلمان کو اس کا لباس نامناسب معلوم ہوا۔ منہ بکاڑ کر بولا۔ ”تم ڈرائنگ روم میں کھڑے ہو کر لو۔ سخت دواہیات لباس پہن رکھا ہے۔ دیکھو جلدی چائے لے کر آنا۔“ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں جا کر سلمان نے دیکھا، جعفری ایک میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سلمان چپ چاپ اس کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خاموش بیٹھے بیٹھے سلمان کی نظر اس کشن پر پہنچ گئی جو جعفری کے پہلو میں رکھا تھا۔ اس کا غلاف خاصا میلا تھا۔ اس گندے کشن کو دیکھ کر جعفری نے نہ جانے کیا سوچا ہو گا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی طرح کشن اٹھا کر صوفے کے پیچھے ڈال دے تاکہ جعفری کی اس پر نظر نہ پڑے۔ ابھی وہ کشن ہی کے متعلق غور کر رہا تھا کہ ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کا پردہ لہرانے لگا۔ سلمان نے غور کیا کہ پردے کے کنارے پر جگہ جگہ چکنائی کے دھبے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں خادمہ کو برا بھلا کہا جس کے پھو پھونکے باعث پردے اس قدر گندے اور بد نما ہو گئے تھے۔ آخر اس نے اٹھ کر پردے کو اس طرح سمیٹ دیا کہ داغ دھبے کسی حد تک چھپ گئے۔

چائے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ جعفری نے میگزین کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ مگر سلمان سے کچھ نہ کہا۔ وہ کچھ بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ

نف ناک آوازوں سے درہم برہم ہو گیا۔ لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں ہر شخص کو گھور رہی تھیں۔ سب انپکٹر جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ ایک ایک زخم دیکھ رہا تھا اور ہیڈ کا ٹیبیل کو ہاتھیں دیتا جا رہا تھا جو اس کی ہر بات نہایت مستعدی سے قلم بند کر رہا تھا۔ سب انپکٹر نے تقریباً اڑھ گھنٹے میں لاش کے معائنے کی رپورٹ مکمل کی۔ اس کے بعد نیاز کے مردہ جسم کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔

لاش اور جائے واردات کا معائنہ کرنے کے بعد سب انپکٹر نے سب سے پہلے سلطانہ کا بیان لیا۔ اس نے رک رک کر سسکیاں بھرتے ہوئے بتایا کہ نوشا اس کا چھوٹا بھائی ہے اور کئی سال بعد آیا ہے۔ نیاز کا اور اس کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ جس وقت دونوں کا جھگڑا ہوا وہ اپنے کمرے میں درہی تھی۔ وہ نیاز کی چیخیں سن کر وہاں آئی تھی۔ نیاز اس وقت دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم خون میں ڈبا ہوا تھا۔ جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے۔

انپکٹر نے دریافت کیا۔ ”جس وقت آپ موقع واردات پر پہنچیں کیا اس وقت ملزم کمرے میں موجود تھا؟“  
وہ لمحہ بھر کے لیے جھجکی پھر نہ معلوم کیا سوچ کر صاف جھوٹ بول گئی۔ ”نہیں۔ وہ یہاں سے جا چکا تھا۔“

نوشا نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا جو ہر جھکائے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ انپکٹر نے پوچھا۔ ”پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ملزم یہاں آیا تھا اور مقتول سے اس کا جھگڑا تھا؟“

”میں نے پہلی بار اسے آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔“  
”اگر ملزم کو یہاں پولیس کی حراست میں نہ دیکھتیں تو آپ کو اس پر شبہ نہ ہوتا؟“  
”جی نہیں۔“ سلطانہ نے صاف انکار کر دیا۔

”تو پھر آپ نے قتل کی اطلاع اب تک پولیس کو کیوں نہ دی؟“  
”میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ اب تک میرے ہوش و حواس درست نہیں۔“  
وہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سب انپکٹر کے ہر سوال کا رک رک کر جواب دے رہی تھی۔ جو کچھ میں آیا کہتی چلی گئی۔ مگر اس کی آواز سے، اس کے چہرے کے اطمینان سے اندازہ ہوتا تھا کہ

چائے کے دوران اس نے دلچسپ لطیفے سناے۔ سلمان اور رخشندہ کو خوب ہنسیا۔  
چائے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پکچر کا پروگرام بنایا اور اصرار کر کے دونوں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

سینما گھر میں بھی وہ بڑا ہنس مکھ اور خوش طبع نظر آ رہا تھا۔ پکچر دیکھ کر باہر نکلے تو جعفری ان کو چھوڑنے گھر تک گیا۔ سلمان نے کھانے کے لیے کہا تو وہ مزید اصرار کے بغیر آمادہ ہو گیا۔ کھانا کھا کر بھی وہ رات گئے تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔  
وہ سلمان کے فلیٹ سے نکلا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

(۲)

نیاز کے قتل کے چند گھنٹے کے بعد ایک پولیس سب انپکٹر تین کانسٹیبلوں کے ہمراہ کوٹھی پر پہنچا اس نے جائے واردات کا معائنہ کیا۔ نیاز کی لاش ابھی تک خون میں ڈوبی فرش پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف ناک طریقے پر پھٹی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ دیوار کے قریب چٹ پڑا تھا۔

لاش سے کچھ فاصلے پر سلطانہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نہ وہ درہی تھی نہ جسم کو حرکت دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ خانساں تھا اور خادمہ بھی قریب ہی سہی ہوئی بیٹھی تھی۔ فرش پر دیواروں پر لال لال خون بکھرا ہوا تھا۔ کمرے کا ماحول بڑا ہیبت ناک تھا۔

سب انپکٹر کمرے میں تفتیش کے لیے داخل ہوا۔ سلطانہ نے دیکھا نوشا بھی پولیس کے ہمراہ تھا۔ وہ کانسٹیبلوں کی حراست میں سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تھکڑیاں پڑی تھیں۔ کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ آنکھیں سرخ اور وحشت ناک تھیں۔ سلطانہ لمحہ بھر تک ٹھنکی باندھے نوشا کو دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

فضا پر ہولناک سکوت طاری تھا اور اس سکوت میں سلطانہ کی سسکیاں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔ اچانک کوٹھی کے پچھواڑے درختوں تلے گیدڑوں کی آوازیں ابھریں۔ ڈھلتی رات کا نشانہ

بے بھائیں بھائیں کرتے۔ تمام دن اکتادینے والا سناٹا چھایا رہتا۔ شام ہوتے ہی ہر طرف دھندلی ندی پر چھائیاں ریگیتی ہوئی نظر آتیں۔ باہر احاطے میں گھنے درختوں تلے خشک پتے کھڑکھڑاتے۔ اپنی آہٹیں ابھرتیں۔

رات کو اکثر سوتے سوتے سلطانہ کی آنکھ کھل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ نیاز خون میں ڈوبا ہوا نے کھڑا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ وہ خونخوار نظروں سے گھورتا۔ سلطانہ گھبرا کر بستر پر گر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں جاگتی رہتی۔

نیاز کا کمرہ عین اس کے کمرے کے سامنے تھا۔ ہر شام وہ اس کمرے میں جا کر خود روشنی کرتی۔ اور وہاں سلگاتی تاکہ نیاز کی روح خراب ہو کر بھٹکتی نہ پھرے۔ مگر رات گئے جب وہ اس کمرے کی ہب دیکھتی تو دھندلی دھندلی روشنی میں کوئی آہستہ آہستہ ٹہکتا ہوا معلوم ہوتا۔ ہوا زور سے چلتی۔ درختوں کے نیچے سوکھے پتے کھڑکھڑاتے اور سنسان رات میں کسی کے تیز تیز بھاگنے کی آہٹیں اترتیں۔ وہ خوف سے آنکھیں بند کر لیتی۔ تمام رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

مسلل شب بیداری اور پے بہ پے دکھوں نے اس کی صحت خراب کر دی۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ لگوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ ان دنوں اسے شدت سے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ مگر کوئی بھی ہانڈ تھا جو اسے ڈھارس دے سکتا۔ غم گساری کر سکتا۔ کوٹھی میں خادمہ کے علاوہ صرف خاندان والوں ہر وقت سب سے سب رہتے۔ بلکہ خادمہ تو ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ مگر سلطانہ غامض کر کے اسے روک لیا۔ پھر بھی وہ رات کو کوٹھی میں رہنے کے بجائے اپنی بیٹی کے گھر جا کر لگتی تھی۔ اسے سلطانہ سے بھی زیادہ خوف معلوم ہوتا۔



ایک شام، خان بہادر کو ٹھی پر آیا۔ اس کے ہمراہ ایک ادھیڑ آدمی تھا۔ اس کا جسم بھدا تھا۔ ڈھارنگ، بڑی بڑی بے رونق آنکھیں اور کپٹی کے پاس زخم کا گہرا نشان وہ وضع قطع سے خاصا صورت اور اول جلول لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی کڑھکی دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔ خان بہادر سلطانہ سے اسے یہ کہہ کر ملایا کہ وہ نیاز کا بڑا بھائی ہے۔ راولپنڈی میں رہتا ہے اور نیاز کے مرنے کا اطلاع پا کر آج ہی آیا ہے۔ حالانکہ نیاز نے سلطانہ سے اس کا کبھی تذکرہ نہیں کیا تھا اور نیاز کی اس

لوہان خوشبوؤں کے ہم ڈھارس، حوصلہ، غم گساری، ہمدردی، اول جلول، بے ڈھنگا، بیہودہ، کڑھکی، سختی۔

وہ خوف اور گھبراہٹ پر قابو پاتی جا رہی ہے۔ اس نے رونا بند کر دیا تھا اور انپکٹر کے ہر استفسار کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

انپکٹر نے پوچھا۔ ”مقتول سے آپ کی کب شادی ہوئی؟“

سلطانہ اس سوال پر گھبرا گئی۔ اس نے نیاز کے خلاف شدید نفرت محسوس کی۔ وہ انپکٹر کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ اس وقت وہ سخت اذیت محسوس کر رہی تھی۔

انپکٹر نے اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا وہ آپ کے شوہر نہیں تھے؟“ سلطانہ نے گردن جھکا کر کہا۔ ”وہ رشتے میں میرے سوتیلے باپ تھے۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ نیاز کی لاش پر تھوک دے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کمرے میں بیٹھے ہوئے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اچانک برہنہ ہو گئی ہے۔

انپکٹر نے سلطانہ سے اور بھی بہت سے سوالات کئے۔ مگر وہ اب قوت مدافعت کو چکی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا کیا لٹے سیدھے جوابات دیئے۔

پولیس نے خانساں اور خادمہ کے بھی بیانات لیے۔ انپکٹر، کانسٹیبلوں اور نوٹش کے ہمراہ کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ دروازہ پر کھڑی نوٹش کو جاتے ہوئے دور تک دیکھتی رہی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پڑی تھیں۔ وہ سر جھکائے کانسٹیبلوں کے نرنے میں چپ چاپ چل رہا تھا۔

رات بھر ایک پولیس کانسٹیبل نیاز کی لاش پر پہرہ دیتا رہا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے مرد گاڑی آئی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے گئی۔

سب انپکٹر کئی بار تفتیش کے سلسلے میں کوٹھی پر آیا اور سلطانہ کے علاوہ خادمہ اور خانساں سے قتل کے متعلق طرح طرح کی باتیں پوچھتا رہا۔ سلطانہ کو اس کے سوالات سے بڑی وحشت ہوتی۔ مگر اس سے بھی زیادہ وحشت اسے اس کوٹھی سے ہونے لگی تھی جو اب مرگھٹ کی طرز ڈراؤنی معلوم ہوتی۔ کوٹھی پر ہر وقت ہو کا عالم طاری رہتا۔ درود یوار پر مردنی چھائی رہتی۔ خاؤ

استفسار: سوال۔ قوت مدافعت: مرد اور دانت کرنے کی طاقت: غم: گھبراہٹ: مرگھٹ: ہندوؤں کی مردے جلانے کی جگہ۔ ہو کا عالم: بھدا ویرانی۔



ہاں رہا تھا۔ اس کی آواز اونچی تھی۔ وہ گندی گندیاں بک رہا تھا۔ سلطانہ سکتے کے سے عالم میں  
موش بیٹھی تھی۔ اسی اثنا میں خادمہ روتی ہوئی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے کمرے میں داخل  
ہونے ہی کہا۔

”نیگم صاحبہ! میرا حساب کر دیجئے۔ میں اب آپ کی نوکری نہیں کر سکتی۔“  
سلطانہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ سخت ناراض معلوم ہوتی تھی۔ منہ بگاڑ کر بولی۔ ”میں  
پکی ٹہل چا کر کرتی ہوں۔ پر اس کا مطلب یہ نہیں میں نے عزت بھی بچا دی ہے۔ میں اس  
رج گالیاں نہیں سن سکتی۔“

خادمہ برابر بڑبڑاتی تھی اور سلطانہ اسے سمجھا رہی تھی کہ ملازمت چھوڑ کر نہ جائے۔ اسی  
اٹل سامنے سے فیاض آتا ہوا نظر آیا۔ اس کی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔  
ٹائی پر ہل تھے۔ اس کا کرخت چہرہ جھلسا ہوا لگ رہا تھا۔ آتے ہی گرج کر بولا۔

”یہ حرامزادی یہاں بیٹھی کیا فیل مچا رہی ہے؟“

خادمہ نے فوراً کہا۔ ”دیکھئے نیگم صاحبہ! پھر انہوں نے گالی دی۔ میں اگر کچھ کہہ سن دوں گی تو  
ٹھنہ نہ کہئے گا۔“

فیاض نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ ”اے بھی یہاں سے نکل جا۔ میں  
کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ سو کی بچی، حرامزادی، کنجری۔“

فیاض گالیاں دینے لگا۔ خادمہ تھی تو ادھیڑ مگر دنگ عورت تھی۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی  
بدایا۔ فیاض مارنے کے لیے جھپٹا۔ سلطانہ اگر نہ روکتی تو شاید وہ خادمہ کو مارتا بھی۔ وہ پاگلوں کی  
ٹانگھا پھاڑ پھاڑ کر جیج رہا تھا۔

خادمہ روتی بیٹھتی گھر سے چلی گئی۔

سلطانہ کو خادمہ کے چلے جانے کا بہت افسوس ہوا۔ وہ کام بھی مستعدی سے کرتی تھی اور اس  
اگسار بھی تھی۔ جب سے نیاز مرا تھا اس وقت سے سلطانہ کے لیے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی  
۔ وہ ہر معاملے میں اس سے مشورہ کر لیتی۔ دل گھبراتا تو گھنٹوں اس کے ساتھ بیٹھی ادھر ادھر کی  
مایا کرتی۔ اس طرح اس کا دل بہل جاتا تھا۔

الہام نے جس حرکت ہوتا۔ ٹہل چا کر کرتا۔ خدمت کرتا۔ ملازمت کرتا۔ فیل چاتا۔ خور شراب کرتا۔ قہر آلود غصے سے بھری ہوئی۔

میں شاہت بھی نہیں تھی۔ تاہم سلطانہ نے اس کے متعلق کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔  
خان بہادر فرزند علی کو وہ معزز اور ذمہ دار آدمی سمجھتی تھی۔ لہذا اس کی باتوں پر سلطانہ کو فوراً  
اعتبار آگیا۔

خان بہادر کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ البتہ وہ شخص کو ٹھنی ہی میں ٹھہرا رہا۔ اس کا نام فیاض تھا۔  
راولپنڈی میں اس کی کپڑے کی دکان تھی۔ نیاز کے قتل کی اطلاع اسے نیاز کے ایک دوست کے خط  
سے ملی تھی اور وہ خط ملتے ہی چلا آیا تھا۔ اس کے بال بچے ابھی تک راولپنڈی ہی میں تھے۔ اس نے  
اپنے متعلق سلطانہ کو یہی بتایا تھا۔

مگر نہ تو اس نے نیاز کی موت پر آنسو بہائے اور نہ اس کے چہرے پر کسی گہرے غم کا تاثر تھا۔  
سلطانہ سے اس نے بات چیت بھی کم کی اور اس کے بچے کو دیکھ کر نہ کسی التفات کا اظہار کیا نہ شفقت  
کا۔ رات کا کھانا اس نے وہیں کھایا۔ وہ جڑے ہلا ہلا کر بد تمیزی سے کھانا کھا تا رہا۔ کھانے سے فارغ  
ہو کر اس نے زور زور سے دکاریں لیں جس سے اس کا اجڑپن ظاہر ہوتا تھا۔ یوں بھی اس کا لہجہ بڑا  
عامیانہ تھا۔ مگر سلطانہ کو اس کے آنے سے کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ کوٹھی پر رات بھر جو ہولناک  
ساناٹا رہتا تھا کچھ کم ہو گیا۔

سلطانہ نے اس کی رہائش کے لیے کوٹھی کے ایک کمرے میں بندوبست کر دیا وہ سرشام ہی  
سونے کے لیے بستر پر چلا گیا۔ اس رات سلطانہ کئی راتوں کے بعد گہری نیند سوئی۔ سویرے اٹھ کر  
اس نے فیاض کے لیے ناشتا اپنی نگرانی میں تیار کرایا اور اس میں خاصا اہتمام کیا۔ وہ اس کے سامنے  
جس وقت بھی جاتی، دوپٹے کے آئینے سے سر ڈھک لیتی۔ بات کرتی تو نظریں نیچی کر کے۔ وہ اس کا  
احترام بالکل اپنے جینٹھ کی طرح کر رہی تھی۔

فیاض سہ پہر تک اپنے کمرے میں رہا۔ پھر وہ کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ رات کو واپس آیا۔  
اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ شام کو باہر رہتا۔ سلطانہ کے ساتھ پہلے ہی دن سے اس کا جوڑیہ  
تھا وہ برقرار رہا۔ وہ اس سے بہت کم بات چیت کرتا۔ اس کا زیادہ تر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا۔  
فیاض کو آئے ہوئے چوتھا یا نچوال دن تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں سو رہی  
تھی۔ اچانک شور سن کر اس کی آنکھیں کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سنا فیاض خادمہ کو

شاہت: اصل صورت کی مشابہت: التفات: توجہ: محبت: اجڑپن: جہالت: سرشام: شام ہونے ہی۔

سلطانہ کو فیاض کارویہ سخت ناگوار گزرا۔

زوجان تھا۔ صورتِ شکل سے ادبِ اش معلوم ہوتا تھا۔ تمام دن ڈرائنگ روم میں گزارتا۔ لہک لہک رقصی گیت گاتا۔ گھٹیا قسم کے سگریٹ پیتا اور ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اور سگریٹ کے ٹکڑے لرے کے اندر نکھیر دیتا۔ صوفوں پر اس نے جگہ جگہ تیل کے داغ دھبے ڈال دیئے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردوں سے تولیہ کا کام لیتا۔ دونوں وقت ڈیسر بھر کھانا کھاتا اور چائے کے کئی کئی پ ایک ہی وقت میں پی جاتا۔ وہ کام کاج کچھ نہیں کرتا تھا۔ بس ہر وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا۔ رات ہوتی تو فیاض کے کمرے میں جا کر سو جاتا۔ کہیں آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ہر وقت کوٹھی میں موجود رہتا۔

سلطانہ جب اس کے سامنے جاتی تو برابر گھورتا رہتا۔ لفتکوں کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں برتا اور گھٹیا فلمی گیت گنگناٹا شروع کر دیتا۔ اس کا نام کرم الہی تھا۔ مگر وہ چند ہی روز میں سلطانہ کے لیے قہر الہی بن گیا۔

سلطانہ ان تبدیلیوں پر غور کر رہی تھی کہ فیاض نے ایک روز بڑی عجیب حرکت کی۔ اس نے نیاز کا سارا سامان اٹھوا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ ہر کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ ہر الماری اور رک کھول کر دیکھا۔ اس نے سلطانہ کے زیورات اور کپڑے دیکھنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا اور لاریوں کی کنجیاں بھی طلب کیں۔ سلطانہ نے پہلے تو ٹالنا چاہا۔ مگر جب وہ بار بار اصرار کرنے لگا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

وہ مجز کر بولا۔ ”اگر تم نے کنجیاں نہ دیں تو میں تمہاری ساری الماریاں اور پکے اٹھوا کر اُسے کمرے میں بند کر دوں گا۔“

اس دھمکی پر سلطانہ بھی جھنجھلا اٹھی۔ ”دیکھئے میں آپ کی ہر بات خاموشی سے برداشت کرتی تھا۔ اب آپ حد سے گزرتے جارہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ نہ میں اپنے صندوق اور الماریوں کی پ کو کنجیاں دوں گی اور نہ ان پر کسی کو ہاتھ لگانے دوں گی۔“

”تو پھر پچھتاؤ گی۔“ فیاض نے کھل کر دھمکی دی۔

سلطانہ جل کر بولی۔ ”جائیے جو آپ سے کیا جائے کر لیجئے۔“

فیاض آنکھیں نکال کر بولا ”میں تم کو کھڑے کھڑے یہاں سے نکال سکتا ہوں۔“

”تم کون ہوتے ہو مجھے یہاں سے نکالنے والے؟“

شام کو خانساں پر بھی نزلہ گرا۔ فیاض خواہ مخواہ اس پر برسنے لگا۔ اسے بھی اس نے چیخ مچا کر گالیاں دیں۔ مگر خانساں ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے زبان سے اف تک نہ کی۔ سر جھکائے خاموشی سے فیاض کی گالیاں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ اس کے پاس گئی۔ اس نے دیکھا خانساں باورچی خانہ میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بہت افسردہ نظر آ رہا تھا۔ سلطانہ نے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ آبدیدہ ہو گیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”بیگم صاحبہ! اپنی قسمت ہی میں در بدر کی ٹھوکریں کھانی لکھی ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آپ ہی کے قدموں میں ساری زندگی گزار دوں گا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہاں سے بھی میرا آب و دانہ اٹھ چکا ہے۔“

سلطانہ دیر تک خانساں کو سمجھاتی رہی۔ جب اسے سمجھا بجا کر باورچی خانہ سے باہر نکلے تو اس نے فیاض کو اپنے کمرے کے سامنے ٹھلنے ہوئے پایا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”دیکھو جی! تمہاری یہ عادتیں مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم نے نوکروں کو بہت سر پر چڑھا رکھا ہے۔ سالے ایک نمبر کام چور ہو گئے ہیں۔“ سلطانہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹھالیارو رہا تھا۔ وہ اسے گود میں لے کر کمرے کے اندر ٹھلنے لگی۔

فیاض کارویہ خانساں کے ساتھ روز بروز خراب ہوتا گیا۔ وہ بات بات پر اس پر برس پڑتا۔ گندی گندی گالیاں دیتا۔ سلطانہ اگر بات رفع دفع کرنے کی غرض سے کچھ کہتی تو وہ آنکھیں نکال کر اس پر بھی غرا لگتا۔ اب وہ گھر کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے لگا تھا۔ ایک ایک بات کی چھان بین کرتا۔ یہ کیوں ہوا؟ یہ کس لیے کیا گیا؟ وہ کیا ہے؟ اس کی ان حرکتوں نے چند ہی روز میں سلطانہ کو پریشان کر دیا۔

پھر اور بھی غنی غنی باتیں سامنے آئیں۔ فیاض نے ڈرائیور کو علیحدہ کر دیا اور کار گیران سے نکال کر نہ جانے کہاں لے گیا۔ سلطانہ نے پوچھا تو اس نے بڑی بے رخی سے کہا۔ ”مرمت کے لیے گئی ہے۔“ حالانکہ کار بالکل ٹھیک چل رہی تھی۔ مگر فیاض نے اس طرح تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے جواب دیا کہ وہ مزید استفسار نہ کر سکی۔

کچھ عرصے بعد وہ اپنی ہی وضع قطع کے ایک اور شخص کو بھی لے آیا۔ وہ چوبیس چوبیس سال کا

کفن کھوٹ: لوگوں کا مال کھا جانے والا۔ مضحمل: اداس، رنجیدہ۔

جائے اور اس کا کوئی حق نہیں؟“

میں نے تم کو مسئلے کی شرعی نوعیت بتادی۔“ خان بہادر نرم لہجے میں بولا۔ ”اپنی قانونی حیثیت کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو میں یہ کہوں گا تمہارا نیاز کی جائداد پر کوئی حق نہیں بنتا۔“ اس نے نظر بھر کر سلطانہ کو دیکھا جو سر جھکائے بھیجی بھیجی سی بیٹھی تھی۔ ”نیاز کو تمہارے باپ کی حیثیت سے دیکھا جائے تب بھی سوتیلی اولاد ہونے کے رشتے سے اس کے ترکے میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا ہے وہ بھی نیاز کی ناجائز اولاد ہے۔ اس کا بھی حق نہیں بنتا۔“

سلطانہ نے خان بہادر کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی۔ ”مگر اس کے باپ کی حیثیت سے تو ہر جگہ انہیں کا نام لکھا گیا ہے۔“

خان بہادر مسکرا کر بولا۔ ”تم کسی کا بھی نام لکھو اور۔ مگر قانون تو یہ نہیں تسلیم کرے گا کہ اس بچے کا باپ نیاز ہی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے تو لکھا نہیں کہ یہ میرا بچہ ہے۔“

سلطانہ نے جھٹ کہا۔ ”ہسپتال کے رجسٹر میں انہوں نے خود دستخط کئے تھے۔ آپ جا کر دریافت کر لیں۔“

”اگر ایسا بھی ہے۔ تب بھی مجھے علم نہیں کہ اس سلسلے میں قانون کیا کہتا ہے۔ مگر میں یہ جانتا ہوں کہ اس کے باوجود بھی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ عدالت میں اور بھی بہت سے ثبوت مہیا کرنے ہوں گے۔ تم چاہو تو کسی وکیل سے مشورہ کر لو۔“

”میں کس وکیل کے پاس جاؤں گی۔“ سلطانہ نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ ”آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”تم پریشان نہ ہو۔“ خان بہادر نے اسے تسلی دی۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ عدالت میں جانے اور مقدمہ بازی کے چکر میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ تم اطمینان سے یہاں رہو۔ میں فیاض کو سمجھا دوں گا۔ اب وہ یہاں کم ہی رہے گا۔ نیاز کے کاروبار کی فی الحال میں دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ مگر میں اسی مہینے عہدہ کرنے مکہ معظمہ جا رہا ہوں۔ لہذا جلد ہی سب کچھ فیاض کے سپرد کر دوں گا۔“

کاروبار کے چکروں میں پھنس جائے گا تو تم سے ایجنے کی اسے فرصت ہی کب ملے گی۔ تم کو گھر کے خرچ کے لیے ہر ماہ جو کچھ ملتا تھا وہ ملتا رہے گا۔ تم سنجیاں اور ضروری کاغذات فیاض کو دے دینا تاکہ

میں اور دوسری جگہ جو روپیہ پڑا ہے اسے نکال کر کاروبار چلایا جائے۔“

مگر سلطانہ سنجیاں دینے پر رضامند نہیں ہوئی۔

خان بہادر نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ ”تم فیاض سے بہت بدگمان معلوم ہوتی ہو۔ خبر اس کی بات چھوڑو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر دو چار روز غور کر لو۔ پھر اطمینان سے جواب دینا۔“

خان بہادر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر چلا گیا۔

سلطانہ کو خان بہادر کی باتوں سے قدرے اطمینان ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر خان بہادر نے زیادہ اصرار کیا تو وہ تمام سنجیاں اور کاغذات اس کے ہاتھ میں دے دے گی۔ وہ اسے شریف اور معقول آدمی سمجھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جو کچھ کرے گا اس کی بہتری کے لیے کرے گا۔ سلطانہ بہت اب تک انہیں باتوں پر غور کرتی رہی۔

\*\*\*

نہ معلوم کتنی رات گزر چکی تھی۔ دفعۃً آہٹ سے سلطانہ کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی اس لڑکی پر جو باغیچے میں کھلتی تھی ایک سایہ نظر آیا۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد غائب ہو گیا۔ باہر دھندلی دھندلی چاندنی پھیلی تھی۔ ہوا سکی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے خشک پتوں پر قدموں کی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سلطانہ خوف سے تھرا کر رہ گئی۔ نیاز کے کمرے میں پیچکی لگی روشنی پھیلی تھی۔ وہ ٹھنکی باندھے اسی طرف دیکھتی رہی۔

نیند اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ سہمی ہوئی خاموش پڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی کے قریب آہٹ ہوئی۔ سلطانہ نے گھبرا کر دیکھا، کوئی گردن نکالے جھانک رہا ہے۔ دیکھتے

کچھ نہ کھڑکی پر چڑھ کر دم سے کمرے کے اندر کودا۔ سلطانہ کی گھٹکتی بندھ گئی۔ اس نے چیخنے کے بجائے بھاڑا۔ اسی وقت کسی نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ دھندلی چاندنی میں اس نے دیکھا۔ فیاض اس کے سینے پر جھکا ہوا کھڑا ہے۔ اس کی آنکھیں

نزلے سے چمک رہی تھیں۔

سلطانہ نے مزاحمت کی تو فیاض نے اس کے منہ پر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ سرگوشی کے انداز

لکھا: اندھا خیال رکھنے والی۔ سکی ہوئی صاف ستھری۔ ٹھنکی بندھ جاتا۔ ڈر کے مارے بول نہ سکتا۔

ترک: دو مال و دولت جو کوئی شخص مرنے کے بعد چھوڑ جائے۔ پیچیدگیاں: مشکلات، الجھاؤ۔

اول شب کو بوڑھا خانساں گھبراہٹ سے اُٹھ اُٹھ کر اُڑا دیا۔ وہ بڑا خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں لٹکاتے ہوئے کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ کو کتنی فوراً چھوڑ دیجئے۔ یہ دونوں ننھے کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔“

سلطانہ اس وقت بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے جھٹ سے ننھے ایاز کو سینے سے چمٹا لیا۔

”یا اللہ کیا ہونے والا ہے۔ تم مجھے خان بہادر صاحب کے پاس لے چلو۔“

وہ بولا۔ ”وہی تو یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں۔“

اس انکشاف پر وہ ششدر رہ گئی۔ یقین نہ آنے کے سے انداز میں بولی۔ ”نہیں خانساں وہ نادر بے رحم نہیں ہو سکتے۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کسی اور نے نہیں خود کرم الہی نے مجھے بتایا ہے۔ یہ فیاض، بڑیاں کا بھائی والی کہاں ہے۔ خان بہادر صاحب نے خواہ مخواہ کا ڈھونگ رچایا ہے۔ یہ تو جائیداد پر غصہ کرنے کا چکر ہے۔“

وہ بے بسی سے بولی۔ ”تو اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟“

بوڑھا خانساں ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”میرا چھوٹا بھائی یہیں شہر میں رہتا ہے۔ آپ اسے ساتھ وہاں چلی چلیں۔ مجھے بھی ان لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کرم الہی مجھے کئی بار دھمکی دے چکا ہے۔ اس کے خوف سے تو میں آپ کے پاس اب تک آیا نہیں۔ خدا قسم! میں تو کب کا یہاں کام چھوڑ کر چلا جاتا۔ مگر آپ کی وجہ سے اب تک پڑا ہوں؟“

دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر یہی طے ہوا کہ فوراً کوٹھی ڈھکی جائے۔ یہ منصوبہ بنانے کے بعد سلطانہ نے سوچا کہ وہ اپنے زبورات اور قیمتی کپڑے لے کر نکلے اور کرم الہی کی واپسی سے قبل خانساں کے ہمراہ چلی جائے۔ مگر اس نے جب اس کمرے میں لائیں سارا قیمتی سامان رکھا تھا، جا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ فیاض نے

میں آہستہ سے بولا۔ ”چکی پڑی رہ حرامزادی۔“

اس نے دوسرا تھپڑ مارا۔ فیاض قوی ہیکل آدمی تھا۔ سلطانہ کے منہ پر دو بھر پور ہاتھ پڑے تو اس کی ہتھیلی ہل گئی۔ فیاض دست درازی کرنے لگا۔ پاگلوں کی طرح اس کا لباس نوچنے لگا۔

سلطانہ برابر مزاحمت کرتی رہی۔ اس نے چیخنے چلانے کی کوشش کی۔ لیکن فیاض نے اس کا منہ اپنے چوڑے چکلے مضبوط ہاتھ سے اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ آواز نہ نکل سکی۔ وہ صرف غصے میں کرتی رہی۔ ساتھ ہی فیاض بے دردی سے مارتا بھی رہا۔ آخر وہ تھک کر شل ہو گئی۔ اس نے بے بسی سے فیاض کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بلکہ بلک کر رونے لگی۔ مگر فیاض دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ باز نہ آیا۔

باہر پھسکی پھسکی چاندنی پھیلی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھے پتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیاز کے کمرے میں روشنی مدہم پڑ گئی تھی۔ فیاض کھڑکی سے کود کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کرم الہی اسی راستے سے کمرے کے اندر آ گیا۔

سلطانہ نے جل کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ مگر وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا اور رنڈی بازوں کی طرح چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ سلطانہ نے ایک بار کچکا کے اس کے بازو پر کاٹ لیا۔ وہ پھر بھی ناراض نہ ہوا۔ ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

کرم الہی کے جانے کے بعد وہ صبح تک بستر پر بے حال پڑی رہی۔ اس کا جسم مردے کی طرح بے جان ہو گیا تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ گلا خشک پڑ گیا تھا۔ قریب ہی پالنے میں اس کا بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ بچہ کو لمحہ بھر تک جھک کر دیکھتی رہی۔ پھر اسے سینے سے لگا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

باہر صبح کا جالا پھیل رہا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال درست کئے اور تنھي ہوئی سی بستر پر گر پڑی۔ اس روز اس نے ناشتا بھی کمرے ہی میں کیا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ برآمدے میں فیاض اور کرم الہی کے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ان کے سامنے جاتے ہوئے اسے شدید زہنی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے دونوں کو ٹھی سے باہر چلے گئے۔



بچے چاہے مسلمان نے نبی جھلکتی ہوئی کار غور سے دیکھی جو سڑک کے کنارے راج ہنس کی طرح پر ہلانے کھڑی تھی۔

بلڈنگ کے در پچوں سے دونوں جوان عیسائی لڑکیاں جھک جھک کر کار کو دیکھ رہی تھیں۔ مسلمان نے سوچا جھلکتی ہوئی شاندار کار دروازے پر کھڑی ہو تو لڑکیوں پر رعب تو خوب پڑتا ہے۔ اس نے اور کیا کہ دونوں لڑکیاں اسے دیکھ کر مسکرائی بھی تھیں۔ مسلمان نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی۔ لمبوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کی اور گردن اوچی کر کے زینے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

کمرے میں جا کر اس نے دیکھا۔ جعفری صوفے کی پشت سے گردن نکائے، ٹانگوں کو بے لکھی سے پھیلائے اطمینان سے سرگرتی رہا تھا۔ اس وقت وہ ہلکا سیلیٹی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی رنگ کی تھی۔ قریب ہی دوسرے صوفے پر رخشندہ بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر ابھی تک چائے نہ برتن بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں فلموں کے بارے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ مسلمان ایکٹے ہی جعفری نے زوردار نعرہ لگایا۔

”ہیلو سالو من! میرا خیال ہے تمہیں اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔“ اس نے کلائی پر بندھی ٹائی کھڑکی دیکھی۔ ”میں ۳ منٹ ۱۸ سیکنڈ سے بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ سخت بوریت میں مبتلا ہاں مگر سزاو من میری مدد کو نہ آتیں۔ تمہیں میری طرف سے پہلے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“ جعفری نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مسلمان بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”تم تھکے ہوئے معلوم رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں فوراً ایک گرم گرم پیالہ چائے کا پینا چاہیے۔ چائے بہت خوش ذائقہ ہے۔ کیا تم آج کل اور نچ پکیو استعمال کر رہے ہو؟ یقیناً ویسی ہے۔ اس کی مہک مجھے دھوکا نہیں دے لے۔“ وہ بڑی روانی سے بولتا رہا۔

رخشندہ نے چائے بنا کر دی۔

مسلمان آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ چائے ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ نہ اس میں اور نچ پکیو کی مہک نہ اور نہ خوش ذائقہ تھی۔

جعفری پر اس روز باتیں کرنے کا دورہ پڑا تھا۔ وہ بے ٹکان بول رہا تھا اور بے تکلفی سے زور نقشہ لگا رہا تھا۔

راتوں رات سارے ٹرک اور سوٹ کیس کمرے سے نکال کر غائب کر دیئے تھے۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

وہ دیر تک دروازے کا پٹ پکڑے دل گرفتہ کھڑی رہی۔ خاناماں نے تسلی دی تو وہ کسی قدر سنبھلی۔ اس وقت اس کے پاس کچھ اوپر سو روپے تھے۔ اس نے ایک سوٹ کیس میں ضروری سامان رکھا اور خاناما کو تانگالانے کے لیے بھیج دیا۔

ذرا دیر بعد تانگا آگیا۔ سوٹ کیس اور سامان اس میں رکھ دیا گیا۔ سلطانہ کو بھی سے باہر جانے لگی تو ایک اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ سوچا کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ اس سے تواچھا ہی ہے کہ کو بھی میں رہ کر آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرے۔ مگر اسے فوراً اٹھایا زیاد آگیا۔ اب وہی اس کا سہارا رہ گیا تھا۔ وہ اس کی جان خطرے میں ڈالنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہ تھی۔

اس نے حسرت بھری نظروں سے کوٹھی کے در و دیوار کو دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر سڑک پر آگئی۔

تانگے میں بیٹھ کر ایک بار پھر اس نے کوٹھی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ تانگا آگے روانہ ہو گیا۔

(۳)

مسلمان دفتر سے دیر میں لوٹا۔ اس نے دیکھا فلیٹ کے نیچے سڑک پر جعفری کی کار کھڑی ہے۔ مسلمان کو کسی قدر حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ جعفری کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ جیسے بجے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اس نے خود ہی تو مسلمان سے جیسے بجے شام تک دفتر میں کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ اور جب یہ بات تھی تو اس کی غیر حاضری میں وہ یہاں کیوں آیا؟ جعفری کا معمول تھا کہ جب وہ اس کے فلیٹ پر آتا تو ہمیشہ دفتر سے اسے اپنے ہمراہ لے لیتا۔ گزشتہ چار ساڑھے چار ماہ کے عرصے میں، جب سے جعفری کی اس کے گھر میں آمد و رفت شروع ہوئی تھی، صرف ایک بار ایسا ہوا کہ جعفری اکیلا ہی آیا تھا۔ مگر آنے سے قبل اس نے مسلمان کو بتا دیا تھا کہ وہ کس وقت اس کے فلیٹ پر

”رخشدہ کی گوری گوری کلائی پر بچ رہی تھی۔ اس کے بعد بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ رخشدہ کے لیے بظری کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ سلمان نے ایک دفعہ دہلی زبان سے منع بھی کیا۔ مگر جعفری نے اس بات قہقہوں میں اڑا دی۔

”اگر میرے پاس ایک عدد بیوی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کوئی بصورت چیز نہیں خرید سکتا۔ سالو من! تم مجھ پر اس طرح ظلم نہیں کر سکتے۔ شاپنگ میرا محبوب نقطہ ہے۔ اور کسی خوبصورت چیز کو خرید کر الماری میں سجانے کا میں قائل نہیں۔ میں اپنا گھر بڑیم بنانا نہیں چاہتا۔ اور اب تو یہ گھر بھی میرے گھر کا ہی ایک حصہ بن گیا ہے۔“

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اب وہ سلمان کے یہاں بڑی بے باکی سے مسکراتا ہوا آتا اور آتے بالابالی پن سے کوٹ اتار کر صوفے پر ڈال دیتا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا اور سلمان کی بیوی سے کہتا۔ ”کیا آج رات کے کھانے پر شامی کباب ممکن ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج شامی کباب راز کھائے جائیں۔“

وہ اپنی فرمائش بے دھڑک بتا دیتا اور ابھی تکلف سے کام نہ لیتا۔ سلمان سے اس کے مراسم روز بروز گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ دفتر میں بھی وہ اس سے اسی باتیں آتا۔ اس بڑھتے ہوئے ربط ضبط کا اثر یہ ہوا کہ دفتر والوں پر سلمان کا بھی رعب پڑنے لگا۔ اس کی خوب خوب خوشامدیں ہوتیں۔ طرح طرح سے اسے خوش کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اکا جعفری سے کوئی کام ہو تا وہ سفارش کے لیے سلمان کو پکڑتا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی کہ سلمان جعفری سے کسی کی سفارش کر دیتا تو اس کا کام بن جاتا۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود سلمان ان دنوں پریشان پریشان رہتا۔ اسے اپنے گھر پر جعفری کا روز آنا جانا پسند نہ تھا۔ جب سے جعفری کی آمدورفت شروع ہوئی تھی رخشدہ اس سے بے نیازی نہ لگی تھی۔ اس کی حیثیت جعفری کے مقابلے میں گھٹ کر دوسرے درجے پر آگئی تھی۔ ان کی موجودگی میں وہ احساس کمتری میں مبتلا رہتا۔

انہی دنوں ایک سہ پہر کو وہ دفتر سے واپس آیا تو بیوی گھر پر موجود نہیں تھی۔ جنت نے بتایا کہ نرئی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گئی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح جعفری کے ساتھ تنہا

رات کا کھانا بھی اس نے سلمان کے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کلفٹن جانے کا پروگرام بنا۔ رات کے نو بجے تھے۔ روپہلی چاندنی چمکنی ہوئی تھی۔ ہوا تیکھی تھی۔ رخشدہ بھی ان کے ساتھ تھی۔

وہ بڑی مسرور نظر آرہی تھی۔ بچوں کی طرح ہنس ہنس کر سادگی سے اپنی مسرت کا اظہار کر رہی تھی۔

کھلی گاڑی میں اس وقت بیٹھنا بڑا خوشگوار لگ رہا تھا۔ فریئر گارڈن کے سامنے سے گزر کر جب وہ کلفٹن جانے والی سڑک پر آگئے تو راستہ اور بھی دل فریب ہو گیا۔ سڑک پر حدنگاہ تک دوڑوڑو روشنیوں کی قطار چلی گئی تھی۔

وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو فضا اور بھی زیادہ حسین ہو گئی چاندنی دور تک بکھری ہوئی رہی۔ پر افشائ کی طرح جھلملہا رہی تھی۔ سمندر کی لہریں شور کرتی ہوئی اٹھتیں اور ساحل پر دور تک بکھ جاتیں۔ تینوں ریت کے ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گئے اور لہروں کا اتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔ ٹھیک اس مقام پر جہاں سمندر اور آسمان کی سرحدیں مل رہی تھیں، چند کشتیاں آبی پر ندوں کی طرح اپنے سفید سفید بادبان لہرا رہی تھیں۔ فضا بڑی سہانی تھی اور اس سہانی فضا میں جعفری کی موجودگی پر لطف معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے ہلکے مزیدار لطیفے سنا کر خود بھی ہنس رہا تھا اور ان دونوں کو بھی ہنسا رہا تھا۔ تینوں کلفٹن سے واپس ہوئے تو رات ڈھل چکی تھی۔ سڑکیں شبنم سے بھگی ہوئی تھیں۔ رخشدہ کا جسم سرد ہوا سے کپکپا رہا تھا۔

\*\*\*

سلمان کے گھر میں جعفری کی آمدورفت جاری رہی۔ اب وہ اکثر سلمان کی غیر حاضری میں بھی آجاتا اور گھنٹوں بیٹھا بے تکلفی کے ساتھ رخشدہ سے باتیں کرتا رہتا۔ ایک بار وہ اس کے لیے ایک تیز گھڑی لے کر آیا۔ ہنس کر بولا۔ ”لندن سے میرا ایک دوست لایا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ میں ابھی شادی نہیں کی۔ جب گھر میں بیوی موجود نہ ہو تو بھلا لیڈیز واج کا کیا مصرف ہو سکتا ہے؟“

اس نے خود اپنے ہاتھ سے رخشدہ کی کلائی پر گھڑی باندھ دی۔ گھڑی واقعی خوبصورت تھی۔ روپہلی: چھدر، چمکنی: بکھرا، افشائ: گونے کے باریک کئے ہوئے کورے۔ بادباں: وہ کپڑا جو کشتی کی رفتار کو تیز کرنے اور اس کار موڑنے کے لئے لگاتے ہیں۔ معرف: استعمال۔

ذہن و صورت اور دل رہا نظر آرہی تھی۔ وہ جلدی سے چھوٹی میز اٹھا کر لائی۔ اس پر کھانا لگایا اور قریب  
بچہ کر انتظار کرنے لگی کہ وہ کھانا شروع کرے۔ مگر سلمان روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلائے  
ناموش بیٹھا تھا۔

آخر بیوی نے نوالہ بنایا اور اس کے منہ کے قریب لے جا کر بولی۔ ”آپ کو میری قسم۔ تھوڑا  
کھا لیجئے۔“ لیکن سلمان نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بگڑ کر بولا۔

”ایک بار کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں پھر تم مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو؟ میں اس وقت کھانا  
نہیں کھاؤں گا۔“

وہ دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رخصتہ وہاں تک کھانے کے قریب سر جھکائے  
ناموش بیٹھی رہی۔ پھر برتن اٹھا کر باورچی خانے میں گئی۔ رات کے سناٹے میں ذرا دیر تک برتنوں  
کا کھڑکھڑاہٹ ابھرتی رہی۔ باورچی خانے سے نکل کر وہ سڑک پر کھلنے والی کھڑکی پر جا کر کھڑی ہو  
گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے کے فرش پر ٹپکنے لگی۔ سلمان بستر پر لیٹا بیوی کی ہر حرکت دیکھتا رہا۔ ہر  
آواز ہر آہٹ سنتا رہا۔

چند منٹ بعد وہ کمرے میں آئی اور ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ وہ  
اس کے چہرے پر جھکی۔ سلمان نے آنکھیں بند کر لیں اور رخصتہ کی تیز تیز سانسوں کا لمس محسوس  
کرنے لگا۔

وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ پھر اندر آئی۔ کئی بار وہ کمرے میں آئی اور چند لمحے رک کر  
اگلے کمرے میں چلی گئی۔

وہ اس وقت بڑی بے چین معلوم ہو رہی تھی۔ سلمان نے بستر پر لیٹے لیٹے سوچا۔ اسے اس  
لڑکی کی کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا تھا۔ اسے اپنی بیوی پر شبہ نہیں کرنا  
چاہیے۔ وہ جعفری کے ساتھ بچکر دیکھنے ہی تو گئی تھی۔ کون سا ایسا بڑا جرم ہو گیا جس کی وہ یہ سزا دے  
اے۔ اسے رخصتہ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ آخر وہ اس کی شریک حیات ہے۔ اس سے پیار بھی کرتی  
ہے۔ ورنہ وہ اس قدر بے قرار نہ ہوتی۔ یہ یقیناً اس کے قدامت پسند خاندانی پس منظر کا اثر ہے جو وہ  
لا طرح شک و شبہ کی نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے باپ میں اور اس کی عمر میں چوتھائی

لہذا اس کو بھی قدامت پسند۔ قدیم رسوم و رواج کی پیروی کرنے والا۔

گئی تھی۔ سلمان کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ جھنجلاہٹ میں اس نے چائے بھی نہ پی۔  
شام ہو گئی مگر دونوں واپس نہ آئے۔ سلمان بے چینی سے کمرے میں ٹپکنے لگا۔ اندر میرا گھر  
ہو تا جا رہا تھا۔ رات ہو گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ پھر نو بجے، دس بجے۔ رات  
سنسان ہو گئی۔ سناٹا پھیلنے لگا۔ سلمان تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔ گیارہ بجنے کے کچھ دیر بعد دونوں واپس  
آئے۔ دروازہ سلمان نے ہی نے اٹھ کر کھولا۔

جعفری نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”ارے تم ابھی تک سوئے نہیں۔ تم یقیناً جاگ رہے تھے  
میں شرط بدنے کو تیار ہوں۔“ وہ بے تکلفی سے ہنس رہا تھا۔ رخصتہ البتہ خاموش تھی۔ وہ سلمان کا  
نظر بچا کر جھٹ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دونوں فلم دیکھ کر آئے تھے۔ جعفری کچھ دیر فلم کی تعریف کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر چلا گیا۔  
چلتے چلتے سلمان سے کہتا گیا۔

”سالو من! آرڈی براؤنج سے تمہارے خلاف بڑا سخت نوٹ آیا ہے۔ تم کام سے غفلت برد  
رہے ہو۔ یہ درست نہیں۔ کل صبح دفتر میں مجھ سے مل لینا۔“

سلمان کا نصف غصہ تو اس اطلاع سے رخصتہ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ آرڈی براؤنج والوں۔  
اس کے خلاف کیوں شکایت کی؟ ضرور اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی۔ ان دنوں وہ کام کی طرف  
سے لاپرواہی بھی بہت برت رہا تھا۔ وہ اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ بیوی نے آکر کہا۔  
”آپ نے کھانا کھایا؟“

سلمان نے روکھے پن سے کہا۔ ”نہیں۔“  
رخصتہ پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے رسان سے کہا۔ ”میں ابھی کھانا گرم کر کے لا  
ہوں۔“ خادمہ کو چگانے کے بجائے وہ خود ہی جھپاک سے باورچی خانے میں چلی گئی۔ سلمان نے  
بھی کیا مگر وہ باز نہ آئی۔ باورچی خانے میں برابر برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔  
ذرا دیر بعد رخصتہ کھانے لے کر آگئی۔ وہ ابھی ابھی آگ کے سامنے سے اٹھ کر آئی تھی۔  
کے رخسار شعلوں کی تپش سے تھما رہے تھے۔ آنکھوں میں ستارے جھللا رہے تھے۔ بالوں کی لہ  
بکھر کر ماتھے پر آگئی تھی۔ اس آب و تاب نے اس کی دل کشی اور بڑھادی تھی۔ وہ اس وقت



ایک روز اس نے سنجیدگی سے طے کیا کہ جعفری کی آمد و رفت بند کر دینا چاہیے۔ لیکن اس راج جعفری کے ناراض ہو جانے کا خدشہ تھا اور جعفری کی ناراضگی سے ملازمت خطرے میں پڑ جاتی۔ لہذا ایسا قدم اٹھانے سے پیشتر دوسری ملازمت تلاش کر لینا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے ملازمت کی تلاش میں دوڑ دوڑ کر شروع کر دی مگر کئی ہفتوں کی دوڑ دوڑ کے بعد اسے پانچ سو کے برابر دو سو روپے کی بھی نوکری نہ ملی۔ چچا سسر اس دنیا میں نہیں رہا تھا جس کی سفارش اور اثر و رسوخ سے نئی ملازمت مل جاتی۔ چچا سسر اس کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ دوسری ملازمت نہ ملی لہذا وہ جعفری کو ناراض کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سلمان نے سوچا کہ اب ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ رخشندہ کو جعفری کے ساتھ تنہا نہ جانے دے۔ خود بھی اس کے ہمراہ جایا کرے۔ اس طرح اس تکلیف سے توجیح جائے گا جو ان دونوں کے جانے کے بعد محسوس رہا تھا۔ چنانچہ ایک روز جب دونوں باہر جانے لگے تو سلمان بھی ان کے ہمراہ چلا گیا۔

مگر اس روز اور بھی زیادہ اذیت پہنچی۔ شام کی چائے انہوں نے شیزان میں پی۔ وہاں جعفری نے کچھ دوست بھی آگئے۔ اور جب اس نے سلمان اور رخشندہ کا تعارف مسٹر اور مسز سلمان کہہ کر لیا تو ہر ایک نے چونک کر اس طرح سلمان کو دیکھا جیسے انہیں جعفری کی بات پر یقین نہیں آیا۔ سلمان نے دل گرفتہ ہو کر سوچا کیا وہ واقعی بد صورت ہو گیا ہے یا اپنی وضع قطع سے اس قابل نہیں لگتا کہ اسے رخشندہ کا شوہر سمجھا جائے۔

جعفری نے اپنے ایک دوست سے اس کا تعارف کرایا تو وہ مسکرا کر بولا۔  
”تو گویا آپ ہیں مسٹر سلمان۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”آپ کی بیگم سے جعفری کے ہاتھ اکثر ملاقات ہوئی مگر آپ سے بھی ملنے کا اشتیاق تھا۔ آپ تو جی بہت دلچسپ آدمی معلوم آتے ہیں۔“

سلمان نے پوچھا۔ ”آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بہت دلچسپ آدمی ہوں؟“  
”کسی روز میرے یہاں آکر چائے پیچھے تو میں بتاؤں گا کہ آپ کتنے دلچسپ آدمی ہیں۔ لیکن اسے باتیں ہوں گی۔ بیگم کو اپنے ساتھ ضرور لایئے گا۔“ اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر اور گھر کا پتہ بتایا۔ وہ وزارت صنعت و تجارت میں ڈپٹی سیکریٹری تھا۔ ”تو آپ دونوں کب آرہے ہیں؟ ٹیلی فون کر لیجئے گا۔ میں اپنی کار بھیج دوں گا۔“

صدی سے بھی زیادہ کا فرق ہے اور اس چوتھائی صدی میں زندگی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اسے زندگی کو اپنے باپ کی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ وہ سخت قدامت پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ سلمان بستر چھوڑ کر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ رخشندہ صوفے پر تھک کر سو گئی تھی۔ تیز روشنی میں اس کا چہرہ بڑا معصوم نظر آرہا تھا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ صوفے کے نیچے جھول رہا تھا۔ کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے اندر آرہے تھے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ سلمان نے آہستہ سے جھنجھوڑا اور بڑے پیار سے بولا۔  
”یہاں کھلی ہوا میں کیوں لیٹی ہو؟ طبیعت خراب ہو جائے گی۔“  
رخشندہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اس کے بازو کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی۔

\*\*\*

سلمان دفتر سے واپس آیا تو اس روز بھی رخشندہ گھر پر موجود نہ تھی۔ وہ جعفری کے ساتھ سلمان کی غیر حاضری میں باہر چلی گئی تھی۔ اب وہ اکثر اس طرح جعفری کے ساتھ گھومنے چلی جاتی۔ مگر نہ تو سلمان نے کوئی باز پرس کی اور نہ رخشندہ نے کبھی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ موجود بھی ہو تا تو جعفری صرف تکلفاً پوچھتا۔  
”کیا تم کچھ دیکھنے کے موڈ میں ہو؟“ اور فوراً کہتا۔ ”تم یقیناً تھکے ہوئے ہو۔ تم کو آرام کرنا چاہیے۔“ وہ گھڑی دیکھ کر اس کی بیوی کو آواز دیتا۔ ”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں رختی؟“ اب رخشندہ کو وہ رختی ہی کہتا تھا۔ ذرا دیر بعد رخشندہ کی آواز ابھرتی ”ابھی آئی۔“ پھر وہ بن سنور کر اس طرح آتی کہ کمرہ جگمگانے لگتا۔

بعد میں جعفری نے سلمان سے تکلفاً پوچھنا بھی چھوڑ دیا۔ روزانہ شام کو سلمان کے گھر آتا۔ وہ اور رخشندہ مسکراتے ہوئے باہر چلے جاتے۔

سلمان کمرے میں تنہا بیٹھا سوچا کرتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا اسے دونوں کا حد سے بڑھتا ہوا یہ میل جول روک دینا چاہیے؟ وہ الزام ڈالنے بننے کی کوشش کے باوجود ماڈرن بھی نہیں بن سکا تھا۔ اسے دونوں کے اس رویے سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔

وہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس کی صحت پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ اس نے بار بار سوچا کہ اسے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ مستقل آزار بن جائے گا۔

اس نے تیز تیز قدموں سے زینے کی سیڑھیاں طے کیں۔ غصے میں دروازہ زور سے دھکا دے رکھو لا۔

ڈرائنگ روم خالی تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ سامنے مسمری پر ہنسی لیٹا تھا۔ اس کی بیوی سرہانے بیٹھی جعفری کا سر دبار ہی تھی۔

سلمان کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ وہ دہلیز پر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو مضبوطی سے انگلیوں میں بچھلایا اور ڈپٹ کر بولا۔ ”رخصتی!“

بیوی نے گھبرا کر دیکھا اور فوراً اس کے قریب آگئی۔ اس نے سرگوشی کی۔ آہستہ بولے۔ ”جعفری کی طبیعت خراب ہے۔“

سلمان نے خونخوار نظروں سے رخشندہ کو دیکھا۔ اسی وقت جعفری کی آواز ابھری۔ ”سالو من! کیا بات ہے؟ میرے پاس آؤ۔“

جعفری اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سلمان کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔ ”تم روٹے ہوئے بچوں کی طرح وہاں کیوں کھڑے ہو؟ یہاں تو آؤ۔ آؤ بھی۔“ اس کا لہجہ سر پرستانہ تھا اور ٹھکانہ بھی۔

سلمان آہستہ آہستہ چل کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ”کیا تم مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو گے؟“ جعفری نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔“

وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ سلمان نے خاموشی سے اس کی ہڈیانی پر ہاتھ لگایا۔ اس کی پیشانی پسینے سے شرابور تھی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

”ارے آپ کو تو بڑا تیز بخار ہے۔“

”بہت خراب ہو رہی ہے طبیعت۔“

”میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔“

”نہیں میں خود چلوں گا۔“

سلمان نے سہارا دے کر نیچے اتارا اور اسے سنبھالے ہوئے کار تک لے گیا۔ رخشندہ بھی لاتھ تھی۔ کار وہی چلا رہی تھی۔

سلمان اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس نے جھنجھلا کر دل ہی دل میں کہا۔ یہ سالار شوت کی کمائی پر پلا ہوا مسٹڈ ایم۔ اے نواز، کیا مجھے بھڑا سمجھ رہا ہے یا محض آٹو کا بھڑا جو اس طرح رخشندہ کو اپنی کوٹھی پر لانے کے لیے مجھ سے بیباکی سے بات کر رہا ہے؟ اس کا جی چاہا کہ نواز کے منہ پر کس کے ایسا تھپڑ رسید کرے کہ عقل ٹھکانے آجائے۔

جعفری فوراً بھانپ گیا کہ سلمان کو نواز کی بات ناگوار گزری۔ مسکرا کر بولا۔ ”نواز! میرا مشورہ ہے تم ذیل کارنگی کو ضرور پڑھو۔ میری مراد اس کی کتاب ہاؤ ٹون فرینڈز سے ہے۔“

نواز کو بھی سلمان کی خفگی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لہذا وہ ذیل کارنگی کے بارے میں جعفری سے باتیں کرنے لگا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اس روز کے بعد سلمان پھر ان دونوں کے ہمراہ نہ گیا۔ اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ سلگتا رہا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ رخشندہ بڑی بے باکی سے جعفری کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ اب جعفری کا بیشتر وقت سلمان ہی کے فلیٹ میں گزرتا۔

\*\*\*

اس روز چٹھی تھی۔ لیکن جعفری نے سلمان کی ڈیوٹی دفتر میں لگادی۔ وہ خود بھی دفتر آیا۔ مگر زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ کچھ دوستوں کے ساتھ دھابے جی آؤٹنگ کے لیے جا رہا ہے۔ جزل منبر کا شاید فون آئے تو کہہ دے کہ وہ کسی رشتہ دار کو رخصت کرنے ایئر پورٹ گیا ہے۔

سلمان ۳ بجے تک دفتر میں کام کرتا رہا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ لہذا وہ جلد ہی دفتر سے اٹھ گیا۔ واپس گھر آیا۔ دیکھا، جعفری کی کار اس کے فلیٹ کے نیچے کھڑی ہے۔ کار دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

سلمان غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں اس نے بازار میں جا کر چاقو خرید لیا اور یہ طے کر کے گھر میں گھسا کہ وہ آج جعفری اور رخشندہ دونوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔ اس کے سر پر خون کھیل رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے چاقو کو وہ دالہنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ اپنی ذلت کا انتقام لینے کا اس کی سمجھ میں یہی طریقہ آیا۔ روز روز کے چرکوں نے زندگی عذاب بنا دی تھی۔

مسلمان کو پہلی بار علم ہوا کہ وہ کار چلاتا بھی سیکھ گئی ہے۔

تینوں ڈاکٹر کے کلینک پہنچے۔ واپسی پر وہ جعفری کو چھوڑنے اس کی کوٹھی گیا اور رات گئے تک وہاں رہا۔ رخصتہ بڑی مستعدی سے جعفری کی تیمارداری کرتی رہی۔ مسلمان خاموش بیٹھا سے دیکھتا رہا۔ جب وہ گھر لوٹا تو چاقو اس کی جیب میں پڑا تھا۔ اور جعفری کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے لیے رخصتہ وہیں ٹھہر گئی تھی۔

(۴)

سلطانہ کو بوڑھے خانساں کے بھائی کے ساتھ رہتے ہوئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ مزاج میں نرمی تھی۔ بڑے بھائی کی طرح کم سخن اور مرجان مرغ تھا۔ بازار میں اس کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔ وہ صبح کا نکلا رات گئے گھر میں داخل ہوتا۔ تمام دن دکان پر بیٹھا رہتا۔ وہ سلطانہ کی بڑی عزت کرتا تھا اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ مگر اس کی بیوی بڑی سرکش اور منہ پھٹ تھی۔ ذرا سی بات پر آنکھیں نکال کر کھڑی ہو جاتی۔ ہر سال اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تھا۔ اب تک گیارہ کی پلٹن تیار کر چکی تھی۔ درجن کا آخری بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔ وہ دن بھر بچوں کو چیخ چیخ کر کوسنے دیتی۔ ہر وقت اس کی ناک پر غصہ رہتا۔ ذرا کوئی بات مزاج کے خلاف ہوتی اور اس نے دہانہ شروع کر دیا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ قد ٹھکانا اور نچلا دھڑ خوب پھیلا ہوا تھا۔ دیکھنے میں اچھی خاصی بھوری بھینس معلوم ہوتی تھی۔

سلطانہ کو پہلے ہی دن سے وہ اچھی نہیں لگی۔ وہ اس سے بہت کم بات چیت کرتی۔ سلطانہ نے کبھی اس سے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ چھوٹا سا گھر تھا جس میں کل دو کمرے تھے۔ کمروں کے آگے برآمدہ بھی تھا۔ مگر سلطانہ کو رہائش کے لیے ایک کمرہ مل گیا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت کمرے کے اندر گزارتی۔

نئے لیاؤ کی ان دنوں طبیعت خراب تھی۔ دانت نکل رہے تھے۔ وہ ہر وقت ماں کی گود میں

تیمارداری: بیمار کی عیادت۔ کم سخن: کم بولنے والا۔ مرجان مرغ: ہر حال میں خوش رہنے والا۔ سرکش: نافرمان۔ منہ پھٹ: زبان دراز۔ بد زبان۔ ٹھکانا: چھوٹا قدر۔

رہتا۔ ماں لمحہ بھر کو جدا ہوتی تو دہریں ریں کرتا شروع کر دیتا۔

بوڑھا خانساں ابھی تک بے روزگار تھا اور ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ سلطانہ اپنے ساتھ چار روپے لائی تھی خرچ ہو چکے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا وہ گھر میں کھاتی تھی۔ البتہ بچے کے دودھ اور دوسری ضروریات پر وہ اپنے پاس سے خرچ کر رہی تھی۔ جب سارے روپے خرچ ہو گئے تو ایک روز اس نے خانساں کو بلایا اور کانوں میں پڑے ہوئے سونے کے آویزے نکال کر خانساں کو دیئے کہ ان کو فروخت کر دے۔

خانساں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”بیگم صاحبہ! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

سلطانہ بولی۔ ”دیکھو بابا تم مجھے بیگم صاحبہ نہ کہا کرو۔ مجھے بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔“ وہ اب خانساں کے بجائے اسے بابا کہنے لگی تھی۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”تو پھر کیا کہا کروں؟“

”جو آپ کا جی چاہے۔ ویسے آپ میرا نام تو جاننے ہی ہیں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”چلو بھی اللہ میاں نے مجھے اتنی بڑی پالی پوسی بیٹی دے دی۔“ اس نے سلطانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ”اچھا اب تم یہ بندے پہن لو۔ میرے پاس ابھی کچھ رقم پڑی ہے۔ فی الحال تم اس سے کام چلاؤ۔ جب تک اللہ میرا کام لگا دے گا۔“

سلطانہ نے بہت اصرار کیا مگر وہ آویزے فروخت کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ اسی وقت جا کر ان نے اپنا صندوق کھولا اور پچاس روپے لاکر سلطانہ کو دے دیئے۔

سلطانہ نے روپے تولے لیے مگر اسے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا اس طرح اب تک کام چلے گا؟ کب تک وہ خانساں سے روپے لیتی رہے گی؟ وہ اسی ادھیڑ بن میں دیر تک سر ٹھکائے بیٹھی رہی۔

\*\*\*

شاید جمعہ تھا۔ خانساں کا چھوٹا بھائی دکان سے سرشام ہی واپس آ گیا تھا۔ جمعے کو وہ عام طور پر جلد ہی گھر آ جاتا تھا۔ اس روز وہ بازار سے مٹھائی لایا تھا۔ اس نے سلطانہ کو بھی مٹھائی بھجوانا چاہی تو بڑی جھگڑا کر بولی۔

ایسے ایسے: کانون کا ایک دیوہ پالی پوسی: مرویدی عمر کی: سرشام: شام ہوتے ہی۔

نوکری ملے تو کیسے؟ کوئی تلاش بھی کرے۔ اللہ دے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو۔“  
شوہر مری ہوئی آواز میں بولا۔ ”چھاپچھا! میں ان سے بات کروں گا۔ اب تو تم چپ ہو جاؤ۔“

مگر وہ باز نہ آئی۔ کہتی رہی۔ ”اگر تم نے ان سے نہ کہا تو خدا قسم میں سامان باہر رکھوا دوں گی اور انوں سے کہوں گی کہ بڑھاؤ اپنا ٹیوہیاں سے۔ بہت ہو چکی مہمان داری۔“

وہ زچ ہو کر بولا۔ ”خدا کے لیے تم اب چپ ہو جاؤ۔ بہت کہہ چکیں۔“  
وہ بجائے چپ ہونے کے اور زیادہ زور زور سے چیخنے لگی۔ جو منہ میں آیا، کہتی چلی گئی۔ اس نے رونا بھی شروع کر دیا۔ شوہر سیدھا سادا دیو آدمی تھا۔ چنگاموں سے جلد گھبرا جانے والا۔ بجائے اس کے کہ وہ بیوی کو ڈانٹتا ڈھنچٹا اس کی خوشامد کرنے لگا۔

سلطانہ دم بخود بیٹھی ایک ایک بات ایک ایک آواز سنتی رہی۔ اس نے سوچا اب اس گھر میں وہ زیادہ عرصے نہیں ٹھہر سکتی۔ وہ رات گئے تک بستر پر پڑی سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کس کے پاس جائے؟ کہاں جائے؟ کئی بار اس نے انتہائی امید کی کہ عالم میں سوچا کہ اس زندگی سے تو موت بھلی۔ پھر اس رات ایک ایسا لمحہ بھی آیا کہ اس نے سنجیدگی سے خود کشی کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بار ماں نے اسے بتایا تھا کہ محلے کی ایک عورت نے ٹنچر آبیوڈین بنا کر خود کشی کر لی تھی۔ سلطانہ کو تھوڑے سے ٹنچر آبیوڈین کی ضرورت تھی۔ اس نے سوچا جب رات سنان ہو جائے گی اور گھر میں سب سو جائیں گے تو پہلے وہ ننھے لایا کو ٹنچر پلائے گی۔ پھر خود ہالے گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ صبح کو بستر پر صرف لاشیں ہی ملیں گی۔ رات بھر وہ یہی سوچتی رہی اور چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ بستر سے اٹھنے کے ساتھ ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ تکراری لائے والی چھری سے اپنی پنڈلی چیر ڈالی۔ چھری کند تھی۔ سلطانہ کو زخم لگانے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ بار بار اس کا ہاتھ لرز جاتا۔ مگر پنڈلی کو زخمی کرنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ ٹنچر آبیوڈین کیا کہہ کر منگواتی۔

فردسے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو: مردانے مفت میں کھانے کو ملے اسے کمانے کی کیا ضرورت ہے۔ بڑھاؤ اپنا ٹیوہیاں: مردانے چلے جاؤ۔ زچ: لالچ، آواز، کج آنکھ، دیو: دہنے والا، ڈرپوک: تکراری، ہیزی: کند، جو تیز نہ ہو۔

”بس رہنے دو بہت ہو چکیں خاطر داریاں۔ اپنے گھر میں کھانے والے کچھ کم ہیں جو تجھے مجھے کھلاتے پھر رہے ہو۔ خواہ خواہ کے لیے بڑے بھیانے ایک مصیبت لا کر ہمارے سر پر ڈال دی۔ بیگم ہوں گی ان کے لیے۔ انہوں نے نمک کھلایا ہے۔ ہمارے ساتھ کیا کر دیا جو دونوں وقت پانگ پر بٹھا کر دسترخوان لگائیں۔“

وہ بڑی تیز اور طرار عورت تھی۔ ایک زبان میں دس باتیں کہتی تھی۔ تراق پراق بولتی چلی گئی۔ سلطانہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ درمیان میں دیوار تھی۔ مگر آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اس کے منہ سے ایسی جلی کٹی باتیں کئی بار سن چکی تھی۔ ذرا دیر بعد اس کے شوہر کی آواز ابھری۔

”نیک بخت کیوں ایسی باتیں کر رہی ہے۔ خدا کسی پر برا وقت نہ ڈالے۔ بے چاری مصیبت کی ماری ہوئی ہے۔ ہمارا کیا لیتی ہے۔ دو وقت کا کھانا کھا لیتی ہے تو اس میں کیا جاتا ہے۔ اللہ نہ جانے کس کے نصیب سے دیتا ہے۔“

بیوی اس کے سمجھانے پر اور بھڑک اٹھی۔ چیخ کر بولی۔ ”بس بس رہنے دو اپنی خدا ترسی، ہم کون سے بڑے دھنسا سینٹھ ہیں۔ نہ جانے کس طرح رو کھا سو کھا کھا کر گزارہ ہو رہا ہے۔ اوپر سے یہ مصیبت اور سر پر آگئی۔ یہ بڑے بھیا اچھے خاصے دفان ہو گئے تھے۔ اب آئے ہیں تو اپنے ساتھ یہ دم جھٹکا لگا کے لے آئے۔ خود بھی ٹھونس رہے ہیں اور اپنے الفتوں کو بھی ٹھنسا رہے ہیں۔“

وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ سارے گھر میں اس کی آواز گونجنے لگی۔ شوہر نے ٹوکا۔ ”آہستہ بولو۔ وہ بے چاری سنے گی تو کیا کہے گی؟“

وہ اور زور سے چیخنے چلانے لگی۔ ”سن رہی ہے تو سننے دو۔ میں کسی کے لیے اپنے منہ میں قفل نہیں ڈالوں گی۔ میرا گھر ہے جس طرح چاہوں بات کروں۔ دیکھو میں نے تم سے کہہ دیا کہ مجھ سے اب نہیں کھلایا جائے گا۔ تم بڑے بھیا صاف صاف کہہ دو کہ اپنی مصیبت اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ سرائے یا ہوٹل نہیں ہے جس کا بیجا آکر ٹھہر گیا۔ واہ واہ یہ بھی خوب رہی۔ خود مزے سے اینڈتے پھرتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ نچا کر نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”بھئی نوکری نہیں لگتی۔ اے

خاطر داری: آؤ بھت، تواضع، ایک زبان میں: ایک ہی دفعہ، ایک ساتھ: تراق پراق: جلد جلد، بے باکانہ: جلی سکی باتیں، نصیب والا: تکلیف دہ باتیں، دھنسا سینٹھ: بہت زیادہ امیر، الفتوں: مفت خوروں، اینڈتے پھرتا: غرور سے پھرتا، نخرے سے پھرتا۔

میں خانساں آئے گا۔ اور اس کی لاش دیکھ کر رو پڑے گا۔ وہ ضرور روئے گا۔ اسے ضرور دکھ ہوگا۔ اور اس کی بھادج ضرور اسے کونے دے گی۔ حرامزادی کو یہیں آکر مرنا رہ گیا تھا۔ وہ زور زور سے چیخے گی۔ اس کا زن مرید شوہر اسے چپ کرانے کے لیے منت سماجت کرے گا۔ اور بستر پر لاش سرد رہے گی۔ اسے کچھ بھی خبر نہ ہوگی۔

ان تمام باتوں کو وہ سوچ چکی تھی، سوچ رہی تھی اور دیر تک سوچنا چاہتی تھی۔ بار بار اس کا دل بر آتا۔ وہ رو پڑتی۔

رونے سے اسے تسکین مل رہی تھی۔

\*\*\*

صفر اشک بشارت نظر آ رہی تھی۔ اس نے خود ہی بات چھیڑی۔ ”اللہ میاں نے میری تو سن لی۔“ لیکن سلطانہ نے اس کی بات بالکل نہ سنی۔ وہ پتھر کی طرح خاموش تھی۔ صفر اکہتی رہی۔ ”نہ اب اس حرامزادے کے آگے ہاتھ پھیلائے کی ضرورت ہے نہ تیرے میرے احسان اٹھانے کی۔

اپنے ہاتھ پاؤں سلامت۔ اب تو دو چار کو بٹھا کر کھلانے کا دم ہے۔“

سلطانہ نے اس کی باتوں پر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔

صفر لمحہ بھر رک کر بولی۔ ”اے کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

سلطانہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”اجھی ہے۔“

”بڑی چپ چاپ نظر آ رہی ہو۔ بات کیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ سلطانہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں تو آج کل ٹھاٹھ سے کام پر جا رہی ہوں۔ اسی لیے کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔“

اس دفعہ سلطانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔ ”کہاں مل گیا؟“

”اے وہ کیا نام ہے اس کا۔ انڈسٹرل ہوم۔ انگریزی میں نام رکھا ہے۔ یاد بھی تو نہیں رہتا۔“

سلطانہ کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ ”کیا کام ہوتا ہے وہاں؟“

”فی الحال تو میں سلائی کا کام کرتی ہوں۔ ویسے کام سیکھ بھی رہی ہوں۔ وہاں تو نہ جانے کتنی

لے دیا۔ برا بھلا کہنا۔ حیران میرا: اپنے بچے کا۔

پنڈلی زخمی کرنے کے بعد وہ پنچگر کے لیے خانساں کا انتظار کرنے لگی۔ وہ سویرے بہت تڑکے اٹھ کر کہیں چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ ہر طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ سلطانہ نڈھال بیٹھی تھی۔ بچہ اس کی گود میں سو رہا تھا۔ اسی اثنا میں صفر آگئی۔ وہ چہرے جسم کی زرد رو عورت تھی۔ دو چار مکان چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ اکثر آیا کرتی تھی۔ سلطانہ سے بھی اس کی تھوڑی بہت یاد اللہ ہو گئی تھی۔

صفر ان دنوں سخت پریشان تھی۔ اس کے شوہر نے ایک طوائف کو گھر میں ڈال لیا تھا اور اب اسی کے ساتھ رہتا تھا۔ شروع شروع میں وہ صفر اور اس کے بچوں کے اخراجات کے لیے کچھ نہ کچھ دیتا رہا۔ مگر پچھلے کئی ماہ سے خرچ دینا تو ایک طرف وہ اس کی طرف آکر جھانکا تک نہیں۔ صفر اپری کئی وقت کے فاقے پر رہے تھے۔ سلطانہ خود مصیبت کی ماری تھی اسی لیے صفر اسے اسے ہمدردی تھی۔

صفر گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اس کے پاس آئی۔ اس روز خلاف توقع اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

سلطانہ کا اس وقت بات چیت کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تنہائی چاہتی تھی۔ اور اس تنہائی میں بیٹھ کر وہ ان باتوں کو سوچنا چاہتی تھی جو پچھلی رات سے اس کے دماغ میں منڈلا رہی تھیں جن کو دہرانے میں حرا آ رہا تھا۔ یہ موت کا ڈانٹہ تھا۔ مر جانے کی حسرت تھی۔

اس کے چاروں طرف گہری تاریکی کا جال پھیلا تھا اور اس جال میں الجھی ہوئی وہ اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کو محسوس کر رہی تھی۔ ان لمحوں کو دیکھ رہی تھی جب وہ اپنے بچے کو تیز بدبودار تیزابی پنچگر پلائے گی۔ بچہ پہلے گھبرا کر روئے گا۔ پھر تڑپے گا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں گی۔ منکا ڈھلک جائے گا۔ وہ مر جائے گا۔ اس کی لاش اٹھا کر وہ سینے سے چٹالے گی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پیشانی کو چومے گی۔ دوسرے لمحے آویڑیں گی کی شیشی اس کے ہاتھ میں ہوگی اور تیزابی مادہ اس کے حلق سے نیچے اتر رہا ہوگا۔ پھر اس کا دل کٹنے لگے گا۔ وہ تڑپنے لگے گی۔ آنکھوں کے سامنے ہر چیز دھندلی پڑتی جائے گی۔ ایک ہنگی۔ دوسری ہنگی اور پھر قصہ ختم۔

صبح بستر پر اس کی لاش پڑی ہوگی۔ اس کے برابر ننھے لیا ز کا مردہ ہوگا۔ سب سے پہلے کمرے

تڑکے: صبح سویرے۔ یاد اللہ: سلام دعا، واقعت۔ آنکھیں ابل پڑنا: تکلیف سے آنکھیں کل آنا۔ منکا ڈھلکنا: مرتے وقت گردن کا پیرما ہونا۔

سٹرل ہوم میں داخل کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اس نے اسی وقت سلطانہ کا نام رجسٹر میں درج کیا۔  
 دراصل کاٹک بنا کر دے دیا۔ سلطانہ چاہتی تھی کہ انڈسٹرل ہوم ہی میں اس کی رہائش کا بھی  
 روبرو ہو جائے۔ مگر علی احمد نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ صاف کہہ دیا۔

”دیکھئے ہم آپ کو رہنے کی جگہ نہ دے سکیں گے۔ اس کا بندوبست تو آپ کو خود ہی کرنا پڑے گا۔“  
 سلطانہ نے عاجزی سے کہا۔ ”میں جہاں رہتی ہوں وہ لوگ مجھے زیادہ عرصے اپنے ساتھ  
 ہرانا نہیں چاہتے۔ میرا یہاں کوئی نہیں ہے جس کے پاس جا کر ٹھہر جاؤں۔“  
 ”کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا۔ میرا مطلب ہے کوئی عزیز کوئی رشتہ دار۔“  
 ”اگر اتنا ہی سہارا ہوتا تو میں آپ سے اس طرح کیوں کہتی۔“

علی احمد ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”آپ کل اسی  
 ن آئیے گا تو میں کچھ بتا سکوں گا۔ فی الحال میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“

سلطانہ کے لیے اب زیادہ اصرار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ صفر کے ساتھ واپس گھر آگئی۔  
 دوسرے روز وہ پھر ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ علی احمد دفتر میں موجود تھا۔ سلطانہ کو دیکھ کر بولا۔  
 ”سٹرل ہوم میں تو ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں۔ وہاں جائیں گی تو آپ کو خود اس کا اندازہ  
 جائے گا۔ سردست یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ہیڈ کوارٹر میں ٹھہر جائیں۔ یہاں آپ کو رہنے کے لیے  
 کمرہ مل جائے گا۔ مگر یہ آپ کی عارضی رہائش ہوگی۔ اسکاٹی لارک کو شش کر رہے ہیں کہ بستی  
 ما آپ کے لیے مکان کا بندوبست کر دیا جائے۔“

سلطانہ نے خاموشی سے اس کی بات مان لی۔  
 وہ اسی روز اپنا سامان لے کر وہاں پہنچ گئی۔ اسکاٹی لارکوں نے سلطانہ کے لیے کمرہ خالی کر دیا۔  
 بہت مختصر تھا مگر صاف ستھرا تھا۔

چند روز تو سلطانہ کو ہیڈ کوارٹر میں بڑی وحشت معلوم ہوئی وہاں سب مرد ہی مرد تھے۔ وہ  
 سٹرل ہوم سے شام کو لوٹتی اور زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی۔ کبھی کبھار کسی کام سے باہر نکلنا  
 اتنا تو بڑی شرم معلوم ہوتی۔ لیکن نکھایا بہت جلد اسکاٹی لارکوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ گھنٹوں  
 کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

طرح کے کام ہوتے ہیں۔ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ خدا قسم بڑے اچھے اچھے گھروں کی  
 عورتیں آتی ہیں۔“  
 ”تمہیں تنخواہ ملتی ہے؟“

”جتنا کام کرو اتنی ہی آمدنی۔ ہفتے کے ہفتے حساب مل جاتا ہے۔“  
 سلطانہ نے ہنسی بھرتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے بھی وہاں کام مل جائے گا؟“ مرنے کی تمننا پر زندہ  
 رہنے کی خواہش حاوی ہو گئی۔ سلطانہ بالکل بھول گئی کہ پچھلی رات سے اب تک وہ کیا کیسوچتی رہی  
 تھی۔ اس نے کس کس طرح موت کا ارمان کیا تھا اور کس کس طرح خود کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔  
 مگر زندگی پھر زندگی ہے۔ حرکت اور حرارت۔ جدوجہد، مسلسل جدوجہد۔

صفر نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا۔ ”تم کام کرو گی؟“  
 ”کیوں کیا ہوا؟“

”تو پھر کسی دن میرے ساتھ چلو۔“  
 سلطانہ بولی۔ ”آج ہی لے چلو۔“  
 ”میں دس بجے جاؤں گی۔ تیار ہو جاؤ۔ میں آکر تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گی۔“  
 سلطانہ آمادہ ہو گئی۔

صفر اچلی گئی۔ سلطانہ نے اٹھ کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔  
 پنڈلی کا زخم یاد آیا۔ اس نے توجہ دی۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے ہی صفر آگئی۔ سلطانہ اس وقت تک تیار ہو چکی تھی۔ اس نے ننھے لارک  
 کو خانماں کی بڑی بھتیجی کے سپرد کیا اور صفر کے ہمراہ گھر سے نکلی۔ صفر اسے انڈسٹرل ہوم کے  
 بجائے پہلے فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر لے گئی۔ انڈسٹرل ہوم میں داخلے کی اجازت وہیں سے ملتی تھی۔  
 دونوں وہاں پہنچیں تو دس بج چکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر دیکھ کر سلطانہ کو شبہ سا ہوا کہ اس عمارت کو  
 پہلے بھی کبھی دیکھ چکی ہے۔ مگر وہ زیادہ توجہ نہ دے سکی۔ شبہ صرف شبہ کی حد تک رہا۔ اس عمارت کو  
 جب پہلی بار اس نے دیکھا تھا تو اندھیری رات تھی۔ ویسے بھی اس کی زندگی میں اس وقت سے اب  
 تک اتنی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں کہ بہت سی باتوں کی یاد تک دھندلا گئی تھی۔

ہیڈ کوارٹر میں اس وقت علی احمد ڈیوٹی پر تھا۔ صفر نے سلطانہ کو اس سے ملایا۔ وہ سلطانہ کو

سلطانہ کو اسکاٹی لارک بڑے عجیب و غریب معلوم ہوئے۔ وہ بلا کسی غرض کے سب کی خدمت کرتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ وہ اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ مونہ جھوٹا کھاتے، مونہ بڑا پہنتے اور بڑے مطمئن نظر آتے۔ بات کرتے وقت ان کا لہجہ نرم ہوتا۔ وہ ننھے ایاز کے ساتھ لٹیرے فوجوانوں کی طرح قہقہے لگا کر کھیلتے تھے۔ اور وہ بھی اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ ہمک ہمک ان کے پاس جاتا اور گھنٹوں ماں کے پاس آنے کا نام نہ لیتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ علی احمد اس کے پاس اپنی قیص میں رفقہ کرانے کے لیے آیا۔ اس نے بلا کی تمہید کے سلطانہ سے کہا۔ ”آپ پڑھائی کیوں نہیں شروع کر دیتیں؟“

سلطانہ فوراً آمادہ ہو گئی۔ ”آپ مجھے پڑھا دیا کریں گے؟“

علی احمد ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میں صرف آدھ گھنٹہ آپ کو دے سکوں گا۔“ اسی وقت پروگرام طے ہو گیا۔ دوسرے روز سورج غروب ہوتے ہی علی احمد پڑھانے آ گیا۔ علی احمد کی توقع سے زیادہ دین نکلی۔ پڑھنے سے اسے دلچسپی بھی تھی۔ بچپن میں قرآن پاک کا راجھی کر چکی تھی۔ لہذا مقررہ مدت سے پہلے ہی اس نے تعلیم بالغاں کا پہلا کورس ختم کر دیا۔ اس لڑکی دلچسپی اور لگن دیکھ کر علی احمد نے پڑھائی کے وقت میں پندرہ منٹ کا اضافہ کر دیا۔ وہ وقت کا نامے پابند تھا۔ سبق شروع کرنے سے پہلے گھڑی دیکھ لیتا اور جیسے ہی ۴۵ منٹ پورے ہوتے فوراً کرکٹ اہو جاتا۔ پڑھائی کے دوران وہ کبھی غیر متعلق بات نہیں کرتا تھا۔ کئی بار سلطانہ نے سوچا نوشا کے بارے میں علی احمد سے بات کرے، مگر علی احمد کا سنجیدہ چہرہ اور سوچتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی۔

وہ نوشا کے لیے بڑی بے چین تھی۔ آخر ایک روز اس نے ہمت کر کے علی احمد سے کہہ ہی ”میرا چھوٹا بھائی جیل میں ہے۔ اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔“

علی احمد نے چونک کر سلطانہ کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”کس کو قتل کیا تھا اس نے؟“

سلطانہ نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے باپ کو۔“

علی احمد اور زیادہ حیرت زدہ ہو گیا۔ ”اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔ بڑا بے رحم فوجوان ہے۔“

”وہ اتنا برا نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”کیوں؟“ علی احمد بدستور حیرت زدہ تھا۔

سلطانہ دس بجے انڈسٹریل ہوم چلی جاتی۔ سینے پر ونے کے علاوہ اسے تھوڑی بہت کلید کاری بھی آتی تھی۔ اسے اسی کام پر لگادیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ زردوزی اور لکڑی کے کھلونے بنانے کا کورس بھی مکمل کر رہی تھی۔ کام میں سب سے بڑی مشکل نکھایا ز تھا جس نے شروع شروع میں رو رو کر اسے بہت پریشان کیا۔

انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے والی عورتوں میں بہت کم ایسی تھیں جو ننھے ننھے بچوں کو اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ بچوں سے چونکہ کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی تھی اس لیے عام طور پر انڈسٹریل ہوم میں بچوں والی عورتوں کو بہت کم داخلہ ملتا تھا۔ ویسے بچوں کے لیے انڈسٹریل ہوم میں ایک لمبا والاں تھا جس میں کئی پالنے پڑے تھے۔ جو بچے گھنٹوں چلنے والے تھے ان کے واسطے لکڑی کی باڑھ لگا کر چھوٹا سا احاطہ بنادیا گیا تھا جہاں وہ کھیلتے رہتے۔

ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک یا بھی مقرر تھی۔

سلطانہ رفتہ رفتہ ہیڈ کوارٹر کے ماحول سے مانوس ہوتی گئی۔

علی احمد سے وہ ایک بار بات چیت کر چکی تھی۔ لہذا وہ کبھی کبھار اس سے بات کر لیتی۔ نکھایا ز علی احمد سے بہت مل گیا تھا۔ اس لیے گفتگو کرنے کا روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ نکل ہی آتا۔ ذرا طمیان نصیب ہوا تو اسے نوشا کا خیال ستانے لگا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اگر نے آخری بار اسے پولیس کی حراست میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جھکڑیاں پڑی تھیں۔

وہ نوشا کے بارے میں علی احمد سے بات کرنا چاہتی تھی، مگر ہمت نہ پڑتی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے نوشا کے متعلق کچھ کہا تو اسے اور بھی ایسی باتیں بتانا پڑیں گی جن کو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ ممکن ہے انہیں سن کر علی احمد بدگماں ہو جائے اور اسے ہیڈ کوارٹر سے بھی نکلنا پڑے۔

ویسے اسکاٹی لارکوں کو بھی سلطانہ سے خاصی مدد ملتی تھی۔ وہ ان کے چھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کر دیا کرتی۔ قیصوں میں بٹن ٹانگ دیتی۔ ہفتے کی رات کو فلک پیا کا اجلاس ہوتا تو وہ اسکاٹی لارکوں کے لیے چائے تیار کر دیتی۔ سارے اسکاٹی لارک اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ اس سے بات کرتے تو نظریں نیچی کر کے۔ کبھی بلا وجہ اس سے بات چیت کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اگر وہ ان کا چھوٹا مونہ کام کر دیتی تو وہ بار بار اس کا شکریہ ادا کرتے۔

رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”چلو اٹھ کر منہ دھو لو۔ تم بہت دیر تک روٹی ہو۔“

سلطانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر علی احمد کو دیکھا۔ وہ اس کے عین مقابل لڑی تھی۔

پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب علی احمد نے بڑے جذباتی انداز سے سوچا۔ سلطانہ واقعی خوبصورت ہے اور بہت مظلوم بھی ہے۔ اس نے گہری سانس بھری اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ سلطانہ کے شانے پر رکھ دیا۔

اس ”کیوں“ کا وہ کیا جواب دیتی۔ اسی بات کے طشت از بام ہو جانے سے تو وہ ڈر رہی تھی۔ پھر علی احمد نے خود ہی کہا۔ ”میری سمجھ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں آیا۔ ٹھیک ہے کہ وہ تمہارا بھائی ہے اور تمہیں اس سے محبت بھی ہے۔ مگر تمہاری ساری تباہی تو اس کے ہاتھوں ہوئی۔ کم از کم میرا تو یہی اندازہ ہے۔“

سلطانہ نے سوچا اگر علی احمد نے نوشا کے متعلق ایسی ہی رائے قائم کی تو وہ نوشا کی کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ نوشا کو چھانی ہو جائے گی۔ اس کا بھائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گا۔ اس نے یہی سوچ کر دبی زبان سے رک رک کر علی احمد کو ساری باتیں صاف صاف بتادیں۔ اور جب وہ سب کچھ بتا چکی تو اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”میں واقعی بہت بری ہوں۔ واقعی بہت بری ہوں۔ آپ مجھے جتنا چاہیں ذلیل سمجھ لیں مگر اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

کمرے کی فضا چاک غمناک ہو گئی۔ باہر رات کی تاریکی تھی اور کمرے میں سلطانہ کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ علی احمد سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا واقعی یہ لڑکی مصیبت زدہ ہے۔ وہ ربڑ کی گیند کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر گر رہی تھی اور ہر جگہ اس پر ٹھوکر لگائی جا رہی تھی۔ یہ عجیب معاشرہ ہے جہاں عورت ربڑ کی گیند اور خوبصورتی چوری کا مال بن جاتی ہے۔

لیپ کی زرد زرد روشنی میں سلطانہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بجھتی ہوئی موسم بستی کی طرح آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بڑی مظلوم نظر آرہی تھی۔ علی احمد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

”تم پریشان نہ ہو۔ میں تمہارے بھائی کی رہائی کے لیے پوری پوری کوشش کروں گا۔“

سلطانہ نے بھیگی ہوئی پلکوں سے علی احمد کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

”آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا۔ مجھے ایک سہارا مل جائے گا۔ میرا کوئی نہیں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

علی احمد اس کے رونے سے پریشان ہو گیا وہ بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر تک سلطانہ کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے سلطانہ کا سر آہستہ آہستہ تھپ تھپایا۔ ”روؤ مت“



ہاری لگ رہی تھی۔

وہ بے نیازی سے بولی۔ ”کیوں؟“

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”صبح بات کر لیجئے گا۔ مجھے نیند معلوم ہو رہی ہے۔“ وہ بدستور لا پرواہی سے بول رہی تھی۔

اس نے جمائی لینے کے لیے منہ کھولا اور لمحہ کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ سلمان نے ٹوکا۔  
”میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔“ اس کا لہجہ حکمانہ تھا۔

وہ دھم سے صوفے پر گر پڑی اور تیزی سے بولی۔ ”لیجئے بیٹھ گئی۔ کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“  
سلمان لمحہ بھر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر بڑے اطمینان سے بولا۔ ”مجھے تمہاری یہ حرکتیں  
لفظی پسند نہیں۔ میں اب زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”آپ کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر منوچر کے پاس چلے گا۔“  
”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ چلے چل کر بستر پر لیٹئے۔ دو خواب  
اڑ گولیاں کھا لیجئے اچھی نیند آجائے گی۔ دراصل بات۔۔۔“

وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر سکی تھی کہ سلمان نے اسے جھڑک دیا۔ ”رخصی! زیادہ اسرار  
بننے کی کوشش نہ کرو۔“

وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ ”لیجئے اس میں اسرار بننے کی کون سی بات ہے۔ آپ خواہ بخواہ الٹی  
یدھی باتیں سوچا کرتے ہیں۔“

وہ تیزی سے بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے الٹی سیدھی باتیں سوچنے کا موقع نہ دو۔  
رنہ۔۔۔“ اس نے جھٹ اپنا دایاں ہاتھ نکال کر سامنے کر دیا۔ اور کمائی دار چاقو کڑکڑاتا ہوا کھل

یا۔ روشنی میں اس کا پھل اس طرح جھللا رہا تھا کہ رخشندہ کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اس نے دہشت  
اور نظروں سے سلمان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دیکھتے ہوئے انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ چہرے  
اس قدر وحشت اور دیوانگی تھی کہ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر رخشندہ کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔ ”یہ آج آپ کیا کر

## فصل پانزدہم

(۱)

سنان رات میں دروازے کی تھنڈی زور زور سے بجنے لگی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ سلمان ابھی تک جاگ رہا تھا۔  
اس نے خاموشی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ رخشندہ اور جعفری دروازے پر کھڑے تھے۔ جعفری  
فوراً واپس چلا گیا۔ سلمان سے اس کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ زینے کی سیڑھیاں  
طے کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔ ڈراویر بعد کار کے اشارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ جعفری جا چکا تھا۔

سلمان دروازہ بند کر کے لوٹا۔ سامنے صوفے پر اس کی بیوی تھکی ہوئی نیم دراز تھی۔ وہ چپ  
چاپ دوسرے کمرے میں گیا۔ مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ رخشندہ اسی طرح لیٹی تھی۔ اس کے بال کمر  
کر ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک دھندلا گئی تھی۔ آنکھوں میں کا جل پیکا پڑ گیا تھا۔  
سلمان نے اس کے چہرے پر اچھتی سی نظر ڈالی اور اس کے روبرو جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ رخشندہ  
نے اسے دیکھ کر بڑے ناز سے کہا۔ ”افو! ابھی آج تو میں بہت تھک گئی۔“

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا۔ خاموش بیٹھا رہا۔  
وہ روشنی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ وہ  
کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ کمرے میں آتا دینے والی خاموشی چھائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رخشندہ  
اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ سلمان نے کہا ”بیٹھ جاؤ!“ اس کی آواز خلاف معمول بہت

رہے ہیں؟“

”یہ اب تمہارے سوچنے کی بات ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا کرنے والا ہوں۔“

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم جعفری سے ملنا جلنا بند کر دو۔“

”مگر یہ تو بہت بری بات ہوگی۔“

مسلمان اونچی آواز سے بولا۔ ”اگر تم کو اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا تو کچھ عرصے کے لیے اپنے میکے چلی جاؤ۔“

اس دفعہ رخشندہ نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا۔ مسلمان کی بات سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تھکے لہجے میں بولی۔ ”میکے میں میرا اب کون بیٹھا ہے جس کے پاس چلی جاؤں۔“ اس کا لہجہ اور ٹیکھا ہو گیا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔“

”مگر بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی۔“ مسلمان اس روز دو ٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ کئی بار یہی بات پہلے اشاروں میں اور پھر نرمی سے کہہ چکا تھا۔

رخشندہ تلملا کر کھڑی ہو گئی۔ ”جو آپ چاہتے ہیں وہی ہوگا۔“ وہ مڑی اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مسلمان ذرا دیر صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ بھی سونے کے لیے اپنے بستر پر چلا گیا۔

\*\*\*

شام کو جعفری آیا۔ مسلمان اس وقت گھر ہی میں تھا۔ البتہ اس کی بیوی جعفری کی آمد سے پہلے ہی برابر والے فلیٹ میں چلی گئی۔

جعفری سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بڑی بے تکلفی سے پکارنے لگا۔ ”رخشی! کوئی جواب نہ ملا۔“

اس دفعہ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ ”رخشی! جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔ ایسی خوبصورت شام کو صرف بوڑھے گھر پر رہتے ہیں یا بچوں کی آئینیں۔ مجھے اس وقت کمرے میں زیادہ دیر قید نہ رکھنا۔“ وہ تیزی سے بولتا چلا گیا۔

خلاف توقع جب اسے رخشندہ کی آواز نہ سنائی دی تو وہ سامنے والے کمرے میں گھس گیا اور

زور زور سے بولنے لگا۔

”یہاں تو اندھیرا ہے۔ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔“

وہ رخشندہ کو تلاش کرتا رہا۔ پکارتا رہا۔ مسلمان خاموش بیٹھا اس کی آواز سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جعفری واپس آیا۔

”سالو من! کیا تم بتا سکتے ہو رخشی اس وقت کہاں ہے؟“

مسلمان نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

جعفری نے لمحہ بھر رک کر کہا۔ ”تمہارے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہو سکتی ہے؟“

”میں جب واپس آیا تو وہ موجود نہیں تھی۔“ وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

”تو گویا تمہیں اس کے پروگرام کا کوئی پتہ نہیں۔ تم عجیب شوہر ہو یعنی تم کو یہ نہیں معلوم کہ تمہاری بیوی اس وقت کہاں ہوگی؟“

مسلمان نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ دل ہی دل میں کہا۔ واقعی میں عجیب شوہر ہوں۔ عجیب نہ ہوتا تو جعفری، تم مجھ سے میری بیوی کے متعلق اس طرح بات نہ کرتے۔ مجھے اتنا الو کا پتھا اور بے غیرت نہ سمجھتے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر تھپڑ سید کرے اور دھکے دے کر باہر نکال دے۔ مگر یہ تھپڑ بہت مہنگا پڑتا۔ اس میں پانچ سو روپے ماہانہ کا نقصان تھا اور اتنا بڑا نقصان جھیلنے کے لیے وہ فی الحال آمادہ نہیں تھا۔

جعفری اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ آخر تھکا ہوا سا صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بڑا بے چین نظر آ رہا تھا۔ اس کی بے چینی سے مسلمان کو لطف آ رہا تھا۔ گھنٹہ بھر تک وہ اسی بے چینی کے عالم میں رخشندہ کا انتظار کرتا رہا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کے چہرے پر جو تازگی تھی، دھندلا گئی تھی۔ وہ مضطرب اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی عالم میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔

مسلمان نے غور کیا کہ جاتے وقت وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ مسلمان نے کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا۔ جعفری نے تیزی سے سڑک عبور کی۔ اپنی کار کے پاس پہنچا اچھل کر اگلی نشست پر بیٹھا۔ اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا۔ زور سے کار کا دروازہ بند کیا اور تیز رفتار سے کار دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے

محفل: کزور۔ آن کی آن میں دیکھتے دیکھتے۔

او جھل ہو گیا۔ یہ تمام حرکتیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ چوٹ کھا کے گیا ہے کم از کم ہفتہ بھر تک نہیں آئے گا۔

مگر سلمان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ فوجی کے قریب وہ پھر موجود تھا۔ اس کا چہرہ ابھی تک پریشان تھا۔ وہ کمرے میں جس انداز سے داخل ہوا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوشی سے نہیں آیا تھا۔ وہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر اس نے سلمان سے پوچھا۔

”رخصتی واپس آگئی؟“

”ہاں۔“ سلمان نے مختصر جواب دیا۔

”تم نے پوچھا نہیں وہ کہاں گئی تھی؟“

”نہیں۔“ سلمان نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

”کیوں؟“ جعفری کے لہجے میں بے قراری نمایاں تھی۔

”وہ کچھ ناراض معلوم ہوتی ہے۔ میری ہمت نہ پڑی۔“

سلمان جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر پہلے اس نے رخصتہ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ذرا دیر اور ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ اور اب شاید کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔

جعفری نے سلمان کی بات سنی اور بڑی تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم نے اس سے کچھ نہیں پوچھا؟“

سلمان نے آہستہ سے کہا۔ ”نہیں۔“

جعفری نے کوئی بات نہیں کی۔ بے چینی سے اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔ پھر اٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا جس میں رخصتہ موجود تھی۔

وہ بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی۔ اس روشنی میں رخصتہ کا چہرہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جعفری جا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شکوہ کرنے کے سے انداز میں بولا۔

”میں پوچھ سکتا ہوں شام کو تم کہاں تھیں؟ میں نے تمہارا مکمل ایک گھنٹہ انتظار کیا۔ تم نے

پری آج کی پوری شام خراب کر دی۔“

وہ خاموش رہی۔ اس نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

جعفری نے اس دفعہ نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے۔ تم کچھ اداس معلوم ہو رہی ہو۔“

وہ بیزار سے بولی۔ ”میرے سر میں درد ہے۔“

”اوہو تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ میں ڈاکٹر کو لے آؤں؟“

وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ ”جی نہیں شکریہ!“ اس نے خشکیں نظروں سے اسے دیکھا۔

جعفری صاحب! آپ آئندہ میرے کمرے میں اس طرح بغیر پوچھے نہ آیا کریں۔ یہ میرا بیڈ روم ہے ڈرائیونگ روم نہیں ہے۔“

جعفری سناٹے میں آگیا۔ گھبرا کر بولا۔ ”تم تو بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔“

وہ اسی طرح تیز لہجے میں بولی۔ ”بہتر ہو گا کہ آپ ڈرائیونگ روم میں جا کر بیٹھیں۔“

اس دفعہ جعفری تملاکر رہ گیا۔ رخصتہ کی یہ ساری باتیں اس کے لیے بالکل انوکھی تھیں۔ نا سے حقارت ٹپک رہی تھی۔ اس نے تیکھی نظروں سے رخصتہ کو دیکھا اور جھنجھایا ہوا کمرے سے ہر نکل گیا۔

سلمان دروازے سے لگا چوروں کی طرح ان کی باتیں سن رہا تھا۔ جعفری کو آتے دیکھ کر وہ مڑا۔ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

جعفری کمرے میں آیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جعفری نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ سیدھا روٹی دروازے کی جانب بڑھا۔

سلمان بھی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا تو سلمان نے نرمی سے کہا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا وہ بہت ناراض ہے۔“

جعفری نے مشتبہ نظروں سے اسے دیکھا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

\*\*\*

سلمان دفتر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد جعفری کا چہرہ اسی سے بلانے آیا۔ سلمان نے اس کے کمرے

شام کو وہ سلمان کے گھر پہنچا۔ رخصتہ اس وقت موجود تھی۔ سلمان بھی دفتر سے ذرا دیر پہلے واپس آیا تھا۔ وہ اور جعفری بیرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔ رخصتہ اس کمرے میں آئی۔ نہ تو اس نے جعفری سے بات کی نہ اس کی جانب دیکھا۔ چپ چاپ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ وہ اس وقت عام گریلو لباس میں تھی جس سے یہ بات واضح تھی کہ وہ پڑوس کے کسی فلیٹ میں گئی ہے۔ کم از کم اس لباس میں وہ بازار نہیں جاسکتی تھی۔

جعفری دیر تک رخصتہ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ آخر شام گھری ہو گئی اور رات شہر میں اتر آئی تو جعفری چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

کئی روز تک یہی ہوتا رہا۔ جعفری آتا۔ رخصتہ یا تو گھر میں موجود ہی نہ ہوتی یا جعفری کے آتے ہی اٹھ کر پڑوس میں چلی جاتی اور جب تک وہ گھر میں رہتا واپس نہ آتی۔ کبھی آگے سامنا ہوتا اور جعفری زبردستی بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بے رخی سے جواب دیتی۔ جعفری تلملا کر رہ جاتا۔ ان دنوں وہ سخت پریشان تھا۔ دفتر میں بھی کھویا کھویا نظر آتا۔ سلمان کے گھر آتا تو بے چینی سے کمرے میں ٹھہرتا رہتا۔ گھنٹوں صوفے سے گردن ٹکائے خلا میں گھورا کرتا۔ تھک جاتا تو کارلے کر کہیں چلا جاتا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد پھر واپس آ جاتا۔ اس کا تروتازہ چہرہ چند ہی روز میں مجلس کر رہ گیا۔ آنکھوں کی چمک دمک بجھ گئی تھی۔ تیز لہجے میں جلدی جلدی بات کرنے کے بجائے وہ اب راکرک کر اور آہستہ آہستہ بات کرنے لگا تھا۔

رخصتہ بھی ان دنوں اجڑی اجڑی نظر آتی۔ اس نے لباس میں اہتمام برتنا چھوڑ دیا تھا۔ میک اپ کی طرف سے بھی لا پرواہ ہو گئی تھی۔ ہر وقت عام گریلو لباس میں رہتی۔ کئی کئی روز کپڑے نہ بدلتی۔ بال بکھرے ہیں تو شام تک بکھرے رہتے۔ بہت ہوا تو لمبے لمبے بالوں کا بے نکاسا جوڑا باندھ لیا۔ اس کے حسن کی ساری سحر انگیزی اور دل کشی ماند پڑ گئی تھی۔ وہ بالکل معمولی لڑکی معلوم ہوتی۔ اور رخصتہ جو ہر شام قدم قدم پر اپنے حسن کا جادو جگاتی ہوئی گھر سے نکلتی تھی نہ جانے کہاں روپوش ہو گئی تھی۔ اس کی آواز میں جو لوج اور نفیسگی تھی وہ بھی نہ رہی۔ وہ اب چڑچڑی ہو گئی تھی۔ بات بات پر اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ وہ ہر وقت اکھڑی اکھڑی سی رہتی۔

سلمان چپ چاپ دونوں کی یہ حالت دیکھتا رہا۔ ان کی بے چینی سے، ان کی پریشانی سے اسے

اٹلی اجڑی: بیزار۔ سحر انگیزی: جادوگری، مراد خوبصورتی۔ ماند پڑنا: کم ہونا، دم ہونا۔ لوج: نرمی۔ نفیسگی: نرمی۔

میں جا کر دیکھا۔ جعفری خاموش بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا۔ سلمان پر نظر پڑتے ہی اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ تیکھے لہجے میں بولا۔

”مسٹر سالومن! آپ کے خلاف بڑی سخت شکایت آئی ہے۔ آپ بالکل لا پرواہ ہوتے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر اس دفتر کو چھوڑنا پڑے تو آپ کو حیرت نہ ہونا چاہیے۔“

یہی سیدھی سیدھی دھمکی تھی۔ سلمان نے یہ دھمکی خاموشی سے سن لی۔ آئندہ پوری احتیاط برتنے کا وعدہ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اس دھمکی نے اسے پریشان کر دیا۔ تنخواہ سے اس نے اتنا بھی پس انداز نہیں کیا تھا کہ ایک مہینہ بھی بے روزگاری کا گزار سکے اور فوری ملازمت ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔

وہ پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ جعفری نے اسے پھر بلوایا۔ اس دفعہ اس نے کھل کر بات کی۔

”کیا تمہارا رشتی سے جھگڑا ہوا تھا؟“

”نہیں۔“ سلمان نے صاف انکار کر دیا۔

”تم مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ضرور ایسی بات ہے۔“

سلمان نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”آپ یقین ماننے ایسی کوئی بات نہیں۔“

”کیا تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“ جعفری کے دل کا چور بول اٹھا۔ وہ سلمان سے صاف صاف بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر سلمان نے اسے موقع نہ دیا۔ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”آپ سے مجھے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟“

”پھر رشتی کل اس قدر ناراض کیوں تھی؟“

”ناراض تو وہ مجھ سے بھی ہے۔ آج صبح اس نے میرے ساتھ ناشتا بھی نہیں کیا۔ آپ ہی اس سے پوچھئے۔ میری تو بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔“ سلمان اس وقت بڑا معصوم اور سادہ لوح معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی اس سادہ لوحی پر جعفری مسکرا دیا۔

”میرا خیال ہے وہ ضرور تمہاری کسی بات سے ناراض ہے۔ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ تم اسے ابھی سمجھ نہیں سکے۔“

وہ دیر تک سر پرستانہ انداز میں باتیں کرتا رہا۔

میں زہر بن کر سرایت کر جاتی۔

وہ اس درد سے، اس کرب سے بلبلاتا تھا۔ آخر اس اذیت سے بچنے کا اس نے یہ طریقہ نکالا کہ اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔ اکثر ایسا ہو تا کہ وہ صبح دفتر کے لیے گھر سے نکلتا اور آدھی رات کے بعد واپس آتا۔

ایک شام وہ اپنے دفتر کے ایک ساتھی کے ساتھ فلم دیکھنے گیا۔ گیارہ بجے دونوں سنیما ہاؤس سے نکلے تو پینے پلانے کا پروگرام بن گیا۔ کچھ عرصے سے اس نے شغل سے نوشی بھی شروع کر دیا تھا۔ اس روز اس کے ہمراہ عنایت تھا۔ اسے تنخواہ معقول ملتی تھی اور ابھی تک کنوارہ تھا۔ بڑی بے فکری سے خرچ کرتا تھا۔ اس کی تحریک پر دونوں شہر کے ایک مشہور ہوٹل میں شراب پینے چلے گئے۔

ہوٹل کا بار خاصا وسیع تھا۔ مگر روشنی بہت کم تھی۔ بار میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ زیادہ تر غیر ملکی نظر آرہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ وہ دھیمی دھیمی روشنی میں شغل بادہ نوشی کر رہے تھے۔ بے تکلفی سے ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ تازگی اور حرارت حاصل کر رہے تھے۔ فضا میں رنگ و بو کی فراوانی تھی۔ یہ جاڑوں کی سرد رات تھی۔ کونین کی برف پوش وادیوں سے آنے والی خشک ہوائیں چل رہی تھیں۔ لوگ موٹے موٹے اونچی لباسوں میں ملبوس تھے۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

دونوں ایک ٹیبل کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

عنایت نے آرڈر دیا۔ ویٹر گلاسوں میں اسکاچ و ہسکی لے آیا۔ دونوں آہستہ آہستہ وہ ہسکی کی ہسکی لگانے لگے۔ عنایت خاصا باتونی نوجوان تھا۔ وہ اپنا تازہ معاشرت سنانے لگا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ بڑا اونچا فلٹ ہے۔ سلمان اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی منمنک خیز حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک ایک گوشے میں اس کی نظر گئی۔ وہ دم بخود رہ گیا۔

سامنے جعفری اور رخشندہ بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ اور تنومند آدمی بھی تھا۔ وضع قطع سے غیر ملکی نظر آتا تھا۔ وہ چھپوڑی حرکتیں کر رہا تھا۔ اور منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہا تھا۔ غالباً بہت زیادہ پی گیا تھا۔ سلمان نے دیکھا۔ رخشندہ نے جام اٹھایا اور اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ ہاں! وہ

بلبلاتا ہے قرار ہوتا۔ شغل سے نوشی: شراب چہل: فراوانی: کثرت: زیادتی: چالے: سردی کا موسم۔

تسکین ملتی۔ اس تسکین میں اس ذہنی اذیت کے انتقام کا جذبہ بھی شامل تھا جو جعفری اور رخشندہ سے اسے پہنچا تھا اور جس کی تکلیف سے وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔

لیکن اس کا جذبہ انتقام جلد ہی آسودہ ہو گیا۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان دونوں کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ دونوں بے چین تھے۔ بے قرار تھے۔ خود اپنی آگ میں جل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے تھے مگر مل نہ سکتے تھے۔ اس سارے ڈرامے میں اس کا کردار بالکل ولن کا سا تھا اور جب وہ اس پر غور کرتا تو خود اپنی نظروں میں گر جاتا۔ اسے عجیب سی ذلت کا احساس ہوتا جو خود بڑا اذیت ناک تھا۔

کچھ یہی سوچ کر اس نے ایک روز رخشندہ سے کہا۔ ”رکشی! تم کو جعفری کی اس طرح بے عزتی نہیں کرنا چاہیے۔ تم اس سے بات چیت تو کر لیا کرو۔“

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ خود ہی تو ان سے ملنے جلنے پر منع کیا۔ اب خود ہی سفارش بھی کر رہے ہیں۔“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔

”مگر میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اتنا سخت رویہ اختیار کر لو۔ یہ تو اس بے چارے کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔“

اس نے رخشندہ کو سمجھا بھجا کر کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔

اس شام رخشندہ نے جعفری کے ساتھ چائے پی۔ بات چیت بھی کی۔ پھر تینوں بکچر دیکھنے چلے گئے۔ رخشندہ اور جعفری بہت خوش نظر آرہے تھے۔ رخشندہ نے اس روز ایک عرصے بعد نفاست سے میک اپ کیا تھا۔ بالوں کو ایک خاص انداز سے آراستہ کیا تھا۔ لباس سے بھی خوش ذوقی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر دل کش اور دل آرا نظر آرہی تھی۔ اس کے یہ دلکشی دیکھ کر سلمان کو بھی مسرت ہوئی۔ بہر حال وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ اسے چھو سکتا تھا۔ اسے چوم سکتا تھا۔ اس کی گداز بانہوں پر سر رکھ کر سو سکتا تھا۔

\*\*\*

رخشندہ اور جعفری شام ہوتے ہی سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتے۔ سلمان گھر میں بیٹھا کڑھتا رہتا۔ رخشندہ رات گئے جعفری کے ساتھ مسکراتی ہوئی آتی۔ اس کی مسکراہٹ سلمان کے ذہن

آسودہ ہوتا: مراوغضا: ختم ہونا: خوش ذوقی: نفاست: سلیقہ: گداز: نرم۔

شمسین پی رہی تھی۔ سلمان کا سارا جسم لرز کر رہ گیا۔

وہ اپنی آنکھوں سے رخشندہ کو مے نوشی کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ رک رک کر آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت اور ہر ہر انداز کو وہ بغور دیکھ رہا تھا۔ عنایت نے ایک بار اسے ٹوکا بھی۔  
”کہاں کھو گئے تم؟ یہ پیگ تو ختم کرو۔“

سلمان نے خاموشی سے اپنا گلاس اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں غنائت خالی کر دیا۔ یہ تیسرا پیگ تھا۔ ایک چھوٹا اس نے اور منگولیا۔ اور بظاہر عنایت کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ مگر اس کی پوری توجہ اس گوشے کی جانب تھی جہاں وہ تینوں بیٹھے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد تینوں اٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ رخشندہ کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ تو مند غیر ملکی نے اپنا بازو آگے کر دیا اور رخشندہ اس کے بازو میں جھولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دونوں آگے آگے تھے۔ جعفری ان سے دو قدم پیچھے ہٹ کر چل رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کئی پیکٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اپنی جھکی ہوئی گردن اور چال ڈھال سے بالکل چڑتا تیا معلوم ہو رہا تھا۔

سلمان خود کو ان کی نظروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور دزدیدہ نگاہوں سے تینوں کو دیکھ بھی رہا تھا۔ عین اس وقت عنایت کی آواز ابھری۔

”اوہو ہو ہو! تم جعفری کو دیکھ رہے ہو۔ یار وہاں کل اپنے پروموشن کے چکر میں لگا ہے۔“

سلمان نے حیرت سے عنایت کو دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

عنایت جھوم کر بولا۔ ”یار بڑی زور دار لونڈیا ایم۔ ڈی کو پیش کی ہے۔ دیکھو تو کیسا چمٹائے ہوئے چل رہا ہے۔ رات تو اس سالے کی گزرے گی۔ ہائے! کیا غضب کا دانا ہے۔“

اس نے رخشندہ کے گداز جسم کے بارے میں ایسی گندی بات کہی کہ سلمان تڑپ کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے عنایت نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

”کیا یہی کمپنی کا وہ میٹنگ ڈائریکٹر ہے جو پچھلے ہفتے نیویارک سے آیا ہے؟“

”مسٹر برائن کو کیا تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تین سال قبل انہی دنوں دورے پر آیا تھا۔ مگر اس وقت تک تم کمپنی میں ملازم نہیں ہوئے تھے۔ ظالم اس عمر میں بھی بڑا نکمیں مزاج ہے۔“

چڑتا تیا: خوشامدی، مکینہ۔ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا: شکیموں سے دیکھنا۔ نکمیں مزاج: عیاش، بیش پند۔

بھفری کا پروموشن تو سمجھو کیا ہو گیا۔“

سلمان کو یقین نہ آیا۔ ”نہیں پارٹنر! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”شرط بدلو۔ اسی ہفتے تم سن لینا کہ جعفری کو پروموشن مل گیا۔ اتنی بڑی رشوت پر تو سلطنت ل سکتی تھی۔ تم پروموشن کی بات کر رہے ہو۔ استاد ترقی کرنا چاہتے ہو تو یہ ٹیلنک سیکھ لو۔ سب سے انسان نسخہ ہے۔“ عنایت نے قہقہہ لگایا۔ ”ہندوستانی رجواڑوں اور دیسی ریاستوں کے بارے میں شہور ہے کہ وہاں دو شیرائیں ایک زمانے میں سچے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ اگر کوئی نوجوان لڑکی صبح ی صبح اپنے بھائی سے یہ کہہ دیتی تھی کہ رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ فوج میں کیپٹن بن گیا ہے تو اسی روز کیپٹن بن جاتا تھا۔ سرکاری ہر کارہ خود آؤر ڈرلے کر گھر آتا تھا۔ کیا سمجھ؟“ وہ بے تکلفی سے ہنستا رہا۔ ”یار والیان ریاست کی بھی کیا بات تھی۔ سب ہی سالے اپنے وقت کے راجہ اندر تھے۔“ وہ نشے کی دھن میں بولتا جا رہا تھا اور سلمان کو اس کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ عنایت کچھ دیر اور ٹھہرتا چاہتا تھا مگر سلمان نے زیادہ اصرار کیا تو وہ بھی چلنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ واپس جاتے ہوئے سلمان نے دیکھا، جعفری اکیلا بیٹھا شغل بادہ نوشی کر رہا تھا۔ سلمان کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ اس نے سوچا۔ کیا عنایت سچ کہہ رہا ہے؟ بھفری، رخشندہ کو برائن کے سپرد کر کے چلا آیا؟ مگر اسے یقین نہ آیا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ رخشندہ گھر پر ہوگی۔

مگر جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو رخشندہ وہاں نہیں تھی۔

سلمان بہت دیر تک جاگتا رہا۔ بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر تھک کر سو گیا۔ صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو رخشندہ بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ نہ جانے وہ رات کو کس وقت لوٹی تھی۔ خادمہ نے دروازہ کھولا تھا اور اسی کی زبانی سلمان کو معلوم ہوا کہ رخشندہ جس وقت آئی تھی اس کی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

\*\*\*

سلمان نے اپنا شکاری چاقو نکالا۔ اسے کھولا۔ چاقو کمائی زور سے کڑکڑاتی ہوئی چیخنی۔ اب نکالی میں وہ اکثر چاقو کھولتا۔ اس کی کمائی چیخنی۔ سلمان اس کی دھار پر انگوٹھا پھیر کر تیزی اور جلا کا

لڑکھٹا: شرط لگانا۔ ہر کارہ: ملازم، ڈاکر۔ جلا: چمک، روشنی۔

اندازہ لگاتا۔

مسلمان کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر تھوک دے۔ سالا بھڑوا! کس ڈھٹائی سے اپنا کارنامہ پان کر رہا ہے۔ کم از کم رخشندہ کے سامنے تو اسے اپنی اس ترقی کا اس طرح اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ اس عہدے کی بلندی پر پہنچنے کا زینہ تو وہی بنی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے مسلمان کو اچانک اپنا خیال آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ جعفری سے بڑا بھڑوا ہے جس کی بیوی رات رات بھر دوسروں کے پہلو گرم کرتی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ کتنی ذلت کی بات ہے۔ اسے ڈوب مرنے چاہیے۔ نفرت، حقارت، غم وغصے کے طے جلے احساسات نے اچانک اس پر طغ کر دیا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔

رخشندہ اور جعفری اٹھ کر باہر چلے گئے۔ رخشندہ نے لباس میں خاص اہتمام کیا تھا۔ میک اپ پر بھی خاصی توجہ صرف کی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی حسین اور طرح دار نظر آرہی تھی۔ جعفری نے اپنی زنی کی خوشی میں کچھ دوستوں کو رات کے کھانے پر بوٹ کلب میں بلایا تھا جس کا وہ باقاعدہ ممبر تھا۔ ہر چند کہ مہمانوں کی فہرست میں مسلمان کا نام شامل نہ تھا۔ مگر اس نے تکلفاً مسلمان کو بھی مدعو کیا اور اس نے سب معمول ان کے ہمراہ جانے سے گریز کیا۔ سرور کا بہانا تراش کر گھر ہی پر ٹھہر گیا۔

دونوں کے جانے کے بعد وہ خاموش بیٹھا بیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر انتہائی جھنجھلاہٹ کے عالم میں اس نے طے کیا کہ دونوں کو جس قدر جلد ہو سکے ٹھکانے لگایا جائے۔ اپنی تذلیل کا وہ اس طرح اہل لے سکتا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایک دوسرے خیال نے ذہن میں سر ابھارا جو بالکل مختلف تھا۔ اس نے سوچا ان دونوں کے لیے وہ کیوں اپنی زندگی داؤ پر لگانا چاہتا ہے؟ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی جنگلی سور کا شکار کرتے ہوئے مارا جائے۔

اس وقت اس نے ایک نیا منصوبہ بنایا اور اس کا آغاز دوسرے دن دفتر میں اس وقت ہوا جب اس نے جعفری کے سامنے اپنا استعفیٰ ڈال دیا۔ جعفری ہکا بکا ہو کر اس کا منہ ٹکنے لگا۔ حیرت زدہ ہو کر بلا۔ ”تم ملازمت چھوڑ رہے ہو۔ تم کو ہو کیا گیا؟“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”میں نے تو تمہارے پدموشن کی سفارش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کو جلد ہی پدموشن مل جائے گی۔“

”شکریہ مجھے نہ اب اس ملازمت سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ پدموشن سے۔“ مسلمان نے جھکے جھکے میں کہا۔ ”ابھی میں ایک استعفیٰ اور دینا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔“

”مگر کے لیے وہ خاموش رہا۔ اس نے جعفری کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا

اول شب کو رخشندہ جب جعفری کے ساتھ گھر سے باہر چلی جاتی تو مسلمان کمرہ بند کرتا۔ چاقو کھولتا اور الماری کے پیچھے سے ڈمی نکال کر بلندی پر رکھ دیتا۔ یہ ڈمی اس نے موٹے اونٹنی پٹے کے ایک بڑے تھیلے میں روٹی بھر کر تیار کی تھی۔ وہ ہونٹوں کو زور سے بھیجنے کر ڈمی پر چاقو سے وار پر وار کرتا۔ پھر تھک کر بیٹھ جاتا اور دیر تک ہانپتا رہتا۔ کبھی یہ ڈمی جعفری کا روپ اختیار کر لیتی کبھی رخشندہ بن جاتی۔

سرما کی ٹھنڈی سسنان راتوں میں اس نے اپنے ذہن میں نہ جانے کتنی بار جعفری اور رخشندہ کو قتل کیا تھا۔ ان کے خون میں ڈوبے ہوئے جسموں کو پھڑکتے ہوئے دیکھا تھا اور خوف سے بدن میں جبر جبری محسوس کی تھی۔

دونوں کو قتل کرنے کا ہر رات وہ نیا منصوبہ تیار کرتا مگر دوسرے روز اس منصوبے میں کوئی نہ کوئی خالی نظر آتی۔

ابھی اس کا منصوبہ تیار نہیں ہوا تھا کہ ایک شام جعفری حسب معمول مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت رخشندہ اور مسلمان بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جعفری بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ دونوں کے قریب پہنچ کر وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اور بڑے کھلنڈرے انداز میں بولا۔

”آپ دونوں چاہیں تو مجھ سے بڑی شاندار پارٹی لے سکتے ہیں۔ آج اور ابھی۔“

رخشندہ نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”آج تو بڑے جوویل موڈ میں نظر آرہے ہیں۔ بات کیا ہے؟“

”پہلے تم مجھے ایک گرام گرم مبارک باد دو۔“

رخشندہ بولی۔ ”کوئی بہت اونچی خوشخبری معلوم ہوتی ہے جو اس طرح بیٹگی مبارک باد کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔“ اس کا انداز گفتگو صاف چٹلی کھا رہا تھا کہ اسے اس خوش خبری کا پہلے ہی علم تھا۔

وہ گردن کو خم دے کر ایکٹروں کی طرح لمحہ بھر تک اسے سکتا رہا۔ پھر اس نے سینہ پر ہاتھ رکھا اور کسی قدر گردن جھکا کر کہا۔ ”آپ کا یہ خاکسار کمپنی کا براؤنچ منیجر مقرر ہو گیا ہے۔ دو ہزار تنخواہ ملے گی۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے ٹھانڈے ہوں گے۔ کیوں ہے نا بہت بڑی خوش خبری؟“

فیصلہ کر چکا ہوں۔“

”میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہرہ و غیرہ طلب نہ کرے۔“

”تم نے اس کے بارے میں رخشندہ سے گفتگو کی؟ میرے خیال میں تمہیں پہلے اس سے بات کرنی چاہیے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ میری جانب سے یہ تمام باتیں آپ طے کر لیں؟“

جعفری ذرا دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سلمان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میرا مشورہ ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ رخشندہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اسے چھوڑتے ہوئے تمہیں دکھ نہیں ہوگا؟“

سلمان نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ہرگز نہیں۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”آج آپ رخشندہ سے اس سلسلے میں بات کریں گے؟“

جعفری کو اس معاملے میں سلمان سے قطعی ہمدردی نہیں تھی۔ مگر وہ خواہ مخواہ ہمدرد بننے کی کوشش کرنے لگا۔ ”میں رخشندہ سے بات تو کر لوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

سلمان نے جل کر کہا۔ ”جعفری صاحب آپ کیوں مجھے خواہ مخواہ مشورہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دو ہزار روپے تنخواہ پانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی سمجھ بھی مجھ سے چار گنا قیمتی ہے۔“

جعفری ناراض ہونے کے بجائے نرم پڑ گیا۔ اس نے سوچا اس وقت سلمان کا پارا چڑھا ہوا ہے۔ مزید کچھ کہا تو وہ برس پڑے گا۔ آہستہ سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں رخشندہ سے آج ہی بات کر دوں گا۔“

سلمان خاموشی سے چلا گیا۔ اس نے دفتر میں بھی بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ شام تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو جعفری موجود تھا۔ رخشندہ بھی قریب ہی بیٹھی تھی۔ سلمان نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ ایک صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ رخشندہ کا چہرہ مر جھایا ہوا تھا۔ وہ کسی قدر

پریشان نظر آ رہی تھی۔

\*\*\*

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔

تینوں چپ بیٹھے تھے اور اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔ دسمبر کی یہ سرد شام بڑی اداس تھی۔ کمرے کے کرب ناک سکوت سے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہاں کوئی مر گیا ہے اور وہ تینوں اش کے سر ہانے بیٹھے سوگ منا رہے ہیں۔

بہت دیر بعد جعفری کی آواز ابھری۔ ”میں نے تمہارے آنے سے ذرا دیر پہلے رخشندہ سے بات کی تھی۔ اسے تمہارے فیصلے سے بہت دکھ پہنچا ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں کہ تم بہت غلط قدم اٹھا رہے ہو۔“

جعفری کی بات سن کر رخشندہ کی گردن جھک گئی۔ اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ منڈلانے لگا۔ لیکن سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

وہ تیزی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ چاقو نکالا اور فوراً اوپس آ گیا۔ اور ان دونوں کے درمیان ٹانگیں پھیلا کر اس طرح سینہ تان کر کھڑا ہو گیا کہ وہ اس کے سامنے بہت حقیر معلوم ہونے لگے۔

سلمان نے قہر آلود نظروں سے جعفری کو دیکھا۔ ”ہاں تو مسٹر جعفری! تم کیا کہہ رہے تھے؟“ اس نے ایک جھٹکے سے چاقو کھولا۔ اس کی کمائی کڑکڑاتی ہوئی زور سے چیخی۔ جعفری اور رخشندہ کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ دونوں سہمی ہوئی نظروں سے سلمان کو دیکھنے لگے۔ سلمان نے اونچی آواز سے کہا۔

”میرے فیصلے سے اس عورت کو دکھ ہوا ہے۔ یہ عورت جو اتفاق سے میری بیوی ہے اور جسے بیوی کہتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔“ لمحہ بھر کے لیے وہ رکا اور ٹیکھے لہجے میں بولنے لگا۔

”میرا پہلا فیصلہ یہ تھا کہ تم دونوں کے سینے میں یہ چاقو پوسٹ کر دوں۔ مجھے اسی طرح تسکین مل گئی تھی۔ تم دونوں نے مل کر میرے سکون کو میری خوشیوں کو لوٹا ہے۔ دن کا چین اور راتوں کی نذر حرام کر دی۔ تم نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں اب بالکل فلاش ہوں۔ ایک ہارا ہوا جواری۔ تم

لہناک: تکلیف دہ فلاش: غریب، نکال۔

حق مہر: دور تم جو نکال کے وقت مرد اپنی بیوی کو دینے کا ہمد کرتا ہے۔ توقف: وقفہ پارا چڑھنا: غصہ آنا۔



زیب سے گزر گیا۔

سلمان شام تک کمرے میں مردے کی طرح خاموش پڑا رہا۔ اس روز نہ اس نے کھانا کھایا اور نہ پہرہ کی چائے پی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا اس کا اسے بھی دکھ تھا۔

رخشدہ کے ساتھ اس نے اس گھر میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ ہر چیز سے اس کی وابستہ تھی۔ درود پوار سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ ہر طرف اس کا سایہ منڈلا رہا تھا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب ایک رات رخشدہ دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ جلد عروسی میں نرانیوں کی طرح جھومتا ہوا داخل ہوا تھا۔ سامنے پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسمری پر وہ سرخ لباس

میں سٹائی بیٹھی تھی۔ اس کا جسم خوش رنگ پھولوں کی مانند مہک رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے زینب جاکر بیٹھ گیا۔ پھر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے رخشدہ کا مہندی سے رچا ہوا گورا گورا

ہرک ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ ”ہاتھ تو بہت خوبصورت ہے۔“ وہ سٹ کر دوہری ہو گئی تھی۔ سلمان نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا تھا۔ ”میری شہزادی!“ وہ شرم سے سٹائی بیٹھی رہی۔ ”بولو میری

شہزادی!“ اس نے بڑے پیار سے اصرار کیا تھا۔ ”جی۔“ بڑا مختصر جواب ملا تھا۔ اور اس نے بے ساختہ

ہاتھ بڑھا کر دلہن کا گھونگٹ الٹ دیا۔ دلہن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا سلمان نے اس کا

نول کی طرح دل آویز چہرہ دیکھ کر دل میں کہا تھا۔ یہ تو بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اور پھر اس

خوبصورت لڑکی کے ساتھ مل جل کر اس نے خوبصورت زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ پر سکون دنیا

بسانے کا تہیہ کیا تھا۔ اور آج وہ خوبصورت خواب بکھر گئے تھے۔ پر سکون دنیا جہنم بن کر ابڑ گئی تھی۔

سلمان کو ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ ان کو یاد کرتے کرتے وہ تنکے میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ جب رونے سے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہو گیا تو اس نے سوچا اب کیا کرنا چاہیے۔ اچانک اسے علی

احمد یاد آگیا۔ پھر فلک پیا اور اس کے اسکا کی لارک یاد آگئے۔ اب علی احمد ہی اسے سہارا دے سکتا تھا اور فلک بیچا کے ساتھ ہی اس کی اجڑی ہوئی بے رونق زندگی میں حرارت اور نمونید اہو سکتی تھی۔

اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے باہر چلا گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا۔

رات کے شو میں فلم دیکھی اور واپس آکر اطمینان سے سو گیا۔

چند ہی روز میں اس نے گھر کا سارا سامان فروخت کر دیا۔ دفتر سے تنخواہ لی۔ فلیٹ اس نے

لہجہ عروسی: دلہن کا چہرہ کھٹ۔

خدا کی بہتی

دونوں نے مجھے پاگل بنادیا۔ مجھے کتے سے زیادہ ذلیل کر دیا۔“

سلمان کی آواز ابھر گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

جعفری اور رخشدہ سراپیسگی کے عالم میں دم بخود بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

چہروں پر دہشت چھائی تھی۔ سلمان نے تامل کے بعد کہا۔ ”دروست۔ میں تم کو قتل نہیں کروں گا۔

میری زندگی اتنی ناکارہ نہیں ہے کہ تم دونوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر پھانسی کے پھندے پر

لٹک جاؤں۔ میرے لیے یہ کوڑھی ہو کر مرنے سے زیادہ گھناؤنی موت ہوگی۔“ ذرا دیر کے لیے وہ

رکا۔ ”جعفری! تم رنڈی کے بھڑوے ہو، میں بھی بھڑوا ہوں اور یہ سامنے وہ رنڈی بیٹھی ہے۔“

اس نے رخشدہ کی جانب انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”مگر اب میں اس رنڈی کا بھڑوانا نہیں

چاہتا۔ تم اپنی یہ امانت اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ورنہ سچ کہتا ہوں مجھے وہ ذلیل موت اختیار کرنا پڑے گی

جو میں کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتا۔ بولو کیا کہتے ہو؟ میرے سر پر اس وقت خون کھیل رہا ہے۔

میں ساری باتیں ابھی اور اسی وقت طے کرنا چاہتا ہوں۔“

جعفری نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے تمہاری تجویز منظور ہے۔ میں رخشدہ کو اپنے

ساتھ لے جاؤں گا۔“

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔

سلمان نے خود اپنے ہاتھوں سے رخشدہ کا سارا سامان اٹھا اٹھا کر جعفری کی کار میں بھرا۔

خادمہ کو بھی رخشدہ کے ساتھ رخصت کیا۔ اور جب وہ چلے گئے تو نڈھال ہو کر دھم سے صوفے پر

گر پڑا۔ وہ رینک لمبی لمبی سانسیں بھرتا رہا۔



سلمان اور رخشدہ نے عدالت میں علاقہ مجسٹریٹ کے روبرو طلاق نامے پر دستخط کر دیئے۔

رخشدہ نے مہر معاف کر دیا تھا۔ جعفری گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا۔ دوسرا گواہ ان کا

دکیل تھا جس نے طلاق نامے کی دستاویزات تیار کی تھی۔

عدالت سے باہر نکلتے وقت رخشدہ رو رہی تھی۔

جعفری اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلمان نے دونوں کو دیکھا اور تیزی سے ان کے

سراپیسگی: ڈر، خوف، رنڈی کا بھڑوا، رنڈی کا سودا کرانے والے۔

سلطانہ نے جواب دیا۔ ”میں یہیں رہتی ہوں۔“

”یعنی تم ہیڈ کوارٹر میں رہتی ہو؟“

”جی ہاں پچھلے ہی مہینے مجھے رکنیت ملی ہے۔“

سلمان نے غور کیا کہ سلطانہ کے چہرے پر ابھی تک وہی مانوس معصومیت تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کئے شرما کر بول رہی تھی۔ وہی سادگی، وہی بڑی بڑی روشن آنکھوں پر جھکی ہوئی گھنی پلکوں کے سائے، وہی گردن کا ہلکا سا خم۔ سلطانہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہ ابھی تک ایسی ہی خوبصورت اور دل آویز تھی۔

وہ زندگی کا ایک طویل سفر طے کر کے واپس آیا تھا۔ راستہ نامہوار تھا۔ اس نے قدم قدم پر ٹوکریں کھائی تھیں، دکھ جھیلے تھے۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اسے خوشی ہوئی کہ سلطانہ اس طرح اہلک مل گئی۔ وہ بھی اس قدر قریب کہ دونوں ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کے دوش بدوش چل سکتے تھے۔ اب تو سلطانہ اس کی راہ میں حائل بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں کی ایک ہی راہ تھی، ایک ہی مقصد تھا اور ایک ہی منزل تھی۔

یہ سوچتے سوچتے معاً نیاز یاد آگیا۔ اور اس کا خیال آتے ہی سلمان کو ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی کوئی اس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سلطانہ سے پوچھا۔

”نیاز کہاں ہے؟“

سلطانہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”کئی مہینے ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔“

سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ عین اسی وقت علی احمد لاہوری میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ سرخ سرخ گالوں والا ایک تندرست بچہ تھا۔ یہ لایا تھا۔ علی احمد نے حیرت سے سلمان کو دیکھا اور خوشی سے چیخ پڑا۔

”سلمان تم آگئے؟“

دونوں ہانپتے پھیلا کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ علی احمد اس کی پیٹھ تھپتھا کر بولا۔

”مجھے یقین تھا سلمان ایک روز تم ضرور واپس آؤ گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آگئے۔ مجھے بہت

لاش بدوش: کندھے سے کندھا ملا کر، متحد ہو کر۔

ساڑھے چار ہزار روپے لے کر پگڑی پر دے دیا۔

دسمبر کی ایک سرد رات کو وہ ایک سوٹ کیس اور بستر لے کر سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچ گیا۔

(۲)

گنتی کی گنجان آبادی کے چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں کے درمیان فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر کی سفید دیواروں والی عمارت منارہ روشن کی مانند سر اوجھائی تھی۔ پہرہ دار گزر چکا تھا۔ جاڑوں کی ہلکی ہلکی بستی دھوپ دروہام پر پھیلی تھی۔ گلی کوچوں میں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے، شور مچا رہے تھے، عورتیں اونچی آوازوں سے بول رہی تھیں۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ سلمان صدر دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ہیڈ کوارٹر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ کوئی اس کائی لارک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر جھانکتا ہوا لاہوری کی طرف مڑ گیا۔ قریب پہنچا مگر جھجک کر دروازے پر رک گیا۔

لاہوری کی لمبی میز پر ایک عورت جھکی ہوئی نہایت انہماک سے اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا۔ پیٹھ سلمان کی جانب تھی۔

عورت نے دروازے پر چاپ سن کر گردن موڑی۔

سلمان ششدر رہ گیا۔ وہ سلطانہ تھی۔ لمحہ بھر تک وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے تنکٹا رہا۔ پھر اس نے تعجب سے کہا۔

”سلطانہ؟“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”جی؟“

سلطانہ بھی حیرت زدہ نظر آرہی تھی۔ اس نے سوچا سلمان یہاں کیسے آگیا اور یہی بات وہ سلطانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”تم یہاں کس طرح آئیں؟“ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

تھک دھڑنگ: بالکل بے لباس۔ چہل پہل اور گہما گہمی، رونق۔

خوشی ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔“

یہ علی احمد تھا۔ اس نے کھنکار کر سلمان کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”سلمان! یہ سلطانہ ہے، میری بیوی۔“

اڑاڑا دم اور دو دیوار تک لرزاٹھے۔ سلمان لڑکھڑا کر رہ گیا۔ پل بھر کے لیے اس کے دل کی دکت رک گئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے علی احمد کو دیکھا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ علی احمد کسی قدر شرما کر بولا۔

”ہاں بھی میں نے شادی کر لی۔“

یہ کہتے کہتے علی احمد کی نظریں جھک گئیں۔ اس کی کشادہ پیشانی دکت رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرانے لگی تھی۔

ہیشہ سنجیدہ رہنے والا علی احمد بہت معصوم اور بھولا بھالا نظر آ رہا تھا۔

سلمان پر لمحے بھر تک سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ پھر اس نے چونک کر کہا۔ ”مبارک ہو۔“ اس سے زیادہ وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ اس کی آواز میں دہلی دہلی تھر تھر ہٹ تھی۔

علی احمد نے کہا۔ ”تم سفر سے تھکے ہو۔ آ رہے ہو۔ کسی کمرے میں جا کر آرام کرو۔ رات کو اہلخانہ سے باتیں ہوں گی۔ اس وقت مجھے ایک مقدمے کے سلسلے میں کورٹ جانا ہے۔“

سلمان نے پوچھا۔ ”کیا اس رات کے ہنگامے والا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے؟“

”نہیں، وہ تو کب کا ختم ہو گیا۔ اس مقدمے میں جان ہی کب تھی۔ وہ تو دھاندلی سے الیکشن جیتنے کے لیے اسکاٹی لارکوں کے خلاف پولیس نے بنایا تھا۔ یہ دوسرا ہی مقدمہ ہے۔“

علی احمد نے سلطانہ کو مخاطب کیا۔ ”سلطانہ! تم بھی کورٹ چلو گی؟“

”جی ہاں۔ میں تو بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

علی احمد معذرت کرنے لگا۔ ”بھئی معاف کرنا سلطانہ مجھے دیر ہو گئی۔“

سلطانہ بولی۔ ”آپ تھکے ہوئے ہیں۔ ذرا آرام تو کر لیجئے۔ کہتے تو چائے بنا دوں۔“ اس نے

نارے تو فک کر کے۔ ”مگر آپ زیادہ چائے پینا بند کر دیں۔ بہت چائے پینے لگے ہیں۔“

علی احمد مسکرا کر بولا۔ ”اچھا بھی اب چائے کم پیا کروں گا۔ تمہارا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔“

دونوں بڑے گھریلو انداز سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے لب و لہجے میں ایک دوسرے کے

بلے خلوں تھا، پیار تھا، اپنائیت تھی۔

سلمان معذرت کرنے لگا۔ ”طرح طرح کی پریشانیوں میں ایسا گھرا رہا کہ آپ کو خط بھی نہ لکھ سکا۔ فرصت سے بتاؤں گا مجھ پر اس عرصے میں کیا کیا بیت گئی؟“

علی احمد نے زور سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ مسکرا کر بولا۔ ”تم زندگی کی اس چمک دمک پر رنجھ گئے جو دور سے بہت خوبصورت اور بڑی دلکش نظر آتی ہے۔ مگر سونے کا یہ جگمگ جگمگ کرتا پہاڑ صرف دیکھنے کے لیے ہے۔ جتنا اس کے قریب جانے کی کوشش کرو اتنا ہی دور ہٹتا جاتا ہے۔ یہ عجیب گورکھ دھند ہے۔ ایک تار سلجھاؤ دس الجھتے ہیں۔ ساری عمر تانا بانا ہی سلجھاتے گزار دو۔ سرا کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔“

علی احمد پر فلسفیانہ موڈ طاری تھا۔ وہ ابھی نہ جانے کتنی دیر زندگی کے اسرار اور موز پر گفتگو کرتا۔ اسی اثنا میں ننھا لیا زاس کے کرتے کا دامن پکڑ کر زور زور سے رونے لگا۔

علی احمد نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ اس کے رخساروں کا بوسہ لیا۔ ہنس کر بولا۔ ”سلمان! یہ سب سے چھوٹا اسکاٹی لارک، لیا ہے۔“

سلمان نے بچے کے گول منوں سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ ”کس کا بچہ ہے؟“

علی احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”فی الحال تو یہ میرا ہی بچہ ہے۔“ مگر بچے کو شاید اس کی بات ناگوار

گزری۔ وہ منہ پھاڑ کر رونے لگا۔ پیچھے سے سلطانہ کی آواز آئی۔

”لایئے اسے مجھے دے دیجئے۔“

علی احمد نے گھوم کر سلطانہ کو دیکھا اور سلمان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ”سلطانہ! تم ان سے نہیں ملیں۔ یہ فلک پیا کے بہت سینئر اسکاٹی لارک ہیں سلمان۔“

سلطانہ نے نظریں اٹھائیں۔

سلمان نے دیکھا۔ وہی جھلکتی ہوئی شفاف آنکھیں، وہی سینے میں اتر جانے والی نظریں، وہی گھبرایا گھبرایا سا معصوم چہرہ۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ سلطانہ! میں مر کر بھی تم کو نہیں بھول سکتا۔ یہ آنکھیں، یہ عارض، یہ لب۔ سلمان لمحہ بھر کے لیے بالکل بھول گیا کہ سلطانہ اور اس کے

علاوہ وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔

اچانک اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ کوئی اس کے وجود میں چیخا۔ نہیں، نہیں۔ یہ فرار ہے۔ خود نشی ہے۔ وہ زندہ رہے گا اور ایک اسکائی لارک کی طرح زندہ رہے گا۔ اس زندگی میں، اس جدوجہد میں حرکت تھی، حرارت تھی، مسرت تھی اور یہ مسرت بڑی مقدس اور پاکیزہ تھی۔ پہلے پورے معاشرے کو خوبصورت بناؤ۔ اس کے چہرے سے غلاظت اور گندگی صاف کرو۔ پھر خوب صورت چیزوں کی تمنا کرو۔ زندگی، حسین عورت کا ایک تبسم، شراب کا ایک جام نہیں ہے۔ زندگی عمل اور ذکرت کا نام ہے۔ انقلاب اور تغیر کا نام ہے۔ اس تغیر سے تم منہ نہیں موڑ سکتے۔ تمہارے ذہن میں وہ کانا چھ گیا ہے جو تمہارے شعور کو کبھی خود کشی کرنے نہ دے گا۔

سلمان نے فلک پیا چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ آنکھیں بند کئے سہ پہر تک کمرے میں پڑا گہری نیند سوتا رہا۔

\*\*\*

شام کو سلمان لا بیریری میں گیا۔ تمام اسکائی لارک وہاں موجود تھے۔ نئے اسکائی لارکوں سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ سب نے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ وہ ایک ایک سے گلے ملا۔ خوب زور زور سے قہقہے لگائے۔

اس کی آمد کی خوشی میں اسکائی لارکوں نے ایک چھوٹی سی پارٹی دی۔ اس میں چائے تھی، پھل تھے، اور گرم گرم سمو سے تھے جو سلطانہ نے تیار کئے تھے۔ چائے کی میز پر اس نے خوب باتیں کیں۔ طرح طرح کے لطیفے سنا کر سب کو خوب ہنسایا۔

بہت عرصے بعد اس کی ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز شام گزری۔ مگر وہ اب فلک پیا کا رکن نہیں رہا تھا۔ طویل غیر حاضری کے باعث اس کی رکنیت منسوخ کر دی گئی تھی۔ وہ دوبارہ رکنیت حاصل کرنے کا متمنی ضرور تھا اور اپنی اس خواہش کا علی احمد اور تنظیم کے دوسرے ارکان سے اظہار کر چکا تھا۔

چند روز بعد فلک پیا کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر زیدی نے اجلاس کی صدارت کی۔ اب وہی فلک پیا کا صدر بھی تھا۔ علی احمد بدستور کمرزئی جنرل تھا۔

سلمان سے یہ سب دیکھنا نہ گیا۔ ان کی ایک ایک بات اسے ناگن کی طرح ڈس رہی تھی۔ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا عذاب ہو گیا۔

”میں آپ سے شام کو ملوں گا۔“

علی احمد بولا۔ ”تم اسکائی لارک افضل کے کمرے میں ٹھہر جاؤ۔ اس کا کمرہ سب سے آخر میں ہے۔“

سلمان نے خاموشی سے اپنا بستر بند اور سوٹ کیس اٹھایا اور باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب بڑھا۔

”سلمان میں تمہاری کچھ مدد کروں؟“

”جی نہیں شکریہ! ان دونوں کا وزن زیادہ نہیں ہے۔“ یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

افضل کے کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا بستر بند کھولا اور سگریٹ سلگا کر تھکا ہوا سالیٹ گیا اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ ذہن پر برف کی تہیں جمی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار سوچتا یہ کیا ہو گیا؟ اسی سلطانہ کے باعث ایک بار اس نے فلک پیا چھوڑا تھا اور گھر جا کر طرح طرح کے جھیلوں میں پھنس گیا تھا۔ کیا وہ پھر اس کے لیے فلک پیا چھوڑ دے؟ یہاں رہ کر وہ اسے علی احمد سے اس طرح ہٹتے بولتے، پیار اور محبت سے ملتے جلتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اس کے لیے مستقل آزار بن جائے گا۔

انتہائی بے بسی کے عالم میں سلمان نے سوچا۔ خدایا! وہ اب کیا کرے۔ زندگی ہے کہ اس سے روشنی ہی چلی جا رہی ہے۔ حالات ہیں کہ بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ جینے کی ہر آس ہر امید اسے ٹھکرا کر آگے نکل جاتی ہے۔ وہ یہاں آیا تھا کہ زندگی کے دکھ بھرے سفر میں علی احمد اس کی رہنمائی کرے گا۔ اسے سہارا دے گا۔ مگر علی احمد نے ملتے ہی سینے میں خنجر اتار دیا۔ کیا وہ یہاں سے چلا جائے؟

ابھی اس کے پاس پانچ ہزار روپے موجود تھے جس سے وہ سال بھر تک گزارہ کر سکتا تھا۔ اور اس عرصے میں کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کر لینا ایسا مشکل نہیں تھا۔ پھر وہی ملازمت۔ وہی گھر اور اس گھر کو آباد کرنے کے لیے ایک عدد بیوی کی ضرورت۔ پھر وہی پرانا چکر۔ وہی شب و روز اور ان شب و روز کو خوشگوار بنانے کے لیے وہی باسی ہنگامے جن کا ذائقہ وہ کچھ چکا تھا، جن کا اسے بہت تلخ تجربہ تھا۔

\*\*\*

ریاض پچھلے مہینے جیل سے رہا ہو کر آیا تھا اور فلک پیاکا باقاعدہ رکن بن چکا تھا۔ وہ بھی اجلاس میں شریک تھا اور دیر سے خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

وہ صدر کی اجازت سے تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو خاموشی چھا گئی۔ اس نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

”میں اسکاٹی لارک سلمان کے جذبہ ایثار کی قدر کرتا ہوں۔ یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ انہیں فلک پیاسے کس قدر گہرا لگاؤ ہے۔ فلک پیاکا جماعت ہے، ایک تنظیم ہے۔ اور کوئی تنظیم محض تنظیم نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اغراض و مقاصد سے، یعنی اپنے سماجی اور اقتصادی پروگرام سے پہچانی جاتی ہے۔ فلک پیاکا بھی ایک سماجی اور اقتصادی پروگرام ہے۔ اسے عملی جامہ پہنانے اور کامیاب بنانے کے لیے ہم کو ان طبقات، سماجی تنظیموں اور جماعتوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرنا چاہیے جنہیں اس کے اغراض و مقاصد سے پوری طرح اتفاق ہے۔“

افضل نے مداخلت کی۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ اسکاٹی لارک ریاض یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں عملی سیاست میں سرگرمی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔“

”میں نے اپنی بات ابھی ختم نہیں کی ہے۔“ ریاض نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن اسکاٹی لارک افضل اگر دلوں کا حال پڑھ لیتے ہیں اور ذہنوں کے بھید معلوم کر لینے کا گرجاتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ ان کا قیاس درست ہے۔ میں یہی کہنا چاہتا تھا۔“

اس دفعہ افضل کے بجائے ساجد نے اٹھ کر کہا۔ ”میں اسکاٹی لارک ریاض پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فلک پیانے پہلے بھی عملی سیاست میں حصہ لیا تھا۔ میری مراد میونسپلٹی کے الیکشن سے ہے۔ یہ ہمارے لیے بڑا تلخ تجربہ ثابت ہوا۔ ہمیں اس کے نتیجے میں بہت بڑی قربانی دینی پڑی۔“ اس نے دیوار پر آویزاں صفدر بشیر کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تصویر آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ فلک پیاکا بانی اور ہمارے نہایت محترم رہنما کی تصویر ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی المناک موت کیوں، کیسے اور کن حالات میں واقع ہوئی۔“

”ایسی قربانیاں تو ہمیں آئندہ بھی دینی پڑیں گی اور ذہنی طور پر اس کے لیے خود کو تیار کرنا

اس نے سلمان کی رکنیت بحال کرنے کی تجویز اجلاس میں پیش کی۔

تجویز پر مختصر بحث ہوئی اور اسے اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ ساتھ ہی سلمان کو سخت تنبیہ بھی کی گئی کہ وہ آئندہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرے۔

سلمان اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔ اسے بلایا گیا اور اجلاس کے فیصلے سے آگاہ کر دیا گیا۔ رکنیت بحال ہونے پر ارکان نے اسے مبارک باد دی۔ اسے اجلاس کی کاروائی میں شرکت کرنے کی بھی اجازت مل گئی۔

سلمان کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے اجلاس سے خطاب بھی کیا۔ صدر اور دوسرے ارکان کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں یقین دلایا کہ وہ نہ صرف محتاط رہے گا بلکہ پوری پوری کوشش کرے گا کہ اس سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو۔ ساتھ ہی اس نے پشیمانی کا اظہار کیا اور اپنے غیر ذمہ دارانہ رویے کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔

ایجنڈے کی اہم شق، امجد خاں کی رپورٹ تھی۔

امجد خاں پچھلے سالانہ انتخابات میں فلک پیاکا خازن منتخب ہوا تھا۔ رپورٹ میں مالی مشکلات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ فلک پیاکا کام اپنے ہمدردوں کے چندے اور انڈسٹریل ہوم کیا مدنی سے چل رہا ہے۔ مگر فنڈ کی کمی کے باعث تنظیم کی سرگرمیوں کا آگے بڑھنا روز بروز مشکل ہو تا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈپسٹری کا ذکر خاص طور پر کیا گیا جو مالی مشکلات کے باعث غیر اطمینان بخش حالت میں تھی۔

سلمان نے صدر سے اجازت لی۔ اپنے کمرے میں گیا۔ سوٹ کیس کھولا۔ پانچ ہزار روپے نکالے۔ اجلاس میں واپس گیا۔ صدر کے سامنے نوٹوں کی گڈی رکھتے ہوئے نہایت انکسار سے کہا۔

”فلک پیاکے فنڈ کے لیے یہ میری حقیر پیشکش ہے۔“

اسکاٹی لارکوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر سلمان کے خلوص کو سراہا۔ انہوں نے اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا کہ ذرا دیر کے لیے اجلاس کی سنجیدہ فضا درہم برہم ہو گئی۔ سلمان کا سینہ فخر سے تن گیا۔

زندگی میں اتنی زبردست خوشی اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

دائرہ کار وسیع کرنے اور تقسیم کار کی اہمیت پر زور دیا۔ تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔ مختصر طور پر بتایا کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے۔

اس کی تجویز پر زیادہ بحث نہیں ہوئی۔ اسے منظور کر لیا گیا۔

اسی اجلاس میں اتفاق رائے سے سلطانہ کو انڈسٹریل ہوم کا انچارج، علی احمد کو تعلیم بالغاں کا انچارج، ڈاکٹر زیدی کو ملٹی امداد کے کاموں کا انچارج اور ریاض کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا انچارج منتخب کیا گیا۔ سعید احمد کو، جو ہوز طالب علم تھا، طلباء میں کام کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔

ریاض کی دوسری تجویز یہ تھی کہ فلک پیا اور اسکاٹی لارک، چونکہ عوام کے لیے نامانوس نام ہیں، لہذا تنظیم کا نام ایسا رکھا جائے جو ہمارے معاشرے کی روایات اور اقدار سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس تجویز پر طویل بحث شروع ہو گئی۔

رات لگ بھگ آدھی ہو چکی تھی اور اسکاٹی لارکوں کو صبح تڑکے اٹھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ صدر نے بحث ملتوی کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ تجویز پر آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے۔ اجلاس ختم ہو گیا۔

مسلمان کو اس کی خواہش پر ریاض کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ وہ پہلے بھی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا تھا۔ مزدوروں میں کام کرنے کا اسے بخوبی تجربہ تھا۔

صبح ہوئی تو وہ ریاض کے ہمراہ ٹریڈ یونین کے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

مسلمان ایک بار پھر پورے جوش و خروش اور لگن کے ساتھ فلک پیا کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔

اب وہ عہد اخود کو بے حد مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ سلطانہ کے بارے میں سوچنے کا موقع نہ ملے۔ اس طرح جافنشانی اور مستعدی سے کام کرنے میں اسے مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ ذہنی آسودگی مل رہی تھی۔

وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے سلسلے میں اکثر رات گئے واپس آتا۔ اس کا بیشتر وقت مزدوروں کے ساتھ گزرتا۔ وہ ان کے مسائل میں گہری دلچسپی لیتا۔

ریاض کی نگرانی میں اس کی ذہنی تربیت ہو رہی تھی۔ اس کا سیاسی شعور زیادہ سے زیادہ بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ ذہن میں نئے درجے کھل رہے تھے۔ وہ معروضی حالات سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ان کا

عہد: جان بوجہ کر جافنشانی، محنت، مستعدی، ہوشیاری، آسودگی، سکون۔ معروضی حالات: آس پاس کے مضمون حالات۔

پڑے گا۔“ ریاض نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”آپ نے یہ بھی سوچا کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں، وہ کیا ہے؟ سیاست صرف کاروبار حکومت میں حصہ لینے کا نام نہیں۔ یہ بنیادی طور پر معاشرے میں اقتصادی رشتوں کا اظہار ہے۔ اسے اس طرح سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کارخانے دار بھی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے اور مزدور بھی۔ دونوں ہی انسان ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ مگر جب کارخانے دار کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگاتا ہے تو اسے مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے یہ ایک طرح کا اقتصادی معاہدہ ہوتا ہے۔ مزدور، جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے اپنی محنت بیچتا ہے اور کارخانہ دار اسے خریدتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر جب مزدور اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لیے ٹریڈ یونین بناتے ہیں تو اسی وقت سے اقتصادی رشتوں کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دونوں ہی اپنے اپنے مفادات کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ یہی جدوجہد، یہی سماجی اور اقتصادی رشتوں کی تبدیلی سیاست ہے۔

اسی طرح جب آپ غربت، پس ماندگی اور سماجی اور اقتصادی عدم توازن ختم کر کے مساوات قائم کرنے اور معاشرے کو صحت مند اور خوب صورت بنانے کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم کرتے ہیں تو یہ جدوجہد ان طبقات اور سماجی گروہوں کے خلاف ہوتی ہے جو محنت کش عوام کی غربت اور پس ماندگی کا باعث ہیں۔ جو ان کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد سیاست ہے۔ فرق صرف سیاست کی نوعیت کا ہے۔ ایک استحصال کرنے والے طبقات کی سیاست ہوتی ہے، ایک استحصال زدہ غریب طبقات کی سیاست ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے۔“

مگر علی احمد نے ریاض کو مزید کہنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے اسکاٹی لارک ریاض کے موقف سے قطعی اتفاق ہے۔ مگر بحث کے لیے جو بلاشبہ ایک صحت مند رجحان ہے مناسب جگہ یہ اجلاس نہیں اسٹیڈی سرکل ہے۔ میں گزارش کروں گا کہ اسکاٹی لارک ریاض کے ذہن میں اس اجلاس کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی تجویز ہے تو اسے سامنے لائیں تاکہ اس پر غور کیا جائے۔“

ریاض نے علی احمد کی بات مان لی۔ اس نے ایک تجویز کی صورت میں فلک پیا کی سرگرمیوں کا

لازم و ملزوم: دو ایسی چیزیں جن کا وجود ایک دوسرے کے لیے ضروری ہو۔ عدم توازن: ناہمواری، ظلم۔ مساوات: برابری۔ استحصال زدہ: جس کا حق چھینا گیا ہو، مظلوم۔ صحت مند رجحان: اچھی روایت۔

وہ اقبال جرم کر چکا تھا۔

نیاز کے قتل کے الزام میں اس پر مقدمہ چلا۔ نہ اس کا کوئی گواہ تھا نہ ہمدرد اور نہ ہی کسی نے اس کے مقدمے کی پیروی کی۔ لہذا تھریات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت مجسٹریٹ کی عدالت سے اسے سیشن سپرد کر دیا گیا۔

شامی اکثر جیل میں اس سے ملنے آتا۔ وہی اس بھری دنیا میں اس کا تنہا ہمدرد و نمکسار تھا۔ پھر اس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

ملاقات کے دن نوشا اس کا بے چینی سے انتظار کرتا۔

مگر شامی کو تپ دق ہو گئی تھی۔ وہ خون تھوکنے لگا۔ ہر وقت بخار میں بھٹتا رہتا۔ تپ دق کے موزی مرض نے اس کے مخفی جسم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ کچھ عرصہ خیراتی اسپتال میں رہا۔ اب اپنے گھر کے ایک گوشے میں پڑا زندگی کے دن گن رہا تھا۔



علی احمد نے جب نوشا کے مقدمے کی پیروی کی تو عالم یہ تھا کہ نوشا کے سر پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ وہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ دوسری طرف استغاثہ کے گواہ بھی پیدا ہو گئے تھے۔ پولیس کو یہ شہادتیں خان بہادر فرزند علی نے مہیا کی تھیں۔

وہ نوشا کے مقدمے میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ نوشا کو قتل عمد کے جرم میں سزائے موت دلوانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ پولیس کا مقدمہ بہت مضبوط تھا۔

علی احمد نے نوشا کے مقدمے کے لیے جس وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں وہ نیاز کے قتل میں خان بہادر فرزند علی اور اس کے نیچر کو بھی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ نیاز کو قتل سے پہلے زہر دیا جا چکا تھا۔ اپنے اس موقف کی تائید میں اس نے یہ دلیل ثبوت کے ساتھ پیش کی تھی کہ قتل کی رات خان بہادر اپنے نیچر نذر محمد کے ہمراہ نیاز کے پاس آیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد نیاز نے اپنے پیٹ میں شدید درد محسوس کیا تھا۔ اسے خون کی تپ بھی ہوئی تھی۔ اس واقعے کی عینی گواہ سلطانہ اور اس کی خادمہ تھی۔ ان کے علاوہ بوڑھا

تجزیہ کرتا اور اس تجزیے کی روشنی میں مزدوروں کی جدوجہد کے لیے حکمت عملی وضع کرتا۔

ہیڈ کوارٹر میں واپس آتے ہی سلمان کھانا کھاتا اور لائبریری میں چلا جاتا۔ گھنٹوں مطالعہ میں غرق رہتا۔ اسٹینڈی سرکل کے مباحثوں کے لیے نوٹ تیار کرتا اور آدھی رات کو تھکا ہارا اس طرح بستر پر جا کر سوتا کہ صبح ہونے سے پہلے اس کی آنکھ نہ کھلتی۔

یہ اس کی زندگی کے بڑے طوفانی روز و شب تھے۔ کام، کام اور کام۔ ان دنوں اس پر یہی دھن سوار تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو روز بروز بڑھاتا جا رہا تھا۔ کبھی اس کے خلاف غیر ذمہ داری یا کام سے غفلت کا الزام نہ لگا۔ جب تک ہیڈ کوارٹر میں رہتا مطالعہ کرتا یا اپنی ڈائری بار بار دیکھتا کہ کس وقت اسے کہاں پہنچنا ہے اور کیا کام کرتا ہے۔

کبھی کبھی سلطانہ سے مڈھ بھگڑ ہو جاتی تو وہ صرف یہ سوچ کر رہ جاتا۔ یہ سلطانہ تھی۔ ہاں سلطانہ ہی تھی۔ وہی ہوگی۔ علی احمد کی بیوی۔ ننھے لیا کی ماں۔ اب وہ اسے سلطانہ سے زیادہ علی احمد کی شریک حیات اور ننھے لیا کی ماں کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش کرتا۔ اس کوشش میں وہ اس سلطانہ کو بھولتا جا رہا تھا جو دلکش خدو خال والی ایک خوبصورت لڑکی تھی اور جس سے اسے محبت بھی تھی۔

سلمان کے شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ مصروف دن مصروف راتیں۔ مویشیوں کی سی زندگی بسر کرنے والے پس ماندہ اور مظلوم عوام کو انسان بنانے کی جدوجہد۔ ان کے لیے علم کی روشنی، شعور کی بالیدگی، ترقی اور خوشحالی کی تمنا۔ اس جدوجہد کی کوئی سرحد نہیں۔ یہ رواں دواں اور ہر آن آگے بڑھنے کا عمل ہے۔ یہ معاشرے کی تبدیلی کا ایسا مسلسل سفر ہے جس میں زندگی نئی نئی منزلوں کی جانب جا رہی ہے۔ اس سفر میں انسانی جدوجہد اپنی جسمانی اور ذہنی محنت کے کس بل پر، دریاؤں کا رخ موڑتی، سمندروں کا سینہ روندتی، چاند ستاروں پر کندیں ڈال رہی ہے۔ فطرت کے سر بستہ اسرار اور موز افشا کر رہی ہے۔ کائنات کی تسخیر کر رہی ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ارتقائی عمل ہے۔

(۳)

نوشا جیل میں تھا۔ وہ زندگی اور موت کے دوراں پر کھڑا اپنی قسمت کا فیصلے سننے کا انتظار کر رہا تھا۔

حکمت عملی وضع کرتا: تدبیر کرتا: پالیسی بناتا: مہیجر: آساناسنا: خدو خال: چہرے کے نقوش: بالیدگی: کھار: رواں دواں: جاری رہنے والا: ہر آن: ہر وقت: چلائی: جاری: وساری: سر بستہ: پوشیدہ: تسخیر: تابع کرتا: قابو میں لاتا۔

تپ دق: ایک مرض: استغاثہ: دعویٰ کرنے والا: قتل عمد: جان بوجہ قتل کرتا۔

گر گے فیاض کے ذریعے سلطانہ کو کوٹھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور ایک جعلی دستاویز کی بنیاد پر نیاز کی تمام جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا۔

خان بہادر میونسپلٹی کا چیئرمین تھا۔ کئی کارخانوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس سندھ اور پنجاب میں زرعی املاک اور جاگیر تھی۔ اب وہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اور ممبر منتخب ہونے سے پہلے ہی وزیر بننے کے لیے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔

وزراء اور اعلیٰ حکام سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے تعلقات اور اثر و رسوخ کا دائرہ ملک سے نکل کر بیرون ملک تک پھیل چکا تھا۔

اس کا ایک بیٹا کو لمبو پلان کے تحت لندن میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ دوسرا فورڈ فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر کو لمبیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔

خان بہادر فرزند علی، جواب الحاج خان بہادر فرزند علی بن چکا تھا، اسلام کی سر بلندی کا علم بردار تھا۔ نورانی مسجد کے پر شکوہ مینار اس کے جذبہ ایمانی کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ وہ ملک اور قوم کا بھائی خواہ اور محبت وطن تھا۔ اسکا لی لارکوں کو وطن دشمن اور تحریک کار قرار دیتا تھا۔ انہیں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل میں بند کرنے کی کھلم کھلا دھمکیاں دیتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے پاکستان میں متروکہ جائیداد کی طرح اسلام اور حب الوطنی کے جملہ حقوق بھی اپنے نام الاٹ کر لیے ہیں۔

نوشا جیل میں تھا اور پھانسی کے پھندے کے سائے میں کھڑا تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزند ارجمند بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اپنے مستقبل کی روشن صبح کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہ خواص اور عوام کی قسمت کا فرق ہے۔ خواص، خان بہادر فرزند علی پیدا کرتے ہیں اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور نو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں کوئی قتل کر کے جیل جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر اڑیاں رگڑ رگڑ کے موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی رکشا کھینچتا ہے اور تپ دق میں مبتلا ہو کر خون تھوکتا ہے اور کوئی بیچروں کے ساتھ تالیاں پٹار کر کو لہے منکا تا ہے۔

\*\*\*

نوشا کا مقدمہ ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ اسے کراچی سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

بہی خواہ: بہتری چاہنے والا۔ کھلم کھلا: سر عام۔ متروکہ جائیداد: ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد۔

خانساں تھا۔ لیکن دو مہینے پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

دوسری ہی پیشی پر خادمہ اپنے بیان سے منحرف ہو گئی۔ خان بہادر نے ایک ہزار روپے دے کر اسے توڑ لیا تھا۔

اب صرف سلطانہ واحد گواہ رہ گئی تھی۔

اس مرحلے پر نوشا کے وکیل نے عدالت کے روبرو ایک درخواست پیش کی جس میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ نیاز کی لاش ایک مجسٹریٹ کی نگرانی میں قبر سے نکالی جائے۔ اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ لیکن عدالت نے سلطانہ کی گواہی اس لیے قابل اعتنا قرار نہ دی کہ وہ نوشا کی حقیقی بہن تھی۔ لہذا درخواست مسترد کر دی گئی۔

عدالت کے اس فیصلے میں بھی خان بہادر فرزند علی کے اثر و رسوخ اور دولت کو بہت بڑا دخل تھا۔

مسلمان بھی نوشا کے مقدمے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ دوبارہ ملاقات کے دن نوشا سے ملنے جیل گیا۔ اس کے لیے پھل اور مٹھائی بھی لے گیا۔ اس نے نوشا کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھا تو تڑپ اٹھا۔ اس کا چہرہ بھگ گیا اور دل بیٹھنے لگا۔

علی احمد بڑی تندہی سے نوشا کے مقدمے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ وہ وکیل سے ملتا۔ مقدمے کے سلسلے میں تبادلہ خیالات کرتا۔ ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہتا۔

\*\*\*

مقدمہ کی سماعت جاری رہی۔

ایک روز عدالت سے واپسی پر علی احمد نے دکھ بھرے لہجے میں مسلمان کو بتایا کہ نوشا کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور سیشن جج کے اس فیصلے کے خلاف وکیل نے ہائی کورٹ میں اپیل بھی دائر کر دی ہے۔

اب نوشا کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہائیکورٹ کے ہاتھ میں تھا۔

اس عرصے میں مسلمان کو اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ یہی کہ ننھالیا ز دراصل نیاز کا بچہ ہے جسے علی احمد اپنی اولاد کی طرح پال رہا ہے۔ نیاز کے قتل کے بعد خان بہادر فرزند علی نے اپنے

منحرف ہونا: بھڑکانا، مکر جانا۔ قابل اعتنا: توجہ کے لائق۔ تندہی: عمت، مستقل مزاجی۔



مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب اس کی اپیل پر عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔

علی احمد چند روز پہلے ہی کراچی پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہمراہ وکیل تھا، سلطانہ تھی، سلمان تھا، دو اور اسکا کئی لارک بھی تھے۔

اس روز صبح ہی سے سلطانہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پونے سو جے ہوئے تھے۔

وہ رات بھر بے چین رہی۔ پل بھر کے لیے بھی نہ سو سکی۔ وہ کھوئی کھوئی سی ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ نہ بول رہی تھی نہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ فیصلہ سننے کی غرض سے جب سب عدالت میں پہنچے تو سلطانہ کی بے قراری اور بڑھ گئی۔

نوشا ملزموں کے کٹہرے میں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ ڈاڑھی کے بھورے بھورے سنہری بالوں میں اس کا چہرہ، بحریہ کے نوعمر ملاحوں کی طرح خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی ماں سے روٹھا ہوا کھڑا ہے۔

عدالت میں موت کی سی گہری خاموشی چھائی تھی۔ پھر اس خاموشی میں ایک بھاری بھر کم آواز ابھری۔ یہ جج کی آواز تھی۔ وہ فیصلہ سن رہا تھا۔

نوشا قاتل تھا۔ قانون کا یہی فیصلہ تھا۔

استغاثہ نے نوشا کے خلاف شہادتوں کے ساتھ پورا پورا ثبوت بھی مہیا کر دیا تھا۔ اسے موت کی سزا دی جا چکی تھی۔ ہائی کورٹ نے عدالت ماتحت کے فیصلے سے اتفاق رائے کیا تھا۔ اسے برقرار رکھا تھا۔ البتہ تا بالغ ہونے کے باعث عدالت نے سزائے موت کے بجائے نوشا کے لیے چودہ سال قید با مشقت کی سزا کا فیصلہ دیا۔

انصاف نے اپنا تقاضا پورا کر دیا۔

نوشا کو ملزموں کے کٹہرے سے نکالا گیا اور جن ہاتھوں کو قلم کی ضرورت تھی، ان میں ہتھ کڑیاں ڈال دی گئیں۔ ہتھ کڑیاں پہن کر نوشا پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

”مجھے پھانسی دے دو۔“

”مجھے گولی مار دو“

”میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔“

”میں اب جینا نہیں چاہتا۔“

”خدا کے لیے مجھے پھانسی دے دو!“

”جج صاحب! اللہ کے لیے مجھے پھانسی دے دو!“

نوشا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ پہلی بار جیل گیا تو واپسی پر جیب کترابن گیا۔ تب وہ صرف سال بھر کے لیے جیل گیا تھا۔ اب اسے چودہ سال کی سزا ملی تھی۔ چودہ سال کی طویل مدت میں وہ زیادہ بڑا اور زیادہ خطرناک جرائم پیشہ بن سکتا تھا۔ مگر وہ جرائم پیشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس زندگی سے موت بہتر تھی۔

وہ موت چاہتا تھا۔ وہ ہلک ہلک کر پھانسی کی درخواست کر رہا تھا۔ مگر عدالت اسے پھانسی دینے کے حق میں نہیں تھی۔ انصاف کا یہی تقاضا تھا۔

کانٹینبل اسے گھسیٹ کر عدالت سے باہر لے گئے۔

نوشا نے ایک بار بے قرار ہو کر ہاتھ بلند کئے اور آہنی ہتھ کڑیوں سے دیوانہ وار اپنا سر ٹکرائے لگا۔

آن کی آن میں اس کی پیشانی پر سرخ سرخ لو تھڑے ابھرنے لگے۔ چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ کانٹینبلوں نے جھپٹ کر اس کی مشکلیں کس لیں۔

سلطانہ چیخ مار کر اس کی جانب لپکی۔

”نوشا! میرا بھیا! خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جا!“

”نہ جا۔ نوشا نہ جا۔ میں مر جاؤں گی۔“

”نوشا، نوشا!“

علی احمد نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ سلطانہ اس کے سینے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

علی احمد پیار سے اس کی پیٹھ تھپک کر تسلی دینے لگا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ

پڑ گیا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھللا رہے تھے۔

سلمان لمحہ بھر تک، دونوں کو تنگنی باندھے دیکھتا رہا۔ اچانک اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ آنسوؤں کے گرم گرم قطرے پلکوں سے ڈھلک کر ٹپ ٹپ فرش پر گرنے لگے۔ سلمان نے منہ پھیر کر آنسو پونچھے اور چپ چاپ عدالت سے باہر چلا گیا۔

کراچی،

اکتوبر ۱۹۵۷ء